محمد
صلی اللہ علیہ وسلم

پیغمبرِ انسانیت
صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

پیغمبرِ انسانیت ﷺ

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

اِدارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲۔ کلب روڈ، لاہور

طبع پنجم: 2006ء

تعداد: 1100

ناشر: ڈاکٹر رشید احمد (جالندھری)
ناظم ادارہ ثقافتِ اسلامیہ

قیمت: 200/- روپے

مطبع: رفاعی پرنٹرز، لاہور

اس کتاب کی طباعت و اشاعت اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، انفاق فاؤنڈیشن، کراچی اور محکمہ اطلاعات و ثقافت، حکومت پنجاب کی مالی معاونت کی بدولت ممکن ہوئی ہے۔ شکریہ!

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

مولانا حسن مثنیٰ ندوی

اردو زبان میں سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اشاعت و تبلیغ کا کام بڑی محنت' بڑی توجہ اور بڑے شدومد سے ہوا ہے۔ اس کی ایک باقاعدہ تحریک چلی ہے اور اس عنوان پر مسلسل تصنیفات و تالیفات وجود میں آئی ہیں اور آتی چلی جاتی ہیں۔ ہمارے برصغیر میں اس سلسلے میں جو خدمات انجام دی گئیں' ان کی مختصر تفصیل یہ ہے:

سید احمد خاں

برصغیر پاک و ہند میں انیسویں صدی عیسوی کے خادمان سیرت میں سب سے پہلا نام تحریک علی گڑھ کے بانی سید احمد خاں کا ہے' جنھوں نے یورپی مستشرقین کی گمراہ کن سرگرمیوں کا بہت مدلل اور موثر جواب دیا۔ سرسید نے سرولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کے جواب میں اپنی مشہور کتاب "خطبات احمدیہؐ" لکھی جس کو اردو زبان میں سیرت کی پہلی تصنیف کہنا چاہیے۔ سرسید نے یہ کتاب بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھی تھی' حتی کہ عبرانی بائبل کے حوالے بھی اسی زبان کے حروف میں پیش کیے ہیں اور پھر رومن

تلفظ کے ساتھ ان حوالوں کے ترجمے بھی درج کر دیے ہیں۔ یہ کتاب نہایت سنجیدہ اور مدلل ہے اور اس میں ولیم میور کے اعتراضات کا جواب بڑے اچھے انداز میں دیا گیا ہے۔

شاہ سلیمان پھلواروی

تحریک سیرت کی بنیاد مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء میں رکھی تھی۔ وہ برصغیر کے جلیل القدر عالم اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کے بعد قاضی محمد سلیمان منصور پوری اور سید سلیمان ندوی کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ ان تین ہم ناموں (سلامنہ ثلاثہ) کو سیرت کے سلسلے میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ قابل غور چیز یہ ہے کہ سیرت نبویؐ کو انھوں نے کس کس انداز سے پیش کیا اور تربیت فکری و نظری کے اعتبار سے اس کا درجہ کیا ہے؟

حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کے وعظ و بیان سیرت کی خصوصیات حسب ذیل تھیں:

۱۔ رسولؐ اللہ کی زندگی، نبوت، نزول وحی، تبلیغ، غزوات اور دوسرے تمام اہم واقعات کا بیان زمانی تسلسل کے ساتھ تفصیل سے ہوتا تھا۔

۲۔ تمام اسما، انساب، مقامات، جغرافیے اور سنین کی پوری پوری تعیین ہوتی تھی۔

۳۔ تاریخی روایات کے محض حوالے پر اکتفا نہ ہوتی بلکہ جابجا ان پر قرآن سے، عقل و درایت سے، رجال سے، اصول جرح و تعدیل سے اور معیار سیرت کے نقطہ نگاہ سے تبصرہ اور تنقید بھی کرتے جاتے تھے۔

۴۔ جہاں سیرت کی تفصیل پیش کی جاتی وہیں قدم قدم پر اپنی سیرتوں کو سیرت طیبہ کے آئینے میں دیکھ کر سنبھالنے اور سنوارنے کی تلقین بھی ہوتی جاتی۔

۵۔ یہ بیان محض علمی تحقیق اور خشک لیکچر نہ ہوتا تھا بلکہ محققانہ اور متکلمانہ انداز کے ساتھ ساتھ عارفانہ شیفتگی و سوز و گداز اور برمحل اشعار مثنوی وغیرہ کی آمیزش سے پورا بیان روحانی تاثیر کا عجیب مرقع بن جاتا ہے۔ گویا بیک وقت وہ دماغ اور دل دونوں سے اپیل کرتے تھے۔ ان کا علم و فضل' ان کی سحر بیانی اور روحانی سوز و گداز آج تک ضرب المثل ہے۔

قاضی سلیمان منصور پوری

خدمت سیرت کے سلسلے میں دوسرا اہم نام مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری کا ہے۔ قاضی صاحب ریاست پٹیالہ (مشرقی پنجاب) کے جج تھے اور وسیع النظر عالم و محقق تھے۔ ان کی مشہور کتاب رحمتہ للعالمین کی پہلی جلد ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب سیرت رسولؐ پر بحیثیت سیرت پہلی تفصیلی جامعیت کی کتاب تھی جو اردو زبان میں منظر عام پر آئی۔ یہ تحریک سیرت کے مقصود کے مطابق تھی اور قاضی صاحب نے سب سے پہلے یہ کتاب مرکز تحریک سیرت (پھلواری) کو بھیجی۔ قاضی صاحب کو اس مرکز سے خصوصی ربط تھا۔

قاضی صاحب کا مقصد صرف اشاعت سیرت ہی نہ تھا بلکہ ایسے ڈھنگ اور اسلوب کے ساتھ سیرت طیبہ کو پیش کرنا تھا کہ اس کا تسلسل تاریخی نظر انداز نہ ہو' اور پھلواری کے مرکز سیرت کی اس پر نگاہ رہتی تھی۔

رحمتہ للعالمین تین جلدوں پر مشتمل ہے اور ملک کے ہر گوشے میں اس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مختصراً اس کی خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ پوری عالمانہ تحقیق سے لکھی گئی ہے۔ جو روایت جہاں سے لی ہے وہاں حاشیے پر اس کا پورا حوالہ بھی درج ہے۔

۲۔ تمام واقعات جو سیرت سے متعلق ہیں سن وار ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔

۳۔ جہاں کوئی عمدہ نتیجہ مستنبط ہو سکتا ہے اور عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق ہے وہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔

۴۔ بائبل سے ہر جگہ استناد کر کے اہل کتاب پر حجت قائم کی گئی ہے۔

۵۔ لب و لہجہ اتنا متین' سنجیدہ اور پراثر ہے کہ مخالف سے مخالف پڑھنے والا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مناظرانہ اور متشددانہ انداز سے پرہیز کیا گیا ہے۔

۶۔ مصنف نے اس کے صفحات پر دماغ کے ساتھ دل کے ٹکڑے بھی رکھ دیے ہیں۔ ایک ایک لفظ سے عشق نبویؐ اور حب انسانیت نمایاں ہے۔

۷۔ مصنف علام اپنے دور کی تمام جدید تحریکات اور عملی و تحقیقی اقدار سے بھی واقف ہیں اور جابجا اسلامی اقدار و احکام سے ان کا مقابلہ کرتے جاتے ہیں۔ نبوی غزوات' نظام زکوٰۃ' قانون طلاق وغیرہ کا ذکر آتا ہے تو وہ صرف ان کا ذکر کر کے آگے نہیں بڑھ جاتے بلکہ وہیں متن میں یا حاشیے پر ایسے اسلوب سے بحث کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے تمام شکوک خود بخود رفع ہوتے چلے جائیں' خواہ وہ کسی قوم اور کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔

۸۔ تفحص و جستجو کا یہ عالم ہے کہ غزوۂ احد میں جس انصاری خاتون کے چار اعزا (شوہر' فرزند' باپ اور بھائی) شہید ہوئے اور

اس نے کوئی پروا نہ کی' اس کا نام تلاش کرنے کے لیے انصار کے تمام انساب کو چھان ڈالا اور بالآخر اس خاتون کا نام "ہند" تلاش کر ہی لیا۔ ارباب تاریخ و سیر نے قاضی صاحب سے پہلے اس خاتون کا نام کہیں درج نہیں کیا تھا۔

۹۔ دوسری جلد میں حضور اکرمؐ' اصحابؓ' ازواج' اولاد وغیرہ کے انساب کا جس طرح تفحص کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو فن انساب پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ سنین کی تحقیقات جو آخر کتاب میں درج ہے' اس سے ریاضی کے اس فن میں بھی مصنف کے دخل اور وسعت نظر کا پتا چلتا ہے۔

۱۰۔ تیسری جلد میں حضور اکرمؐ کے خصائص اور اسلام کی خصوصیات بڑی خوش اسلوبی سے پیش کی ہیں۔

شبلی نعمانی

زبان و قلم کی ان دوگراں قدر خدمات سیرت کے بعد تو بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں کسی کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی' لیکن یہ واقعہ ہے کہ جگہ کبھی کسی کے واسطے کہیں ختم نہیں ہوتی۔ اسی زمانے میں دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی بھی سیرت النبیؐ مرتب کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے بلکہ کام کچھ شروع بھی کر دیا تھا۔ لیکن ان کا پیمانۂ عمر جلد ہی لبریز ہو گیا۔ شبلی نے ابتدا کی مگر وہ ان کا آخری دور تھا اور کچھ ہی عرصے بعد بستر مرگ پر پہنچ کر انھوں نے یہ "امانت" سید سلیمان ندوی کے سپرد کی اور آنکھیں موند لیں۔

جب پہلی مرتبہ لوگوں کو معلوم ہوا کہ مولانا شبلی نعمانی بھی سیرت النبیؐ لکھ رہے ہیں تو ایک اخبار نے لکھا تھا کہ "جناب قاضی سلیمان صاحب منصور

پوری تو سیرت لکھ ہی چکے اب اس کی کیا ضرورت ہے اور اس سے زیادہ کیا کچھ لکھا جا سکتا ہے؟"

لیکن اخبار مذکور نے یہ محسوس نہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اتنی جامع ہے اور سیرت پاک ایک ایسا نگینہ ہے جس کے ہزاروں پہلو ہیں اور لکھتے وقت انسان کی محدود نگاہ ایک یا چند پہلو سے آگے نہیں بڑھتی۔ خود یورپ میں حضورؐ کی سیرت پر بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ بعضوں کا تو خیال ہے کہ ڈھائی ہزار سے کم نہیں لکھی گئیں۔ اس بیان کو انتہائی مبالغہ بھی قرار دیا جائے جب بھی ان کی تعداد کچھ معمولی نہیں رہتی۔ مشہور سیرت نگاروں میں ایڈورڈ گبن' جان ڈیون پورٹ' لینیارڈ' کارلائل وغیرہ کو کون نہیں جانتا؟ انھوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ ایک مورخ پہلے سیرت لکھ چکا ہے تو اب ہمارے لیے کوئی گنجائش کہاں باقی ہے؟

سید سلیمان ندوی

بہرحال مولانا شبلی نے سیرت النبیؐ کا آغاز کیا لیکن اس کی تکمیل نہ کر سکے' قرعہ فال پھر ایک سلیمان ہی کے نام پڑا اور فضائے علم و تحقیق علامہ سید سلیمان ندوی کے نام سے گونج اٹھی۔ سید صاحب نے سیرت النبیؐ کی تکمیل کی اور اس کی جلدوں پر جلدیں منظر عام پر آنی شروع ہو گئیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سید صاحب نے اس خدمت کو ایک زندۂ جاوید کارنامہ' لازوال یادگار اور غیر فانی توشہ آخرت بنا دیا۔ سیرت کی ساری جلدیں آپ کے سامنے ہیں۔ اس کی عالم گیر مقبولیت و اہمیت کا اندازہ لگانا بھی کچھ دشوار نہیں۔ ایک سرسری نظر اس کی خصوصیات پر ڈالیے:

۱۔ اس کی زبان ایسی معیاری اور اتنی بلند پایہ ہے کہ اردو ادب بہت کچھ ترقیاں کرنے کے باوجود ابھی تک اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

۲۔ سیرت نگاری میں جذبات کا عنصر اتنا ہی رکھا گیا ہے جتنی اس کی ضرورت ہے' دل سے زیادہ دماغ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس دور عقلیت کے عقلیت پسندوں' جدید تعلیم یافتوں' روشن خیالوں' مسلمانوں اور نامسلمانوں سب کے لیے یکساں موثر' اپیلنگ اور تسکین بخش ہے۔

۳۔ روایات پر محققانہ' مورخانہ اور ناقدانہ بحثیں ہر جگہ نمایاں ہیں۔ جس روایت کو رد کرنا مقصود ہو اس کے لیے عمدہ عقلی توجیہ پیش کی گئی ہے اور ایسے نازک موقعے پر بھی علمی سنجیدگی میں ذرا فرق نہیں آتا۔ غیر ضروری اور مبالغہ آمیز روایات سے احتراز کیا گیا ہے' وہ بھی دلیل کے ساتھ۔

۴۔ مغربی مفکرین کی تمام قدیم و جدید متعصبانہ نکتہ چینیاں پیش نظر رہی ہیں بلکہ ان مباحث میں عموماً ہتھیار تک ان ہی کے استعمال کیے گئے ہیں' مگر بحث کے انداز میں کہیں جوابی رخ نہیں ہے' اور بحثیں اس حسن کے ساتھ کی ہیں کہ مسائل زیر بحث کے تمام پہلو ابھرتے اور نکھرتے چلے جاتے ہیں۔

۵۔ ملت کو عقلی ارتقا کی طرف لے جانے کی غرض سے قدیم انداز کو جدید اقدار کے قالب میں ڈھالنے کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا گیا اور جدید علم کلام کی شان دار رہنمائی کی گئی ہے۔

۶۔ رسول پاکؐ کی سیرت پر ہر جگہ انسانی نگاہ ڈالی گئی ہے اور پڑھنے والا یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسانیت کا ہمدرد' بلند اقدار کا محافظ' اعلیٰ کردار کا حامل' سعی پیہم کا پیکر' افکار عالیہ کا مخزن بن کر اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے اگر کوئی واحد نمونہ ہے تو وہ صرف محمد رسولؐ اللہ کی پاک سیرت ہے:

ولقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنہ مسلمانوں ہی کے لیے

نہیں ساری دنیا کے لیے کافہ للناس بشیراً و نذیراً

۷۔ معجزات نبویؐ کے لیے ایک پوری جلد وقف کی ہے اور اس میں معجزے کی حقیقت اور مقام پر عقلی حیثیت سے ایسی پر مغز بحث کی ہے کہ اردو میں تو کیا دوسری زبانوں میں بھی ایک جگہ اتنا بڑا اور ایسا ذخیرہ نہیں ملے گا۔ پھر تمام صحیح معجزات کو ایک ایک کر کے اس طرح سمیٹا ہے کہ دوسری تمام کتابوں سے بے نیاز کر دیا۔ پھر ان سب پر مدلل عقلی اور سائنٹفک بحثیں کی ہیں۔

۸۔ ایک جلد صرف اخلاق کے لیے مخصوص کی ہے۔ یہ مجموعہ بجائے خود بے حد اہم ہے۔ اس سے زیادہ جامع کتاب اس فن پر اور کہیں نہیں ملے گی۔ اخلاقیات کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات اور بڑے سے بڑے اصول کو اس طرح مرتب کر دیا ہے کہ اب اس سے باہر کسی چیز کو تلاش کرنا اور پانا مشکل ہے۔ اخلاقیات ایک ایسی ہمہ گیر حقیقت ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہیں۔ سید صاحب کی تلاش و جستجو' دقت نظر اور ہمہ گیری نے پوری زندگی کو مجسم کر دیا ہے جس کی اہمیت کا اندازہ لگانا اہل نظر ہی کا کام ہے۔

۹۔ ایک جلد اسلامی عبادات پر مشتمل ہے۔ بہ ظاہر یہ سمجھ میں آنا دشوار ہے کہ عبادات کے احکام اتنی ضخیم جلد میں کس طرح پھیل سکتے ہیں' لیکن پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ کس کس انداز سے ایک ایک چیز کا احاطہ کیا ہے۔ پھر ہر جگہ عبادت کا فلسفہ اور اس پر عقلی و علمی بحثیں۔ ایسی جامعیت بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔

۱۰۔ سیرت النبیؐ کی یہ تمام جلدیں اپنی وسعت مضامین و معلومات اور جامعیت مسائل حیات کے لحاظ سے اسلامی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔

نیا تصور

سید صاحب کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ اس دور میں یہ ہے کہ انھوں نے "سیرت" کا ایک نیا تصور بخشا اور ایک جامع قدر عطا کی۔ عام طور پر یہی خیال کیا جاتا تھا کہ سیرت کا تعلق صرف ان "واقعات" سے ہے جو ولادت سے وفات تک کے عرصے میں پیش آئے ہوں' انگریزی زبان میں اسی کو لائف کہتے ہیں۔ اس لیے حضور اکرمؐ کی سیرت یہی ہے کہ ولادت سے وفات تک کے تمام واقعات مرتب کر دیے جائیں' لیکن سید صاحب نے سیرت اور حیات (لائف) میں فرق کیا اور محدود تصور میں وسعت پیدا کی۔ اسے ہمہ گیر بنایا۔ سیرت النبیؐ کی مسلسل جلدیں پیش کر کے انھوں نے دراصل یہ حقیقت واضح کی کہ رسولؐ کی زندگی کے چند واقعات ہی کا نام سیرت نہیں ہے' بلکہ "رسالت" اس پوری انسانی زندگی اور اس کے ایک ایک گوشے سے تعلق رکھتی ہے' رسول کی زندگی کو رسالت سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ کسی شخص کو اس کے اخلاق و کردار سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ رسول اکرمؐ کے اخلاق و کردار اور طرز حیات پر مختصر مگر جامع ترین تبصرہ یہی ہے وکان خلقه القرآن اور اسی کو قرآن نے یوں کہا ہے کہ انک لعلی خلق عظیم ○ (القلم : ۴) لہٰذا سیرت نبویؐ کے دائرے میں چند تاریخی واقعات و سوانح ہی نہیں آتے بلکہ سارا قرآن آتا ہے' ساری تعلیمات آتی ہیں۔ فرامین' عقائد' معاملات' عبادات' انداز زیست حتی کہ حضورؐ سے کچھ تعلق رکھنے والے ان رفقا کے سوانح حیات بھی آجاتے ہیں جو حضورؐ کے زیر تربیت رہے۔ غرض وہ ساری اسلامی زندگی اور فکر زندگی اور اس سے تعلق رکھنے والی ہر ہر بات جو حضورؐ سے کچھ بھی واسطہ رکھتی ہو' چاہے انفرادی چاہے اجتماعی' سیرت رسولؐ کے احاطے کے اندر ہے۔ سیرت کے اسی نئے تصور' حقیقی تصور اور جامع قدر نے "سیرت النبیؐ" کی

جلدوں میں اتنا اضافہ کیا ہے۔ ساتویں جلد زیر ترتیب تھی' مگر وہ اس کی تکمیل سے پہلے ہی ہم سے جدا ہو گئے۔

سیرت کمیٹی پٹی

اس سلسلے میں سیرت کمیٹی پٹی کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے متحدہ ہندوستان میں جا بجا بڑی تعداد میں سیرت کمیٹیاں قائم کیں۔ چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کر کے ہر جگہ پھیلا دیے۔ ان رسالوں میں حضورؐ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کئی ایک رسالے غیر مسلموں کے لیے بھی شائع کیے اور ان اعتراضات کو دور کیا جو عموماً غیر مسلموں کی طرف سے کیے جاتے ہیں۔ اس کمیٹی نے بڑی شہرت حاصل کی' لیکن ایک ذات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے یہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ اس کے بانی عبدالمجید قرشی تھے جو پاکستان میں آنے کے کچھ عرصہ بعد انتقال کر گئے۔ یہ کام ان کے ساتھ ہی گویا ختم ہو گیا۔

ارتقائی کڑیاں

قانون ارتقا کے مطابق شاہ سلیمان پھلواروی' قاضی سلیمان منصور پوری اور سید سلیمان ندوی' سلسلہ ارتقا کی ترقی پذیر کڑیاں ہیں۔ یہاں قدرت کی اس لطیفہ پسندی کا ہم تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ سیرت رسولؐ کی خدمت تبلیغ و اشاعت کے لیے کچھ عجب انداز سے سلسلہ وار اس نے سلامنہ ثلاثہ کا انتخاب کیا' اور یہ بھی ایک وحدت کا ظہور ہے۔ فالکل واحد یتجلی بکل شان۔

دوسری چند کتابیں

یوں تو اور بھی بہتیری کتابیں چھوٹی بھی اور بڑی بھی' سیرت پر اردو

زبان میں لکھی گئی ہیں لیکن بیشتر نقل و اختصار یا اقتباس و تلخیص کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے ان کو چھوڑ کر' اور پھر ان کو بھی چھوڑ کر جو انگریزی میں کچھ لکھی گئی ہیں' یہاں بے موقع نہ ہوگا اگر چند کا تذکرہ کر دیا جائے جو کسی نہ کسی اعتبار سے اہم ہیں' اور خاص طور سے سیرت پر لکھی گئی ہیں۔ یہاں ان کتابوں کو بھی ہم نظر انداز کریں گے جن میں سیرت کی پوری کتاب یعنی تاریخ اسلام کے ایک حصے کی صورت میں آئی ہے۔ ان کے تذکرے میں زمانی تسلسل کا لحاظ بھی پیش نظر نہیں ہے۔

۱۔　**تذکرہ جمیل :** یہ کتاب مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی ندوی بن حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کی مرتب کردہ ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے کے تین ابواب ہیں۔ مسلسل بیان سیرت' انتیس وفود کا ذکر جو بارگاہ رسالتؐ میں آئے اور چودہ خطبات نبوی۔ دوسرے حصے میں قرآن مجید' جنگ و جہاد' تعدد ازواج النبی' قانون طلاق اور غلامی وغیرہ پر بحیثیت مسئلہ بحثیں ہیں۔ تیسرے حصے میں' اسلام کا نظام الاخلاق ہے۔ ان تینوں جلدوں کی خصوصیت یہ ہے کہ :

الف : بیان سیرت کو بارہ مجالس میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

ب : اس میں جا بجا وہ عارفانہ نکات اور سوز و درد کی کیفیات بھی ہیں جو مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کا خاص حصہ تھیں۔

ج : وہ عقلی مباحث اور نفسیاتی نکتے بھی درج ہیں جن کا سیرت نگاروں نے ذکر نہیں کیا۔

د : انداز بیان بہت سادہ اور رواں ہے۔ زمانی اعتبار سے یہ کتاب اگرچہ متاخر ہے لیکن اس لحاظ سے اولیت اس کو حاصل ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں باغ سیرت کا پودا لگانے والے شاہ سلیمان پھلواروی کے بیان سیرت اور نکات و معارف کو قلم بند کیا گیا ہے۔

۲۔ **سیرۃ الرسولؐ :** یہ کتاب مولانا اسلم جیراج پوری کی تالیف ہے۔ مولانا سنجیدہ اہل قلم اور مورخ و محقق ہیں۔

۳۔ **اصح السیر :** یہ کتاب مولانا عبدالرؤف قادری داناپوری کی تالیف ہے۔ مولانا عالم اور مورخ ہیں۔ جا بجا معتدل انداز کی تحقیق و تشریح سے کام لیتے ہیں اور اپنے استدلال کو روایات سے تقویت پہنچاتے ہیں۔

۴۔ **النبی الخاتم :** یہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی ایک غیر ضخیم تصنیف ہے۔ مولانا بڑے فاضل، محقق اور وسیع النظر عالم تھے۔ ان کی تحریر میں سوز و گداز بھی ہے، والہانہ کیفیت بھی اور محققانہ اشارات بھی۔

۵۔ **اسوۃ الرسول :** یہ مولانا سید اولاد حیدر بلگرامی کی تصنیف ہے۔ مولانا مشہور شیعی عالم، مورخ اور اہل قلم ہیں۔ ان کی یہ کتاب شبلی اور شبلی کے مقدمہ سیرت پر کڑی تنقید سے شروع ہوتی ہے۔ نقد و جرح کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ مگر شاید تکمیل کو نہ پہنچی۔ صرف پہلی جلد شائع ہوئی۔

۶۔ **سرور عالمؐ :** ریاست کپور تھلہ کے جج سید عبدالمجید نے لکھی ہے اور سیرت کی ایک مختصر کتاب ہے۔ انداز بیان موثر ہے۔

۷۔ **رحمت عالمؐ :** مولانا سید سلیمان ندوی کی لکھی ہوئی ایک مختصر کتاب سیرت ہے۔ اگرچہ بچوں کے لیے لکھی گئی ہے اور سادہ انداز کی کتاب ہے مگر بڑوں کے لیے بھی اتنی ہی مفید ہے۔

۸۔ **سوانح عمری محمدؐ :** محمد شاہ خاں صاحب حنفی آفریدی کی لکھی ہوئی ہے اور سوانح عمری ہے۔

۹۔ **مہر نبوتؐ :** قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری نے اپنی ضخیم کتاب رحمۃ للعالمین لکھنے سے پہلے لکھی تھی۔ یہ سیرت کی ایک مختصر

سی کتاب ہے۔

۱۰۔ **حضرت محمدؐ:** یہ ایک برہمو سماجی پنڈت نے اردو زبان میں لکھی ہے اور ایک مختصر کتاب سیرت ہے۔ برہمو سماج ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے جو تمام انبیا و رسل کو مانتا ہے مگر ختم نبوت کا قائل نہیں۔

۱۱۔ **خطبات مدراس:** مولانا سید سلیمان ندوی کے آٹھ لیکچروں کا مجموعہ ہے۔ یہ لکچر انھوں نے ۱۹۲۵ء میں جنوبی ہند کی اسلامی تعلیمی انجمن کی فرمائش پر مدراس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے مشترک اجتماع کے سامنے دیے تھے۔ ہر خطبہ سیرت کے الگ الگ پہلو پر روشنی ڈالتا ہے، جو یہ ہیں:

(۱) انسانیت کی تکمیل صرف انبیا کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے۔
(۲) عالم گیر اور دائمی نمونہ عمل صرف محمد رسولؐ اللہ کی سیرت ہے۔
(۳) سیرت محمدیؐ کا تاریخی پہلو۔ (۴) تکمیلی پہلو (۵) جامعیت (۶) عملی پہلو (۷) پیغمبر اسلام کا پیغام (۸) پیغام محمدی۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے سابق سفیر مصر برائے پاکستان کے ایما پر کوئی دو سال قبل مولانا محمد ناظم ندوی نے عربی میں اس کا ترجمہ کیا اور یہ کتاب مصر میں شائع ہو کر مقبول ہوئی۔

۱۲۔ **ختم المرسلینؐ:** مولانا عبدالحلیم شرر مشہور مورخ اور ناول نگار و عالم و ادیب تھے۔ انھوں نے "ختم المرسلین" کے نام سے سیرت لکھی تھی۔ اس موقع پر ہم مولانا شرر کی ضخیم کتاب "جویائے حق" کو نظر انداز نہیں کرسکتے جو اپنے طرز کی نرالی کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے حضرت سلمان فارسی کی زندگی اس انداز سے پیش کی ہے کہ ان کی زبان سے سیرت نبوی نہایت موثر انداز میں (بطرز ناول) بیان ہوتی ہے، اور پڑھنے والا اسے ختم کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔

۱۳۔ نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب : مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی تالیف ہے۔ مولانا قدیم انداز کے بزرگ' بڑے عالم اور مفسر تھے اور ان کی تحریر میں سادگی ہوتی تھی۔

۱۴۔ تذکرۃ المصطفے : مشہور مورخ و محقق پروفیسر نواب علی کی تالیف ہے۔

۱۵۔ تاریخ احمدی : یہ کتاب نواب پریاداں کی لکھی ہوئی ہے۔ انھوں نے ذخیرۂ کتب و روایات کو سامنے رکھ کر یہ سیرت مرتب کی ہے۔

۱۶۔ پیغمبر صحرا : مشہور نو مسلم خالد لطیف گابا کی انگریزی تصنیف "دی پرافٹ آف دی ڈیزرٹ" کا ترجمہ ہے۔

۱۷۔ حدیث دفاع : اردو زبان میں ایک تازہ ترین اور غالباً اپنے انداز اور زاویہ نظر سے انوکھی کتاب ہے جو "حدیث دفاع" کے نام سے پاکستان کے ایک مشہور فوجی افسر میجر جنرل اکبر خاں نے لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے غزوات نبوی پر جدید فنی و فوجی نقطہ نظر سے بحث کی ہے اور فوجی حکمت عملی یعنی مقامات جنگ' انداز جنگ اور اوقات جنگ کے انتخاب پر روشنی ڈالی ہے۔ نیز میدان جنگ' صف بندی کے رخ' اور فوجوں کی آمد کے راستے وغیرہ کے نقشے بھی دیے ہیں۔ مصنف نے اپنی کتاب کا نام رکھنے میں بھی بڑی حسین ادبیت کا ثبوت دیا ہے۔

۱۸۔ انگریزی زبان سے جو تراجم ہوئے ہیں ان میں "سیرت اور مستشرقین" کے نام سے مولوی عبدالعلیم بی۔ اے جامعی کی کتاب بھی سیرت ہی پر ہے اور بہت مفید ہے۔ یہ والہازن کا ترجمہ ہے اور مترجم نے یہ التزام کیا ہے کہ والہازن کی بحثوں اور راویوں پر محققانہ نقد و

جرح ساتھ ہی ساتھ کی ہے اور تفصیلی مدلل حاشیے لگا کر ان کی وہیں تصحیح کی ہے۔

یہ چند کتابیں ہیں' ان کے نام اور ان کے مصنفوں کے نام بھی ہم نے لکھ دیے ہیں' لیکن ظاہر ہے کہ یہی ساری تصنیفیں نہیں' اور بھی کتابیں ہیں جن میں کچھ ایسی ہوں گی جو ہماری نظر سے نہ گزری ہوں گی۔ پھر یہاں مقصود ان سب کا احصا بھی نہیں ہے۔ ہر مصنف کا کوئی نہ کوئی خاص زاویہ نگاہ ہوتا ہے اور اپنی تصنیف میں وہ اسی زاویے کو سب سے زیادہ نمایاں رکھتا ہے۔ ان خصوصی زاویوں سے نہ جانے کتنی کتابیں ابھی اور بھی لکھیں جائیں گی۔ پھر تحقیق و جستجو کا دروازہ تو ہمیشہ ہی کھلا ہوا ہے۔ اگلوں نے جتنی کتابیں بھی لکھی ہیں ان کو ہمارے لیے چھوڑتے وقت ہم سے اسی کی توقع رکھی ہے کہ ان کی محنت و جستجو کو ہم مزید تحقیق و تلاش کی روشنی میں آگے بڑھائیں گے۔ سیرت ایک حیات انگیز زندگی کا مرقع ہے اس شخصیت کا جس نے انسانیت کو پیغام حیات دیا ہے اور زندگی ہر لمحے آگے بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا عنوان سیرت اور انداز جستجو بھی نئے سے نئے سامنے آتے جاتے ہیں۔

یہ کتاب سیرت ـــــ پیغمبر انسانیت ـــــ جو آپ کے پیش نظر ہے' اپنی نوعیت کی ایک الگ کتاب ہے۔ اسے جو باتیں ممتاز کرتی ہیں ان میں سب سے پہلی بات اس کا مخصوص نقطہ نظر ہے اور وہ یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ہر مرحلہ زندگی پر انسانی اقدار کی کتنی محافظت فرمائی ہے۔ آں حضورؐ کو زندگی کے نازک ترین مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ لیکن ہر موقعے پر اس نصب العین کو پیش نظر رکھا ہے کہ انسانیت کا سربلند رہے۔ حضورؐ نے اپنی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (میں انسانی اقدار کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں)۔ لہٰذا جہاں مختلف قدریں یک جا ہوئیں وہاں اعلیٰ اقدار کو اختیار فرمایا اور کسی موقعے پر بھی انسانی قدروں کو

مجروح نہ ہونے دیا۔ آں حضرتؐ نے افکار عالیہ محض پیش ہی نہیں فرمائے بلکہ ہر قدم پر عملی زندگی میں اسے جزو حیات بھی بنایا۔ اس کتاب میں اسی حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ بعض استنباطی نکات ایسے درج کیے ہیں جن کی طرف ذہن نہیں گئے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ زبان رواں اور عاشقانہ ہے۔ انداز نگارش اچھوتا اور جذبہ عقیدت و محبت ہر جگہ نمایاں ہے اور یہی سیرت مصطفےؐ کی جان ہے۔ ہم نے انتہائی اختصار کے ساتھ چند خصوصیات لکھی ہیں۔ اگر اختصار پیش نظر نہ ہوتا تو تفصیل سے ہر ایک پر مثالیں دے کر گفتگو کرتے۔ ان تمام باتوں کا صحیح اندازہ کتاب پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

(۱)

حیات مبارکہ کے ابتدائی حالات

ولادت باسعادت

حضور ۹ ربیع الاول سنہ ۱ عام الفیل (واقعہ فیل کے ۵۲ دن بعد) مکہ مکرمہ میں بروز دو شنبہ بوقت صبح صادق پیدا ہوئے۔ انگریزی تاریخ ۲۲ اپریل ۵۷۱ء تھی اور بکرمی ۲۵ بیساکھ سمت ۶۲۸۔

یتیمی

ولادت سے کئی دن پیشتر حضورؐ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب وفات پاچکے تھے۔ بے سہاروں کا سہارا بن بھی وہی سکتا ہے جس کی زندگی خود بھی بے سہارا رہ چکی ہو۔ یتیموں کا صحیح دست گیر وہی ہو سکتا ہے جس نے خود بھی یتیمی کے دن دیکھے ہوں۔ حضورؐ کی زندگی کا مشن "دست گیر بندہ بے ساز و برگ" ہونا تھا' اس لیے قدرت نے ولادت کے ساتھ ہی یتیمی کو وابستہ کر دیا۔ دنیا کے ان گنت یتیموں کے لیے یہی ذات سہارا بننے والی تھی اور ہر یتیم کو اسی ذات سے ایک ابدی شرف انتساب حاصل کرنا تھا۔

عبدالمطلب اور آمنہؓ

اس یتیم کا نام دادا (عبدالمطلب) نے محمدؐ رکھا اور باپ کی طرح

پرورش میں ہاتھ بٹایا۔ والدہ (آمنہؓ) نے کچھ دنوں دودھ پلایا اور کچھ دنوں ابولہب کی لونڈی ثوبیہ نے رضاعت کا فرض انجام دیا۔ اس کے بعد کم و بیش چار سال حلیمہ سعدیہؓ نے اپنے پاس رکھا۔ رضاعت کے دن ختم ہونے کے بعد حلیمہؓ آپؐ کو واپس لائیں۔ مگر آمنہؓ نے پھر لوٹا دیا۔ بنی ہوازن کے گاؤں کی آب و ہوا نے حضورؐ کی صحت پر اچھا اثر کیا۔ چار سال پورے ہونے کے بعد حلیمہ پھر آپؐ کو لائیں۔ اس کے بعد حضورؐ کبھی آمنہؓ کے پاس رہے اور کبھی حلیمہؓ کے پاس۔ چھٹے برس سے حضورؐ مستقل اپنی والدہ آمنہؓ کے پاس رہنے لگے۔ آمنہؓ نے ان ہی دنوں میں مدینے کا سفر کیا۔ واپسی میں بمقام ابواء انتقال کیا اور آپؐ کی دایہ ام ایمنؓ آپؐ کو اپنے ساتھ مکے واپس لائیں۔ باپ کے بعد یہ دوسرا سہارا ماں تھی۔ قدرت نے اسے بھی اٹھا لیا۔ اب دادا (عبدالمطلب) نے پرورش کی طرف پوری توجہ دی۔ مگر دو سال کے بعد بیاسی (۸۲) سال کا یہ بوڑھا بھی چل بسا اور یہ تیسرا سہارا بھی ختم ہو گیا۔ قدرت نے یہ پسند نہ کیا کہ جسے خود بے سہاروں کا سہارا بننا ہے وہ کسی کا سہارا لے۔ لہٰذا رفتہ رفتہ سارے بڑے چھوٹے سہارے ہٹا لیے۔

شغل تجارت اور نکاح خدیجہ

آمنہؓ اور عبدالمطلب کے بعد چچا زبیر' پھر ابو طالب نے بڑی عمدگی سے پرورش کا حق ادا کیا۔ ابو طالب ہر وقت حضورؐ کو حضر و سفر میں ساتھ رکھتے۔ اس رفاقت کی وجہ سے حضورؐ کو تجارتی نشیب و فراز کا خاصا علم ہو گیا۔ آپؐ کی امانت داری' دیانت داری' ہوشیاری اور پختہ کاری مشہور ہونے لگی۔ ان خوبیوں کا علم جب خدیجہؓ بنت خویلد کو ہوا تو انھوں نے حضورؐ سے تجارتی شرکت و معاونت کی درخواست کی جو حضورؐ نے منظور فرما لی۔ خدیجہؓ عرب کی ایک مال دار تاجرہ تھیں۔ ان کے دو نکاح پہلے ہو چکے تھے' ایک عتیق

بن عائذ مخزومی سے اور دوسرا ابو ہالہ بن نباش تمیمی سے۔ ان دونوں کی وفات ہو چکی تھی اور اب خدیجہؓ بیوہ تھیں۔ تجارتی کاروبار میں مدد دینے والے ان کے چند غلام تھے اور میسرہؓ ان میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اب خدیجہؓ نے اپنی تجارت یوں شروع کی کہ مال ان کا تھا اور محنت حضورؐ کی۔

اس سے پہلے تجارتی تجربے کے بعد ہی خدیجہؓ کو کافی منافع ہوا۔ اس کے علاوہ میسرہ کی زبانی خدیجہؓ کو حضورؐ کی بلند کرداری' صداقت' امانت' دیانت' معاملہ فہمی کے ایسے غیر معمولی اوصاف کا علم ہوا کہ خدیجہؓ نے حضورؐ سے مناکحت کی درخواست کی جو حضورؐ نے قبول فرمالی۔ اس وقت حضورؐ کی عمر پچیس (۲۵) سال کی تھی اور خدیجہؓ کی چالیس سال۔

لمحہ فکریہ

آگے چلنے سے پہلے ذرا یہاں ان اقدار پر غور کرتے چلیے جو اس بظاہر غیر اہم واقعے سے قائم ہوتی ہیں۔ یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ پیغمبر کی زندگی میں تضاد نہیں ہوتا' یعنی ان کی زندگی قبل از پیغمبری بھی قدرتاً" ان خطوط پر قائم رہتی ہے جن پر بعد از پیغمبری بہت بڑے اور وسیع پیمانے پر چلنا پڑتا ہے۔ ان دونوں زندگیوں میں تضاد نہیں ہوتا۔ قبل از بعثت زندگی گلستان ہوتی ہے جس سے بعد از بعثت کی زندگی کی بہار کا قیاس و اندازہ کیا جاتا ہے۔ اولیا اور انبیا میں یہی بڑا فرق ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص ابتدا میں پکا شیطان ہو' مشرک ہو' رہزن ہو' شرابی ہو' بدکار ہو' سب کچھ ہو اور پھر دفعتاً" اس کی زندگی میں ایسا انقلاب آجائے کہ نہ صرف یہ کہ اس کی ساری بدکرداریوں کی تلافی ہو جائے بلکہ مقربین میں اس کا نام سرفہرست لکھ دیا جائے۔ لیکن اس قسم کا تضاد نبی کی زندگی میں نہیں ہوتا۔ نبی کا رخ ابتدا میں بھی لاشعوری طور پر ادھر ہی ہوتا ہے جدھر آخر کار اسے جانا ہے۔

اب ذرا غور کیجیے۔ انسانی زندگی میں دو چیزوں کو بڑی اساسی اہمیت حاصل ہے اور انسان کتنا ہی مقدس بن جائے مگر ان دو چیزوں کی غیر معمولی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا۔ ایک تو ہے تسکین شکم اور دوسری تسکین جنسیت۔ ان دونوں چیزوں کے متعلق آگے چل کر قرآن کریم جو واضح ہدایات' محکم اصول اور اساسی قوانین دینے والا تھا' ان کا ایک سمٹا ہوا نقشہ ابتدا ہی سے حضورؐ کی قبل از بعثت زندگی میں بنیادی طور پر موجود تھا' یعنی اپنی معاشی زندگی کو سنبھالنے کے لیے حضورؐ نے تجارت کو پسند فرمایا۔

تجارت کا مقصد اگر محض حصول دولت ہو تو تجارت ہی کے نام سے سو طرح کی بے عنوانیاں ہوسکتی ہیں' لیکن حضورؐ نے کسب معاش کے لیے جو تجارت اختیار فرمائی وہ محض تجارت نہ تھی بلکہ ہر قدم پر اخلاقی اقدار کو برقرار رکھا۔ سب سے پہلی "قدر" دیانت و امانت ہے اور تاریخ کی ہر سطر اس پر گواہ ہے کہ سارے جاننے والے آمنہؓ کے اس لال کو امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ شدید اعتقادی اختلاف کے باوجود اہل کفر بھی آخر وقت تک اپنی امانتیں حضورؐ کے پاس رکھتے رہے۔ پھر تجارتی کامیابی کے دوسرے عوامل و عناصر محنت اور حکمت ہیں' جس کی شاہد حضورؐ کی پوری زندگی ہے۔ جناب خدیجہؓ پر محض اس بات کا اثر نہ تھا کہ حضورؐ نے بہت سا منافع لا کر دیا۔ یہ منافعے تو اس سے پہلے بھی بارہا ہوئے ہوں گے۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ محض حضورؐ کے جمال و شباب نے خدیجہؓ کو متاثر کیا تھا۔ اگر اس کو بھی دخل ہو تو یہ تقاضاے بشریت کے خلاف تو نہیں' لیکن خدیجہؓ جیسی مال دار کے لیے ایسے حسین نوجوانوں کی کمی نہ تھی۔ ان کو متاثر کرنے والی شے نہ تجارتی منافع تھا نہ جمال و شباب۔ انھیں متاثر کرنے والی چیز صرف وہ کردار تھا جو انھوں نے خود دیکھا اور موثق ذرائع سے معلوم کیا۔ خدیجہؓ کے اصلی تاثرات ان جملوں سے واضح ہوتے ہیں جو انھوں نے حضورؐ کے متعلق پہلی وحی نازل ہونے اور حضورؐ کے خوف زدہ

ہونے کے وقت فرمائے ہیں۔

دوسری اعلیٰ قدر جو اس ازدواج میں ہے وہ حضورؐ کی عفت و پاک بازی ہے جو ولادت سے وفات تک اسی طرح قائم رہی۔ منکرین رسالت نے حضورؐ پر ہر طرح کے الزام لگائے۔ کاہن و ساحر کہا' مسحور کہا' مجنون بتایا' پرستار اقتدار ہونے کا الزام لگایا' کاذب کہنے سے بھی دریغ نہ کیا' آبائی دین کے لیے فتنہ قرار دیا' سب کچھ ہوا۔ لیکن صداقت و امانت کی طرح عفاف و پاکیزگی کو بھی ایک مسلم حقیقت سمجھتے رہے۔ تقوے پر کبھی حرف گیری نہ کی۔ اگر حضورؐ کی پاک بازی میں دشمنوں کو ادنیٰ سے ادنیٰ شبہ بھی ہوتا تو وہ اسے اچھالنے' پھیلانے اور بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ عفت و پاک دامنی کی یہ اعلیٰ قدر کس جگہ حضورؐ نے قائم فرمائی ہے؟ اس جگہ جہاں سارا ماحول جنسی بے راہ روی کی سڑاند سے بسا ہوا ہے۔ جہاں شعرا اپنی فحش کاریوں کو عریاں کرنا ادب کا کمال سمجھتے ہیں اور جہاں بے حیائی و بے حجابی سے بھرے ہوئے قصیدے کو اتنا بلند مقام حاصل ہوتا ہے کہ دیوار کعبہ پر اسے آویزاں کر دیا جاتا ہے' اور جہاں رسم مناکحت سے پہلے اور نکاح کے بغیر بھی کوئی جنسی اختلاط معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اس پلید اور مسموم فضا میں پرورش پانے کے باوجود ایک انسان کا عفاف و پاک دامنی کے اعلیٰ ترین مقام پر جمے رہنا قدرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جو ہونے والے پیغمبر ہی کے حصے میں سب سے پہلے آسکتا تھا۔ حضورؐ نے عمر کے پچیس سال اس طرح گزارے ہیں کہ عفت و پاک بازی قدموں پر لوٹتی رہی۔

پھر نکاح کیا تو کس سے؟ اس عورت سے جو حضورؐ سے پندرہ سال بڑی یعنی چالیس سال کی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یکے بعد دیگرے اس کے دو نکاح پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ کیا حضورؐ پر نفسانی مغلوبیت کا ادنیٰ سے ادنیٰ گمان بھی کیا جاسکتا ہے؟

ایک اور بڑی حقیقت پر بھی غور کیجیے۔ عرب کا کون سا فرد تھا جو حضورؐ کی صورت و سیرت کا شیدا نہ ہو؟ نبوت سے پہلے حضورؐ کس کی نگاہوں میں محبوب نہ تھے؟ کون شخص تھا جسے حضورؐ سے کوئی معمولی سی بھی شکایت ہو؟ کیا ایسے حسن صورت و سیرت رکھنے والے باوقار و معزز انسان کے پاس دوسرے پیغام نکاح نہ آئے ہوں گے؟ پھر حضورؐ نے اسے منظور کیوں نہ فرمایا؟ یا خود کسی جگہ پیغام کیوں نہ دیا؟ ابو طالب سے ایک رفیقہ حیات تلاش کرنے کا تقاضا کیوں نہ فرمایا؟ عرب میں ایک رفیقہ زندگی تلاش کرنے میں کون سی دشواری تھی؟ نبی کی زندگی کا رخ ابتدا ہی سے اس منزل کی طرف ہوتا ہے جدھر اسے نبوت کے بعد جانا ہوتا ہے۔ ازدواجی زندگی کے لیے آگے چل کر جو ہدایات ملنی تھیں ان میں ایک بڑی اہم چیز کفالت ہے۔ وعَلَى المولودِ لَهُ رِزقهن وكِسوتهن (البقرہ: ۲۳۳) (بیوی اور بچوں کے کھانے اور پہننے کی ذمے داری شوہر ہی پر عائد ہوتی ہے)۔ حضورؐ نے یہ محسوس فرمالیا تھا کہ کفالت کے بوجھ کو اٹھانے کی سردست استطاعت نہیں ہے، اس لیے ازدواج کی طرف پچیس سال کی عمر تک کوئی توجہ نہ فرمائی۔ حالانکہ یہی عمر ولولہ شباب سے بھرپور ہوتی ہے۔ جب ایک ایسی عورت نے خود پیام دیا جو اپنا معاشی بوجھ خود اٹھا سکتی تھی اور جس کے تجارتی منافعے میں خود حضورؐ حصے دار تھے تو حضورؐ نے اس پیغام کو قبول فرمالیا۔ حضورؐ نے پچیس سال کی عمر تک صبر و عفاف کی جو قدر دنیا کو دی ہے وہی نبوت کے بعد بھی قائم رکھی ہے۔

یہاں ایک حقیقت اور بھی غور طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ حضورؐ کی اصل ازدواجی زندگی حضرت خدیجہؓ ہی سے وابستہ رہی ہے۔ باقی جتنی ازواج مطہرات آئی ہیں وہ دوسرے مصالح کے تحت آئی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بجز خدیجہ (اور ماریہ قبطیہ) کے کسی کے بطن سے حضورؐ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی، حالاں کہ حضورؐ صحت جسمانی میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے اور ازواج بانجھ نہ

تھیں۔ ہم انشاء اللہ اس کا مفصل ذکر آگے کریں گے۔

ازدواج خدیجہؓ میں ایسی اعلیٰ ازدواجی قدریں ہیں جو ہر متاہل کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں۔ حضورؐ نے کتنی اعلیٰ درجے کی وفا کا ثبوت دیا ہے کہ ان کی موجودگی میں کسی دوسری رفیقہ حیات کو لانے کا تصور تک نہ آنے دیا' حالاں کہ عرب کے کلچر (ثقافت و تمدن) میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا نہ فقط یہ کہ معیوب نہ تھا بلکہ ہنر تھا۔ دس دس بیویاں تک رکھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ تحدید تو نبوت کے بعد ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کوئی حد بندی نہ تھی۔ اس کے باوجود حضورؐ نے وفا کا جو ثبوت دیا ہے وہ یہ ہے کہ اپنی پچاس سال کی عمر تک اسی ایک رفیقہ حیات کے ساتھ جو پینسٹھ سال کی بڑھیا ہو کر دنیا سے رخصت ہوئی نباہ کرتے رہے اور کسی دوسرے ازدواج کی طرف رخ بھی نہ کیا۔ وفا کی انتہا یہ ہے کہ خدیجہؓ کی رحلت کے بعد بھی ہمیشہ ان کی فراست و ایثار و ایمان کو یاد فرماتے رہے۔ حضورؐ کے اسی کیرکٹر کا اثر تھا کہ اس فلک نیلگوں کے نیچے سب سے پہلے حضورؐ کی نبوت پر ایمان لانے والی ہستی یہی رفیقہ حیات خدیجہ ہوئی اور یہ صرف ایمان ہی نہیں لائی' بلکہ اپنا سب کچھ حضورؐ پر قربان کر دیا' اور شعب ابی طالب میں تین سال تک محصوریت اور فقر و فاقہ کی انتہائی مصیبتوں میں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ ازدواجی زندگی میں حسن وفا کی ایسی اعلیٰ قدریں کہیں اور بھی مل سکتی ہیں؟

غور و فکر

اس ازدواجی زندگی کے بعد ہی سے حضورؐ کے خیالات میں ایک تموج سا پیدا ہونے لگا۔ اپنی عرب قوم کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتے' قوم کی بداخلاقیاں' مسافروں کا لٹنا' غریبوں' کمزوروں کا ستایا جانا اور سب سے بڑھ کر قبیلے قبیلے کی باہمی خوں ریزیاں۔ یہ ساری باتیں ایک ایک کر کے سامنے آتیں۔

پھر اور پیچھے جاتے اور یہ پوری کائنات' اس کی آفرینش اور اس کا نظام زیر غور آجاتا۔ کوئی حل سمجھ میں نہ آتا تو عبادت میں مشغول ہو جاتے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا طریق عبادت تھا جو حضورؐ اختیار فرماتے تھے؟ اس سوال کا قطعی جواب دینا تو مشکل ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ عبادات و مناسک کا کوئی نہ کوئی طریقہ ہر قوم میں رہا کیا ہے۔ عرب قوم میں بھی یہ مناسک موجود تھے۔ مسیحی بھی اپنے طرز پر مناسک بجالاتے تھے اور صابئی بھی نماز ادا کرتے تھے۔ قرینہ یہ ہے کہ ان ہی طریقوں میں سے کوئی طریقہ حضورؐ نے اختیار فرمایا ہوگا۔ حضورؐ کو اور ایمان لانے والوں کو اہل مکہ عموماً" صابئی کہتے تھے' اس لیے ممکن ہے کہ حضورؐ کا طریقہ عبادت ان سے ملتا جلتا ہو۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ساری قومیں اللہ کو ماننے کے باوجود کواکب' جنوں' فرشتوں' پیغمبروں اور بتوں کی پرستش کیا کرتی تھیں اور ان سب معبودان باطل کو خدا تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ' وسیلہ اور مقرب تصور کرتی تھیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں' پیغمبر کی زندگی کا رخ شروع سے صحیح سمت میں ہوتا ہے' اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ حضورؐ نے جو بھی طریقہ عبادت اختیار فرمایا ہوگا اس کا رخ خالق کائنات ہی کی طرف تھا۔

کائنات پر ایک فلسفی کی نگاہ سے اور معاشرے پر ایک مصلح کے انداز سے غور و فکر اسی مقام نبوت کی تمہید تھی جس کے بعد ایک پیغمبر معاشرے کو خالق کائنات کے دیے ہوئے نظام کے سانچے میں ڈھالنے کا پیغام دیتا ہے۔ نبی کا پیغام یہی تو ہوتا ہے کہ جس طرح یہ کائناتی نظام بڑی حسن و خوبی سے اس لیے چل رہا ہے کہ یہ بے اختیارانہ قانون الٰہی کے تابع ہے' اسی طرح انسانی معاشرے کی سلامتی و امن بھی اسی پر موقوف ہے کہ وہ اپنے اختیار سے خدا کے دیے ہوئے نظام پر چلے۔

معاشرے کی خرابیوں پر غور کرنے کے بعد حضورؐ نے بہت سے لوگوں سے گفتگو فرمائی اور ان خرابیوں کو دور کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ آخر "حلف الفضول" کے نام سے ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ "حلف الفضول" اس کا نام اس لیے پڑا کہ اس کے کئی ارکان کے نام لفظ "فضل" سے مشتق تھے۔ اس انجمن میں بنی ہاشم مع ابنائے عبدالمطلب' بنی اسد' بنی زہرہ اور بنی تمیم شامل تھے۔ ان سب نے مل کر اس بات کا حلف لیا کہ (۱) ملک سے بدامنی دور کریں گے۔ (۲) غریبوں کی دست گیری کریں گے۔ (۳) مظلوموں کی حمایت کریں گے اور (۴) مسافروں کی حفاظت کریں گے۔

لمحہ فکریہ

ذرا یہاں غور کیجیے۔ کیا پیغمبر کا رخ پیغمبری سے پہلے ہی انہی اخلاقی اقدار کی طرف نہیں جو پیغمبری کے بعد آنے والی ہیں؟ کیا پیغام الٰہی کا بہت بڑا حصہ ان ہی مقاصد میں سمٹا ہوا نہیں؟ کیا یہی وہ مقاصد نہیں جو عالم گیر ہونے کے بعد انسانی معاشرے کو امن و عافیت سے ہم کنار کرتے ہیں۔ یہی تو وہ اقدار عالیہ ہیں جن کی دنیا ہمیشہ سے پیاسی رہی ہے۔ بلاشبہ یہ مقاصد ابھی چھوٹے پیمانے پر اور محدود دائرے کے اندر ہیں' لیکن آگے چل کر آفاقی رنگ اور بین الاقوامی مقام حاصل کرنے والے ہیں۔

نصب حجر اسود کا حکیمانہ فیصلہ

"حلف الفضول" کو ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اسی سال سیلاب نے کعبہ اللہ کی دیواریں شق کر دی۔ اس کی تعمیر میں تمام ابنائے قریش نے حصہ لیا کیوں کہ کعبے کی مرکزیت اور احترام سب میں مسلم تھا اور قریش کی آبرو کعبے ہی کی وجہ سے قائم تھی۔ تعمیر کے سلسلے میں یہ سوال اٹھا کہ حجر اسود کو کون اٹھا کر نصب کرے۔ ہر قبیلہ کیا ہر شخص ہی یہ چاہتا تھا کہ حجر اسود کو نصب کرنے

کا شرف اسے حاصل ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تلواریں نیام سے نکلنے لگیں۔ یہ وقت تھا حلف الفضول کے امتحان کا۔ اس انجمن کا پہلا مقصد ملک سے بدامنی و فساد کو دور کرنا تھا مگر یہاں قبیلوی جہالت ابھر رہی تھی۔ قریب تھا کہ تلواریں حرکت میں آجائیں۔ یکایک ایک طویل العمر شخص ابو امیہ بن مغیرہ آگے بڑھا اور یہ تجویز پیش کی کہ ہم سب مل کر ایک حکم بنالیں اور فیصلہ اسی کے سپرد کر دیں۔ اس تجویز کو مان لینے کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوا کہ حکم کون ہو؟ آخر بحث و مباحثہ یہاں آکر ختم ہوا کہ کل صبح جو شخص کعبے کے اندر سب سے پہلے آئے' اسی کو حکم تسلیم کر لیا جائے۔

یہ رات سب نے کس بے چینی اور ادھیڑ بن میں کاٹی ہوگی اور کس انداز سے ہر قبیلے کے افراد میں اس مسئلے پر گفتگو ہوئی ہوگی؟ اس کا صحیح اندازہ تو وہی کرسکتا ہے جو عرب کی قبیلوی ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہو۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر ایک نے سویرے سب سے پہلے پہنچنے کی سکیم بنائی ہوگی اور کوشش بھی کی ہوگی۔ لیکن ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ ہر آنے والے نے اپنے سے پہلے محمدؐ بن عبداللہ کو کعبے میں موجود پایا۔

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگوں نے رات کا بڑا حصہ گفتگوئیں کرنے اور سکیمیں بنانے میں صرف کر دیا اور جب نیند نے غلبہ کیا تو سب کے سب غافل ہوگئے۔ لیکن کیا خود حضورؐ کو کوئی فکر نہ ہوگی؟ کیا حضورؐ کی وہ ساری رات چین آرام سے گزری ہوگی؟ قیاس کہتا ہے نہیں' بلکہ حضورؐ سب سے زیادہ مضطرب ہوں گے۔ اس لیے نہیں کہ حجر اسود کو نصب کرنے کا شرف حاصل کریں یا حکم بنیں بلکہ اس لیے کہ قوم کو باہمی خوں ریزی سے بچا کر حلف الفضول کا ایک بڑا مقصد پورا فرمائیں اور کیا عجب کہ یہی بے چینی حضورؐ کو سب سے پہلے کعبے میں لے گئی ہو۔

بہرحال جب آنے والوں نے سب سے پہلے حضورؐ کو دیکھا تو سب یک

زبان ہو کر پکار اٹھے ھذا الامین رضیناہ یہ امین جو فیصلہ کر دے ہمیں منظور ہے۔" یوں تو جو بھی پہلے پہنچ جاتا اس کو طے شدہ فیصلے کے مطابق حکم ماننا پڑتا لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ حکم ماننے والوں کے دل بھی اسے گوارا کر لیتے۔ مگر یہاں ہر آنے والا اس طرح بے ساختہ اپنی رضامندی و شگفتگی کا اظہار کرتا ہے جیسے حضورؐ اس کے دل کی آواز ہیں۔ یہ جملہ اس محبوبیت کا پتا دے رہا ہے جو حضورؐ کو اپنی ساری قوم میں حاصل تھی۔

حضورؐ خود بہ خود حکم تسلیم ہو گئے۔ ہر شخص متوجہ ہے کہ دیکھیں حضورؐ کیا فیصلہ فرماتے ہیں؟ لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ یا تو خود ہی حجر اسود کو نصب کریں گے یا کسی اور کو اس کام کے لیے نامزد فرما دیں گے۔ مگر حضورؐ کا فیصلہ یہ تھا کہ ایک چادر بچھائی' حجر اسود کو اس کے بیچ میں رکھا اور ہر قبیلے کے سردار سے کہا کہ اس چادر کا ایک ایک گوشہ پکڑ کر اٹھاؤ۔ سب نے مل کر اسے اٹھایا اور اس جگہ لے آئے جہاں اسے نصب ہونا تھا۔ اس کے بعد حضورؐ نے اپنے دست مبارک سے اسے اس کے مقام پر نصب فرما دیا۔

لمحہ فکریہ

بات دیکھنے میں معمولی سی نظر آتی ہے لیکن یہ حقیقت پھر سامنے لایئے کہ نبی کا رخ ابتدا ہی سے صحیح سمت میں ہوتا ہے۔ حضورؐ کا یہ فیصلہ کتنی بڑی قدریں اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ اس موقعے پر تلواریں حرکت میں آنے لگی تھیں۔ اگر خدانخواستہ کسی ایک کی گردن پر بھی لگتی تو جنگ کا سلسلہ نسلوں تک چلتا رہتا اور جنگ بعاث (اوس اور خزرج کے درمیان یہ جنگ ایک سو بیس سال تک جاری رہی تھی) پیچھے رہ جاتی۔ جنگ کے معاملے میں عربوں کی ذہنیت کسی مورخ سے پوشیدہ نہیں۔ یہ حلف الفضول ہی کا صدقہ ہے جو ابو امیہ بن مغیرہ نے تحکیم کی رائے دی۔ پھر حضورؐ نے اس موقعے پر حجر اسود کے

نصب کرنے میں جس دانائی و حکمت سے فیصلہ دیا ہے وہ بڑی اعلیٰ قدروں کا حامل ہے۔ اس سے جنگ ہی نہ رک گئی بلکہ ایک بڑا درس اس سے یہ حاصل ہوا کہ انسانی خون کو محفوظ رکھنے اور باہمی اختلاف کو دور کرنے کے لیے مختلف اور متضاد عناصر کو ایک مرکز پر کس حکیمانہ طریقے سے لایا جاسکتا ہے کہ وہ مرکزی نقطہ سب کے لیے قدر مشترک کا کام دے 'کعبہ ہو یا حجر اسود' یہ سارے افراد کی مشترک ملکیت ہے۔ اس کی غرض سارے بنی آدم کو اجتماعیت اور امن کی دولت سے نوازنا ہے۔ مَثَابَہ لِلنَّاسِ وَاَمْنًا (البقرہ: ۱۲۵)

حضور کی ہستی اتنی محبوب تھی کہ اگر حضورؐ حکم ہو چکنے کے بعد خود ہی حجر اسود کو نصب کر دیتے تو کوئی اختلاف نہ کرتا۔ لیکن اس میں کسی قدر خود غرضی کا شائبہ پیدا ہوتا۔ اس لیے حضورؐ نے سب ہی کو اس میں شریک کر لیا۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ جھگڑنے والے قبائل کے تمام افراد کا ایک ایک کر کے چادر میں شریک ہونا ممکن نہ تھا' اس لیے حضورؐ نے نمائندگی کا اصول برتا۔ اور یہ ایک ایسا زریں اصول ہے جسے کاروبار زندگی کے ہر مرحلے پر برتنا پڑتا ہے۔ یہ چادر محض ایک چادر نہ تھی بلکہ آئندہ آنے والا ایک مثالی پیغام تھا جس میں ہر رنگ و نسل' ہر وطن و زبان اور ہر پیشہ و مذہب کا آدمی شریک ہو سکے:

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

عرب کی گم راہیاں

آگے چلنے سے پہلے عرب اور خصوصاً مکے کی حالت پر ایک سرسری نظر ڈالتے جائیے۔ عربوں میں صرف عیوب ہی نہ تھے' بہت سے ہنر بھی تھے۔ لیکن محل استعمال کی غلطی نے ان کے ہنر کو بھی عیب بنا دیا تھا۔ عرب بے غیرت بھی تھے اور غیرت مند بھی۔ زن و مرد طواف کعبہ کے وقت عریاں ہو جانے کو عبادت سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اسے بے غیرتی ہی میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن

ان کی غیرت مندی کا انداز یہ تھا کہ اپنی نومولود دختر کو زندہ درگور کر دینا تقاضاے غیرت تصور کرتے تھے۔ وہ بزدل بھی تھے اور بہادر بھی۔ جہاں شرف انسانیت کے اظہار کا موقع ہوتا وہاں وہ بزدل ثابت ہوتے تھے۔ وہ جن' فرشتے' ارواح کے علاوہ ستاروں اور پتھر کی مورتیوں تک سے ڈر کر ان کے آگے گردن عبادت خم کر دیتے تھے۔ یہ تو تھی ان کی بزدلی۔ ساتھ ہی وہ بڑے جری اور بہادر بھی تھے مگر اس وقت جب کسی قافلے کو لوٹنا ہو یا معمولی سی بات پر آپس میں خوں ریزی کرنی ہو۔ وہ مہمان نواز بھی تھے اور مہمان کش بھی۔ جب کسی کو اپنی زبان سے پناہ دے دیتے تو ان کے لیے مہمان نواز تھے' لیکن جب زائرین حرم کو لوٹنا ہو تو انھیں مہمان نہیں سمجھتے تھے۔ وہ بڑے فصیح ، بلیغ تھے۔ لیکن اس وقت جب اپنی خودستائی یا دوسروں کی ہجو کرنی ہو یا اپنے معاشقے کی عریاں داستانیں بیان کرنی ہوں۔ لیکن جب قبیلوی عصبیت مسلط ہو تو اظہار حق میں وہ گونگے بن جاتے تھے۔ سوتیلی ماؤں بہنوں کو وراثت میں لے کر اپنی بیوی بنا لینا ان کے نزدیک کوئی عیب نہ تھا۔ تعدد ازواج کی کوئی حد بندی نہ تھی۔ انسان بعض اوقات بتوں پر بھینٹ چڑھا دیے جاتے تھے۔ غرض عقائد اوہام کا مجموعہ اور اخلاق ناگفتہ بہ تھے۔ امن و امان مفقود' راستے پر خطر' عصمتیں غیر محفوظ۔ جہالت' تاریکی' بے رحمی' ظلم' ہر عیب کی فراوانی تھی۔ جو ہنر تھے وہ بھی محل استعمال غلط ہونے کی وجہ سے سراپا عیب بن گئے تھے۔ اصنام پرستی اس طرح دلوں میں رچی ہوئی تھی کہ کعبے کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے تھے۔ یہ وہ خانہ خدا تھا جسے سیدنا خلیل اللہ نے خالص خداے واحد کی عبادت کے لیے تعمیر کیا تھا۔ لیکن نیرنگی زمانہ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اسی کعبے کے اندر خود سیدنا ابراہیمؑ کا مجسمہ بھی رکھ دیا گیا تھا۔

عزلت گزینی

قوم کے یہ رجحانات اور معاشرے کے یہ حالات حضورؐ کے سامنے

تھے۔ مگر اصلاح حال کی کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ ان تمام قسم کی برائیوں سے حضورؐ کو طبعاً نفرت تھی۔ اس لیے ان چیزوں میں حضورؐ نے کبھی قوم کا ساتھ نہ دیا۔ حضورؐ کبھی نظام کائنات پر غور فرماتے اور کبھی انسانوں کی ان بربادیوں کو دیکھتے۔ نظام کائنات میں حسن' نظم' باقاعدگی اور امن نظر آتا اور زمین پر فتح' بدنظمی' بے قاعدگی اور فساد دکھائی دیتا۔ طبیعت میں کڑھن سی پیدا ہوتی مگر کوئی بس نہ چلتا۔ کوئی اصلاح کی سبیل نظر نہ آتی۔ ہر چند کہ حلف الفضول نے اپنا کچھ اثر دکھایا مگر وہ جزئی اصلاح تھی اور یہاں زندگی کے بے شمار گوشوں میں خلا نظر آ رہا تھا۔

قاعدہ ہے کہ جب انسان برائی کو دور کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کم از کم اپنے آپ کو برے اثرات سے الگ رکھے۔ بہ ظاہر یہی محرک دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ سے حضورؐ کے دل میں کنارہ کشی کا جذبہ پیدا ہوا تاکہ تنہائی میں غور و فکر کر کے اس پیچیدگی کا حل تلاش کیا جائے۔ لیکن درحقیقت یہ قدرت کی طرف سے ایک غیر محسوس پکار تھی' ایک خاص سکیم کے تحت۔ یہ ایک نامعلوم کشش تھی' ایک بار گراں سپرد ہونے کے لیے:

من نہ باختیار خود می روم از قفائے او
آں دو کمند عنبریں می بردم کشاں کشاں

حضورؐ نے اپنے لیے ایک پرسکون گوشہ تنہائی تلاش فرمایا۔ یہ کوہ حرا پر ایک غار تھا جسے غار حرا کہتے ہیں۔ مکے سے کوئی چھ سات میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ غار چار گز لمبا اور پونے دو گز چوڑا ہے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے' اس خشک و تنگ غار کی قدر و قیمت کا جس سے تمام اقدار حیات کے چشمے ابل کر سارے عالم کو سیراب کرتے رہے اور ابد تک کرتے رہیں گے۔

رویائے صادقہ

حضورؐ یہاں تنہا جا بیٹھتے اور سارا وقت یاد الٰہی میں بسر کرتے۔ گھر سے

کچھ ستو اور پانی وغیرہ ساتھ رکھ لیتے اور جب تک یہ ختم نہ ہوتا گھر کا رخ نہ کرتے۔

غار حرا کی عزلت گزینی تک ہی حضورؐ کی وہ زندگی ہے جسے قرآن کریم نے ووجدک ضالا (الضحیٰ : ۷) کہا ہے۔ بلاشبہ یہاں ضال کا لفظ ہدایت کے مقابلے میں آیا ہے' لیکن ہم اس کا ترجمہ "گم راہ" کرنا سوے ادب سمجھتے ہیں۔ ضالتہ کھوئی ہوئی اونٹنی کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپؐ نبوت سے ملنے سے پہلے کھوئے ہوئے تھے' حیرانی کے عالم میں تھے' تلاش حق میں وارفتہ و سرگرداں تھے' فھدیٰ۔ اس کے بعد زندگی کا نصب العین اور اس کی طرف آگے بڑھنے کا راستہ مل گیا۔

بہرکیف اس حرا نشینی کا ابتدائی ثمرہ یہ تھا کہ حضورؐ کو اکثر خواب آتے وہ مثل فلق الصبح (سپیدہ فجر کی طرح اس کا ظہور ہوتا) بار نبوت کو اٹھانے کے لیے ابتدائی مشق ہو رہی تھی۔

* * *

(۲)

بعثت نبوی اور دعوت اسلام

پہلا سندیس

اب رفتہ رفتہ محمدی ظرف بار نبوت کو سنبھالنے کے قابل ہو گیا تھا۔ عمر شریف کا اکتالیسواں سال تھا اور ۹ ربیع الاول کی تاریخ تھی' جو ۱۲ فروری ۶۱۰ء اور ۱۷ پھاگن سمت ۶۶۶ کے مطابق تھا۔ دوشنبے کا دن تھا اور یہ وہی دن ہے جس میں حضورؐ اس دنیا میں تشریف لائے' وقت کیا تھا؟ اللہ کو معلوم۔ بہرحال یکایک ایک صورت ناآشنا نووارد آتا ہے اور آتے ہی فرمائش کرتا ہے اقراء پڑھیے۔ ایک امی سے پڑھنے کی فرمائش عجیب سی بات تھی۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ: میں تو پڑھا ہوا نہیں۔

یہاں قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہاں کوئی پڑھی جانے والی شے بھی پیش کی گئی ہو' ورنہ "پڑھو" کا جواب یہ ہوتا کہ "کیا پڑھوں؟" بہرکیف روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ نووارد نے کوئی پڑھنے کی چیز بھی پیش کی ہو۔

حضورؐ نے جب یہ جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں تو اس نووارد نے حضورؐ سے خوب بھینچ کر معانقہ کیا اور چھوڑ دیا۔ پھر دوسری بار یہی سوال و جواب اور پرزور معانقہ ہوا۔ تیسری بار بھی اسی طرح ہوا۔ اس کے بعد اس نے یہ آیات پڑھ کر حضورؐ کے سینے میں اتار دیں:

اقرا باسم ربک الذی خلق ج خلق الانسان من علق ج
اقرا وربک الاکرم ○ الذی علم بالقلم ○ علم الانسان
مالم یعلم ط (العلق : ۱ - ۵)

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو علق سے پیدا کیا۔ پڑھ تیرا رب سب سے بڑھ کر کریم ہے' جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ جانتا بھی نہ تھا۔

یہ نووارد ناموس ربانی (جبریل امین) تھا۔ اور یہ پہلی وحی عہدۂ نبوت کے ساتھ ساتھ آئی۔

لمحہ فکریہ

یہاں ذرا اس نکتے پر غور کیجئے کہ سارے عالم کی تعلیم کے لیے اور تمام زمانے کی تدریس کے لیے ایک ایسے امی کو منتخب کیا جا رہا ہے جس نے ایک لمحے کے لیے بھی کسی مدرسہ و تعلیم گاہ کی صورت نہ دیکھی اور کسی معلم و استاد کے سامنے زانوے ادب تہہ نہیں کیا۔ جو رسمی نوشت و خواند سے بلند و بالا اور درس گاہ قدرت کا سبق آموختہ ہے اور دنیا کے سامنے یہ اعلان کرتا ہے کہ بعثت معلما (میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں):

یتیمے　　که　　ناکردہ　　قرآں　　درست
کتب　　خانہ　　ہفت　　ملت　　بشست

پڑھنے کا درس اقراء میں ہے اور لکھنے کا درس علم بالقلم میں۔ اقراء کی دوبار تکرار ہے اور تعلیم کا بھی دو ہی بار ذکر ہے۔ علم آدم کی فضیلت ملائکہ پر علم ہی کی بدولت ہے۔ علم ادم الاسماء کلھا (البقرہ : ۳۱) اور اگر شکاری جانوروں کو "تعلیم" دی جائے تو وہ بھی اپنی حیوانی سطح سے بلند ہو کر

انسانی صف میں آجاتا ہے اور اس کا شکار بے ذبح کیے ہوئے بھی ویسا ہی حلال ہوتا ہے جس طرح انسان کا ذبح کیا ہوا۔

وَمَا عَلَّمْتُم مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ز فَكُلُوا مِمَّآ أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ (المائدہ : ۴)

امام اعظم ابو حنیفہ کا قول ہے کہ ایمان گھٹتا بڑھتا نہیں۔ سیدنا علی مرتضٰی (باب مدینہ العلم) کا ارشاد بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ لوکشف الغطاء ما اذددت یقینا (پردۂ حقیقت اٹھ جانے کے بعد بھی میرے یقین میں کوئی اضافہ نہ ہوگا)۔ غرض ایمان بھی ایک مقام پر آکر ٹھہر سکتا ہے' لیکن علم؟ اس کی کوئی انتہا نہیں' یہ کہیں جاکر ختم نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ جیسے معلم کو بھی یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (اے میرے رب میرے علم میں برابر اضافہ ہی کرتا چلا جا)

یہی وجہ ہے کہ پہلی وحی کا آغاز پڑھنے لکھنے اور تعلیم کے ذکر سے ہوا ہے۔ اس سے کچھ اور زیادہ کہنے کی اجازت دیجیے۔ رسولؐ خدا نے اپنے آپ کو مدینہ العلم فرمایا ہے اور اسلام کے بدترین دشمن عمرو بن ہشام کو ابوجہل کا لقب دیا ہے۔ یعنی اسلام علم کا نام ہے اور کفر جہالت کا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے کے دور کو دور جاہلیت کہتے ہیں۔ اعمال صالحہ وجود میں نہیں آسکتے جب تک پہلے ان کا علم نہ ہو۔

مگر یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ علم محض منطق و فلسفہ' اور فقہ و تفسیر کی چند درسی کتابوں میں بند نہیں۔ ہمارے ہاں کتب درسیہ تمام کرنے والوں کو عالم یا عالم دین کا خطاب مل جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ دین میں زندگی کے تمام خانوں کو داخل تصور کیا جاتا ہے اور ہے بھی ایسا ہی۔ لیکن ہمارے ہاں کا "عالم" چند کے سوا سارے علوم و فنون سے ناواقف ہوتا ہے۔ آج دنیا میں بے شمار علوم و فنون شاخ در شاخ ہیں اور ان میں نت نئے اضافے ہوتے

جاتے ہیں۔ ان سب کا عالم بھی عالم ہی کہے جانے کا مستحق ہے۔ کوئی عالم عمرانیات ہے' کوئی عالم تاریخ' کوئی عالم جغرافیہ ہے' کوئی عالم حیوانات' کوئی عالم قانون ہے' کوئی عالم معاشریات' کوئی عالم حساب ہے' کوئی عالم فقہ' بلکہ عالم فقہ حنفی یا شافعی وغیرہ وغیرہ۔ غرض عالم وہ بھی ہے جس نے فقہ و تفسیر کے علاوہ کوئی اور علم حاصل کیا ہو اور وہ بھی علما میں شمار ہو گا جو پریکٹیکل سائنس پر عبور رکھتا ہو۔ اگر چاند گہن کی نماز کا طریقہ جاننے والا عالم ہے تو اس سے بڑا عالم وہ ہے جو رصد گاہ میں بیٹھا کیفیات بدر کا بغور مطالعہ کر رہا ہو' اور وہ بھی بڑا علامہ ہے جو تسخیر قمر کے لیے فضائے بسیط میں راکٹ اڑا رہا ہو۔ صرف عربی زبان پڑھنے والا ہی عالم نہیں' دوسری زبانوں کا ماہر بھی عالم ہو سکتا ہے۔ اس لفظ عالم کو اتنا محدود کیوں کیا جائے؟ مقصد حصول علم ہے خواہ کسی زبان میں ہو۔

مگر ہاں یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ مومن و کافر کے علم میں فقط رجحان (Attitude) اور مقصد و نیت کا فرق ہے۔ ہر علم کا غلط مصرف عالم کو ہلاکت میں ڈالے گا اور صحیح استعمال جنتی زندگی بخشے گا۔

علم را بر من زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

علم وہی ہے جسے حضورؐ نے نافع فرمایا ہے اور قرآنی نقطہ نگاہ سے بقا بھی اسی چیز کو ہے جو نفع بخش ہو۔ وَاَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (الرعد : ١٧) (جو چیز انسانوں کو نفع پہنچاتی ہے' اسی کو زمین میں بقا حاصل ہوتی ہے۔) قرآن ہی نے ہمیں "بقائے انفع" کا اصول دیا ہے جو بقائے اصلح سے زیادہ جامع ہے۔

خلوت و جلوت

یہاں ایک اور حقیقت پر بھی غور کرتے چلیے جسے زندگی کے بے شمار

مراحل پر پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ خدا اپنی صفات کے لحاظ سے بہ ظاہر جامع الاضداد ہے۔ وہ نافع بھی ہے ضار بھی' قابض بھی ہے باسط بھی' عفو بھی ہے ذوانتقام بھی۔ مگر یہ بھی عجیب تضاد ہے کہ تضاد ہوتے ہوئے بھی کوئی تضاد نہیں۔ یہ تمام اضدادی اور غیر اضدادی صفات مل کر ایک وحدت ہو گئی ہیں۔ کچھ یہی شکل اس کی مخلوقات اور خصوصاً" انسان کی ہے۔ جس طرح انسان مجبور بھی ہے اور مختار بھی' اسی طرح اس کی زندگی میں جلوت بھی ضروری ہے اور خلوت بھی۔ اس کے لیے نہ تنہا جلوت ہی جلوت ہے اور نہ محض خلوت ہی خلوت۔ دونوں اپنے اپنے موقعے کے لیے ہیں اور دونوں کے لیے ایک دوسرے کا سہارا ہونا ضروری ہے۔

حضورؐ نے ایک میعاد تک حرا میں خلوت گزینی فرمائی لیکن کیا یہ محض خلوت برائے خلوت تھی؟ نہیں یہ خلوت برائے جلوت تھی۔ جناب کلیم اللہ کو بھی چالیس دن طور سینا پر خلوت نشینی کا حکم ہوا تھا' لیکن کیوں؟ کیا اس لیے کہ زندگی بھر کے لیے گوشہ نشین ہو جائیں؟ نہیں بلکہ اس لیے کہ اس خلوت میں جو کچھ عطا ہوا ہے اسے بنی اسرائیل کی انجمن میں اور قومی و ملکی جلوت میں لائیں۔ جلوت انجمن کا گرد و غبار خلوت میں صاف ہوتا ہے اور خلوت کا تصفیہ جلوت انجمن کے کام آتا ہے۔ عمر بھر کے لیے گوشہ گیر ہو جانا اور اس کے ثمرات سے انجمن کو محروم رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی برتن کو صرف صیقل ہی کیا جاتا رہے مگر کبھی اس کا کوئی مصرف نہ لیا جائے۔ حضورؐ کی حرا نشینی محض انفرادی تزکیہ نفس نہ تھی بلکہ:

در شبستان حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

خدا کا یہ آخری پیغمبر حرا نشین سادھو بن کر نہیں رہ گیا بلکہ:

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا

اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا
مس خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

فراست خدیجہ

غرض یہ پہلا سندیس اور اولین وحی جسے برداشت کرنے کے لیے حضورؐ کا ظرف پہلے ہی قدرت نے تیار کر دیا تھا' لیکن رسول بھی ایک انسان ہوتا ہے۔ دل لرزنے لگا۔ اسی حالت میں گھر واپس تشریف لائے اور لیٹ گئے۔ جناب خدیجہؓ سے فرمایا: "مجھے کپڑا اوڑھا دو۔" پھر فرمایا: "مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔" خدیجہؓ نے جواب دیا: "خدا آپؐ کو غمگین اور بے بس نہ ہونے دے گا کیوں کہ آپؐ صلہ رحمی فرماتے ہیں' دوسروں کا بار اٹھا لیتے ہیں۔ مہمان نواز ہیں اور تمام معاملات میں حق کا ساتھ دیتے ہیں۔"

لمحہ فکریہ

یہاں جناب خدیجہؓ کے اس بیان کو بار بار پڑھیے۔ ہونے والے پیغمبر کی عمومی زندگی کا ایک سمٹا ہوا نقشہ ہے جو جناب خدیجہؓ نے چند لفظوں میں کھینچا ہے۔ یہی وہ اخلاقی قدریں ہیں جو آگے دینوی و اخروی' انفرادی و اجتماعی زندگی پر پوری وسعت کے ساتھ پھیل کر "اسلام" بنا ہے۔ اس حقیقت کو پھر سامنے لائیے کہ نبی کی زندگی کا رخ ابتدا ہی سے منزل مقصود کی طرف ہوتا ہے۔ یہ وہ "معروف اقدار" ہیں جن کا احترام انسان ہمیشہ سے کرتا آیا ہے۔ حضورؐ میں یہ قدریں اتنے کمال کے ساتھ جلوہ گر تھیں کہ محمدیؐ زندگی کی سب سے بڑی راز دار اس کی شہادت دے رہی ہے۔ جناب خدیجہؓ کی زبان سے قدرتی طور پر وہ اصول ظاہر ہو رہا ہے' جسے قرآن نے "بقائے انفع" کہا ہے اور آج کے اہل علم بقائے اصلح کہتے ہیں۔ اس راز دار جلوت و خلوت رفیقہ حیات

نے حضورؐ کی جتنی صفات بیان کی ہیں' وہ نفع خلائق ہی سے تعلق رکھتی ہیں اور انہی کو بنیاد بنا کر یہ حکم لگا رہی ہیں کہ خدا آپؐ کو ضائع نہ کرے گا۔

ورقہ بن نوفل کی شہادت

ذرا سکون طبع ہوا تو حضورؐ نے تمام واقعہ کہہ سنایا۔ جناب خدیجہؓ حضورؐ کو اپنے عم زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ یہ بزرگ ضعیف' کمزور چشم اور بوڑھے عیسائی تھے۔ آخری عمر بائبل کے مطالعے میں اور اس کے عربی ترجمے میں گزرتی تھی۔ جناب خدیجہؓ کی فرمائش پر حضورؐ نے غار حرا میں پیش آنے والی تمام سرگزشت بیان فرمائی۔ ورقہ نے کہا: "یہ آنے والا وہی ناموس ربانی (جبریل) ہے جو موسیٰؑ پر اترا تھا۔ کاش میں اس وقت جوان ہوتا اور زندہ رہتا جب تمھاری قوم تمھیں شہربدر کر دے گی تو اس وقت میں تمھاری ہر ممکن مدد کرتا۔" حضورؐ نے فرمایا: "کیا مجھے میری قوم نکال دے گی؟" ورقہ نے کہا: "ہاں! یہ ناموس ربانی جس کے پاس آتا ہے' قوم اس کے ننگ و ناموس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔"

یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ حضرت خدیجہؓ سب سے پہلے ایمان لائیں' لیکن نبوت کی تصدیق اور جذبہ نصرت کی آرزو تو سب سے پہلے ورقہ ہی نے کی تھی۔ ورقہ کی چند ہی دنوں بعد رحلت ہوگئی' لیکن ان کی تصدیق کے شرف اولیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ بعض روایات میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اگر ورقہ دوزخی ہوتے تو میں ان کو سفید لباس میں نہ دیکھتا۔ بلکہ حضرت عائشہؓ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ: ورقہ کو برا بھلا نہ کہو کیوں کہ میں نے ان کے لیے ایک یا دو جنتیں دیکھی ہیں۔ (رواہ البزار) اگر یہ روایات صحیح ہیں تو ان کے اول مومن ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ عمل و ایثار کے امتحان کا شرف نہ حاصل کرسکے اور موت نے یہ مراحل آنے

سے پہلے ہی انھیں جالیا۔

ایمان خدیجہؓ

قیاس بھی یہی چاہتا ہے کہ سب سے پہلے جناب خدیجہؓ ہی ایمان لائی ہوں' کیوں کہ حضورؐ نے سب سے پہلے انہی سے سارا واقعہ بیان فرمایا تھا' اور ابھی تک ورقہ کے علاوہ کسی اور کو اس کی اطلاع نہ تھی۔ جناب خدیجہؓ صرف عورتوں ہی میں سب سے پہلے ایمان نہ لائی تھیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ورقہ کو نظرانداز کر دیجئے تو سارے مردوزن میں وہ سب سے پہلی مومنہ ہیں۔

لمحہ فکریہ

یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھیے کہ جناب خدیجہؓ حضورؐ کی رفیقہ حیات ہیں۔ دن رات کا ساتھ ہے۔ زمانہ شناس ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز کا تجربہ رکھتی ہیں۔ تجارتی تجربات نے مردم شناسی کا جوہر بھی پیدا کر دیا ہے۔ ازدواجی زندگی کا یہ تیسرا تجربہ ہے۔ شوہر کی زندگی کا ایک ایک گوشہ ان کی نظروں کے سامنے ہے۔ عورت کی نگاہ سے شوہر کا کون سا عیب و ہنر پوشیدہ رہتا ہے؟ عورت پر کس کے تقدس کا جادو چل سکتا ہے؟ پھر عورت بھی خدیجہؓ جیسی زمانہ شناس عورت۔ اس کے سامنے شوہر کا اتنا بڑا عظیم الشان اور انقلابی دعوائے نبوت پیش ہوتا ہے جس کا اسے وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اگر وہ اس دعوے کو رد کر دے یا خاموش ہی رہے تو اس کا بظاہر کچھ نہیں بگڑتا۔ کیوں کہ وہ خود کفیل ہے' اور وہ اس دعوے کو قبول کر لے تو زمین و آسمان کی دشمنی مول لینے کا خطرہ سامنے ہے۔ وہ ورقہ کی زبان سے سن چکی ہے کہ: "تیری تمام ہردلعزیزیاں اور محبوبیتیں نظرانداز کر دی جائیں گی' اور تیری قوم ہی تجھے بے وطن کر دے گی۔" وہ اقرار نبوت کرنے میں اور کچھ نہیں تو کچھ مہلت لے سکتی تھی کہ ذرا اس کی عام مقبولیت و نامقبولیت کا اور اس کے

تلخ و شیریں نتائج کا اندازہ کر لے' اور اعتراف رسالت کے خطرناک اقدام کو کچھ دیر تک کے لیے معرض التوا میں ڈال دے۔ مگر اس پچپن سالہ بوڑھی عورت کی جواں ہمتی اور پختہ ایمانی کو دیکھیے کہ مستقبل کے تمام نتائج سے بے نیاز ہو کر کسی وقفے کے بغیر سب سے پہلے تنہا ایمان لے آتی ہے' اور آگے چل کر نہ فقط اپنی ساری متاع اس مشن پر قربان کر دیتی ہے بلکہ سخت سے سخت امتحانات کے مواقع پر اس کے ایمان میں ادنیٰ سے ادنیٰ لغزش بھی پیدا نہیں ہوتی۔

یہ یقین و ایمان' یہ عزم و پختگی' یہ بے دھڑک اعتراف حق اور حضورؐ کی صداقت پر یہ ایمان و ایقان جناب خدیجہؓ کے اندر کہاں سے اور کس بنیاد پر پیدا ہو گیا تھا؟ حضورؐ کے کردار میں' سیرت کے کسی گوشے میں اگر ادنیٰ سا خلل یا خلا بھی خدیجہؓ کو نظر آتا تو ایک بیوی کے لیے اپنے شوہر پر ایسا پختہ ایمان لے آنا ممکن نہ تھا۔ محمدیؐ کردار اور اس کے اخلاقی اقدار کے ثبوت کے لیے صرف اتنی ہی دلیل کافی ہے کہ اس کی صداقت پر سب سے پہلے ایک عورت جو اس کی راز دار و واقف کار بیوی ہے' ایمان لاتی ہے اور دم واپسیں تک اس کے اندر سخت سے سخت امتحان بھی لغزش پیدا نہیں کرتا۔

ایک سعید روح (ابو بکرؓ)

سیدہ خدیجہؓ کے بعد جناب ابو بکر صدیقؓ ایمان لائے۔ یہ حضورؐ سے صرف اڑھائی سال چھوٹے ہیں۔ یہ بھی گویا حضورؐ کے ساتھ کے کھیلے ہیں۔ دن رات کا ساتھ رہا ہے۔ حضورؐ کے کردار کا کوئی گوشہ ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ زیرکی و فراست کا یہ عالم ہے کہ ساری زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ نہیں ملتا جہاں قوت فیصلہ نے ٹھوکر کھائی ہو۔ جز رسی ایسی کہ جہاں دنیا کے عقلا سطح پر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں' وہاں ان کا صاف ذہن لمحوں میں معاملات کی تہہ

تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر معاملہ کوئی دنیوی کاروبار کے نفع و نقصان کا نہیں' صرف ایک صداقت ہے جس پر ایمان لانے کا نتیجہ سردھڑ کی بازی لگانا اور اپنی ساری متاع عزیز کو ایک "معاصر دوست" کے حوالے کر دینا ہے۔ قابل غور صرف ان کا ایمان لے آنا نہیں بلکہ بظاہر ایک خشک اور بے مزہ حقیقت کو اس طرح قبول کرنا ہے جس میں ایک منٹ کا بھی تامل یا وقفہ نہیں۔ حضورؐ نے اسی ادا کا ذکر یوں فرمایا ہے:

"مجھے کوئی شخص بھی ایسا نہ ملا جس نے میرے پیغام کو قبول کرنے میں کچھ تامل نہ کیا ہو بجز ابوبکرؓ کے۔" (رواہ رزین عن ابی ہریرہ)

ایک بچپنے سے ساتھ رہنے والے معاصر رفیق کا فوراً بے تامل ایمان لے آنا اور دفعتہ" اپنے اور اس کے درجے میں امتی و پیغمبر کا غیر معمولی تفاوت قبول کر لینا حضورؐ کی بلند کرداری و صداقت کی وہ پختہ دلیل ہے جو تنہا دوسرے بے شمار دلائل پر بھاری ہے۔ پھر یہ رفاقت بھی ایسی غیر متزلزل ہے جس کا ہر قدم آگے سے آگے ہی بڑھتا چلا گیا ہے۔ سچ کہا اقبال نے:

همت او کشت ملت را چو ابر
ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

حضرت علیؓ

ان ہی اول اول ایمان لانے والوں میں ایک شیر نر بھی ہے جو ہے تو ابھی نو دس سال کی عمر کا لیکن پختہ فہمی' فراست اور حقیقت رسی میں بہتوں سے آگے ہے۔ جسمانی طور پر مرحلہ بلوغ نہ طے کیا ہو لیکن عقل بالغ کی پختگی رکھتا ہے۔ اگر بچوں کی طرح اسے پھسلا لینا ممکن ہوتا تو باپ (ابوطالب) زیادہ آسانی سے پھسلا کر اپنی ملت میں رہنے پر آمادہ یا مجبور کر سکتا تھا۔ لیکن یہ اپنے

بچپنے میں بھی اسی طرح سمجھ بوجھ کر اپنے عم زاد بھائی کی صداقت پر ایمان لاتا ہے جس طرح کوئی سن رسیدہ پختہ کار ایمان لاسکتا تھا۔ یہ تو اپنی کم سنی میں اسلام قبول کرنے پر یوں فخر کرتا ہے کہ:

سبقتکم الی الاسلام طرا　　　غلاماً مابلغت اوان حلمی

میں نے تو اسلام قبول کرنے میں تم سب پر اس وقت شرف اولیت حاصل کیا ہے جب کہ میں کم سن تھا اور بالغ بھی نہ ہوا تھا۔

یہ علی مرتضیٰؓ ہیں جو گویا حضورؐ کی گود میں پلے ہیں۔ عم زاد بھائی ہیں۔ اندر باہر ہر وقت ساتھ ہیں۔ حضورؐ کی زندگی کا کوئی گوشہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ اگر حضورؐ کی پاکیزہ زندگی اور اعلیٰ کرداری کا کوئی گوشہ بھی شک و شبہ کی گنجائش پیدا کرسکتا تو انھیں کیا پڑی تھی جو ایک شفیق باپ کی ملت کو چھوڑ بیٹھتے اور ساری کائنات کو اپنا دشمن بنا لیتے؟ اگر طفلی کی ناپختہ کاری کی وجہ سے رسمی طور پر ایمان لائے ہوتے تو عقلی پختگی آچکنے کے بعد انھیں اپنی راہ بدل لینے سے کون سی چیز روک سکتی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ علی مرتضیٰؓ کا ایمان اس وقت بھی بڑے سے بڑے فرزانے کے ایمان کے برابر تھا' اور یقیناً ان کا شمار بھی حضرت خدیجہؓ اور جناب ابوبکر صدیقؓ کی طرح اول المومنین ہی میں ہے۔ اور ان کا اسلام بھی حضورؐ کی صداقت و بلند کرداری کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

نگاہ باز گشت

خدیجہؓ بیوی ہیں۔ ابوبکرؓ جنم کے ساتھی ہیں۔ علیؓ فرد خاندان ہیں۔ یہ سب حضورؐ کے کردار و سیرت سے اور ایک ایک حرکت و سکون سے واقف ہیں۔ ذرہ برابر بھی حضورؐ کی صداقت میں شبہ یا سیرت میں کمزوری نظر آسکتی تو اتنا بڑا دعویٰ کرتے ہی ان کا دست جنون حضورؐ کے گریبان تک پہنچ جاتا اور

تکذیب سے کوئی چیز روک نہ سکتی تھی۔ حضورؐ تنہا ہوتے اور یہ تمام متحدہ قوتیں ایک طرف ہوتیں۔ لیکن نبوت کا یہ انوکھا اعجاز ہے کہ سب سے پہلے وہی حضرات ایمان لاتے ہیں جو سب سے زیادہ حضورؐ سے قریب رہے ہیں اور جو سب سے زیادہ حضورؐ کے ایک ایک گوشہ زندگی سے واقف ہیں۔ سچ ہے نیکی گھر سے شروع ہوتی ہے۔ ایمان لانے کا مطلب محض اقرار نہیں بلکہ اس سے ایک لمحے کے اندر اپنی پوزیشن بدل کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ بیوی ہو یا دوست یا بھائی دفعتہ" اپنے درجے کو گھٹا کر امتی بن جاتا ہے اور اسی وقت وہ پیغام لانے والے کو نبی مان کر کائنات کا بلند ترین درجہ دے دیتا ہے۔ اپنا آقا و مخدوم اور فرماں روا و مطاع ہی نہیں بلکہ اپنی محبوب ترین متاع تسلیم کر کے اپنی ساری کائنات اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کے حکم کو خدا کا حکم، اس کی رضا کو خدا کی رضا اور اس کی محبت کو خدا کی محبت سمجھنے لگتا ہے اور اس کے اس یقین میں کسی وقت کمی نہیں آتی۔ کون "معاصر" ہے جو کسی صداقت کے بغیر اپنے درجے کو اتنا گھٹانے اور دوسرے کے مقام کو اتنا بلند تسلیم کر لینے کے لیے دفعتہ" آمادہ ہو جائے اور اپنی اسی پوزیشن پر فخر و ناز بھی کرے؟ اور وہ بھی کون؟ وہ جو ہر آن ساتھ رہ کر قریب ترین نگاہوں سے ایک ایک ادا کو دیکھتا رہا ہو اور عقل و فرزانگی کی وہ اعلیٰ کسوٹی رکھتا ہو جو دور ہی سے نیتوں اور ارادوں کا اندازہ کر کے حقیقت کو بھانپ لے اور اسے یہ بھی علم ہو کہ اس کو قبول کرنا ساری کائنات کی دشمنی مول لینا ہے۔

زید بن حارثہؓ

ان ہی اول المومنین میں ایک "زبردستی کا غلام" بھی ہے۔ یہ اپنے والدین سے کہیں بچھڑ گیا تھا۔ دستور جاہلیت کے مطابق کسی نے اسے پکڑ کر جناب خدیجہؓ کے ہاتھ فروخت کر دیا اور انھوں نے اسے حضورؐ کی خدمت کے

لیے وقف کر دیا تھا۔ بی بی خدیجہؓ کے بعد سب سے زیادہ درون خانہ سے یہی واقف تھا۔ خدیجہؓ، ابوبکرؓ اور علیؓ پھر بھی صاحب اثر تھے لیکن یہ زید بن حارثہ غریب بے بس "غلام" تھے۔ آقا کے سوا کوئی خاندانی حمایت انھیں حاصل نہ تھی۔ آگے چل کر مشق ستم کی ساری سکیموں کا آغاز انہی جیسے بے بسوں سے کیا گیا۔ زیدؓ ان شدید خطرات سے بے خبر نہ تھے۔ ان کا شمار بھی انہی اول المومنین میں ہے جو سمجھ بوجھ کر ایمان لائے تھے اور یہ صدقہ تھا اس نبوی کردار کا جس کے ایک ایک گوشے کو یہ شروع سے دیکھتے رہے تھے۔ ان پر نبوی سیرت کا جو اثر تھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ان کے مدت سے بچھڑے بھائی (جبلہ بن حارثہ) کو جب اس "یوسف گم گشتہ" کا پتا چلا تو یہ انھیں لینے کے لیے آئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر یہ تمھارے ساتھ جائے تو میں اسے نہیں روکوں گا۔ ظاہر ہے کہ جبلہ کو دیکھ کر زیدؓ کا دل بھر آیا ہوگا۔ والدین، اقربا، احباب اور وطن کی یاد نے دل میں ہزار طرح کی گدگدیاں پیدا کی ہوں گی اور جبلہ نے ساتھ چلنے کی ہر ممکن تدبیر کی ہوگی۔ لیکن زیدؓ اس کے جواب میں سیدھے حضورؐ کے پاس حاضر ہوئے اور ایک ایسا جملہ کہا جس میں عشق مصطفیٰ کی ساری کائنات سمٹ کر آگئی۔ زیدؓ نے عرض کیا: او اختار علیک احدا؟ یا رسولؐ اللہ کیا میں حضورؐ کو چھوڑ کر کسی اور کو پسند کر سکتا ہوں؟ اس کے بعد جبلہ کا بیان ہے کہ میں اپنے بھائی کے پاس کئی دن رہا اور اس عرصے میں مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ میری ترغیب واپسی غلط تھی اور میرے بھائی زید کا کہنا درست تھا۔ (رواہ الترمذی عن جبلہ بن حارثہ)

جبلہ نے چند دنوں میں جو کچھ محسوس کیا اسے زیدؓ شروع ہی سے چشم حقیقت سے دیکھ چکے تھے اور ان کی یہی بصیرت تھی جس نے انھیں بھی اول المومنین ہونے کا شرف بخشا۔ یہ گھر اور باہر کے قریب ترین افراد تھے جو ایمان لائے اور زید بن حارثہؓ ان میں چوتھے۔ ان تمام قریب ترین افراد کا اول

المومنین ہونا ہی حضورؐ کی صداقت و بلندی کردار کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

اس کے بعد دنیا کا پانچواں مومن صادق وہ مرد درویش اور مرد قلندر ہے جسے ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں۔ اختصار کے ساتھ ان کے اسلام لانے کا واقعہ بھی سن لیجئے۔

ابوذر غفاری کا اسلام

جناب ابو ذر غفاریؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بخاری، مسلم، بیہقی اور مسند احمد وغیرہ میں مختصراً" اور مطولاً" موجود ہے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ انھیں حضورؐ کے متعلق کچھ اڑتی ہوئی سی خبر اپنے ہی وطن میں مل گئی تھی۔ یہ فطرۃً" شرک سے متنفر اور توحید سے قریب تر ہونے کے علاوہ درویش صفت، صاف گو اور اعلیٰ کردار کے حامل تھے۔ حضورؐ کے متعلق سن گن پا کر بے چین ہو گئے۔ پہلے اپنے بھائی انیس کو مکے بھیجا تاکہ صحیح معلومات حاصل کر کے لائیں۔ انیس نے واپس آکر بیان کیا کہ "حضورؐ مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور وہ جو کلام سناتے ہیں وہ شعر و شاعری نہیں۔" جناب ابوذرؓ کو اتنی بھر معلومات سے تسکین نہ ہوئی اور خود چل کھڑے ہوئے۔ مکے پہنچ کر کسی سے حضورؐ کے متعلق صرف اتنا ہی دریافت کیا تھا کہ: وہ شخص جسے لوگ صابیؔ کہتے ہیں کہاں ہے؟ اتنا ہی دریافت کیا تھا کہ لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور جس کے ہاتھ جو کچھ آیا اس سے اس نے مارنا شروع کیا۔ یہ زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آنے کے بعد چاہ زمزم پر گئے، زخم دھوئے اور کعبے کے پردے کے پیچھے جا کر چھپ گئے۔ ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا تھا اور توکل و خودداری کمال درجے کی رکھتے تھے، اس لیے ایک ماہ تک صرف آب زمزم پر ہی گزارا کرتے رہے، جس نے نہ فقط ان کی بھوک ہی کو دبائے رکھا بلکہ اس سے ان کا مرض

بطن بھی دور ہو گیا اور ان کے جسم میں فربہی بھی آگئی۔ ایک چاندنی رات میں یہیں حرم کعبہ میں حضورؐ اور جناب ابوبکرؓ سے ملاقات ہو گئی۔ یہیں وہ اسلام لائے اور جناب ابوبکرؓ ان کو اپنے گھر لے آئے جہاں انھوں نے پہلی بار کچھ کھایا اور یہ طائف کے منقے تھے۔

یہ روایت مسند احمد کی ہے۔ بخاری کی روایت کے مطابق انھیں جناب علیؓ غریب الوطن سمجھ کر حرم سے اپنے ہاں چپکے سے لے آئے اور کئی دن کے بعد موقع دیکھ کر حضورؐ کے پاس لے گئے جہاں انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

یہاں حضورؐ نے ان سے یہ بھی فرمایا کہ: بہتر ہے کہ تم اپنی قوم میں واپس چلے جاؤ اور وہاں اشاعت دین کرو۔ حضورؐ کا یہ ارشاد اس لیے تھا کہ لوگوں کو ان کے اسلام لانے کا حال نہ معلوم ہو اور ان کو ایذائیں نہ پہنچائی جائیں بلکہ یہ سلامتی کے ساتھ یہاں سے اپنے قبیلے میں پہنچ جائیں اور تبلیغ دین میں اپنے اثر سے کام لیں۔ زیرک ابوذرؓ اس مصلحت نبوی کو بھانپ گیا۔ ایک طرف یہ مصلحت تھی اور دوسری جانب ابوذرؓ کا ایمانی جذبہ اندر سے ابل رہا تھا۔ چند سیکنڈ مصلحت کوشی اور جذبہ ایمانی میں کش مکش ہوتی رہی۔ جناب ابوذرؓ کی فراست نے سمجھ لیا کہ یہ حکم نبوی نہیں ایک مشورہ ہے میری ہی بھلائی کے لیے' اور کیا عجب کہ یہ امتحان ہو میرے ایمان کا۔ آخر جذبہ ایمانی غالب آگیا اور جناب ابوذرؓ بولے کہ: ”میں تو ان سب کے سامنے اپنے اسلام کو علی الاعلان ظاہر کر کے رہوں گا۔“ یہ کہہ کر جناب ابوذرؓ حرم میں آئے اور زور دار آواز سے کہا کہ اشھدان لا الہ الا اللّٰہ واشھد ان محمدا رسول اللّٰہ یہ سننا تھا کہ تمام لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور اتنا مارا کہ وہ زمین پر گر پڑے۔ اتنے میں عباس بن عبدالمطلب نے دیکھ لیا تو انھیں بچانے کے لیے ابوذر پر اوندھے ہو گئے اور چلائے کہ: بدبختو یہ قبیلہ غفار کا آدمی ہے۔ تمھارے

تجارتی قافلے شام کی طرف جاتے ہوئے غفار ہی کے راستے سے گزرتے ہیں۔ یہ کہا تو لوگ ہٹ گئے۔ دوسرے دن جناب ابوذرؓ نے پھر حرم میں جا کر اسی طرح کڑکتی ہوئی آواز میں کلمہ شہادت ادا کیا اور لوگ پھر انھیں اسی طرح مارنے پیٹنے لگے۔ اس موقعے پر بھی عباس ہی نے بچایا اور اپنی پناہ میں لے لیا۔

اس کے بعد جب حضرت ابوذر غفاریؓ اپنے وطن واپس ہوئے تو ان کے بھائی انیس اور ان کی والدہ رملہ بنت رہبعیہ بھی ایمان لے آئیں اور چند اور غفاری بھی مشرف باسلام ہوگئے۔ اس قبیلے کے سردار اس وقت خفاف بن ایما بن رخصہ تھے۔ ایمان لانے کے بعد یہی نومسلموں کی امامت نماز کا فرض ادا کرتے تھے۔

یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجیے جس کی تشریح ہمیں شاید آگے کرنی پڑے گی کہ قریش کے لیڈروں کی مخالفت محض "دین" کی بنیاد پر نہ تھی۔ وہ بڑے دانا تھے اور وہ دیکھ رہے تھے کہ اس "نئے دین" کی وجہ سے ان کی آقائی' ان کا اقتدار' ان کی مرکزیت اور سب سے بڑھ کر ان کا معاشی سلسلہ خطرے میں پڑنے والا ہے۔ مگر ان باتوں کا ذکر وہ ضمناً کر دیا کرتے تھے۔ پیش پیش ہمیشہ دین آبا کی عظمت ہی کو رکھتے تھے' کیوں کہ عوام کو دین ہی کے نام پر بھڑکایا جاسکتا تھا۔ یہاں دیکھ لیجیے جوں ہی عباس نے تجارتی خطرے کا ذکر کیا' ان کی "دینی مارپیٹ" ختم ہوگئی۔ اپنے معاشی مقصد کو پس پردہ رکھنا اور دینی خطرے کا نام لے کر عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرنا کوئی نیا طریق کار نہیں۔

جناب ابوذرؓ کی یہی قوت ایمانی اور یہی جذبہ حق گوئی تھا جس نے رسولؐ کی زبان سے کہلوایا کہ: یہ نیلگوں آسمان کسی ایسے انسان پر سایہ فگن نہیں ہوا اور نہ اس خاک دان ارض نے کسی ایسے انسان کو اپنی پشت پر اٹھایا جو ابوذرؓ سے زیادہ سچی زبان رکھتا ہو۔ (ترمذی عن انس)

اولیت اسلام کی بحث

یہاں اہل اسلام میں ایک بحث یہ چھڑ جاتی ہے کہ ان چاروں میں سب سے پہلے کون ایمان لایا؟ جناب خدیجہؓ کی اولیت ایمان تو تقریباً سب کے نزدیک مسلم ہے، لیکن ان کے بعد ایک گروہ جناب ابوبکرؓ کو اول المومنین کہتا ہے اور دوسرا جناب علیؓ کو اول مومن قرار دیتا ہے۔ ابو حنیفہؒ کی طرف یہ تطبیق منسوب کی جاتی ہے کہ عورتوں میں سب سے پہلے خدیجہؓ ایمان لائیں۔ مردوں میں ابوبکرؓ۔ بچوں میں علیؓ اور غلاموں میں زید۔ یہ توجیہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دو چار گھنٹے یا چند دن کی تقدیم و تاخیر میں کون سا فرق پڑ جاتا ہے؟ اس معمولی سے تقدم و تاخر کی کیا قدر و قیمت ہے؟ اس سے کسی کی سیرت کے کس پہلو پر اثر پڑتا ہے اور کس بات کے فیصلے کا اس پر دارومدار ہے؟ اگر یہ ہوتا کہ جو ایک گھنٹہ یا ایک دن پہلے اسلام لائے وہ تو شدید امتحان میں پڑ جاتا ہے اور جو ایک ساعت یا ایک دن کی تاخیر سے مسلمان ہو تو اس کی کوئی آزمائش نہیں ہوتی۔ اگر واقعی یہ بات ہوتی تو چند گھنٹوں کے تقدم و تاخر کو کوئی اہمیت بھی دیتے' لیکن جب دونوں ایمان و عمل اور ثابت قدمی و ایثار کا یکساں ثبوت بہم پہنچاتے ہیں تو یہ چند ساعت کا فرق کون سی اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے؟

اصلی فرق

اگر کوئی واقعی فرق تقدم و تاخر کا ہے تو یہ وہی فرق ہے جو قرآن کریم نے قائم کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے اور اس کے بعد مالی و جانی جہاد کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ جزائے حسنیٰ کا دونوں ہی سے وعدہ ہے۔ سورۂ حدید کی دسویں آیت میں ہے:

لَا يَسْتَوِي مِنْكُم مَّنْ أَنْفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قَاتَلَ ط

اُولٰٓئِکَ اَعۡظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیۡنَ اَنۡفَقُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَ قٰتَلُوۡا ؕ وَ کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الۡحُسۡنٰی ط

(جن لوگوں نے تم میں سے (مکہ) فتح ہونے سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور لڑے' ان کا درجہ ان لوگوں سے بڑا ہے جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور لڑے' لیکن اللہ نے تو سب کو اچھا بدلہ دینے کا وعدہ کیا ہے)۔

یہ فرق تو باقی رہے گا اور رہنا بھی چاہیے۔ یہ فیصلہ قرآنی عین عدل و عقل کے مطابق ہے اور یہ فرق اکیس سال آگے پیچھے کا فرق ہے۔ لیکن آغاز نبوت میں ایک دو گھنٹوں یا ایک دو دنوں کا فرق کوئی قابل ذکر نہیں۔ اسے اچھالنا اور اس پر کسی خاص استحقاق کی عمارت کھڑی کرنا شاعری سے زیادہ نہیں۔

اول المومنین کا مطلب

ہمارے نزدیک اول المومنین کا یہ مطلب ہی نہیں کہ جو دس بجے ایمان لائے وہ اول المومنین ہے اور جو گیارہ بجے مومن ہو وہ ''آخر المومنین'' ہے۔ اولیت کا اصلی فیصلہ وہ وقفہ کرتا ہے جو پیغام نبوت پہنچ چکنے کے بعد اسلام و کفر کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ ایک شخص آج صبح پیغام سنتا ہے اور آج ہی شام کو ایمان لے آتا ہے اور دوسرا ایک ہفتے کے بعد پیغام سنتا ہے اور اسی وقت ایمان لے آتا ہے تو بظاہرہ زمانی لحاظ سے پہلا شخص اول المومنین نظر آئے گا۔ لیکن درحقیقت اول المومنین دوسرا شخص ہے' کیوں کہ پہلے شخص کے کفر و اسلام میں چند گھنٹوں کا وقفہ حائل ہے اور دوسرے شخص نے اپنے کفر و اسلام میں کسی توقف کو حائل ہونے کا موقع نہ دیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے حضورؐ نے یوں فرمایا کہ: میں نے جس پر بھی اسلام پیش کیا' اسے کچھ نہ کچھ

ہچکچاہٹ پیدا ہوئی لیکن ابوبکرؓ نے کوئی توقف نہ کیا۔

یہ عدم توقف بڑی چیز ہے لیکن اس سے اوروں کے اول المومنین ہونے پر کوئی قابل ذکر اثر نہیں پڑتا۔ قرآن پاک نے اس ناقابل اعتنا فرق کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ وہ ان تمام لوگوں کو ایک ہی گروپ میں شمار کرتا ہے جو تھوڑے بہت دنوں کے فرق سے آگے پیچھے ایمان لائے۔ ارشاد قرآنی ہے کہ: وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُھٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ .... (التوبہ: ۱۰۰)

قرآن نے کسی ایک دو فرد کی بجائے پورے گروپ ہی کو سابقون اولون قرار دیا ہے۔ اس لیے ان چاروں —— خدیجہؓ، ابوبکرؓ، علیؓ، زیدؓ —— میں ہر فرد ہی اول المومنین ہے بلکہ دوسرے ابتدائی مسلمان بھی مل کر سابقون اولون کا ایک گروپ بنتے ہیں۔

مبلغ اول کی مساعی

ان تمام ایمان لانے والوں میں صرف جناب ابوبکرؓ ہی تھے جنھوں نے تبلیغ حق کا فریضہ ادا کیا اور اس کے اہل بھی وہی تھے۔ جناب خدیجہؓ عورت تھیں۔ جناب علیؓ کم سن تھے اور جناب زیدؓ کا اثر وسعت نہ رکھتا تھا۔ لیکن جناب ابوبکرؓ میں اس وقت وہ تمام عوامل موجود تھے جو تبلیغ کے لیے ضروری ہیں۔ یہ بڑے حسن و خوبی کے ساتھ خاموش تبلیغ کرتے رہے اور چن چن کر سعید روحوں کو دین حق کی طرف کھینچنا شروع کیا۔

عشرہ مبشرہ کی پانچ اور شخصیتیں

حضرت ابوبکرؓ ہی کی تبلیغ سے متاثر ہو کر پانچ وہ اشخاص ایمان لائے جن کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہے: یہ ہیں حضرات عثمانؓ ذی النورین، زبیرؓ بن عوام، طلحہؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور سعدؓ بن ابی وقاص۔

دوسری سعید روحیں

ان کے بعد ابوعبیدہؓ بن الجراح' عمارؓ بن یاسر اور خود یاسرؓ' خبابؓ بن الارت' عبدالاسدؓ بن ہلال' عثمانؓ بن مظعون' سائبؓ بن عثمان بن مظعون' عامرؓ بن فہیرہ ازدی' ابوحذیفہؓ بن عتبہ' ارقمؓ بن ابی ارقم' بلال حبشیؓ' عمروؓ بن عبسہ' خالدؓ بن سعد بن عاص' سعیدؓ بن زید' عبداللہؓ بن مسعود' صہیب رومی وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین' قدرے توقف و تاخیر سے ایمان لائے۔

خوش نصیب عورتیں

یہ تبلیغ مردوں ہی تک محدود نہ تھی بلکہ عورتوں میں جو سعید روحیں تھیں' انھوں نے بھی لپک کر نعمت اسلام کو اسی یقین و عزم کے ساتھ قبول کر لیا۔ ان میں یاسرؓ کی بیوی اور عمارؓ کی والدہ جناب سمیہؓ تھیں۔ عباسؓ بن عبدالمطلب کی بیوی اور حضورؐ کی چچی ام الفضلؓ تھیں۔ ابوبکر صدیقؓ کی بیوی اسماؓ بنت عمیس اور آپؓ کی صاحب زادی اسماؓ بنت ابی بکرؓ تھیں۔ جناب عمرؓ کی بہن فاطمہؓ بنت خطاب تھیں۔ ام الفضلؓ کا اپنے شوہر سے پہلے اور فاطمہؓ کا اپنے بھائی سے پہلے اسلام قبول کر لینا یقیناً وہ شرف ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

آزاد و غلام

ان سارے ایمان لانے والوں میں وہ لوگ بھی ہیں جو آزاد ہیں اور کبھی قیدی یا غلام نہ ہوئے اور انہی میں وہ افراد بھی ہیں جو اصطلاحی غلام تھے۔ کسی کو لاوارث سمجھ کر پکڑ لیا گیا اور کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ کسی کمزور قبیلے یا جماعت پر بلاوجہ حملہ کر دیا گیا اور ان کے بقیۃ السیف افراد کو اسیر کر کے کہیں بیچ ڈالا گیا۔ انہی کو غلام یا عبد کہا جاتا تھا۔ دنیا کے ہر گوشے میں یہ بے بس

طبقہ موجود تھا۔ ان کے ساتھ جو ظالمانہ برتاؤ ہوا کرتے تھے' ان کے تصور سے بھی انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔ حد یہ ہے کہ اس مظلوم طبقے کی ذہنیت بھی اتنی گر چکی تھی کہ یہ اپنی اپنی مظلومیت کو قضائے مبرم سمجھے بیٹھا تھا اور بلند نظری کا کوئی تصور بھی اس کے اندر نہ آسکتا تھا۔ آزادوں کے اندر انقلابی قسم کا استحکام پیدا ہو جائے تو زیادہ تعجب نہیں' پیغام نبوت نے اس گرے ہوئے بے بس' بے یارومددگار' مجبور و مقہور طبقے میں بلند خیالی' پختہ کرداری اور استقامت کی جو روح پھونکی' اس سے زیادہ کوئی محیر العقول اعجاز تصور میں آنا مشکل ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ جوروستم کے جو پہاڑ آزادوں کے سر پر توڑے گئے اس سے زیادہ ہی ان غلاموں کے ساتھ کیا گیا۔ توقع بھی اسی کی ہو سکتی تھی' اس لیے کہ آزادوں کے خاندان' قبیلے اور حمایتی بھی تھے اور یہ کچھ نہ کچھ پشتینی اثرات کے بھی مالک تھے۔ لیکن غلاموں کا یہ حال تھا کہ ان کے حمایتی اور آقا خود بھی ان پر مشق ستم کرتے تھے اور دوسرے بھی۔ لیکن جو چیز انتہائی طور پر کسی کو حیرت میں ڈال سکتی ہے' وہ یہ ہے کہ یہ قبول حق کے بعد صبر و استقامت میں آزادوں سے ایک قدم بھی پیچھے نہ رہے۔ (۱)

انداز تبلیغ

خود حضورؐ اور دوسرے اہل اسلام کی تبلیغ حق کا جو انداز تھا' اس میں دو چیزیں قابل ذکر ہیں۔ ایک خفا و پوشیدگی اور دوسری قریب تر سے آغاز۔

اخفائے حال

سارے سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ تبلیغ دین تین سال تک خفیہ ہوتی رہی' جس کا مرکز دارارقم بن ابی ارقم تھا۔ اہل اسلام اپنی نمازیں بھی پہاڑی گھاٹیوں میں یا دوسرے پوشیدہ مقامات میں ادا کرتے تھے۔ خفیہ تبلیغ کے متعلق یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا یہ انداز اہل کفر کے خوف یا اہل اسلام کی

بزدلی پر مبنی تھا؟ شجاعت و مردانگی اور حق پرستی کا تو یہ تقاضا ہونا چاہیے تھا کہ اول روز ہی سے اعلان حق کر دیا جاتا اور کسی طاقت سے کوئی خوف نہ ہوتا خواہ نتیجہ کچھ بھی ہوتا۔

ظاہراً تو صورت حال ایسی ہی نظر آتی ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ انداز خفا مبنی برخوف نہ تھا بلکہ تقاضائے حکمت تھا۔ زندگی میں بے شمار مراحل ایسے آتے ہیں جب دو قدروں کا باہم ٹکراؤ ہو جاتا ہے اور وہ ایسا موقع ہوتا ہے کہ کسی ایک کو مقدم اور دوسرے کو موخر کرنا پڑتا ہے اور اس تقدیم و تاخیر میں انسانی عقل و فراست امتحان میں پڑ جاتی ہے۔ انسانی زندگی میں محض خیر و شر ہی کی کش مکش نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات دو خیروں یا دو شروں کی کش مکش بھی اسی طرح سامنے آجاتی ہے کہ کسی ایک ہی کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت خیر کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دو شروں میں کم تر کو اور دو خیروں میں انفع کو اختیار کر لیا جائے۔ حضورؐ کی بصیرت نے ان دو خیروں ——— جرات مندانہ اعلان اور حکیمانہ پوشیدگی ——— میں انفع و اصلح کو اختیار فرمایا۔ اظہار شجاعت کا موقع ہر وقت نہیں ہوتا۔ اگر اس کا بے موقع استعمال ہو تو یہ مردانگی "تہور" بن جاتی ہے۔ شجاعت و تہور میں وہی فرق ہے جو رحم اور بزدلی میں' سخاوت اور اسراف میں یا کفایت شعاری اور بخل میں ہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر خوف اعدا یا بزدلی کا شبہ تو اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب بعد کے لرزہ خیز جور و ستم شروع ہونے کے بعد کوئی فرد اپنا قدم پیچھے ہٹا لیتا یا کسی مرحلہ امتحان پر اقرار حق سے باز آجاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان ایمان لانے والوں میں ایک متنفس بھی ایسا نہیں جس نے انتہائی اذیت اور ظلم کے باوجود اعلان حق اور اظہار ایمان میں کبھی ذرہ برابر بھی ہچکچاہٹ یا تقیہ سازی سے کام لیا ہو۔ اگر آغاز میں اخفائے ایمان بربنائے بزدلی ہوتا تو یہ کم ہمتی اس وقت بھی ظاہر ہو کر رہتی جب ظالم منکروں کو خود بخود علم ہو گیا اور انھوں

نے ان سب "نومسلموں" کے ساتھ شدید ترین انتقامی کارروائی شروع کر دی۔ لیکن ہم تو یہ دیکھتے ہیں ان بے بسوں پر جتنے زیادہ مظالم کیے گئے' اسی قدر ان کی جرات ایمانی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اگر آغاز بزدلی و کم ہمتی سے ہو تو انجام میں یہ شجاعت و مردانگی کہاں سے آسکتی ہے جس کا تصور بھی بڑے بڑے بہادروں کو لرزہ بداندام کر دے؟

قریب تر سے آغاز

انداز تبلیغ کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ آغاز اپنے قریب ترین فرد سے ہو۔ قریب تر ہستی خود انسان کی ذات ہے۔ اس کے بعد اپنے گھر والے ہیں۔ پھر دوسرے افراد خاندان یا قریب ترین دوست احباب' پھر محلّہ' پھر بستی' پھر آگے بعید' بعید تر' بعید ترین۔ فطری اور حکیمانہ انداز یہی ہے اور اسی کے مطابق خود حضورؐ اور دوسرے ایمان لانے والے عمل کرتے رہے۔ حضورؐ کو نبوت کے چند ہی دنوں بعد یہ حکم دیا گیا:

> يَآيّها الْمُدثر لا قم فَانْذر لا وَربّک فَكَبِّر لا وثيابک فَطَهّر ص وَالرّجزَ فَاهجر لا ولَا تمنن تَستَكثرُ لا و لربّک فَاصبِر ○ (المدثر: ۱ تا ۷)
>
> اے گلیم پوش! اٹھ اور وارننگ دے اور اپنے رب کی کبریائی کا اعتراف کر اور اپنے کپڑوں کو پاک کر اور پلیدی سے کنارہ کش رہ اور کثرت معاوضہ حاصل کرنے کے لیے احسان نہ جتا اور اپنے رب کی خوشنودی کے لیے استقامت اختیار کر۔

ان آیات کا ایک ایک جز تزکیہ نفس کے اتھاہ سمندروں کو اپنے کوزے میں بند کیے ہوئے ہے۔ تکمیل ذات اور اصلاح نفس کے تمام ضروری

عناصر ان آیات میں موجود ہیں۔ جو شخص بھی اپنا تزکیہ چاہے گا اسے انہی مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ اگر کوئی شخص ان احکام کا خود پیکر عمل نہ ہو تو وہ نہ تو خود ہی مزکی ہو سکتا ہے نہ دوسروں کے لیے مزکی ہو سکتا ہے۔ کسی حقیقت کا صحیح مبلغ وہی ہو سکتا ہے جس کی رگ رگ میں وہ حقیقت خود بھی رچی ہوئی ہو۔ دوسروں کی نوبت اپنی ذات کے بعد آتی ہے۔ تبلیغ کے لیے وہ تحریک دروں چاہیے جو اپنے اندر آگ کی طرح ہر آن سلگ رہی ہو۔ وہ دھن اور وہ لگن درکار ہے جو چین سے نہ بیٹھنے دے۔ وہ عشق مطلوب ہے جو جنون کی طرح ہر وقت سر پر سوار ہو۔ یہی وہ شعلہ ہے جو دوسروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

ایک مثال

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک تالاب کے وسط میں ایک ڈھیلا پھینکیے تو پانی اچھل کر ایک چھوٹا سا دائرۂ آب بنا دے گا اور یہ دائرہ آہستہ آہستہ پھیلتا جائے گا اور آخر تالاب کے آخری کناروں تک پہنچ جائے گا۔ یہی صورت تبلیغ کی بھی ہے۔

حضورؐ کا کردار قبل از نبوت بھی پیغمبرانہ انداز کا تھا' اور تزکیہ نفس کا میلان پہلے سے موجود تھا جو کھینچ کر غار حرا میں لے جاتا رہا۔ اب وحی نے تزکیے کا وہ پروگرام بھی دے دیا جو مندرجہ بالا آیات میں مذکور ہے۔ اپنی ذات کے بعد یہی دائرہ فطری انداز سے پھیلتا رہا اور الاقرب فالاقرب کو سمیٹتا رہا۔ حضورؐ کی اپنی ذات بابرکات کے بعد قریب تر ذہنی ہم آہنگی رکھنے والے کھنچتے چلے گئے۔ حضورؐ کو قانون فطرت کے مطابق اپنی ذات کے بعد توسیع دین کے لیے وحی الٰہی نے یہ پروگرام دیا:

ا۔..... وَاَنذِر عَشِيرَتَكَ الاَقرَبِينَ ○ (الشعراء: ۲۱۴)

اپنے خاندان کے قریب ترین افراد کو آنے والے نتائج عمل کی وارننگ دو۔

۲۔ .... لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ○ (الانعام : ۹۲)

.... مکے اور پھر اطراف مکہ میں اس وارننگ کو پھیلا۔

۳۔ .... لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ○ (الانعام : ۱۹)

.... میں تم سب کے علاوہ ہر اس شخص کے لیے نذیر ہوں جس تک میرا پیغام پہنچ سکے

یا یوں کہیے کہ :

۴۔ .... كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ○ (سبا : ۲۸)

.... سارے موجودہ و آئندہ انسانوں کے لیے بشیر و نذیر۔

یہی فطری پروگرام تھا اور اسی کے مطابق اپنے اپنے موقعے سے یہ احکام نازل ہوتے رہے' اور اسی پروگرام کے مطابق حضورؐ بھی تبلیغ فرماتے رہے اور دوسرے مسلمان بھی۔

ایک تشنگی

یہ تو مسلم ہے کہ حضورؐ اکرم اور دوسرے صحابہ مبلغین جس کے سامنے بھی اسلام پیش کرتے تھے' وہ مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ کوئی اینچ پیچ یا منطقی موشگافیاں نہ ہوتی تھیں۔ بات دو ٹوک ہوتی تھی اور حشو و زوائد سے پاک۔ اس کے ساتھ مبلغ کا اپنا کردار اور بدلی ہوئی سیرت ہوتی تھی جس کا اثر ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا تھا۔ اخلاص' بے لوثی اور اقدار عالیہ سے وابستگی اس کے علاوہ تھی۔ (۲)

دل چاہتا ہے کہ کاش ایک ایک ایمان لانے والے کی داستان سامنے ہوتی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ آغاز گفتگو کس طرح ہوا؟ اس نے کیا کیا شبہات پیش کیے اور کس جواب سے اسے تسکین ہوئی؟ مبلغ کے کس جملے نے اس پر

کیا اثر کیا اور کس بات نے اس کے دل کو پھیر دیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ دل چاہتا ہے کہ یہ تمام تفصیلات سامنے ہوتیں۔ بہت جگہ کچھ تفصیلات ملتی ہیں اور بہت سے مقامات تشنہ ہیں۔ بعض جگہ تبلیغ کی حکیمانہ تفصیلات کی بجائے معجزاتی رنگ زیادہ غالب ہو گیا ہے حالانکہ معجزے کے زور سے کسی کو مسلمان کرنا حضورؐ کی عام روش کے مطابق نہیں۔ معجزے کے وجود سے انکار نہیں لیکن حضورؐ کی اصلی دعوت عقل و حکمت کی دعوت تھی' صدق و صفا کی دعوت تھی اور جذبات کے ان پہلوؤں کی دعوت تھی جو عقل و فہم سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

بہرحال ہم صرف انہی تبلیغی تفصیلات کو یا کسی کے اسلام لانے کی کیفیات کو بیان کریں گے جو عام طور پر سیرت نگار لکھا کرتے ہیں۔

پیکر صدق و صفا کوہ صفا پر

تین سال اسی طرح خفیہ تبلیغ حکیمانہ انداز سے ہوتی رہی۔ اس کے بعد وحی الٰہی نے حکم دیا کہ:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ○ (الشعرا: ۲۱۴)

اپنے قریبی خاندان والوں کو وارننگ دو۔

حضورؐ ایک دن کوہ صفا پر چڑھ گئے اور قریش کے کئی قبائل کو نام لے لے کر پکارنا شروع کیا۔ اس طرح اوپر چڑھ کر آواز دینا اس وقت کے دستور کے مطابق کسی اہم مقصد کے لیے ہوا کرتا تھا۔ پکار سن کر سب لوگ جمع ہو گئے اور جو نہ آسکا اس نے دریافت حال کے لیے رواج کے مطابق اپنا نمائندہ بھیج دیا۔ اب پوزیشن یہ ہے کہ حضورؐ ٹیلے کے اوپر کھڑے ہیں جہاں سے ٹیلے کے اس طرف بھی دیکھ رہے ہیں اور اس طرف بھی۔ لیکن جو لوگ جمع ہوئے ہیں' وہ نیچے ایک طرف دامن کوہ میں کھڑے ہیں اور وہ سب کے سب صرف ایک ہی جانب دیکھ سکتے ہیں۔ انھیں ٹیلے کے اس پار کی کوئی شے نظر نہیں آسکتی

کیوں کہ بیچ میں ٹیلا حائل ہے۔ اگر یہ لوگ اس طرف کی کوئی بات معلوم کرنا چاہیں تو اس کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ جو اوپر کھڑا ہر طرف دیکھ رہا ہے وہی انھیں کچھ بتائے۔ اس پوزیشن کو سامنے رکھیے۔ اس کے بعد دیکھیے حضورؐ کیا فرماتے ہیں۔ حضورؐ نے ان تمام لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اگر میں تم سے یہ کہوں کہ شہ سواروں کا ایک دستہ ٹیلے کے اس طرف سے (جو تمھیں نظر نہیں آرہا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں) تم پر حملہ آور ہونے والا ہے، تو کیا تم مجھے سچا سمجھو گے؟"

تمام سننے والوں نے یک زبان ہو کر اس سوال کا جواب دیا کہ:

"آج تک تو ہم سب کا تجربہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ سچ ہی بولتے رہے ہیں۔"

یوں تو اب تک سارے دوست دشمن حضورؐ کو صادق و امین ہی کہتے رہے، لیکن آج کا یہ سوال و جواب ایک ایسا عجیب واقعہ ہے جو تاریخ عالم کے سینے پر ہمیشہ ابھرے ہوئے اور کبھی نہ مٹنے والے زریں حروف میں جگمگاتا رہے گا۔ آج ان سب نے صرف یہی نہیں کیا کہ حضورؐ کی صداقت و راست بازی کا غیر مشکوک اعتراف کر لیا بلکہ منکرین نے اپنے لبوں پر بھی اپنے ہاتھوں سے مہر ثبت کر دی۔ اپنی صداقت کا یہ اعتراف کر لینے کے بعد حضورؐ نے دو ٹوک بات یوں فرمائی کہ:

"اچھا تو سن لو کہ میں (بحکم خداوندی) ایک آنے والے سخت عذاب کی وارننگ دیتا ہوں۔"

اس وارننگ کو سننے کے بعد منکر اس وقت تک منکر ہی رہے، گویا وہ ابھی جسے سچا کہہ رہے تھے اسے جھوٹا سمجھنے لگے۔ یہ درحقیقت ان کے اپنے پہلے قول یا اعتراف کی تکذیب تھی جو انہی پہ لوٹتی ہے۔ ابھی سچا کہا اور ابھی

اپنے قول کی تردید بھی کر دی' جس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو وہ پہلے جھوٹ کہہ رہے تھے یا اب کہہ رہے ہیں۔

ان تمام منکروں کی نمائندگی کرتے ہوئے حضورؐ کو مخاطب کر کے ابو لہب بولا:

"تیرا سارا دن بربادی میں گزرے۔ کیا تو نے اتنی سی بات (وہ بھی غلط بات) کے لیے یہاں ہم سب کو بلا کر اکٹھا کیا تھا؟"

ابو لہب کے الفاظ یہ تھے تبالک سائر الیوم الھذا جمعتنا؟ اس کے یہ گستاخانہ الفاظ خدا کو بھی پسند نہ آئے' اس نے وحی بھیجی کہ:

تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ ط مَآ أَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ط سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ○ وَّامْرَاَتُهٗ ط حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ج فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ○

(اللھب)

ابو لہب ہی کے ہاتھ (اقتدار) برباد ہو گیا۔ اس کی دولت اس کی کمائی اس کے کوئی کام نہ آئی۔ وہ جلد شعلے والی آگ میں جا گرے گا اور ساتھ ہی اس کی بیوی بھی۔ جو ایندھن کا بوجھ اٹھائے ہوگی اور اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی۔

لمحہ فکریہ

ان آیات کی تفسیر اس وقت مقصود نہیں' لیکن یہ قابل غور بات ہے کہ ابولہب حضورؐ کا سگا چچا ہے۔ مال دار ہے۔ صاحب اقتدار ہے۔ اس کی بیوی حمنہ ابوسفیان کی بہن ہے اور تکذیب رسالت میں اپنے شوہر سے پوری

ذہنی ہم آہنگی رکھتی ہے۔ زبان وحی دو باتوں کو صراحتہً بتا رہی ہے۔ ایک یہ کہ یہ دونوں دولت ایمان سے محروم رہیں گے اور دوسرے یہ کہ ان دونوں کی ثروت و شوکت ختم ہو جائے گی۔ آنے والے وقت نے بتا دیا کہ یہ پیش گوئی اپنی ظاہری صورت میں بھی حرف بہ حرف پوری ہو کر رہی۔ بعد میں ابولہب جیسے بے شمار کٹر منکر ایمان لے آئے ہیں۔ آج یہ کس طرح اعلان کر دیا گیا کہ یہ دونوں ایمان سے محروم ہی رہیں گے؟ ان کی ساری دولت دھری کی دھری رہ جائے گی اور ان کا سارا اقتدار فنا ہو جائے گا؟ کیا یہ وہی نبوی نگاہ نہیں جو وحی الٰہی کی دوربین سے زمان و مکان کی حدود کو چیر کر حقیقت کو دیکھتی ہے؟ یہی تو وہ مقام نبوت ہے جس کی عملی تمثیل حضورؐ ٹیلے پر کھڑے ہو کر پیش فرما رہے ہیں۔

مقام نبوت کی عجیب تمثیل

کوہ صفا کی بلندی پر کھڑے ہو کر حضورؐ نے مقام نبوت کی جو تمثیل دی ہے اس سے بہتر مثال ممکن ہی نہیں۔ اس تمثیل میں یہ حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ خدا کا فرستادہ پیغمبر ایک ایسے بلند مقام پر کھڑا ہوتا ہے جہاں سے اس کی حدود ناآشنا نگاہیں غیب و شہود کو' دنیا و آخرت کو' معاشرۂ انسانی کے حال و مستقبل کو یکساں دیکھتی ہیں۔ اس کا تعلق خلق اور خالق سے یکساں ہوتا ہے۔ ادھر سے لیتا ہے اور ادھر پہنچاتا ہے۔ ہر اقدام کے وقت اس کی نظریں زندگی کے ہر پہلو پر اور تمام اقدار حیات پر یکساں جمی رہتی ہیں۔ ایک طرف کے دامن کوہ میں کھڑے ہونے والوں کی نگاہیں ایک ہی طرف دیکھ سکتی ہیں۔ لیکن پہاڑی کی بلندی پر کھڑا ہونے والا پہاڑ کی دونوں سمتوں کو بلکہ ہر چہار جانب دیکھتا ہے۔ یہی وہ فرق ہے نبی اور غیر نبی میں جس کی وضاحت حضورؐ نے ایک سہل الفہم عملی تمثیل سے فرمائی ہے کہ دیکھو ٹیلے کی دوسری جانب تم نہیں دیکھ

سکتے اور میں دیکھ رہا ہوں' اور اس پار کسی خبر کی تصدیق تم اسی وقت کرسکتے ہو جب مجھے سچا سمجھ کر میری باتوں پر یقین کرو۔ ٹھیک اسی طرح زندگی کی معمولی حیوانی ضرورتوں پر تو تمھاری نگاہ پہنچ جاتی ہے لیکن ان اقدار انسانی پر تمھاری نظریں نہیں جاتیں جن کا تعلق زندگی کے انجام (آخرت) سے ہے۔ تمھاری نگاہ صرف مخلوقات پر جاتی ہے' خالق پر نہیں پڑتی۔ تم انسانی دماغ پر ہی اپنی زندگی کا دارومدار رکھتے ہو اور یہ نہیں جانتے کہ صحیح ہدایت نامہ زندگی خدا کی طرف سے بذریعہ پیغمبر ہی مل سکتا ہے۔ تمھاری نظریں زندگی کے صرف ایک ناقص پہلو پر ہیں اور میں زندگی کے دونوں سروں کو اسی طرح یکساں دیکھ رہا ہوں جس طرح اس وقت ٹیلے کے بلند مقام سے دونوں بلکہ چاروں طرف نظر دوڑ رہی ہے۔ تمھارے سامنے صرف عالم شہود ہے اور وہ بھی ناقص' مگر میری نگاہ رسالت عالم غیب پر بھی اسی طرح ہے جس طرح عالم شہود پر۔ اس عالم غیب (وحی) کی باتوں کی تصدیق اسی وقت ممکن ہے' جب مجھے سچا جان کر ایمان لے آؤ۔ نبی کے مانے بغیر محض عقل و فراست کسی کام نہیں آسکتی۔

یہ ہیں وہ حقائق جو حضورؐ نے چند لفظوں میں ایک عملی تمثیل دے کر لوگوں کو سمجھائے ہیں اور ایک نبی کے متعلق عالم غیب پر نظر رکھنے کا ایک زندہ ثبوت بھی وہیں مل گیا کہ ابولہب کی گستاخی کے جواب میں وحی پیغمبری اس کا اور اس کی بیوی کا وہ کچھ انجام بتا دیتی ہے جس کا اس وقت کسی کو وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا مگر وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا۔

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ابھی نبوت کا تیسرا سال ہے۔ گنتی کے چند اشخاص ایمان لائے ہیں۔ مسلمان نہایت کمزور حالت میں ہیں۔ لیکن "وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ" کا حکم نازل ہوتے ہی کیسی بے دھڑک جرات مندی کے ساتھ حضورؐ نے علی الاعلان اپنا پیغام پہنچا دیا' اور صرف پیغام ہی نہ پہنچایا بلکہ ایک مال دار و صاحب اقتدار متکبر (ابولہب) کو اس کا انجام بھی بے

تامل سنا کر اس رابطے کی زندہ شہادت پیش فرمادی جو پیغمبر اور خدا کے درمیان ہوتا ہے۔

زبان رسالت سے نکلی ہوئی اس وحی منزل نے آج دنیا کو ایک بڑی اہم قدر بھی عطا کی ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبر کا رشتے دار ہونا کوئی کام نہ آئے گا۔

فلا انساب بَیۡنَھُم یومئذ ولَایَتَسَآء لون ○ (المومنون : ۱۰۱)

بروز حشر نسبی فضیلت کوئی کام نہ آئے گی اور نہ اس کے متعلق کوئی سوال و جواب ہو گا۔

کام آنے والی شے صرف ایمان و عمل ہے۔ قرآن پاک نے جہاں پسر نوحؑ اور پدر ابراہیمؑ کے انجام کا ذکر کیا ہے وہاں اس سے پہلے خود حضورؐ کے چچا اور چچی کا انجام بتا کر حقیقت کی پردہ کشائی کر دی ہے۔

حسن زبصرہ' بلال از حبش' صہیب از روم
زخاک مکہ ابوجہل' ایں چہ بوالعجبی ست

ابوجہل کی جگہ ابولہب کہیے جب بھی مضمون اسی طرح سچا ہو گا۔ پیغمبر کی یا کسی اور بڑی شخصیت کی محض قرابت پر فخر و ناز پر بھروسہ کر کے حسن عمل سے آزاد ہو جانا وہی یہودیانہ ذہنیت ہے' جس کی قرآن کریم نے یوں ترجمانی کی ہے:

نحن اَبۡنوء اللّٰہ وَاحِبَّاءُہ (المائدہ : ۱۸)

ہم تو خدا کے فرزند اور اس کے چہیتے ہیں۔

ایمان و عمل کا معاملہ تو یہ ہے:

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

غرض یہ پہاڑی کا وعظ محض وعظ نہیں بلکہ بہت سی بنیادی اقدار کو

اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

تبلیغی توسیع

اس پہاڑی اعلان و وعظ کے بعد حضور نے برملا تبلیغ شروع فرما دی۔ ہر گلی کوچے میں' ہر مجلس و اجتماع میں اور ہر میلے ٹھیلے میں جا جا کر آواز حق کو بلند آہنگی کے ساتھ پہنچانا شروع کر دیا۔ توحید کی اشاعت فرماتے۔ شرک سے روکتے اور شرک سے پیدا ہونے والی تمام برائیوں کی وضاحت فرماتے ——— اخلاقی برائیوں ——— بت پرستی' بدکاری' چوری' ڈاکے' کذب' قمار بازی' قتل دختر اور ظاہری و باطنی نجاستوں سے لوگوں کو روکتے۔ مشہور میلوں مثلاً عکاظ' یعینہ اور ذوالمجامہ میں بھی پہنچ جاتے اور توحید کی تبلیغ فرماتے۔ اکثر مواقع پر ابوجہل اپنی پارٹی کے ساتھ پیچھے پیچھے جاتا اور یہ اعلان کرتا جاتا کہ: (نقل کفر' کفر نباشد)

"یہ دیوانہ ہے۔ جادوگر ہے۔ تمھیں آبائی دین سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ خبردار اس کی باتیں نہ سنیں۔"

لمحہ فکریہ

یہاں یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ حضورؐ جن مذکورہ بالا اخلاقی برائیوں کا ذکر فرماتے تھے' ان میں بیشتر چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق ابھی تک مکی زندگی میں باقاعدہ "احکام" نہ نازل ہوئے تھے۔ یہ تمام برائیاں عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں اور حضورؐ ان سے لوگوں کو روکتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ نبیؐ کی زندگی کا رخ ابتدا ہی سے صحیح سمت میں ہوتا ہے جسے ہم اوپر کئی جگہ پر واضح کر چکے ہیں۔ دوسرے اگر انسان بالکل ہی گیا گزرا نہ ہو اور ضمیر کی کوئی رمق اس کے اندر باقی ہو تو وہ ان اخلاقی برائیوں کو برائیاں ہی سمجھتا ہے۔ چور چوری کو' جھوٹا جھوٹ کو کبھی نیکی نہیں سمجھتا۔ یہی

وہ حقیقت ہے جسے قرآن "فالھمھا فجورھا وتقوھا ص (الشمس:۸) سے تعبیر کرتا ہے' یعنی ہر نفس انسانی میں خدا کا بخشا ہوا اتنا ضمیر موجود ہے جو عام اخلاقی نیکی و بدی میں تمیز کر سکے۔ کسی کے ساتھ ہمدردی کرنے والا اپنے فعل ہمدردی کو یقیناً نیکی سمجھتا ہے اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ جب اس کے ساتھ کوئی ہمدردی کرے تو وہ خوشنود و شکر گزار ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک چور چوری کر کے اپنی کامیابی پر خواہ کتنا ہی خوش ہو لیکن جب خود اس کے گھر چوری ہو جائے تو وہ رنجیدہ ہو گا اور چوری کرنے والے کو ہزاروں صلواتیں سنائے گا۔ اس کا یہ اظہار رنج کیا وہی فطرت کی آواز نہیں جو ضمیر انسانی کی شکل میں اسے قدرت نے بخشی ہے؟ اگر فی الواقع وہ چور چوری کے فعل کو کوئی نیکی سمجھتا ہوتا تو اپنے گھر چوری ہونے کے بعد بھی وہ اسے نیکی تصور کرتا اور اس فعل پر مسرور ہوتا' شکر گزار ہوتا۔

لہذا ظاہر ہے کہ حضورؐ کی وہ اخلاقی تعلیمات جن کے بارے میں احکام نازل نہ ہوئے تھے 'غبار آلود اور خوابیدہ ضمیر انسانی کو بیدار کرنے کے لیے تھیں اور اس کی بنیاد وہی پیغمبری فطرت تھی جس کا رخ قبل از نبوت صحیح سمت میں تھا' اور جس نے نبوت سے پہلے ہی "حلف الفضول" کی تشکیل کرائی تھی۔

قریش کی مخالفت

یوں تو اس تین سال کے عرصے میں بھی بعض افراد قریش نے ایک "نئے دین" کے اثرات کو فضا میں تیرتا ہوا محسوس کر لیا تھا اور ان کا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ وہ ان "نومسلموں" کی سیرت و کردار کی ایک ایک ادا میں غیر معمولی تبدیلی کو بھانپ رہے تھے تاہم ابھی تک بات ایک حد تک ڈھکی چھپی سی تھی۔ لیکن کوہ صفا کی دعوت کے بعد پیغام نبوت بے نقاب ہو کر سب کے سامنے آ گیا اور کونے کونے میں دعوت توحید کی آواز گونج پیدا کرنے لگی۔ قریش مکہ کے

لیے اس پیغام نبوت سے زیادہ ناگوار اور کوئی شے نہ ہو سکتی تھی' کیوں کہ بت پرستی اور توہم پرستی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ چوری ڈاکے سے ان کا معاشی مفاد وابستہ تھا۔ دختر کشی ان کی نگاہ میں نشان غیرت تھی۔ جنسی بے راہروی صرف سامان لذت اندوزی ہی نہ تھا بلکہ تہور و غیرت کی طرح یہ بھی ان کے ادب شاعری اور زبان آوری کی بنیاد تھی' اور سب سے بڑھ کر یہ خطرہ ان کے سامنے تھا کہ ان کی سیادت و اقتدار چھن جائے گا۔ غرض معاش' آبائی دین' اقتدار اور جنسی آزادی سب انھیں خطرے میں نظر آنے لگے۔ اس لیے وہ بھی اب پوری شدت کے ساتھ پیغام حق کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ حق و انصاف' عدل و صداقت اور شرافت و اخلاق کی سیدھی سادی باتیں ہر انسان کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ انسان اگر انسانیت سے' عقل سے' شریفانہ جذبات سے بالکل گیا گزرا ہو تو اور بات ہے' ورنہ ہر ضمیر انسانی معقول باتوں کی معقولیت کو سمجھ لیتا ہے۔ عام طور پر قریش یا دوسرے لوگوں کا ضمیر اسلام کے ابتدائی پیغام کے حق ہونے کا معترف تھا جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے کہ:

"یعرفونه کما یعرفون ابناء هم ط (البقرہ:۱۴۶)
یہ منکرین اپنے فرزندوں کی طرح اس کی شناخت رکھتے ہیں۔

اس کے باوجود جب انسان پیغام حق کی مخالفت کرتا ہوا خود اپنے ضمیر کے خلاف چلتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ وہ اس سے اپنے بعض مفادات کو خطرے میں محسوس کرتا ہے' اور یہ بھی ایک عام قاعدہ ہے کہ عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ مذہبی آڑ لی جاتی ہے۔ اصلی زد جن مفادات پر پڑتی ہے اسے یا تو ظاہر ہی نہیں کیا جاتا یا موخر رکھا جاتا ہے یا ضمناً" غیر مقصود ظاہر کر کے معمولی انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ بہرحال پیش پیش وہی

بات رکھی جاتی ہے جو مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر سکے۔

اہل مکہ ان ہتھکنڈوں سے بے خبر نہ تھے' اس لیے انھوں نے بھی حضورؐ کی مخالفت کے لیے یہی حربہ استعمال کیا۔ وہ اس زد کا ذکر زیادہ نہ کرتے تھے جو ان کے معاش و اقتدار یا آزاد خواہش نفس پر پڑتی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے آبائی دین اور اپنے معبودوں ہی کو پیش پیش رکھتے تھے اور اسی ہتھکنڈے کو مخالفت کا واسطہ بناتے تھے۔ اپنے مفادات کو آسانی سے کون چھوڑتا ہے؟ مفادات کو ترک کرنے کا جرات مندانہ اقدام تو صرف وہی سعید روحیں کر سکتی ہیں جن کی نگاہوں میں روحانی اقدار کی قیمت ان مفادات سے بدرجہا زیادہ ہو۔ معاندین کی نظروں میں ساری قدر و قیمت کی چیز وہی مادی مفادات کی تھی' لیکن عداوت و دشمنی کے لیے انھیں بھی اپنی خود ساختہ مذہبی اقدار ہی کو پیش پیش رکھنا پڑا۔

ابوطالب سے سوال و جواب

اہل مکہ نے تبلیغ حق روکنے کے لیے پہلے یہ سکیم تیار کی کہ باثر لوگوں کا ایک وفد حضورؐ کے چچا ابو طالب کے پاس بھیج کر تبلیغی سرگرمیوں کی روک تھام کرانے پر زور ڈالا جائے۔ ان سب کو یہ علم تھا کہ آمنہؓ اور عبدالمطلب کی وفات کے بعد ابو طالب ہی حضورؐ کی پرورش کرتے رہے ہیں۔ حضورؐ ان کے احسان مند ہیں اور حضورؐ پر ان کا خاصا اثر ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ابو طالب بھی اپنے آبائی دین پر ان ہی کی طرح قائم ہیں اور یہ توقع ہے کہ ان کے سمجھانے سے حضورؐ بہ تقاضائے احسان مندی اپنے "نئے دین" کی تبلیغ سے باز آجائیں۔

ان ہی توقعات کو لے کر ایک وفد ابو طالب کے پاس گیا۔ اس وفد کے ارکان میں عتبہ بن ربیعہ' شعبہ' ابوسفیان' عاص بن وائل' عاص بن ہشام'

ابو جہل' ولید بن مغیرہ وغیرہ شامل تھے۔ یہ تمام ارکان وفد جہاں دیدہ' تجربہ کار' باثر اور گھاگ قسم کے لوگ تھے' اور ان کی باتوں کو نظر انداز کر دینا ابو طالب کے بس کی بات نہ تھی۔ ان سب نے مل کر ابو طالب پر زور ڈالا کہ اپنے برادر زادے کو اس "نئے فتنے" کی اشاعت و تبلیغ سے روکا جائے۔ ابو طالب نے حضورؐ سے بزرگانہ انداز وقار اور مشفقانہ محبت سے کہا کہ: "جان عم! مجھ پر اتنا بوجھ تو نہ ڈالو جو میری برداشت سے باہر ہو۔ دیکھو بتوں اور معبودوں کی اہانت سے ساری کی ساری قوم ناراض ہو گئی ہے۔ کیوں نہ تم اپنی موجودہ دینی تبلیغ کو روک دو؟"

ابو طالب کو اب تک نبوت کے بے پناہ زور و قوت اور اعتماد علی اللہ کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میرا یہ برادر زادہ میری عمر بھر کی حمایت سے مجبور ہو کر میری یہ پہلی فرمائش مان لے گا اور ساری قوم کی ناراضی کا واسطہ دینا اس کے لیے موثر ہو گا۔ ابو طالب کا تصور غالباً یہ تھا کہ یہ "نیا دین" ایک یوں ہی معمولی سی چیز ہے جسے میری ایک ہی فرمائش آسانی سے روک کر ساری قوم کی ناراضی کو ختم کر دے گی۔ مگر حضورؐ نے اپنے اس آخری دنیوی سہارے کی پروا کیے بغیر جو مختصر سا جواب دیا وہ ہمیشہ مقام نبوت کو ظاہر کرتا رہے گا۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ: "میں اس فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رہ سکتا جس کے لیے میں خدا کی طرف سے مامور ہوں۔"

اس چھوٹے سے جملے نے ابو طالب کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے کہہ دیا کہ: "اچھا تو تم جو کچھ کر رہے ہو' کیے جاؤ۔ جب تک میں زندہ ہوں تمھاری طرف کوئی انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا۔"

ایجاد ستم

وفد کی سکیم ناکام رہی اور حضورؐ کی روش میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

برابر اسی طرح ایک ایک کے کان میں آواز حق پہنچاتے رہے۔ اہل مکہ کو اب روز بروز اپنے لیے خطرہ زیادہ ہی نظر آنے لگا اور اب انھوں نے اس خدائی آواز کو دبانے کے لیے ایک دوسری سکیم تیار کی۔ یوں تو انفرادی طور پر پہلے بھی وہ کمزور اور بے بس نومسلموں پر سختیاں کرلیا کرتے تھے مگر اب باقاعدہ ایک منظم پروگرام ستم ایجادیوں کے لیے بنایا۔ اس سے غرض یہ تھی کہ جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں وہ جور و ستم سے مجبور ہو کر ارتداد اختیار کر لیں اور جو لوگ اسلام قبول کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں' وہ ان عبرت ناک مظالم سے دہشت زدہ ہو کر اسلام لانے کی جرات ہی نہ کر سکیں۔

مظالم کا انداز یہ رکھا گیا کہ اس کا آغاز ان لوگوں سے کیا جائے جو بے بس اور بے اثر ہوں اور ان کے حمایتی وہ قبائل یا حلیف افراد نہ ہوں جو عربی دستور کے مطابق ہر صحیح و غلط کی حمایت کو اپنا قومی و قبیلوی فرض سمجھتے ہیں۔ دوسرا انداز یہ رکھا گیا کہ جو باثر لوگ ہوں ان کو انہی کے باثر سرپرستوں کے ہاتھ سے سزائیں دلوائی جائیں تاکہ دوسروں کو مداخلت کا موقع نہ رہے۔

لرزہ خیز سزاؤں اور ایذا رسانیوں کی یہ داستان بڑی طویل اور دل خراش ہے۔ ہم اس کی تفصیل میں جانے کی بجائے بہت اختصار سے کام لیں گے۔ (۳) چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ا۔ بلال حبشیؓ' امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ انھیں ٹھیک دوپہر کو تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر سینے پر وزنی پتھر رکھ دیا جاتا تھا تاکہ جنبش نہ کر سکیں۔ کبھی گلے میں رسی باندھ کر گلی گلی پھرایا جاتا۔ خرد و کلاں کا جمگھٹ ساتھ ساتھ تمسخر بھی اڑاتا جاتا اور سخت جسمانی اذیتیں بھی پہنچاتا۔ کبھی دھکے دے کر انھیں زمین پر گرا دیا جاتا اور بے رحمی سے گھسیٹا جاتا۔ یہ ساری ایذائیں دیتے ہوئے ان پر دباؤ ڈالا جاتا کہ اب بھی اعتراف توحید سے باز آجاؤ۔ مگر بلالؓ کی زبان سے جب بھی کوئی آواز نکلتی تو وہ احد احد کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔

۲۔ یاسرؓ کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک کیا گیا اور انھیں تو آگ سے داغ داغ کر پانی میں غوطہ دیا جاتا جس سے جسمانی اذیت کے علاوہ دم بھی گھٹنے لگتا۔ ساتھ ہی شدید قسم کی ضربات لگائی جاتیں ـــــ اور وہ ایک دن یہ سزائیں بھگت کر دنیا سے چل بسے۔

۳۔ یاسرؓ کے فرزند عمارؓ کے ساتھ بھی بالکل اسی طرح کا سلوک کیا گیا۔ انھیں بھی جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر اتنا مارا جاتا کہ بے ہوش ہو جاتے۔

۴۔ صہیبؓ رومی کو مار مار کر اتنی تکلیف پہنچائی جاتی کہ ان کے حواس بجا نہ رہتے۔ ہجرت کے وقت ان کا سارا مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔

۵۔ ابو فکیہہ' صفوان بن امیہ کے غلام تھے۔ ان کے پاؤں میں رسی باندھ کر گھسیٹا جاتا اور گرم گرم ریت پر لٹا دیا جاتا۔ کبھی ان کا گلا گھونٹا جاتا اور کبھی سینے پر اتنا بوجھل پتھر رکھ دیا جاتا کہ ان کی زبان باہر نکل پڑتی۔

یہ تو چند مردوں کی مثالیں ہیں۔ کچھ عورتوں کا بھی حال سنیے:

۱۔ زنیرہؓ حضرت عمرؓ کی لونڈی تھی (حضرت عمرؓ اس وقت تک ایمان نہ لائے تھے) ابو جہل نے اس مومنہ کو اتنا مارا کہ اس کی آنکھیں جاتی رہیں۔

۲۔ خود حضرت عمرؓ (اپنی حالت کفر میں) لبینہ کو اس طرح مارتے کہ جب مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ ذرا دم لے لوں تو اور ماروں گا۔ وہ مارتے مارتے تھک جاتے اور لبینہ مار برداشت کرتے کرتے نہ تھکتی۔

۳۔ ہندیہ کو بھی اسی طرح کی اذیت رساں سزائیں دی جاتیں۔

۴۔ ام عبیس کو بھی اسی طرح تختہ مشق بنایا جاتا۔

۵۔ یاسر کی بیوی اور عمار کی والدہ سمیہ پر وہ سارے ظلم کیے گئے جو اس مومنہ کے شوہر و فرزند پر ہوئے' اور اس عورت نے بھی مردانہ وار اپنے شوہر کے ساتھ ہی جان دی اور شہدا میں اسی عورت کا نام سرفہرست ہے۔

یہ تو وہ لوگ ہیں جو مجبور و مقہور تھے' بے بس و زیردست تھے' جن

کا کوئی فرد یا قبیلہ حمایتی یا حلیف یا باز پرس کرنے والا مددگار نہ تھا۔ اگر کوئی تھا تو وہ خود بھی ان ستم ایجادیوں میں بڑھ چڑھ کر عملی حصہ لیتا تھا اور جو ستم و جور بھی ہوتا وہ اس کی مرضی و تجویز سے ہوتا۔ یہ جور و ستم صرف بے کسوں' مجبوروں تک محدود نہ تھا۔ بلکہ بااثر آزاد بھی اس کی لپیٹ میں لے لیے گئے۔

مثلاً:

۱۔ حضرت عثمانؓ کو ان کا چچا چٹائی میں لپیٹ کر نیچے سے اتنا دھواں دیتا کہ ان کا دم گھٹنے لگتا۔

۲۔ مصعبؓ بن عمیر کو ان کی ماں نے صرف مسلمان ہونے کے جرم میں گھر سے باہر نکال دیا۔

یہ چند نظائر ہیں اور وہ بھی تفصیلات میں گئے بغیر (بعض کا ذکر آگے بھی آئے گا)۔ اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ دو بھرے ایمان لانے والوں کے ساتھ کیا کیا کچھ نہ کیا گیا ہو گا۔ مختصر یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اسلام لایا وہ اہل مکہ کے مظالم و ستم کا نشانہ بنا۔

حضورؐ اکرم پر جفائیں

اس مختصر سی داستان جور و ستم سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ یہ سب کچھ صرف نومسلموں کے ساتھ ہوتا رہا اور حضورؐ آرام سے اپنا مشن پھیلاتے رہے۔ نہیں نہیں۔ حضورؐ کو بھی اسی طرح ذہنی اور جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں جس طرح امتیوں کو پہنچائی گئیں۔ چند ایک واقعات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ حضورؐ کعبے میں نماز پڑھ رہے ہیں اور عقبہ بن معیط حضورؐ کی گردن میں کپڑا ڈال کر بل دینا شروع کرتا ہے۔ کپڑے کا پھندا اس قدر کس جاتا ہے کہ حضورؐ کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مگر حضورؐ سجدے میں پڑے تسبیح الٰہی میں مصروف ہیں۔ اتفاقاً" حضرت ابوبکرؓ ادھر آنکلتے ہیں اور یہ جانکاہ منظر دیکھ کر

فرماتے ہیں۔

اتقتلون رجلًا ان یقول ربی اللہ وقد جاء کم بالبینت (المومن : ۲۸)

ظالمو! کیا تم ایک شخص کی جان محض اس جرم میں لے رہے ہو کہ وہ اللہ کو اپنا رب کہتا ہے اور اس کے واضح دلائل بھی لایا ہے۔

یہ سنتے ہی سب کے سب حضرت ابو بکرؓ پر پل پڑے اور انھیں اتنا مارا کہ ہوش بجا نہ رہے اور لاد کر گھر لائے گئے۔

۲۔ اسی طرح حضور دوسرے موقعے پر حرم میں نماز ادا فرما رہے تھے کہ ابو جہل کے اشارے پر ایک شخص نے عین حالت سجدہ میں اونٹ کا ایک بوجھل اوجھ لا کر اوپر ڈال دیا۔ حسن اتفاق سے حضورؐ کی چھوٹی صاحب زادی حضرت فاطمہؓ ادھر آگئیں اور اس بوجھ کو ہٹایا۔

۳۔ ابولہب کی بیوی حمنہ (اس کی کنیت ام جمیل تھی) حضورؐ کی گزر گاہ پر کانٹے بچھا دیا کرتی اور کبھی حضورؐ کے دروازے پر غلاظت کا ڈھیر ڈال دیتی۔

۴۔ حضورؐ جدھر نکلتے وہاں کبھی گالیوں' تالیوں اور شور و غل سے استقبال کیا جاتا اور کبھی حضورؐ پر پتھر پھینکے جاتے۔

۵۔ طائف اور دیگر مقامات پر حضورؐ کو جو اذیتیں پہنچائی گئیں ان کا ذکر اپنے محل میں آگے آئے گا۔

۶۔ اور یہ بھی ایک سچی حقیقت ہے کہ بخوائے عزیز علیہ ماعنتم (جو مصیبتیں تم جھیلتے ہو وہ رسول پر بے حد شاق ہیں) حضورؐ کے لیے ایک ایک امتی کی ایذائیں اتنی زیادہ رنج افزا تھیں کہ کسی انتہائی مشفق ماں باپ پر اپنی محبوب ترین اولاد کی سخت سے سخت تکلیف بھی اتنی گراں نہیں ہو سکتی۔ حضورؐ نے ایک ہی مختصر جملے میں ان تمام ایذارسانیوں کو سمیٹ سمو کر یوں ادا فرما

دیا ہے۔

ما اوذی نبی قط کما اوذیت۔

جتنی تکلیفیں مجھے دی گئی ہیں کسی نبی کو نہیں پہنچائی گئیں۔

برخوان غم چو عالمیاں را ندا زند
اول صلا بہ سلسلہ انبیا زدند (محتشم)

اور حضورؐ تو سلسلہ انبیا کی سب سے آخری اور سب سے اہم کڑی ہیں۔ نیز اس حقیقت سے کون ظالم بے خبر تھا کہ اس "نئے دین" کی ساری جڑ بنیاد حضورؐ ہی کی ذات گرامی ہے؟ یہ کیسے ممکن تھا کہ معاندین و منکرین فروع ہی کی طرح اپنی ساری توجہ مبذول کر دیں اور اصل سے صرف نظر کر لیں؟ انھیں یہ پورا علم تھا کہ ان "نومسلموں" کا قبلہ توجہ اور ان سب کا مرکزی نقطہ آغاز ذات محمدؐ ہے۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اپنے ظلم و ستم کا نشانہ صرف پروانوں کو بنائیں اور شمع کو گل کرنے کی فکر نہ کریں۔ انھوں نے سب کچھ کیا جو وہ حضورؐ کے ساتھ کر سکتے تھے۔

لمحہ فکریہ

ان تمام جان لیوا اور روح فرسا مظالم کو سامنے رکھ کر ایک سوال کا جواب تلاش کیجئے۔ ان تمام آزمائشوں اور شدید ابتلاؤں کے باوجود کوئی ایک متنفس بھی نظر آتا ہے جس نے ایک لحظے کے لیے بھی اسلام سے دست بردار ہونے کا اعلان کیا ہو؟ کوئی فرد بھی ایسا دکھائی دیتا ہے جس کے اندر اس خیال یا شکوے کا شائبہ بھی پیدا ہوا ہو کہ محمدؐ رسول اللہ نے ہمیں کس مصیبت میں ڈال رکھا ہے؟ ایک شخص بھی ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جو محمدؐ اور آپؐ کے پیغام کے مقابلے میں اپنے خاندان، اپنے وقار و عزت، اپنے مال و دولت، اپنے بال بچوں، اپنی جان و روح یا اپنی کسی عزیز ترین متاع کو ترجیح دے کر اسے محفوظ

رکھنے کا کوئی خیال بھی دل میں لایا ہو؟ یا کفر و اسلام کے درمیان کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے مداہنت کا کوئی پہلو اختیار کیا ہو؟

ان تمام سوالات کا جواب نفی اور صرف نفی میں ہے۔ محض نفی ہی میں نہیں بلکہ یہاں یہ نظر آتا ہے کہ ہر آزمائش ایمان میں اضافہ کرتی ہے۔ جتنا زیادہ سخت امتحان ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ اسلامی کردار میں پختگی آتی ہے۔ جس قدر زیادہ دبایا جاتا ہے اسی قدر زیادہ ان کے عشق اقدار میں ابھار پیدا ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر سزا و تعذیب میں انھیں کچھ لذت مل رہی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف حالت کفر میں ابوسفیان کو بھی اور ہرقل روم کو بھی کرنا پڑا۔ ابوسفیان سے ہرقل نے پوچھا:

هل یرتد احد منهم عن دینه بعد ان یدخل فیه سخطه له

کوئی کیا ایسا پیرو محمدیؐ بھی ہے جو اس دین میں داخل ہونے کے بعد اس سے ناراض ہو کر مرتد ہو گیا ہو؟

ابوسفیان نے جواب دیا

لا

ایسا کوئی نہیں۔

ہرقل بولا:

کذالک الایمان اذا خالط بشاشه القلوب (رواه الشیخان ابن عباس)

ایمان دل میں اتر جائے تو اس کی چاشنی ایسی ہی غیر متزلزل ہوتی ہے۔

یہ اعتراف دو ایسے شخصوں کا ہے جن میں سے ایک تو ابھی تک شدید دشمن ہے اور دوسرا دل سے تو قائل ہے مگر حکومت کی کرسی کی خاطر انکار کر گیا۔

پھر ذرا یہ بھی سوچیے کہ ان سارے لرزہ خیز مصائب و آلام کو ہنسی خوشی جھیلنے کے نتیجے میں انھیں کس قسم کے مفاد کی توقع تھی؟ کوئی عہدہ کوئی منصب؟ نہیں۔ کوئی دولت کوئی حکومت؟ نہیں۔ کوئی عزت کوئی جاہ؟ نہیں۔ کوئی زن کوئی زمین؟ نہیں۔ کوئی آرام کوئی راحت؟ نہیں۔ کوئی خطاب کوئی لقب؟ نہیں۔ ان ساری چیزوں کی تو قربانی دی جا رہی ہے۔ یہی تو وہ بت ہیں جن کو لا الہ الا اللہ کی ضرب سے پہلے ہی لمحے میں ریزہ ریزہ کر دیا گیا تھا۔ پھر آخر ان تمام شدائد کو جھیلنے میں کون سا مفاد ان کے پیش نظر تھا؟ اسے صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو ''اقدار حیات'' کی قدر و قیمت کو جانتا ہو' اور اس فرق کو پہچانتا ہو جو مادی مفادات اور اقدار حیات کے درمیان ہے۔ مادی مفادات کو محض حیوانی سطح پر استعمال کرنے کا جہاں تک تعلق ہے' ان سب کا رخ کفر و جاہلیت کی طرف تھا' اور ادھر ان اقدار زندگی کی طرف رخ تھا جن کا مرکز قدر الا قدار ——— اللہ ——— ہے یہ ایک ایسا نظریہ زیست ہے جسے اپنا لینے کے بعد سارے مادی مفادات کا خود بخود صحیح استعمال ہونے لگتا ہے۔ یہ وہ زاویہ نگاہ ہے جو ہر مفاد کے استعمال میں انسان کو نری حیوانی سطح سے اٹھا کر انسانی سطح پر لے آتا ہے اور اسفل السافلین میں سونے والوں کو بیدار کر کے احسن تقویم کی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے۔ جو مومن اس حقیقت کو سمجھ لے اور یہ سمجھنا محض دماغ کا سمجھنا نہ ہو بلکہ دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جانے والا انداز رکھتا ہو تو اس کی نگاہوں میں جان و مال' ازواج و اولاد اور ہر قیمتی سے قیمتی متاع اور مفاد ان اقدار زندگی کے سامنے بے حقیقت' بے قیمت اور ہیچ ہو جائیں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون تھا جس نے ان جانبازوں کو نئی اقدار زندگی سے روشناس کرایا؟ کس نے ان سب کو ترک و اختیار کے یہ جدید پیمانے اور پسند و ناپسند کے یہ انوکھے مقیاس بخشے؟ کس نے صحیح و غلط کے یہ انقلاب

آفریں معیار سمجھائے ہی نہیں بلکہ دلوں کی آخری گہرائیوں میں اتار دیے؟ کیا یہ محمدؐ عربی ہی نہیں جن کی ساری سیرت ہی بجائے خود اعلیٰ اقدار کا مجسم مظہر ہے؟ اس انسان کی بلندی کردار کا کون اندازہ کر سکتا ہے جس کی ایک نگاہ نے مس خام کو کندن بنا کر پوری زندگی کا رخ حقیقت ———— بلکہ حقیقتہ الحقائق ———— کی طرف موڑ دیا اور زاویہ نظر میں اتنی غیر متزلزل پختگی پیدا کر دی کہ اس راہ کی ہر آزمائش و ابتلا سرمایہ لطف و لذت بن گئی۔

استقامت

ان مردان خدا کی استقامت بجائے خود ایک ایسی اعلیٰ قدر ہے جس کے اعتراف و قدردانی میں رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ کی سند نازل ہوئی۔ ان کے پائے ثبات میں آزمائش کے کسی مرحلے پر بھی لغزش نہ آئی۔ ان میں سے کسی نے بھی ان ابتلاؤں سے بچنے کے لیے کبھی کوئی بہانہ تلاش نہ کیا۔ صرف ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس سے بعض غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہ واقعہ ہے عمار بن یاسر کا۔ مختصراً" یہ واقعہ یوں ہے کہ ابوجہل اور اس کے ساتھی بے بس اور زیر دست عمارؓ کو ہر روز مختلف قسم کی سزائیں دیتے تھے تاکہ یہ اسلام سے پھر جائیں۔ ایک دن انھوں نے آگ سے جسم کو جلایا۔ یہ سب کچھ کیا مگر عمارؓ ثابت قدم رہے۔ ایک دن انھوں نے عمارؓ کو پانی میں اس طرح غوطہ دیا کہ ان کا دم گھٹنے لگا اور اس حالت اضطرار میں ان کی زبان سے کلمہ کفر نکل گیا۔ عمارؓ کو سخت پشیمانی ہوئی اور روتے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: "جب وہ ایسا کریں تو تم اسی طرح کہہ کر اپنی جان بچا لو۔" اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:

من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ و قلبہ مطمئن
بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرا فعلیھم غضب

من اللہ ولھم عذاب عظیم ○ (النحل:۱۰۶)
جو ایمان لا چکنے کے بعد کفر کرے اس پر خدا کا غضب نازل ہو گا اور اس کے لیے سخت سزا ہے۔ اس سے مستثنیٰ وہ ہے جسے مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان پر جما ہو۔ وہ نہیں جو شرح صدر کے ساتھ کفر کا مرتکب ہو۔

آیت سے صاف واضح ہے کہ اگر بربنائے ایمان مسلسل جانچ ہو رہی ہو اور اسے برداشت بھی کیا جا رہا ہو تو زندگی پر بعض مرحلے ایسے بھی آتے ہیں کہ جہاں جان پر بن آتی ہے اور زندگی کو مستقبل کے اعلیٰ مقاصد کے لیے محفوظ رکھنا ہی اعلیٰ قدر ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر بچاؤ کی صورت پیدا کرنا جائز ہے۔ لیکن اگر زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اسے عام (Generalise) کر دیا جائے اور وہ بھی کسی آزمائش میں پڑے بغیر محض معمولی خطرے کی بنا پر' تو منافقت اور ایمانی پختگی میں کوئی فرق نہ رہے گا اور استقامت کی تمام قدریں ختم ہو جائیں گی۔

ہجرت حبشہ (۵ نبوی)

تین سال کی خاموش تبلیغ کے بعد یہ دو سال انتہائی مصائب و آلام کے گزرے۔ مظالم اور جور و ستم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اہل اسلام کے لیے اگرچہ آزار و ستم میں لذت گیری کا ایک پہلو بھی تھا لیکن آخر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ان مسلمانوں کو جتنا آزار پہنچایا جاتا' اتنی ہی ان میں پختگی پیدا ہو جاتی اور پھر جس قدر زیادہ ان میں استقامت نظر آتی اسی قدر آزار و ستم میں اضافہ ہو جاتا۔ حضورؐ کو اس بڑھتے ہوئے ظلم و ستم سے اور ذہنی تکلیف ہوتی۔ اس لیے اس سے اس مختصر سی امت کو محفوظ رکھنے کے لیے مسلمانوں کو کسی امن کی جگہ منتقل ہو جانے کی اجازت دی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: حبشے کا نجاشی

(اصحمہ بن ابجر) اگرچہ عیسائی ہے مگر منصف مزاج ہے اور اس سے اہل مکہ جیسے ظلم و ستم کی توقع نہیں۔ اس لیے وہیں جا کر عارضی طور پر پناہ لینی بہتر ہے۔

ایمان اور وطنیت کا مقابلہ

حضورؐ کی یہ تجویز بلاشبہ مکے کی اذیت رساں آزمائشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تھی لیکن یہ ہجرت اور ترک وطن بجائے خود ایک آزمائش تھی۔ مسلمان اب تک ساری آزمائش جھیل چکے تھے۔ ہر قسم کی قربانی پیش کر چکے تھے لیکن وطن کو اپنے اعلیٰ نصب العین پر قربان کرنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ اب وہ بھی آگئی اور خاتم الانبیاؑ نے وطن کو بھی ایک اعلیٰ قدر اور برتر نصب العین پر قربان کرنے کی تعلیم دی۔

یہ ہجرت حبشہ بھی دراصل اسلام کے اسی زاویہ نظر کی تکمیل تھی اور ایک آنے والی بڑی ہجرت (ہجرت مدینہ) کی تمہید تھی۔ یہ فقط مکے کے جور و ستم سے محفوظ رہنے کی ہی ایک سبیل نہ تھی بلکہ وطن کو راہ حق میں قربان کر دینے کا بھی ایک درس تھا جو آگے چل کر زیادہ وسیع پیمانے پر ظاہر ہوا۔

علاوہ ازیں اس پہلی ہجرت میں ایک مصلحت یہ بھی ضرور ہوگی کہ ——— جیسا کہ بعد کے واقعات بتاتے ہیں ——— کہ اشاعت اسلام کے پروگرام کو باہر بھی پھولنے پھلنے کا موقع میسر آئے اور اس کی توقع ان عیسائیوں سے زیادہ ہو سکتی تھی جو دینی مزاج میں اسلام سے قریب تر ہیں۔ ان کے اقرب الی المسلمین ہونے کی شہادت خود قرآن میں بھی ہے۔

اول اول بارہ مردوں اور چار عورتوں کا ایک قافلہ رات کی تاریکی میں بندرگاہ شعیبہ پہنچا۔ حسن اتفاق سے حبشہ جانے والے دو تجارتی جہاز وہاں مل گئے۔ یہ سب لوگ پانچ درہم فی کس دے کر دونوں جہازوں میں بیٹھ گئے اور جلد ہی دونوں حبشے روانہ ہو گئے۔ صبح کفار مکہ کو معلوم ہوا تو تعاقب میں

دوڑے مگر جہاز ان کی دسترس سے باہر ہو چکے تھے۔ اس مختصر سے قافلے میں سیدنا عثمان ذی النورینؓ اور ان کی زوجہ سیدہ رقیہؓ بنت رسولؐ اللہ بھی تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد ایک اور بڑا قافلہ بھی حبشے روانہ ہوگیا۔ اس میں تراسی مرد اور اٹھارہ عورتیں تھیں۔ اس قافلے میں سیدنا جعفر طیار بن ابی طالبؓ بھی تھے جنھوں نے آگے چل کر ایک بڑی مہم سر کی ہے۔ یہ دونوں ہجرتیں اسلام میں پہلی ہجرتیں تھیں۔ جس خدا کی راہ میں یہ اہل مکہ کے ظلم و ستم جھیل رہے تھے اسی خدا کا نام آزادی و اطمینان سے لینے کے لیے یہ لوگ راہی حبشہ ہوئے تھے۔

ابھی بہت سے مسلمان مکے میں موجود تھے۔ ان میں کچھ تو ایسے تھے جن کو بہ ظاہر بے مائیگی اور بے سروسامانی نے روک رکھا تھا۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ بہتوں نے حضورؐ کی معیت کے شرف کو ترک کرنا پسند نہ کیا اور بہتیرے ایسے بھی ہوں گے جو لذت آزار سے سیر نہ ہوئے تھے۔

قریشی وفد حبشے میں

عربوں کی حبشے میں آمدورفت کوئی نئی بات نہ تھی۔ عرصہ دراز سے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ نیز وہ دور پاسپورٹ اور ویزا کی پابندیوں سے آزاد تھا۔ علاوہ ازیں نجاشی حبشہ ایک نیک دل اور فراخ ظرف حکمران تھا۔ اس لیے ان مسلمانوں کا وہاں جا بسنا کوئی ایسی انوکھی بات نہ تھی جس پر وہاں کی حکومت کوئی نوٹس لیتی۔ یہ لوگ وہاں اطمینان سے رہ کر اتنا بھر اسلامی احکام کی پابندی کے ساتھ زندگی گزارنے لگے جو اس وقت نازل ہوچکے تھے لیکن مکے والوں کو ان لوگوں کا وہاں اطمینان کی سانس لینا گوارا نہ ہوا۔ قریش نے اپنا ایک وفد عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ (۴) کی سرکردگی میں دربار حبشہ کی طرف روانہ کر دیا۔

بلاشبہ یہ اقدام قریش مکہ کی ضد اور عداوت کی انتہا پر دال ہے' لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ ان منکرین حق کے کمال استقامت کی بھی دلیل ہے۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ عربوں میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں' لیکن ان کا غلط استعمال ہو رہا تھا۔ رسول عربیؐ کا یہی کمال ہے کہ عربوں کی صلاحیتوں کا رخ صحیح سمت کی طرف موڑ دیا اور جس استعداد کا استعمال غلط ہو رہا تھا اسے اس کے صحیح ترین استعمال میں لگا دیا۔ اگر ان عربوں میں اعلیٰ صلاحیتیں موجود نہ ہوتیں تو آگے چل کر یہ نہ اتنی شان دار قوم بنتے نہ اس کارگہ حیات میں اتنے بڑے بڑے کام کرتے اور نہ امامت اقوام ان کے حصے میں آتی۔

حبشے تک مسلمانوں کا پیچھا کرنا ان اہل مکہ کے جوش عمل' بلند ہمتی اور تسلسل کار اور عزم و استقامت کی دلیل ضرور ہے۔ یہ ساری کارگزاریاں آج اسلام کے خلاف تھیں اور آئندہ یہی صلاحیتیں اقدار زندگی کو بلند کرنے میں صرف ہونے والی تھیں۔

یہ وفد اس غرض سے حبشے گیا تھا کہ کسی تدبیر سے ان پناہ گزیں مسلمانوں کو وہاں سے نکلوایا جائے اور یہ پھر مکے میں آنے پر مجبور ہو جائیں اور انھیں پھر ظلم و ستم کا تختہ مشق بنایا جائے۔ بعد کے واقعات ان کی اسی نیت کا پتا دیتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ظلم و ستم کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے نشانہ و ہدف کی تلاش میں رہتا ہے۔ اگر اسے کوئی ہدف نہ ملے تو اس کے اندر ایسی بے چینی سی محسوس ہوتی ہے جو کسی شکاری کو شکار نہ ملنے پر ہوتی ہے۔ ہر شکاری نئے نئے شکار کی تلاش میں رہتا ہے اور اس کے بغیر اس کی پیاس نہیں بجھتی۔ مکی ظالموں کی نگاہ میں وہ شکار کافی نہ تھے جو مکے میں رہ گئے تھے۔ ان کی فطرت ہر روز نت نئے طرز ستم کے لیے نئے نئے بے کسوں کا رقص بسمل دیکھنے کی عادی ہو رہی تھی۔ وہ اسی لیے حبشے تک تعاقب و تلاش میں گئے کہ قدیم مظلوموں کو کسی طرح واپس لا کر نئی نئی ستم ایجادیوں کی ہوس کو تسکین دے

سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل مکہ خاصی فراست و دانائی کے مالک تھے۔ وہ بالکل بھولے بھالے بے وقوف نہ تھے۔ وہ دور رس نگاہ رکھتے تھے۔ اور پیغام نبوت کی اندرونی قوت و زور اور اس کے پھیلنے کی بے پناہ فطری طاقت کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ مکے کے اندر دیکھ چکے تھے کہ ان کی ہزار مخالفتوں اور شدید سے شدید آزار و ستم کے باوجود اسلام کس طرح دلوں میں گھر کرتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ انھیں خوف صرف یہ تھا کہ کہیں حبشے میں اسلام پھیل کر ایسی منظم طاقت نہ بن جائے جس کی ایک ہی یورش ان کے اقتدار کی کمر توڑ کر رکھ دے۔ دراصل یہی خطرہ قریشی وفد کو حبشے تک لے گیا تھا۔ محض آزار و ستم کی جدت طرازیوں کا شوق پورا کرنا مقصود نہ تھا۔

دوسرے دن اس وفد نے دربار نجاشی میں باریابی حاصل کی اور حرف مطلب یوں ادا کیا کہ: ”ہمارے شہر مکہ کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب نکالا ہے۔ ہم نے ان کو نکال باہر کیا تو یہ لوگ یہاں آکر پناہ گزیں ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ان مجرموں کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔“

ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں بھی وہی مذہبی حربہ استعمال کیا جا رہا ہے جو مکے کے عوام کو بھڑکانے کے لیے کیا جاتا رہا۔ یہ وفد اس زد کا ذکر نہیں کرتا جو مکے والوں کی معاش یا اقتدار پر پڑ رہی ہے۔ وہ آگے آگے مذہب ہی کو رکھتا ہے اور اس نفسیات سے بخوبی واقف ہے کہ ایک مذہبی (عیسائی نجاشی) کے جذبات اسی حربے سے برانگیختہ کیے جاسکتے ہیں۔

نجاشی کے سامنے یہ صورت واقعہ دفعتہً ہی آئی تھی۔ مذہبی انسان کے لیے کسی نئے مذہب کا ذکر قدرتی طور پر باعث دلچسپی ہو جاتا ہے۔ نجاشی کو ایک تو یہ شوق ہوا کہ ذرا اس نئے مذہب کا حال چال تو معلوم کریں۔ دوسرے اس کے جذبہ عدل نے یہ گوارا نہ کیا کہ یک طرفہ بیان سن کر فیصلہ دے دیا

جائے اور دوسرے فریق کا کوئی بیان ہی نہ سنا جائے۔ چنانچہ نجاشی نے دریافت حال کے لیے مسلمانوں کو بلوا بھیجا۔

سیدنا جعفر بن ابی طالب مسلمانوں کے نمائندے بن کر گئے۔ دربار سجا ہوا ہے۔ مجمع اس انوکھے مقدمے کی کارروائیاں دیکھنے اور سننے کا مشتاق ہے۔ قریشی وفد کو مقدمہ اپنے حق میں ہونے کا یقین ہے۔ ادھر رسولؐ اللہ کا عم زاد بھائی جعفر طیار اپنی بے پناہ قوت یقین و ایمان کا لشکر اپنی جلو میں لیے ہوئے پہنچ جاتا ہے۔ ادھر ساری خدائی ہے اور ادھر صرف ایک خدا۔ جعفر نے نجاشی کو سلام تو کیا لیکن رائج الوقت درباری آداب کے مطابق سجدہ نہ کیا۔ نجاشی نے پوچھا "تم بادشاہ کو سجدہ کیوں نہیں کرتے؟" فرمایا: "ہم لوگ اللہ کے سوا اور کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔" پوچھا "یہ کیوں؟" فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایک رسولؐ بھیجا ہے جس نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ نہ کریں اور اسی نے ہمیں صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا بھی حکم دیا ہے۔"

گفتگو چل پڑی اور نجاشی نے حقیقت حال دریافت کی تو یہ نڈر بندۂ خدا ہاشمی بلاغت زبان کو اور اس سے زیادہ ایمانی جرات صاف گوئی کو حرکت میں لایا۔ غیر مسلم ابو طالب کے اس نومسلم طالب حق فرزند نے دربار نجاشی میں اپنے حق پرستانہ خطبے کی ایک ایسی گونج پیدا کی جسے اہل بلاغت نے "ابلغ الخطبات" کی سند بخش دی۔ اس نے کہا:

> "اے فرماں روا! ہم لوگ جاہلیت والی قوم تھے۔ بت پرست تھے اور مردار خوار۔ بے حیائی کے مرتکب ہوتے۔ قطع رحم کرتے اور پڑوسی کا کوئی حق نہ پہچانتے تھے۔ طاقت ور کمزور کو کھا جاتا تھا۔ آخر اللہ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا، جس کے نسب، صداقت، امانت اور پاک دامنی سے ہم اچھی طرح واقف تھے۔ اس نے ہمیں اللہ کی

طرف بلایا کہ اس کی توحید کے قائل ہو جائیں۔ اسی کی عبادت کریں۔ اس کے سوا جن پتھروں اور بتوں کی ہمارے اسلاف عبادت کیا کرتے تھے' ان کو ترک کر دیں۔ نیز اس نے ہمیں سچائی' امانت داری' صلہ رحمی' حسن ہمسائیگی کا حکم دیا اور بے حیائی' خوں ریزی' جھوٹی گواہی سے' نیز یتیم کا مال کھانے اور کسی پاک دامن پر تہمت لگانے سے روکا۔ ہمیں اس نے یہ بھی حکم دیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔"

پھر جعفر نے کئی اسلامی احکام بیان کرنے کے بعد کہا:

"پھر ہم نے اس رسول کی تصدیق کی۔ اس پر ایمان لائے اور اس کے احکام کی پیروی اختیار کی۔ مگر ہماری قوم نے ہم پر ظلم شروع کر دیے۔ ہمیں سزائیں دیں۔ ہمیں ہمارے دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی اور ہم پر جفائیں کرتے رہے۔ آخر ہم لوگ آپ کی سرزمین پر آگئے اور دوسروں پر آپ کو ترجیح دی اور آپ کی ہمسائیگی کو اس توقع پر پسند کیا کہ یہاں ہم پر ظلم نہ کیا جائے گا۔" (۵)

جعفرؓ کی اس تقریر سے مجمع کا رنگ بدل گیا۔ نجاشی کو کچھ اور معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے پوچھا: "وہ شخص جو پیغام وحی لایا ہے اس کا کوئی حصہ تمہارے پاس ہے؟" جعفر نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے چند آیات قرآنی تلاوت کیں۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ان پانچ سالوں میں قرآن کریم کے بہت سے حصے نازل ہو چکے تھے لیکن جعفر نے ان سب میں سے ایسی

آیات کا انتخاب کیا جو ان کی موقع شناسی اور بلاغت کے کمال کی دلیل ہے۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ جعفر ایک مسیحی فرماں روا کے سامنے سوال و جواب کر رہے ہیں۔ اس کا ذہن فطری طور پر مسیح و مریم کے ذکر کو پسند کرتا تھا۔ جناب جعفرؓ نے اس کے سامنے سورہ مریم کی ابتدائی آیات تلاوت کیں جو حسن اتفاق سے ماضی قریب ہی میں نازل ہوئی تھیں۔

مسیحی فرماں رواں کا دربار اور جعفر کی زبان دربار اور تلاوت بھی سورہ مریم کی۔ کیا سماں بندھا ہوگا؟ اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ نجاشی اور اس کے پادری اپنی آنکھوں پر قابو نہ پاسکے اور بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ نجاشی کی روح کی گہرائیوں میں جو تاثر پیدا ہوا وہ یہ الفاظ بن کر زبان پر آیا کہ:

"یہ کلام اور وہ کلام جو موسیٰؑ پر اترا تھا' دونوں کے دونوں ایک ہی منبع نور سے نکلی ہوئی شعاعیں ہیں۔"

پھر وفد قریش کے دونوں رئیسوں سے کہا کہ:

"تم چلے جاؤ۔ میں کبھی ان لوگوں (مسلمانوں) کو تمھارے حوالے نہیں کرسکتا۔"

اور پھر مسلمانوں سے بولا:

"تم میری مملکت میں امن کے ساتھ زندگی بسر کرو۔"

پھر تین بار کہا:

"تمھیں کوئی گالی بھی دے گا تو اس پر تاوان لگے گا۔"

دیکھیے وفد قریش کیا امیدیں باندھ کر آیا تھا اور نتیجہ کیا نکلا۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں اسلام حبشے میں اثر انداز نہ ہو۔ لیکن اس کے لیے راستے کو ان کے وفد نے اپنے ہی ہاتھوں سے ہموار کر دیا۔

روایت کی یہ نوعیت تو طبرانی اور بزار کی ہے' لیکن طبرانی ہی کی ایک

دوسری روایت عبداللہ بن مسعود سے اور نیز مسند احمد میں ام سلمہ سے مذکور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور واقعہ بھی ہوا جو دوسرے دن پیش آیا ہوگا۔ یہ ظاہر ہے کہ وفد قریش کو اپنے مقصد میں رسوا کن ناکامی ہوئی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہمت نہ ہاری اور پھر قسمت آزمائی کے لیے دربار نجاشی میں رسائی حاصل کی۔ اس وقت اس وفد نے ایک بڑی نفسیاتی چال چلی۔ نجاشی کو یہ کہہ کر برانگیختہ کرنا چاہا کہ: "حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جو عقیدہ آپ رکھتے ہیں اس کی یہ لوگ مخالفت کرتے ہیں۔" ایک مسیحی کو برانگیختہ کرنے کے لیے اس سے بہتر حربہ اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ بہرحال نجاشی نے دریافت کیا کہ: "تم لوگ جناب عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے متعلق کیا کہتے ہو؟" مسلمانوں نے جواب دیا کہ: "ہم وہی کچھ کہتے ہیں جو اللہ نے کہا ہے۔ یعنی وہ اللہ کا کلمہ اور روح اللہ ہیں جسے اللہ نے مریم عذرا بتول کی طرف القا فرمایا۔ مریم کو کسی بشر نے مس نہیں کیا اور نہ انھیں اس سے پہلے کوئی ولادت ہوئی۔" یہ سن کر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ: "اے پادریو اور راہبو! اس بیان کردہ حقیقت پر تم لوگ جو اضافہ و مبالغہ کرتے ہو' وہ اس تنکے کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا (یعنی مسیح اتنا ہی بھر ہیں جتنا یہ مسلمان بیان کرتے ہیں)۔ پھر نجاشی نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا:

> "مسلمانو! میں تمھیں اور تمھارے لائے ہوئے پیغام محمدیؐ کو خوش آمدید کہتا ہوں' بلکہ اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور یہ وہی ہے جس کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں اور جس کی بشارت حضرت عیسیٰؑ نے دی ہے۔ تم جاؤ اور جہاں چاہو رہو۔ اگر میں حکومت کے جھنجھٹ میں نہ پھنسا ہوتا تو خود حاضر ہو کر اس کی جوتیاں اٹھاتا اور اس کے لیے وضو کا پانی لاتا۔"

اس کے بعد نجاشی نے حکم دیا کہ اس قریشی وفد کے تمام تحائف واپس کر دیے جائیں۔ جناب ام سلمہ کی روایت میں ایک اہم چیز اور بھی ذکر ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ:

> "اس کے بعد ہم لوگ وہاں بہترین ملک میں بہترین پڑوسی کے ساتھ مقیم رہے۔ اس دوران میں نجاشی کا ایک دشمن حبشے پر حملہ آور ہوا۔ اس وقت ہم مسلمانوں نے بھی (نجاشی کی طرف سے) جنگ میں شرکت کی اور یہ جنگ ہمارے لیے سب سے زیادہ اہم جنگ تھی' کیوں کہ ہمیں اس وقت یہ خوف تھا کہ نجاشی تو ہمارے حقوق کو جانتا پہچانتا ہے۔ اس پر کہیں ایسا شخص غالب نہ آجائے جو ہمارے حقوق کو پہچانتا ہی نہ ہو۔"

لمحہ فکریہ

حبشہ کے ان تمام بیان کردہ واقعات میں دو ایک نکتے قابل غور ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جناب جعفرؓ کی اس تقریر میں جو انھوں نے نجاشی کے دربار میں کی تھی' نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے کے حکم کا بھی ذکر ہے (بعض روایات میں روزے کا بھی ذکر ہے) سوال یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت تو ہجرت مدینہ کے بعد ۲ ہجری کے لگ بھگ نازل ہوئی تھی۔ پھر یہ کون سی زکوٰۃ ہے جس کا جعفر طیار ذکر کر رہے ہیں؟ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مکی آیات میں دس بارہ جگہ زکوٰۃ کی ترغیب موجود ہے۔ مثلاً "قدا فلح المومنون .... وھم للزکوۃ فعلون لا وغیرہ۔ حکم تو کسی مکی آیت میں نہیں مگر بڑی زوردار ترغیبات موجود ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کس قسم کی زکوٰۃ تھی جس کا کئی جگہ مکی آیات میں ذکر ہے اور جس کا جناب جعفر اپنی تقریر میں ذکر فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ

یہاں زکوٰۃ کی وہ نوعیت نہ تھی جو مدنی زندگی میں متعین ہوئی۔ مدنی زندگی میں اس کی نوعیت یہ رکھی گئی کہ اتنے سونے میں اتنی زکوٰۃ' اتنی چاندی میں اتنی' اتنے اونٹوں' گایوں اور بکریوں میں اتنی اور اتنی پیداوار میں اتنی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے اور اس میں بھی فلاں فلاں شرطیں ہیں۔ یہ تفصیلات نہ قرآن میں ہیں اور نہ مکی زندگی میں تھیں۔ اس کے باوجود وہ بھی زکوٰۃ ہی تھی اور جو تفصیلات مدنی زندگی میں آنے کے بعد احادیث سے معلوم ہوتی ہیں وہ بھی زکوٰۃ ہی ہے۔ یقینی بات ہے کہ مکی زندگی میں زکوٰۃ کا سسٹم کچھ اور ہوگا اور مدنی زندگی میں اس کا نظام کچھ اور ہوگیا۔ لیکن زکوٰۃ دونوں ہی کو کہا گیا۔ بہرحال انفاق فی سبیل اللہ مکی زندگی میں بھی ضروری تھا اور مدنی زندگی میں بھی۔

نماز کے متعلق بھی یہی بیان کیا جاتا ہے کہ نماز پنجگانہ ہجرت سے ایک سال قبل شب اسرا میں فرض ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سے بارہ سال پہلے تک نماز پنجگانہ نہ تھی۔ غالباً صبح شام کی تھی اور وہ بھی نماز ہی تھی۔

یہاں پھر ہم اسی بات کو دہراتے ہیں کہ نماز و زکوٰۃ وغیرہ اگرچہ دیر میں فرض ہوئی ہوں لیکن پیغمبر کا رخ ابتدا ہی سے صحیح سمت میں ہوتا ہے۔ ہمیں بہت سے احکام ایسے ملتے ہیں جن پر حضورؐ عمل پہلے ہی سے کرتے رہے اور اس کی آسمانی توثیق بعد میں ہوئی۔ حضورؐ نے ہجرت کے بعد مدینے پہنچنے سے پہلے قبا میں پہلا جمعہ ادا فرمایا۔ اس وقت تک جمعہ فرض نہ ہوا تھا لیکن بعد میں وحی الٰہی نے نماز جمعہ پر مہر توثیق ثبت کر دی۔

قتال فی سبیل اللہ کی بحث

دوسرا نکتہ واقعات حبشہ میں یہ ہے کہ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ایک عیسائی کی حمایت میں دشمن حملہ آور سے جنگ کی۔ لیکن جہاں تک ہم غور کرسکتے ہیں' وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ جنگی شرکت اسی وقت

ہوئی ہے جب نجاشی تصدیق نبوت کر چکا تھا۔ اس کی تصدیق ہی کی وجہ سے حضورؐ نے غزوہ خیبر کے موقعے پر وفات نجاشی کی خبر سن کر اس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی تھی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس نجاشی نے قریشیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حمایت کی اور امن سے رہنے کی اجازت دی وہ اور ہے' اور جو اسلام لایا اور جس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئی وہ دوسرا ہے جو پہلے کا جانشین ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ یہی درست ہو لیکن سردست اس قسم کی تفاصیل ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ اگر پہلے نجاشی کی طرف سے مسلمانوں نے جنگ کی ہو یا اس کا ارادہ کیا ہو تو یہ احسان مندی اور شکرگزاری کا ایک تقاضا ہے اور اس وقت جب کہ قتال کا کوئی تفصیلی حکم نازل نہ ہوا تھا' اہل اسلام کا جنگ کرنا ایک ایسا اجتہادی فعل تھا جو تقاضائے حکمت کے مطابق تھا۔ یہ جنگ غیر اسلامی عیسائیت کی حمایت کی نیت سے نہ تھی بلکہ یہ حمایت تھی "کافر" کی "اکفر" کے مقابلے میں۔ اور کافر بھی وہ جو نیک دل ہے' شریف ہے' محسن ہے' اسلام کی تعلیمات سے اور اہل اسلام کے کردار سے متاثر ہے اور مکی کافروں کے مقابلے میں اہل اسلام کے احترام و حمایت کا اعلان کرتا ہے۔ اس جنگ یا ارادہ جنگ کو کسی طرح بھی "قتال فی سبیل الطاغوت" کا درجہ نہیں دیا جاسکتا' اور نہ "قتال فی سبیل الکفر" کے جواز کے لیے اسے سند بنایا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس وقت تک قتال کے متعلق کوئی حکم ہی نازل نہیں ہوا تھا اور نہ فی سبیل اللہ اور فی سبیل الطاغوت کے فرق کو ممتاز کرنے والے مفصل احکام بتائے گئے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ قتال درحقیقت اپنی امت مسلمہ کے تحفظ کی نیت سے تھا جسے دوسرے لفظوں میں "قتال فی سبیل المسلمین" کہا جاسکتا ہے۔ یہ مسلمانان حبشہ کا ایک اجتہاد تھا اور صحیح اجتہاد تھا۔ حضورؐ کے فیض یافتوں میں ابتدا ہی سے اس صلاحیت اجتہاد کا پایا جانا کون سی تعجب کی بات

ہے۔

بصیرت نبوی

یہاں یہ چیز بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ حضورؐ کبھی حبشے تشریف نہیں لے گئے۔ دوسرے اہل مکہ آتے جاتے رہتے تھے' لیکن حبشے کو ہجرت کے لیے انتخاب کرنے میں حضورؐ کی بصیرت و فراست کتنی صحیح ثابت ہوئی اور قریش کا اندازہ کتنا غلط نکلا۔ حضورؐ صرف صاحب وحی ہی نہ تھے' عقل و بصیرت بھی کمال درجے کی رکھتے تھے' اور زندگی کے ہر مرحلے پر اس کی شہادت ملتی ہے۔ اور بات صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ حضورؐ کا اصلی کمال یہ تھا کہ اپنی امت میں بھی وہی عقل و بصیرت اور وہی فہم و فراست پیدا کر دی جو انھیں امامت اقوام کا اہل بنا دے۔ مسلمانان حبشہ کا جنگی اجتہاد بھی اسی تربیت نبوی کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا۔ نری کورانہ تقلید' نبوی تعلیم کے سراسر منافی ہے۔ خدا بھی بار بار انسانوں کی عقل و بصیرت کو دعوت دیتا ہے اور اپنے احکام کی ایسی پیروی چاہتا ہے جو سمجھ بوجھ اور عقل و بصیرت کی بنیاد پر ہو۔ وہ عباد الرحمٰن کا انداز و وصف یوں بیان فرماتا ہے کہ:

والذین اذا ذکروا بایت ربھم لم یخروا علیھا صما و عمیانا ○
(الفرقان : ۷۳)

رحمٰن کے بندے وہ لوگ ہیں کہ جب انھیں آیات ربانی یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے (بلکہ عقل و بصیرت سے اس کی حکمت کو بھی سمجھتے ہیں۔)

حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات جب کورانہ تقلید اور نیچے اتر کر شخصیت پرستی تک پہنچ جائے اور اپنی عقل و بصیرت کو سوخت کر دے تو انسان میں شرک کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ جزئیات میں بھی اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند سمجھنے لگتا ہے۔ یہی وہ کورانہ تقلید ہے جس کے متعلق مولانا

رومی نے کہا ہے کہ:

چند صد لعنت بریں تقلید باد

تقلید کا ایک ضروری پہلو

لیکن تقلید کا یہ پہلو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ ہر کس و ناکس اجتہاد کا اہل نہیں ہوسکتا۔ ہر ایک کے لیے ابتدائی مراحل میں تقلید ضروری ہے۔ عقلی ناپختگی کی حالت میں تقلید ہی تنہا سہارا ہوتی ہے۔ لیکن تقلید مقصود نہیں ہوتی بلکہ اسی تقلید کی راہ سے بتدریج اسے اجتہاد کے مقام پر پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ دنیا کی بے شمار اقدار ایسی ہیں جو اپنی متضاد قدروں کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ جنگ بجائے خود بدامنی ہے لیکن اسی ذریعے سے امن کا قیام عمل میں آتا ہے۔ آپریشن موجب صد آلام ہے لیکن آرام اسی کے وسیلے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی صورت اجتہاد کی بھی ہے۔ یہ بھی تقلیدی تربیت ہی کے واسطے سے پیدا کیا جاتا ہے۔ مقصد مقام اجتہاد کا حصول ہے اور تقلید صرف ایک گزرگاہ ہے، مقصود نہیں۔ ایک خام عقل بچے کے لیے والدین یا استاد کی ہر ہر مرحلے پر تقلید ضروری ہے، لیکن یہ کلی تقلید ہوتی ہی اس لیے ہے کہ تدریجاً" وہ اپنی عقلی ترقی کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی پیدا کرتا جائے اور تقلید سے آزاد ہوتا چلا جائے۔ یہاں تک کہ وہ چند اصول کا پابند رہ کر جزئیات میں خودمختار "مجتہد" ہو جائے اور اپنے مربیوں کی تقلیدی پابندیوں کا محتاج نہ رہے۔ دوسری اقدار کی طرح یہ عمومی اختیار بھی ایک ایسی قدر ہے جو اپنی متناقض قدر ——— جبر ——— سے شروع ہوتی ہے اور بتدریج اختیار پر آکر ختم ہوئی ہے۔ تقلید و اجتہاد بھی اس سے کچھ مختلف چیز نہیں۔

ہمارا موضوع "سیرت رسولؐ میں اقدار کی محافظت" ہے اس لیے تقلید و اجتہاد پر تفصیلی بحث ہمارے موضوع میں داخل نہیں لیکن نبوی سیرت

میں چوں کہ متعدد مراحل پر یہ چیز سامنے آئے گی اس لیے یہاں ایک بات اور بھی کہنے کی اجازت چاہتے ہیں' اور وہ یہ ہے کہ قرآن میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے۔ احادیث میں بھی اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ بلکہ حدیث معاذ تو اس کی سراسر نفی کرتی ہے۔ وہ مختصراً" یوں ہے کہ جب حضورؐ نے ان سے یہ سوال کیا کہ اگر تمھیں کوئی مسئلہ کتاب اور سنت دونوں میں نہ ملے تو اسے کس طرح حل کرو گے؟ جناب معاذ بن جبل نے جواب دیا کہ: "اجتہد رای ولا آلو یعنی "اس وقت میں (کتاب و سنت کی اصولی روشنی میں) اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوتاہی نہ کروں گا۔" اس جواب پر حضورؐ نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ (رواہ ابوداؤد و الترمذی عن معاذ)

اب سوال صرف یہ ہے کہ جب خدا نے اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کیا اور رسولؐ نے اس دروازے کو (اجتہاد کے اہل کے لیے) کھول دیا تو یہ اصول کب' کیسے' کیوں اور کہاں سے بن گیا کہ اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا اور اب ہر معاملے میں تقلید شخصی یا فرقی ہی ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیرت رسولؐ نے سب سے بڑی قدر یہی قائم فرمائی ہے کہ انسانی عقل و بصیرت کو بیدار کیا ہے اور اسے کورانہ تقلید کی تاریکیوں سے نکالا ہے۔ اور اسی کے تقاضے کے مطابق معاشرۂ انسانی کو آمریت کے جال سے نکال کر ایسی جمہوریت کی راہ پر ڈال دیا ہے جہاں کسی فرد کی حریت ضمیر کو کچلا نہیں جاتا۔ آگے چل کر آپ متعدد مواقع پر دیکھیں گے کہ حضورؐ نے حریت ضمیر کا کتنا احترام فرمایا ہے اور کس طرح اپنی رائے پر دوسروں کے مشورے کو ترجیح دی ہے۔ یہی تو وہ اقدار ہیں جن سے دنیا کو سب سے پہلے حضورؐ نے روشناس کرایا ہے اور آج صدیوں کے بعد دنیا کی بیدار قومیں اسی کو قبول کرتی جا رہی ہیں' اور ہماری قوم ابھی تک سیاسی اعتبار سے ملوکانہ آمریت

اور مذہبی لحاظ سے شخصی تقلید کی جکڑ بندیوں میں گرفتار ہے اور اسی کو عین اسلام سمجھے بیٹھی ہے۔

ترہیب کے بعد ترغیب کا نیا انداز

زور دار حق کو ہمیشہ پہلے جبر و اکراہ سے' تخویف اور دھمکیوں سے یا ظلم و ستم ہی سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب اس تدبیر سے کام نہیں چلتا تو اسے ہر طرح کا لالچ دلا کر تالیف قلب کے ذریعے خریدنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بہادر اور ضدی' ظلم واکرہ سے دبنے کی بجائے عموماً اور زیادہ پختہ و مستقل مزاج ہو جاتا ہے۔ لیکن انتہائی نازک موقع امتحان وہ ہوتا ہے جب اسے تالیف قلب سے خریدنے کی کوشش کی جائے۔ اس وقت بڑے بڑے استقامت پسندوں کے قدم لغزش کھا جاتے ہیں۔ یہ کردار و سیرت کے لیے شدید ترین وقت امتحان ہوتا ہے۔ دنیا کے بے شمار افراد سختیاں جھیلتے ہی اس لیے ہیں کہ ان سے مطلوبہ مالی فوائد حاصل ہو جائیں۔ قریش مکہ نے جب یہ اچھی طرح تجربہ کر لیا کہ ان کی سخت گیریاں اور روح فرسا سزائیں ایک متنفس کو بھی اسلام سے برگشتہ نہ کر سکیں تو انھوں نے اپنی تدبیر اور طرز عمل کا رخ بدل دیا اور اب سختی کی بجائے ترغیبات سے خریدنے کی سکیم بنائی۔ مکے کا بڑا رئیس اور سخن ساز لیڈر عتبہ باہمی مشوروں کے بعد خدمت نبویؐ میں حاضر ہوا اور ایک ڈپلومیٹ کی طرح ہمدردانہ لہجے میں اپنی خدمات یوں پیش کیں۔ اس نے کہا:

> "اے ابن عم! اگر اس نئے دین کی اشاعت سے تمھارا مقصد مال و دولت جمع کرنا ہے تو ہم تمھیں مالا مال کر دیتے ہیں۔ اگر عورتوں کی خواہش ہے تو حسین ترین عورتیں حاضر کر سکتے ہیں' اور اگر قیادت و سرداری مطلوب ہے تو ہم سب تمھیں اپنا سب سے بڑا لیڈر تسلیم کرنے پر راضی

ہیں، مگر یہ تبلیغ ترک کر دو، اور اگر یہ کوئی خلل دماغی ہے تو
ہم اس کا علاج بھی کرنے کو تیار ہیں۔"

عتبہ کی اس "ہمدردانہ تقریر" سے زیادہ اور کوئی ایسی چیز شاید ہی مل سکے جو کفر اور اسلام کے اندر فکر اور زاویہ ہائے نگاہ کے فرق کو واضح کر سکے۔ کفر ایک ایسی زندگی کا نام ہے جو تمام انسانی جدوجہد کا مآل انہی مادی فوائد کو ٹھہراتی ہے اور اس کے نزدیک انسانی کامیابیاں اس حیوانی سطح تک پہنچنے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کا تصور زر، زمین، زن اور اقتدار سے آگے نہیں بڑھتا۔ بلند انسانی اقدار کو اپنانا بلکہ اسے سمجھنا بھی کفر کے حیطہ فکر سے باہر ہے۔ اہل کفر کی نگاہ میں حضورؐ کی ساری جدوجہد اور مسلمانوں کی تمام قربانیوں کا آخری مقصد یہی حیوانی سطح کے مطلوبات تھے۔ ان کا یہ گمان یا یہ غلط فہمی اس لیے تھی کہ اب تک ان کی زندگی کا آخری نصب العین یہی حیوانی و مادی مفادات تھے۔ اس لیے عتبہ نے ان کی نمائندگی کرتے ہوئے ان ہی مفادات کو حضورؐ کے سامنے پیش کیا۔ ان کی سمجھ میں ابھی تک یہ نکتہ نہ آسکا تھا کہ اسلامی آئیڈیالوجی انہی چکروں سے نکال کر انسان کو بلند نظری اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے روشناس کرانے کے لیے تھی اور زندگی کے متعلق نیا زاویہ نگاہ عطا کر کے روحانی قدروں سے وابستہ کرنا اس کا اصل مقصد تھا۔

عتبہ نے جو "خطبہ" دیا اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا:

"میرے متعلق تمھاری جو خوش فہمیاں ہیں وہ بے سروپا اور
غلط نگہی پر مبنی ہیں۔ میں خدا کا پیغامبر ہوں۔ اصل حقیقت
تمھیں ان آیات قرآنی سے معلوم ہو سکے گی۔"

اس کے بعد حضورؐ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں:

حم ۝ تنزیل من الرحمن الرحیم ۝ کتب فصلت
ایتہ قرانا عربیا لقوم یعلمون لا بشیرا و نذیرا

(حم السجدہ: ۱ تا ۴)

حم۔ یہ رحمان و رحیم کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات مفصل ہیں۔ عربی قرآن عقل سے کام لینے والوں کے لیے۔ یہ بشیر بھی ہے اور نذیر بھی۔

عتبہ یہ کلام خدا رسول خدا کی زبان سے سن کر مبہوت و ششدر سا ہوگیا اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر واپس چلا آیا۔ قریش کا مجمع اپنے اس نمائندے کی زبان سے سرگزشت سننے کے لیے بے چینی سے منتظر تھا۔ ایسے اہم اور فیصلہ کن مواقع پر باہمی گفتگو' سوال جواب اور مفاہمانہ فیصلے کی تفصیلات سننے کا اشتیاق جس شدت کے ساتھ ہوا کرتا ہے اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ اب تک تو صرف مظالم کے حربے استعمال ہوتے رہے تھے لیکن آج ایسا جدید تجربہ کیا جا رہا تھا جو پہلے نہیں کیا گیا تھا۔ ایک ایسا حربہ آزمایا جا رہا تھا جو اس سے قبل نہیں آزمایا گیا تھا۔ تخویف اور ترہیب کے سارے تجربے ناکام ہو چکے تھے اور آج آزمائش و امتحان نے اپنا رخ بدل کر ایک نئے انوکھے موڑ پر اپنا قدم رکھا تھا۔ کسی کو کامیابی کا یقین ہو گا اور کوئی ناکامی پر پہلے ہی یقین کر چکا ہو گا اور کتنے ایسے بھی ہوں گے جو بیم و رجا کی درمیانی کیفیت میں اٹکے ہوئے ہوں گے۔ ہر ایک اپنے اپنے قیاسات کے گھوڑے دوڑا رہے ہوں گے اس لیے کہ آج کفر و اسلام کی زور آزمائی ایک نیا پیرہن پہن کر انوکھے انداز سے آئی ہے۔ عتبہ حضورؐ کے پاس سے روانہ ہوا۔ مجمع قریش نے دور ہی سے مضطرب نظروں اور ہمہ تن اشتیاق و انتظار کی نگاہوں سے اسے آتا ہوا دیکھا۔ عربوں میں بہتوں کو یہ ملکہ حاصل تھا کہ وہ دلوں کی تحریر کو پیشانی کی لکیروں میں پڑھ لیتے تھے۔ آواز سے اور چشم و آبرو کی گردش سے نیتوں کو تاڑ جاتے تھے۔ عتبہ کو دور ہی سے دیکھ کر ایک من چلے سے نہ رہا گیا۔ اس نے کہہ ہی دیا کہ: "عتبہ جو چہرہ لے کر گیا تھا' اس سے مختلف چہرہ لے کر واپس آرہا ہے۔" سننے

والوں کا ماتھا ٹھنک گیا۔ اب ان سبھوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ عتبہ کا چہرہ جاتے وقت اور تھا اور اب اس کا نقشہ و رنگ بدلا ہوا ہے۔ مگر تفصیلات سننے کا اشتیاق سب کو بے چین کیے ہوئے تھا۔ عتبہ سے پوچھا گیا کہ: کہو کیا گزری؟ جواب میں عتبہ نے جو کچھ کہا اس سے قیافہ شناس کا اندازہ صحیح ثابت ہوا جس نے عتبہ کے بدلے ہوئے چہرے کو سب سے پہلے بھانپ لیا تھا۔ عتبہ نے قریشیوں کے سوال کے جواب میں کہا:

"اے ابنائے قریش! ابھی میں نے محمدؐ کی زبان سے جو کلام سنا ہے، وہ نہ کہانت ہے نہ جادو اور نہ شعر۔ میری رائے یہ ہے کہ محمدؐ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ قریش کا یہ سارا مجمع چلا اٹھا کہ: "یہ لو عتبہ پر بھی محمدؐ کا جادو چل گیا۔""

ذرا اس شہادت پر غور کیجئے، یہ وہ عتبہ ہے جس کی رگ رگ میں عربی خون کی طرح عربی ذہانت، عربی ثقافت، عربی بلاغت رچی ہوئی ہے۔ اس نے جادو منتر بھی سنے ہیں۔ الفاظ کہانت سے بھی آشنا ہے اور شعر و سخن تو اس کے گھر کی لونڈی ہے۔ نثر، نظم، کہاوت، ضرب الامثال، تعریض و طنز، مدح و ہجو، عشق و تشبیب، غرض جتنی بھی اقسام سخن اور اصناف کلام ہو سکتی ہیں، ان سب سے اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ قرآن کی چند آیات سن کر جو فیصلہ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ: "یہ کلام جادو منتر نہیں، کہانت نہیں، شاعری نہیں۔ یہ تو کوئی اور ہی چیز ہے۔" یہ کون کہہ رہا ہے؟ وہ جہاں دیدہ زمانہ شناس و زمانہ ساز، رئیس و ممتاز، جو پورے قریش کا نمائندہ بن کر اپنی ایمان شکن ترغیبات و تحریصات کی پیش کش لے کر تبلیغ دین کی کمر توڑنے کے غیر متزلزل عزم کے ساتھ گیا تھا۔ اور اب واپس آکر سارے قریش کے طعنے سننا گوارا کر لیتا ہے مگر جو اثر لے کر واپس آتا ہے اسے برملا ظاہر کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا۔

متحدہ الٹی میٹم

آج قریش کے ایک ایک فرد کو معلوم ہو گیا کہ ایک مومن کی نگاہ میں ایمانی اقدار کی جو وقعت ہے اس کے مقابلے میں ترہیب و تعذیب کی طرح کی کوئی تحریص و ترغیب پر کاہ کے برابر بھی نہیں۔ مومن کا ایمان نہ کسی سختی سے ختم کیا جاسکتا ہے نہ کسی قیمت کے عوض خریدا جاسکتا ہے۔ دنیا میں یہی دو گرم و سرد تدبیریں کارگر ہوا کرتی ہیں لیکن یہاں دونوں بے اثر ثابت ہوئیں۔ اس ناکامی نے قریش کی آتش غیظ و غضب کو اور بھڑکا دیا۔ اب انھوں نے اس دین کو ختم کرنے کی ایک اور تدبیر سوچی۔ اب ان کے سارے یا اکثر قبائل نے مل کر ابو طالب کو ایک متحدہ الٹی میٹم دے دیا اور غیر مبہم الفاظ میں کہہ دیا:

> "اے ابو طالب تمھارا برادر زادہ ہمارے معبودوں کو علانیہ برا بھلا کہتا ہے۔ ہمارے آباو اجداد کی بھی تنقیص کرتا ہے۔ اب ہمارا پیانہ صبر چھلک چکا ہے۔ اب صرف دو صورتیں ہیں جن میں ایک کو قبول کر لو۔ یا تو محمدؐ کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم اس سے خود سمجھ لیں گے یا جبراً" اسے اس نئے دین کی اشاعت سے روک دو۔"

ساری قوم کا ناراض ہو جانا کوئی ایسی معمولی بات نہ تھی جس کی پروا نہ کی جاتی۔ معاملہ اب انتہائی نزاکت اختیار کر چکا تھا۔ ابو طالب نے حضورؐ کو ساری قوم کی ناراضی کا واسطہ دیا اور اس کے نتائج سے ڈراتے ہوئے ایک بار پھر فرمائش کی کہ ہمارے معبودوں کی تنقیص نہ کرو۔

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ اس سے پہلے بھی ایک بار ایک وفد ابوطالب کے پاس آکر ایسی ہی فرمائش کر چکا تھا۔ اس وقت حضورؐ نے صرف اسی قدر جواب دیا تھا کہ: "جس فرض کے لیے میں خدا کی طرف سے مامور ہوں اسے ترک نہیں کرسکتا۔" لیکن اب کے صورت حال ذرا مختلف تھی۔ ایک تو یہ بات تھی کہ اس بار تبلیغی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے تصویر کا دوسرا

رخ بھی آزمایا جاچکا تھا اور ان سبھوں نے دیکھ لیا تھا کہ انتہائی مظالم کی طرح تحریص و ترغیب بھی ویسی ہی ناکام ثابت ہوئی تھی۔ ظاہر ہے اس آخری تدبیر کی ناکامی نے قریش کے آتش غیظ و غضب کو اور زیادہ بھڑکا دیا ہوگا اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے پہلے سے زیادہ زور دار انداز سے اب کے متحدہ الٹی میٹم دے دیا۔ اس وقت قوم پہلے سے زیادہ مشتعل تھی' اور ان کے اشتعال نے ابوطالب کو پہلے سے زیادہ مجبور کیا ہوگا اور ابو طالب نے بھی حضورؐ پر اب کی مرتبہ پہلے سے زیادہ دباؤ ڈالا ہوگا۔ جب ہی تو قوم نے ایک ایسا مطالبہ پیش کر دیا جو اس سے پہلے نہ کیا تھا۔ صرف دو ہی متبادل مطالبے تھے: یا حوالگی یا زبان بندی۔ پہلی چیز ابو طالب کی فطری محبت و شفقت کے بھی خلاف تھی اور عربی غیرت اور روایتی وقار کے بھی۔ اس لیے انھوں نے دوسرے ہی مطالبے کی تکمیل پر اپنا زور صرف کیا کیوں کہ ان کے نزدیک اسلام کی اشاعت روک دینے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اس سے ان کے موجودہ مشرب و مذہب کی بھی تائید ہوتی تھی اور ساری قوم کی خفگی بھی دور ہوسکتی تھی۔ اسی لیے انھوں نے دو ہی باتوں کا ذکر کیا۔ ایک ساری کی ساری قوم کی ناراضی اور دوسرے اس ناراضی کی اصلی بنیاد یعنی "معبودوں" کی تنقیص۔

یہ فرمائش آج دوسری بار ایک ایسے چچا کی زبان سے ہو رہی ہے جو آٹھ سال کی عمر سے اب تک اس یتیم کو اپنے فرزندوں سے زیادہ محبت و دلداری کے ساتھ رکھتا رہا ہے۔ اس احسان مندی کا بوجھ اس خفگی سے کہیں زیادہ ہے جس کا اظہار ساری قوم کر رہی ہے۔ اگر قوم کا ایک فرد بھی ناراض نہ ہوتا جب بھی اس محسن چچا کی کوئی بات ٹالی نہ جاسکتی تھی۔ اگر دنیا میں کوئی آخری بزرگانہ سہارا ہے تو یہی ابو طالب ہے۔ یہ اپنے برادرزادے سے اپنے تمام عمر کے محسنانہ برتاؤ کے سہارے قوم کی خفگی کا خوف دلا کر صرف ایک فرمائش یا اپیل کرتا ہے کہ "ہمارے بتوں کی تنقیص ترک کردو۔"

اس فرمائش کے تیور اور الٹی میٹم کے انداز بتا رہے ہیں کہ اب کی بار پہلے سے کہیں زیادہ سیاسی اور جذباتی دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ مگر آج حضورؐ نے ابو طالب اور ان کی قوم کو جو جواب دیا ہے اسے تاریخ اپنے سینے میں ہمیشہ ابھرے ہوئے زریں حروف کی شکل میں محفوظ رکھے گی۔ اس جواب کا ایک ایک حرف مقام نبوت کی رفعتوں کو آشکار کر رہا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

> "سنو چچا جان! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں جب بھی اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ اس راہ میں اگر میری متاع جان بھی جاتی ہے تو احکام خداوندی میں کوئی ردوبدل نہیں کروں گا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ابو طالب کو اس سے پہلے کی گفتگو سے حضورؐ کی عزیمت و استقامت کا اور مقام نبوت کی بے پناہ قوتوں کا پورا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ تاہم اس جواب سے بھی خاصے متاثر ہوئے تھے۔ لیکن آج کے پرجلال جواب نے حضورؐ کے غیر متزلزل عزم کے متعلق ان کے آخری شکوک یا توقعات کی رگوں کو بھی منقطع کر دیا۔

یہ بھی ایک بڑی اعلیٰ قدر ہے کہ جس نوعیت و وزن کا سوال ہو اسی نوعیت و وزن کا جواب بھی دیا جائے۔ پہلے ابو طالب کے پاس صرف ایک وفد آیا تھا اور اس کی فرمائش پر حضورؐ نے اتنے ہی وزن کے جواب پر اکتفا فرمایا۔ مگر آج ایک زوردار' خطرناک اور متحدہ چیلنج تھا۔ یہ الٹی میٹم جتنا زوردار تھا اتنا ہی پرجلال جواب بارگاہ نبوت سے ملا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ابو طالب جتنا پہلے متاثر ہوئے اس سے زیادہ آج اثر پذیر ہوئے۔ انھوں نے حضورؐ کا دوٹوک جواب سن کر کہا:

> "جان عم! تم جو چاہو کرو۔ میں تمھاری حمایت سے دست

کش نہ ہوں گا۔"

حمایت ابو طالب کی نوعیت

یہ قریشی قبائل ابو طالب کو اپنا ہم مذہب سمجھ کر یہ الٹی میٹم لائے تھے' انھیں توقع ہوگی کہ ابو طالب ان کے دو مطالبوں میں سے ایک کو مان لیں گے۔ لیکن جب انھوں نے یہ دیکھا کہ ابو طالب بھی حضورؐ کی حمایت میں ہیں تو انھیں رائج الوقت عربی ذہنیت کے مطابق یہی گمان ہوا ہوگا کہ باوجود اعلان اسلام نہ کرنے کے ابو طالب کی حمایت کی نوعیت وہی ہے جو تمام عربوں میں ہوتی ہے جسے قبیلوی عصبیت کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صحیح و غلط یا حق و باطل سے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ بس یہ جذبہ ہوتا ہے کہ یہ آدمی ہمارے قبیلے کا ہے لہٰذا اس کی حمایت ضرور کرنی ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اسے حمیہ الجاهلیہ (کافرانہ حمایت) کہتے ہیں۔ حضورؐ کی اور دوسرے مسلمانوں کی ایسی حمایت اور بھی بہتیرے اشخاص نے کی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس نوعیت کی کوئی حمایت اگر کوئی شخص کرے خواہ وہ قبیلوی برادری کے اندر ہو یا اس سے باہر تو یہ ایک انسانی شرافت کہی جائے گی اور اس کے احسان کا بدلہ زیادہ بہتر احسان سے دیا جائے گا۔ اس دنیا میں اس کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ بہت سی دنیوی رعایتیں دی جائیں گی۔ یہ سب کچھ ہوگا لیکن اس کا شمار نہ تو حزب اللہ میں ہوگا نہ جماعت مومنین میں۔ لہٰذا آخرت میں اس کی کوئی قیمت یا وزن نہ ہوگا۔ فلا نقیم لهم یوم القیمه وزنا ۝ (الکھف: ۱۰۵)

ابو طالب عرب کے اس قبیلوی جذبہ و ذہنیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ لہٰذا اپنے ہاشمی وقار کو قائم رکھنے کے لیے تمام ابنائے ہاشم کو محمدؐ بن عبداللہ (نہ کہ محمد رسول اللہ) کی حمایت کے لیے ایک مرکز پر جمع کرلیا۔ صرف ابو لہب الگ رہا۔ باقی سارے کافر و مسلم ہاشمیوں کو سمیٹ لیا۔ اس سے ایک

وقتی فائدہ تو حاصل ہو گیا لیکن دینی نقطہ نگاہ سے ایک بڑا نقصان بھی ہوا۔ اب یہ سارا دینی جھگڑا ایک قبیلوی اور "کمونل مسئلہ" بن گیا۔ منکرین کو بھی یہ شبہ ہونے لگا کہ یہ جنگ صنم پرستی اور خدا پرستی کی یا کفر و اسلام کی نہیں بلکہ خاکم بہ دہن یہ سارا کھیل اقتدار ہاشمیت کی بقا کے لیے کھیلا جا رہا ہے' ورنہ سارے مومن و کافر ہاشمی محمد بن عبداللہ کی حمایت کیوں کرتے؟ بہرحال ابوطالب کی یہ حمایت ایمان و عمل اور نجات کی کسوٹی پر پوری اترے یا نہ اترے لیکن اس دنیا میں مستحق تشکر و امتنان ضرور ہے۔

اس مرحلے پر حضورؐ جس طرح بعد میں دوسرے غیر ہاشمی منکروں کی حمایت پر خاموش رہے (جس کا ذکر آگے آئے گا) اس موقعے پر بھی خاموشی اختیار فرمائی۔ اس خاموشی سے غیر مسلموں کی انسانی حمایت قبول کرنے کا پہلو تو نکلتا ہے لیکن حمیہ الجاھلیہ کو درست سمجھنے کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔

ایمان حمزہؓ

ان ہی تائید ہاشمیت کرنے والے غیر مسلموں میں حضورؐ کے چچا حمزہؓ بھی تھے۔ یہ اب تک ایمان نہ لائے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ابوجہل کا حضورؐ سے سامنا ہو گیا۔ ابوجہل عداوت رسولؐ میں سب سے پیش پیش تھا اور اسلام قبول کرنے والوں پر جتنے سخت سے سخت مظالم ہوئے ان میں ابوجہل ہی سب سے بڑا ہیرو تھا۔ اس کا خون تو ہر وقت ہی کھولتا رہتا تھا' آج جو حضورؐ کو دیکھا تو آپے سے باہر ہو گیا۔ حضورؐ کو پہلے تو بہت برا بھلا کہا۔ حضورؐ کی خاموشی سے اس کا خون اور کھولنے لگا تو اس نے ایک پتھر اٹھا کر زور سے حضورؐ کی طرف پھینکا۔ یہ پتھر حضورؐ کے سر مبارک پر لگا اور سر کھل گیا اور خون بہنے لگا۔ اس کی اطلاع حمزہؓ کو پہنچی تو ان کا جوش ہاشمیت ابھر آیا۔ انھیں اس وقت تک نبوت و رسالت کی تائید و حمایت سے کوئی بحث نہ تھی۔ ان کے سامنے ہاشمیت

کے وقار کا سوال تھا۔ ہاتھ میں ایک کمان لیے ہوئے باہر آئے اور ابوجہل کے سر پر اس زور کی ضرب لگائی کہ اس کی کمر کمان ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد حمزہؓ حضورؐ کے پاس آئے اور اپنا یہ قبیلوی انتقامی کارنامہ بیان کیا۔ حمزہؓ اپنی حمیت جاہلیہ کی کارگزاری بیان کر کے منتظر ہوں گے کہ حضورؐ اس حرکت کی تائید و توصیف میں کچھ حوصلہ افزا کلمات فرمائیں گے۔ مگر حکیم امت اور معلم حکمت کی انگلیاں اس وقت حمزہؓ کی نفسیاتی نبض پر تھیں۔ اس وقت حضورؐ کو ایک زریں موقع ہاتھ آگیا اور دو لفظوں میں حمیت جاہلیہ اور حمیت اسلام کا فرق نمایاں کر دیا۔ فرمایا:

"چچا جان! میں اس انتقامی کارروائی سے خوش نہیں ہوا۔
خوش تو جب ہوتا کہ تم اسلام لے آتے۔"

حمزہؓ اس وقت تک تو ابو طالب کی اس پارٹی کے رکن تھے جس کی بنیاد ہاشمیت کی قبیلوی تائید پر تھی' مگر اب کیا ہو؟ حضورؐ نے دو جملوں میں حمیت دینی اور حمیت قبیلوی کا فرق حمزہؓ کے دل میں اتار دیا۔ حمزہؓ نے ابھی ابوجہل کے سر پر آہنی کمان ماری تھی اور حضورؐ نے حمزہؓ کے دل پر نگاہ نبوت کا تیر چلا دیا۔ وہ کمان بے اثر رہی اور یہ تیر ٹھیک نشانے پر پیوست ہو گیا۔ حمزہؓ اسی وقت ایمان لے آئے۔ اب ان کا زاویہ نظر بدل گیا اور حمایت ہاشمیت تائید حق میں تبدیل ہو گئی۔

فرزند خطاب کا ایمان

جناب حمزہؓ ایک بااثر شخصیت کے مالک تھے' ورنہ ابوجہل کا جواب دینے کی ہمت کب کرتے؟ ان کی شجاعت کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ ہزار بہادروں پر بھاری سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے ان کے قبول اسلام نے کفار قریش میں ایک کھلبلی پیدا کر دی۔ ہاشمی عصبیت کی بنیاد پر تو حمزہؓ پہلے بھی حضورؐ کی

حمایت کر رہے تھے لیکن اس سے اہل کفر میں کوئی قابل توجہ بے چینی نہ تھی' اس لیے کہ اس قسم کی قبیلوی حمیت جاہلیہ سے وہ بہت پہلے سے آشنا تھے۔ مگر اب اسلام حمزہؓ نے انھیں جو چوکنا کر دیا اس کی ایک اور ہی وجہ تھی۔ آج انھیں نبوت کی قوتوں کا یہ غیر معمولی تجربہ ہوا کہ ایک حقیقی چچا بھی جو سن میں بہت بڑا ہے' اپنے برادر زادے کی نبوت کے آگے جھک گیا۔ آج کے اس غیر متوقع واقعے نے اہل کفر کو حیرت و استعجاب کا مجسمہ ہی بنا کر نہ رکھ دیا بلکہ انھیں یہ خطرہ بھی محسوس ہونے لگا کہ دوسرے غیر مسلم ہاشمی بھی اپنی قبیلوی حمایت سے بالاتر ہو کر کہیں دینی حمایت نہ شروع کر دیں۔ قبیلوی عصبیت و حمایت ان کی نگاہوں میں کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی لیکن دینی حمایت و تائید کا اندازہ انھیں ایک ایک مسلمان کی بے پناہ استقامت سے بارہا ہو چکا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ دینی حمایت کی قوتوں کے مقابلے میں قبیلوی حمایت کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ قبیلوی حمایت کا جذبہ ہر خاندان میں موجود ہے۔ لیکن دینی حمایت کی غیر متزلزل قوتوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔ ان ہی وجوہ سے اسلام حمزہؓ کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور سارے معاندین آگ بگولا ہو گئے۔ فوراً ہی باہمی مشورے ہونے لگے اور ان کے بڑے لیڈر ابوجہل نے ایک زور دار تقریر کرتے ہوئے ان کی غیرت پر تازیانے لگائے اور ترغیب کا ایک انوکھا انداز اختیار کیا۔ اس نے کہا:

> "تف ہے تم پر۔ ایک شخص برملا تمھارے معبودوں کی تنقیص کرے اور تم اس کا کوئی علاج نہ کرسکو۔ اب ایک آخری بات اور آخری علاج سن لو۔ جو شخص محمدؐ کا سر کاٹ کر لائے گا' اسے میں اپنے پاس سے ایک ہزار اوقیہ چاندی اور سو اونٹ انعام میں دوں گا۔"

اس مجمع میں خطاب کا فرزند عمر بھی موجود تھا۔ ابوجہل کا غیرت افزا

خطاب سن کر ابن خطاب اٹھا۔ اس کے سوا اس کام کی جرات بھی کون کر سکتا تھا؟ خطاب کا یہ آتش اندر لعل فرزند بولا: "گھبراؤ مت' میں ابھی محمدؐ کا سارا قصہ ہی پاک کیے دیتا ہوں۔" ابن خطاب اس مجمع سے روانہ ہو کر گھر پہنچا۔ اپنی برہنہ شمشیر نکالی اور چل پڑا۔

آج تاریخ کائنات کی ایک ایسی دلچسپ اور عجیب و غریب ساعت آئی کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ ہمہ تن چشم اشتیاق بن کر ابن خطاب پر اپنی نگاہیں جمائے ہوئے ہے۔• آج کفر و ایمان کا ایک ایسا انوکھا معرکہ ہو رہا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ پسر خطاب کہاں جا رہا ہے؟ محمدؐ کی طرف۔ اس کے ہاتھ میں کیا ہے؟ شمیر بے نیام۔ کیا ارادے ہیں؟ خاکم بدہن محمدؐ کا سر کاٹ کر لانا چاہتا ہے۔ کیوں؟ ایک ہزار اوقیہ چاندی اور سو اونٹ کا انعام حاصل کرنے اور اسلام کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی غرض سے۔

خطاب کے اس جوشیلے فرزند کو کیا معلوم تھا کہ خالق کائنات نے اسے کس لیے پیدا کیا ہے؟ قدرت مسکراتی ہوئی اسے کشاں کشاں ایک ایسی منزل کی طرف لیے جا رہی تھی جہاں خود اس کی گردن کفر اڑنے والے تھی۔ جہاں وہ ایک دن شمشیر بکف ہو کر یہ اعلان کرنے والا تھا کہ: "جو شخص رسولؐ اللہ کو مردہ کہے گا' اس کی گردن اڑا دوں گا۔" جہاں کفر و شیطنت اس کے نام سے لرزہ براندام ہوں گے۔ جہاں کروڑوں اوقیہ سونا چاندی اس کے قدموں میں آئیں گے اور وہ ادھر رخ بھی نہ کرے گا۔ جہاں وہ فرماں روائی کی ایسی اعلیٰ اقدار عطا کرے گا جو ہمیشہ آئیڈیل کا کام دیتی رہیں گی۔

آگے کیا ہوا؟ اس کی تفصیلات احادیث و سیر کی تمام صحیح روایات میں موجود ہیں۔ لیکن ہم ان سب کو چھوڑ کر بزار کی وہ روایت نقل کرتے ہیں جس میں سیدنا عمرؓ اپنے اسلام کا قصہ خود اپنی زبان سے بیان فرماتے ہیں' جس کی داستان ہے' اسی کی زبان سے سنیے۔ جناب عمرؓ فرماتے ہیں:

"میں حضورؐ کے حق میں (قبل از اسلام) سب سے زیادہ سخت انسان تھا۔ ایک دن میں مکے کے ایک راستے میں تھا کہ ایک قریشی (٦) نے مجھے دیکھا اور پوچھا: کدھر جا رہے ہو ابن خطاب؟ میں نے جواب دیا: اس شخص (حضورؐ اکرمؐ) کے قتل کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس نے کہا: تم یہ کہہ رہے ہو اور خود تمھاری بہن (٧) اسی راستے پر لگ گئی ہے۔ میں غصے میں بھرا ہوا وہاں سے لوٹا اور بہن کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا ——— حضورؐ کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی بے مایہ شخص اسلام لاتا تو ایک یا دو آدمی کو کسی کے سپرد فرما دیتے جو اس نومسلم کی ضروریات زندگی کی کفالت کرتا۔ ایسے دو نومسلموں کو میرے بہنوئی (٨) کے سپرد بھی فرما دیا تھا ——— خیر جب میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے آواز آئی کون ہے؟ میں نے کہا: عمر۔ اس وقت ان کے ہاتھوں میں ایک صحیفہ تھا جو وہ پڑھ رہے تھے۔ میری آواز سنی تو اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک جگہ چھپ گئے (٩) اور کتاب وہیں چھوڑ دی۔ جب میری بہن نے دروازہ کھولا تو میں نے کہا: اپنی جان کی دشمن! تو صابئ (١٠) ہوگئی ہے؟ یہ کہہ کر میں اس کے سر پر مارنے لگا۔ وہ رو رو کر کہنے لگی: ابن خطاب! تم جو کچھ کرسکتے ہو کر لو۔ میں تو اسلام قبول کر چکی ہوں ——— میں وہاں سے ہٹ کر تخت پر بیٹھ گیا اور صحیفے پر نظر پڑی۔ میں نے پوچھا یہ صحیفہ کیسا ہے؟ بہن نے کہا: اسے رہنے دو، تم نہ غسل جنابت کرتے ہو نہ طاہر رہتے ہو۔ اسے صرف

پاکیزہ لوگ ہی چھوا کرتے ہیں۔ میں اصرار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے مجھے وہ صحیفہ دے دیا۔ اس میں لکھا تھا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں نے جب الرحمٰن الرحیم پڑھا تو مجھے معاً" وہ لفظ یاد آگیا جس سے دونوں لفظ مشتق ہیں۔ (۱۱) پھر میں متوجہ ہوا تو یہ پڑھنے لگا۔ سبح للہ ما فی السموات و الارض وھوا لعزیز الحکیم پڑھتے پڑھتے میں اس آیت پر پہنچا: امنوا باللہ و رسولہ وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ پس میں بے اختیار کہہ اٹھا کہ: اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمدا رسول اللہ۔ یہ سن کر چھپے ہوئے آدمی باہر نکل آئے اور خوشی کے مارے تکبیر بلند کرنے لگے اور کہا کہ: اے ابن خطاب! مبارک ہو۔ اس دوشنبے کو حضورؐ نے دعا فرمائی تھی کہ: "اے اللہ! عمر بن خطاب اور عمر بن ہشام (ابو جہل) میں سے جو تجھے زیادہ پیارا ہو اس کے ذریعے سے اس دین کو تقویت پہنچا۔" ہم سبھوں کو یہی توقع تھی کہ اس دعاے نبوی کی قبولیت تمہارے ہی حصے میں آئے گی۔ میں نے کہا کہ: مجھے حضورؐ کے پاس لے چلو۔ حضورؐ کہاں تشریف فرما ہیں؟ جب ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ میں سچے دل سے ایمان لا چکا ہوں تو مجھے حضورؐ کی خدمت میں لے کر روانہ ہوئے۔ جب میں وہاں (۱۲) پہنچا تو دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی نے پوچھا: کون ہے؟ میں نے جواب دیا۔ عمر۔ ان لوگوں کو علم تھا کہ میں حضورؐ کے حق میں بہت سخت ہوں۔ لیکن ابھی تک انھیں میرے اسلام لانے کا حال معلوم نہ تھا' اس لیے کسی

نے دروازہ کھولنے کی جرات نہ کی۔ آخر حضورؐ نے فرمایا: کھول دو دروازہ۔ اگر اللہ اس (عمرؓ) کی بھلائی چاہے گا تو اسے ہدایت دے گا۔" (۱۳) غرض دروازہ کھلا اور دو آدمیوں نے میرے دونوں بازوؤں کو پکڑ لیا اور میں حضورؐ کے قریب آگیا۔ حضورؐ نے فرمایا: "انھیں چھوڑ دو۔" پھر میں حضورؐ کے سامنے بیٹھ گیا۔ حضورؐ نے میرے گریبان کو پکڑ کر فرمایا: "ابن خطاب! اسلام لے آؤ۔" (پھر دعائیہ انداز سے فرمایا) "اے اللہ انھیں ہدایت دے۔" میں بے ساختہ بول اٹھا کہ: اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ و اشھدانک رسول اللّٰہ پھر تو مسلمانوں نے وہ نعرہ تکبیر بلند کیا کہ مکے کی گلیوں میں آواز گونجنے لگی۔ مسلمانوں کی تعداد اس وقت تک ستر (۱۴) ہو چکی تھی۔ اس وقت جب کوئی اسلام قبول کرتا اور لوگوں کو اس کا علم ہوتا تو لوگ اسے ٹھونکتے تھے اور اس کا بس چلتا تو وہ بھی (اپنے بچاؤ کے لیے) جواب دیتا۔ میں اسلام لانے کے بعد ایک شخص کے پاس آیا اور دروازہ کھٹکھٹایا' وہ باہر آیا تو میں نے کہا' "تجھے معلوم ہے میں صابیٔ ہو گیا ہوں۔" وہ یہ کہتا ہوا گھر میں گھس گیا کہ "ایسا نہ کرنا" اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں دوسرے کے پاس گیا اور وہاں بھی بالکل اسی طرح کا سوال و جواب ہوا اور اس نے بھی دروازہ بند کر لیا۔ میں نے کہا: "یہ تو کوئی لطف کی بات نہ ہوئی۔" آخر ایک شخص نے کہا: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگوں کو تمھارے اسلام لانے کا علم ہو جائے؟" میں نے کہا: ہاں ہاں۔ اس نے بتایا کہ: جب لوگ حجر کعبہ

کے پاس جمع ہوں تو تم فلاں آدمی سے یوں کہو کہ: "دیکھو یہ بات میرے تمھارے درمیان ہی رہے۔ میں صابئ ہو گیا ہوں، سمجھ گئے؟" وہ آدمی کسی بات کو راز میں رکھنے کا عادی نہیں۔ غرض میں نے اسی رائے پر عمل کیا تو وہ شخص کھڑا ہو کر بڑے زور سے چلایا کہ: ارے سنتے ہو لوگو! عمر بھی صابئ ہو گیا ہے۔ یہ سن کر سب کے سب مجھ پر جھپٹ پڑے۔ دیر تک وہ سب مجھے ٹھونکتے رہے اور یں ان کی مرمت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میرا ماموں بھی آگیا اور اسے بتایا گیا کہ عمر بھی صابئ ہو گیا ہے۔ بس اس نے حجر میں کھڑے ہو کر آواز دی کہ: ہاں خبردار! میں نے اپنے بھانجے کو پناہ دے دی ہے۔" یہ سن کر لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ مگر میں یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ کوئی دوسرا مسلمان پٹتا رہے اور میں اس کا تماشا دیکھتا رہوں۔ میں نے سوچا کہ یہ کوئی لطف کی بات نہیں کہ مسلمان پٹتے رہیں اور میں نہ پٹوں۔ لہٰذا جب لوگ حجر میں اکٹھا ہوئے تو میں نے اپنے ماموں کے پاس آکر کہا کہ: تیری پناہ تجھ ہی کو مبارک ہو۔ میں اسے قبول ہی نہیں کرتا۔ اس نے کہا: ارے ایسا نہ کرو۔ مگر میں نے اس کی بات مانی ہی نہیں۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ میں برابر پٹتا بھی رہا اور پیٹتا بھی رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غالب کر دیا۔"

ہم نے سیدنا عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعے کی تفصیل بزار کی روایت سے اس لیے بیان کی ہے کہ یہ خود سیدنا عمرؓ کی زبانی ان کی اپنی کہانی ہے اور ان کے مزاج سے خاصی مطابقت رکھتی ہے۔ فن حدیث کے لحاظ سے اس روایت

ہیں وہ قوت نہیں جو دوسری روایتوں میں ہے' اس لیے ہم نے جا بجا فٹ نوٹوں میں بعض ضروری باتیں اضافہ کر دی ہیں۔ بہرحال یہ ہے وہ واقعہ جس کے بعد عمرؓ ساری عمر کے لیے بندہ بے دام ہو گئے اور دینی سیاست عملی' اسلامی شوکت و دبدبہ' بے لاگ عدل و انصاف اور بے داغ امامت و قیادت کا سب سے اعلیٰ نشان ثابت ہوئے۔

سیدنا حمزہؓ کے اسلام لانے کے صرف تین دن بعد سیدنا عمرؓ ایمان لائے۔

کعبے میں علانیہ نماز

اس وقت تک انتالیس (۳۳ مرد اور ۶ عورتیں) نفوس قدسیہ ایمان لا چکے تھے جن میں ابوبکرؓ جیسے با اثر و زیرک' حمزہؓ جیسے شجاع و باہمت' علیؓ جیسے نڈر شیر بھی تھے۔ لیکن ابھی تک نبوت کی شان جمال ایک مظہر شان جلال کی تلاش میں تھی۔ جناب عمرؓ کی واحد ذات نے اسلام لا کر تصویر نبوت کا یہ دوسرا رخ بھی بے نقاب کر دیا۔ مسلمان اب تک گھروں میں یا پہاڑ کی گھاٹیوں میں چھپ چھپ کر نمازیں ادا کرتے تھے' لیکن آج اس ذات گرامی کے قبول اسلام کے بعد مسلمانوں کا یہ مختصر گروہ پہلی بار جوش و خروش اور جرات و ہمت کے ساتھ علانیہ کعبے میں داخل ہوا' اور ڈنکے کی چوٹ نماز باجماعت ادا کی۔ یہ وہی کعبہ ہے جہاں چند دنوں پہلے عین حالت سجدہ میں ابوجہل نے حضورؐ پر اونٹ کا اوجھ ڈلوایا تھا' مگر آج عمرؓ کے دبدبے کے سامنے دم بخود کھڑا ایک ایک مسلمان کو وہیں نماز ادا کرتے سن رہا ہے اور اس کی کچھ پیش نہیں جاتی۔

شعب بن ہاشم کی محصوری

ایمان جناب عمرؓ کوئی ایسا معمولی اور ناقابل توجہ واقعہ نہ تھا جو کفار قریش کو چونکا کر نہ رکھ دیتا۔ ان کے قبول اسلام سے جماعت مومنین کے ایک

نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ اس کی وجہ سے منکرین اور زیادہ انگاروں پر لوٹنے لگے۔ ادھر اہل اسلام کا ایک جدید باشوکت دور شروع ہوا اور ادھر اہل کفر میں ایک نئی تحریک کی لہر دوڑ گئی۔ اب ہم سن ۷ نبوت میں قدم رکھ رہے ہیں جب کہ مسلمانوں کو عموماً اور ابنائے ہاشم کو خصوصاً" ایک شدید قسم کے دور ابتلا و امتحان سے گزرنا پڑا اور مسلسل تین سال (۱۰ نبوت) تک روح فرسا آزمائشوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ ابو طالب نے ہاشمی اقتدار کو (نہ کہ اسلامی وقار کو) باقی رکھنے کے لیے تمام ہاشمیوں کو ———— جس میں صرف ابولہب مستثنیٰ رہا ———— اپنی حمایت کے لیے ایک مرکز پر جمع کر لیا تھا' اس میں قبیلوی رواج کے مطابق مومن و کافر سب شریک تھے۔ ابو طالب کی اس تحریک سے وقتی طور پر منتشر قوتیں یک جا ہو گئیں لیکن دینی زاویہ نگاہ سے غیر مسلم ہاشمیوں کی یہ حمایت ایک قبیلوی عصبیت سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ سیدنا عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد اہل کفر کی مجموعی قوت نے ابو طالب کی اس تحریک حمایت سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اس خالص دینی تبلیغ کو فی الواقع قبیلوی رنگ دے دیا اور اب اسلام و کفر کی یہ جنگ ہاشمی و غیر ہاشمی کی جنگ بن گئی۔ اس سے اہل کفر نے فائدہ یہ اٹھایا کہ (تمام مسلمانوں کے نہیں بلکہ صرف) بنی ہاشم کے مقاطعے کی تحریک پیش کر دی۔ اس مقاطعے میں انھوں نے ابولہب کے سوا مومن و کافر کسی کی تخصیص نہ رکھی۔ جو ہاشمی تھا وہ مقاطعے کا مستحق سمجھا گیا خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ اور زیادہ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جو ہاشمی نہ تھا ———— خواہ وہ مومن و مسلم ہی کیوں نہ ہو ———— مقاطعے کا سزاوار نہ سمجھا گیا۔

کافرانہ سیاست

مکی اور قریشی اہل کفر کچھ ایسے بھولے بھالے نہ تھے جو معاملات کی

تہہ تک پہنچنے سے قاصر رہتے۔ یہ بڑے گھاگ سیاست دان تھے۔ مقاطعے کا یہ فیصلہ یوں ہی رواروی میں نہیں کیا تھا اور خاص کر بنی ہاشم کے مقاطعے کی تخصیص بلاوجہ نہ تھی۔ یہ ان کی اتنی گہری سیاسی نکتہ رسی تھی کہ اس کے بعد تائید ایزدی اور اہل ایمان کی بے پناہ قوت صبر و استقامت نہ ہوتی تو کفر کے غالب آجانے میں کوئی کسرباقی نہ تھی

ذرا سوچیے' ان اہل کفر نے خاص طور پر بنی ہاشم ہی کو کیوں نشانہ بنایا؟ سارے مسلمانوں کو اس لپیٹ میں کیوں نہ لے لیا؟

۱۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ابو طالب کی تحریک حمایت (بربنائے ہاشمیت) نے خود ہی اسلام کی عالم گیر حیثیت کو ہاشمی قبیلوی رنگ دے دیا تھا۔ ظالموں نے اسی سے فائدہ اٹھایا اور انھیں یہ پروپیگنڈے کا موقع مل گیا کہ یہ صرف اقتدار ہاشمیت کی قبیلوی تحریک ہے۔ کوئی دینی تحریک ہوتی تو غیر مسلم ہاشمی کیوں حمایت کے لیے کھڑے ہو جاتے؟

۲۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ غالباً وہ تمام مسلمانوں کا دفعتہ" بائیکاٹ کرنے میں ایک بڑا خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ وہ اور کس کس کو مقاطعے کی لپیٹ میں لیتے؟ اگر جناب عمرؓ کا بائیکاٹ کرتے تو صرف آل خطاب ہی نہیں بلکہ عرب کی قبیلوی ذہنیت کے مطابق سارے ورنہ اکثر بنی عدی بھی عمر بن خطاب کی حمیت جاہلیت پر اتر آتے۔ اگر جناب عثمانؓ سے مقاطعہ کرتے تو بہتیرے یا سارے بنی امیہ ان کی حمایت میں کفار قریش کا ساتھ چھوڑ دیتے۔ اسی طرح جس جس قبیلے کا کوئی فرد اسلام لایا تھا اس سے مقاطعہ کرنے کا مطلب ان تمام خاندانوں اور قبیلوں کو دعوت مقابلہ دینا تھا اور وہ سب کے سب نہیں تو بیشتر افراد اپنے قبیلے کے مسلم فرد کی اسی طرح حمایت کرنے پر آمادہ ہو جاتے جس طرح ابو طالب کی آواز پر تمام مسلم و کافر ہاشمی حمایت کے لیے مجتمع ہو گئے۔ ان سب کا مقابلہ و مقاطعہ قریش کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے بڑی دانائی کے ساتھ

ابو طالب کی تحریک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مقاطعے کو صرف بنی ہاشم تک ہی محدود رکھا۔

۳۔ مقاطعے کا یہ دائرہ محدود رکھنے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اگر یہ کامیاب ہو گیا تو رفتہ رفتہ دوسرے قبائل کے مسلمانوں کو بھی اسی طرح لپیٹ میں لے لیا جائے گا۔ گویا یہ ایک پہلا تجربہ تھا جو بعد میں دوسروں پر بھی آزمایا جاتا۔

۴۔ ایک بڑا سبب مقاطعہ بنی ہاشم کی تخصیص کا یہ بھی تھا کہ اہل کفر کو جو کچھ دشمنی تھی وہ دراصل محمدؐ رسول اللہ سے تھی۔ بنی ہاشم کے غیر مسلم بے شک ان منکروں کے ہم مذہب تھے لیکن ان سے ان کو اتنی ہمدردی نہ تھی جتنی دشمنی حضورؐ سے تھی۔ وہ یہ جذبہ رکھتے تھے کہ ان کی بلا سے غیر مسلم ہاشمی بھی ختم ہو جائیں لیکن ان کے ساتھ اگر رسول ہاشمیؐ کو بھی بے بس کر دیا جائے تو خود بخود سارا قصہ پاک ہو جائے گا۔ اس لیے انھوں نے بھی اپنی ساری توجہ بنی ہاشم ہی کے مقاطعے پر مرکوز کر دی۔

۵۔ ایک اور مصلحت یہ بھی تھی کہ اب اسلام کچھ قوت پکڑ چکا تھا۔ عمرؓ اور حمزہؓ جیسے انسان اسلام لا چکے تھے۔ اب پہلے کی طرح صرف چند بے بسوں کا معاملہ نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں سختی و ظلم کی یہ شکل زیادہ آسان تھی کہ ہر ایک پر الگ الگ ظلم کیا جائے تاکہ حتی الامکان ایک دوسرے سے بے خبر رہے یا کم از کم اپنی آنکھ سے نہ دیکھے۔ اس کی یہی صورت تھی کہ بنی ہاشم کو عام مسلمانوں سے کاٹ کر الگ کر لیا جائے تاکہ یہ عام مسلمانوں سے اور عام مسلمان ان سے بے خبر رہیں۔ اور جو مسلمان اس مقاطعے سے باہر رہیں' ان پر الگ الگ سختیاں کی جائیں تاکہ جو ڈھارس اجتماعی مظلومیت میں ہوتی ہے وہ بھی نہ باقی رہے۔

۶۔ غرض یہی سب خطرات یا مصالح تھے جن کی وجہ سے معاندین نے

مقاطعے کے لیے ابتداء" صرف بنی ہاشم کو نشانہ بنایا۔ ایک بہت بڑی وجہ' جسے اصلی وجہ کہنا چاہیے' یہ تھی کہ رائج الوقت عرب کے قبیلوی دستور کے مطابق حضورؐ کو کفار قریش کے حوالے کر دینے کی ذمہ داری صرف بنی ہاشم پر آتی تھی جس سے حضورؐ کے چچا اور بنی ہاشم کے سردار ابو طالب نے صاف انکار کر دیا' جیسا کہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ ان کی نگاہ میں اصلی مجرم بنی ہاشم تھے جن کے تمام افراد کو ابو طالب نے اپنی قبیلوی حمایت پر اکٹھا کر لیا تھا۔ رہے دوسرے مسلمان تو ان کا جرم ان کی نظروں میں ثانوی حیثیت رکھتا تھا اور وہ ان سے بعد میں بھگت لینے پر اپنے آپ کو قادر سمجھ رہے تھے۔

غرض یہ تھی وہ کافرانہ سیاست جس نے تمام کے تمام ابنائے ہاشم کو خاص طور پر ہدف مقاطعہ بنا دیا۔

مقاطعے کی شکل

ان سب غیر ہاشمی کفار قریش نے ایک حلف نامہ لکھا کہ ان تمام بنی ہاشم سے (بجز ابولہب کے) سلام' کلام' خرید' فروخت' اعانت' امداد' مناکحت' رشتے داری غرض ہر چھوٹے بڑے معاملے میں کامل ترک تعلق کر لیا جائے۔ اس حلف نامے پر تمام ذمے دار اشخاص کے دستخط لیے گئے اور یہ حلف نامہ کعبے کے دروازے پر اس اعلان کے ساتھ آویزاں کر دیا گیا کہ یہ حلف نامہ اس وقت تک آویزاں رہے گا جب تک بنی ہاشم محمدؐ کو قریش کے حوالے نہ کر دیں۔

محصوری کے مصائب و آلام

تمام قبائل قریش کے اس اعلان مقاطعہ کے بعد بنی ہاشم اپنا سامان خوردونوش وغیرہ لے کر ایک تنگ گھاٹی میں محصور ہو گئے' اور اس محصوری کے نتیجے میں دوسرے غیر ہاشمی مسلمان بھی اپنے اپنے گھروں میں گویا محصور

ہوگئے۔ یہ مقاطعہ اور یہ محصوری تین سال (۱۰ نبوی) تک جاری رہی۔ بنی ہاشم کا غلہ اور سامان خورد و نوش ختم ہوگیا۔ بھوک کی شدت میں درختوں کے پتے تک انھیں کھانے پڑے۔ بچے بھوک سے روتے تو ان کی آوازیں گھاٹی سے باہر تک پہنچ جاتیں۔ بعض مسلمان چوری چھپے کچھ غلہ پہنچا آتے۔ اور یہ بھی نوٹ کرنے کی بات ہے کہ بعض اوقات وہ کفار بھی غلہ پہنچا دیتے جن کے دل میں رحم اور انسانیت و شرافت کی رمق موجود تھی۔

منکرین حق ہزار ظالم و بے رحم ہوں لیکن ان سب کا یکساں ہونا ضروری نہیں۔ ان میں کچھ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو انسانیت و شرافت کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ دینی یا قبیلوی اختلاف سے کسی وقت بالاتر ہو جاتے ہیں اور انسانی رحم دلی' نیکی اور ہمدردی کے تقاضے پورے کرنے میں وہ تامل نہیں کرتے۔ یہ دراصل ایسی اخلاقی قدریں ہوتی ہیں جو انھیں بہ نسبت دوسروں کے اسلام کے قریب تر رکھتی ہیں اور مستقبل میں ان کا قبول اسلام زیادہ متوقع ہوتا ہے۔ اسلام ایسی نیکیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نجات اخروی کا دارومدار صرف اتنی ہی باتوں پر نہیں رکھتا' وہ آگے بھی بہت کچھ چاہتا ہے۔ لیکن جہاں تک دنیوی زندگی کے فوز و فلاح اور حسن جزا و مراعات کا تعلق ہے' اسے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ بلکہ حکیم بن حزام نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ:

> "میں جاہلیت کے ایام میں کئی ایک نیک کام کیا کرتا تھا' مثلاً صلوٰۃ ' غلاموں کی رہائی اور صدقہ وغیرہ۔ تو کیا اب اسلام لانے کے بعد ان نیکیوں کا اجر ملے گا؟"

حضورؐ نے جواب دیا کہ: "جو نیکیاں تم کرچکے ہو' ان ہی کی برکت سے تم نے اسلام قبول کرلیا ہے۔" (رواہ الشیخان' عن حکیم بن حزام)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کی نیکیاں ضائع نہیں

جاتیں بلکہ ان کی وجہ سے وہ اسلام سے قریب تر رہتے ہیں اور ان ہی کی بدولت انھیں دولت اسلام نصیب ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ کلیہ نہیں لیکن غالب توقع یہی ہوتی ہے کہ حالت کفر کی نیکیاں اسلام کی طرف لے آئیں۔ اب رہا اخروی نجات کا معاملہ تو ایک روایت اس کے متعلق بھی سن لیجیے۔ عبداللہ بن مسعود، حضورؐ کی ایک حدیث یوں بیان فرماتے ہیں کہ:

> کوئی شخص بھی خواہ وہ مسلم ہو یا کافر جب نیکی کا کوئی کام کرے گا تو اس کا صلہ دیا جائے گا۔ ہم لوگوں نے پوچھا کہ: یا رسول اللہ مسلمان کو جو ثواب سے بہرہ مند کیا جاتا ہے، اس کا تو ہمیں علم ہے لیکن کافر کو ثواب کیوں کر مل سکتا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ: جب وہ عطا و بخشش کرتا ہے یا صلہ رحمی کرتا ہے یا اور کوئی نیک کام کرتا ہے تو دنیا میں اللہ تعالیٰ اسے مال و منال اور اولاد کی صورت میں اس کا صلہ دیتا ہے اور آخرت میں اس کے عذاب میں تخفیف کر دیتا ہے۔ (بزار)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کفر کو ثواب دنیا تو ضرور ملتا ہے اور آخرت کا ثواب اگرچہ نجات کی شکل میں نہ ہو تاہم تخفیف عذاب کی صورت پیدا کر دی جاتی ہے۔

آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ بہت سے اور منکرین اسلام نے بھی کئی موقعوں پر اہل اسلام کے ساتھ اپنی شرافت و ہمدردی کا ثبوت دیا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے اسلامی فیصلہ وہی ہے جو ان دو روایتوں سے مستنبط ہوتا ہے۔ یعنی دنیاوی نعمتوں میں اضافہ اور اخروی عذاب میں بقدر نیکی تخفیف۔ لیکن نجات کے لیے توحید اپنے تمام تقاضوں کے ساتھ لازمی ہے۔ شرک کے ہوتے ہوئے نجات کے متعلق صاف قرآنی فیصلہ یہ ہے:

ان اللہ لا یغفران یشرک بہ (النساء: ۴۸)
خدا اس بات کی تو مغفرت ہی نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

محصوری کا اختتام

مقاطعے اور محصوری کے یہ تین سال انتہائی آزمائش کے دن تھے۔ لیکن اس دوران میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی مرد و زن کے پائے ثبات میں لغزش آئی ہو یا اس کے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی کفرو اسلام کے درمیان مصالحت پیدا کرنے کا خیال آیا ہو۔ یہ ایمان کی پختگی' یہ اسلامی استقامت' یہ غیر متزلزل عزیمت' یہ بلند حوصلے' ان پروانہ ہائے شمع نبوت میں کس نے پیدا کیے؟ یہ تربیت تھی محمد عربیؐ کی۔ یہ بلند ترین کیرکٹر تھا جناب رسالت مآبؐ کا' جسے وہ ابتدا سے دیکھتے چلے آئے تھے اور جس سے زیادہ ان کی نگاہ میں کوئی اور شے قابل اعتماد نہ تھی۔ اگر حضورؐ کی صداقت و استقامت میں انھیں ادنیٰ سے ادنیٰ شبہ بھی ہوتا تو ان کے لیے ساتھ چھوڑ دینے کا اس سے بہتر کوئی اور موقع نہ تھا۔ کون ہے جو کسی کے لیے اپنی ہر متاع عزیز کو اس طرح خطرے میں ڈال دے اور تین سال تک لگاتار ایسی شدید آزمائش میں بھی ثابت قدم رہے؟

ہاں ایک سوال یہاں ضرور ہو سکتا ہے کہ اسی قسم کی استقامت کا ثبوت تو ان ہاشمیوں نے بھی بہم پہنچایا جو مومن نہ تھے۔ ان میں یہ ثبات قدم کس نے پیدا کیا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اہل کفر اور اہل اسلام کے زاویہ ہائے نظر کا مابہ الامتیاز فرق معلوم کرنا ضروری ہے۔ اہل کفر ہونے کا یہ مفہوم بالکل نہیں کہ ان کے اندر کوئی اچھی صفت ہوتی ہی نہیں۔ یقیناً ان کے اندر بھی اعلیٰ قدریں موجود ہوتی ہیں۔ ان کا جرم صرف اسی قدر ہے کہ یا تو وہ ان

اعلیٰ اقدار کے سرچشمہ حقیقی (خدائے تعالیٰ) سے بے تعلق ہوتے ہیں یا پھر اپنی ان اقدار کا استعمال غلط کرتے ہیں۔ ایک کافر بھی سخی ہو سکتا ہے' بہادر اور ثابت قدم ہو سکتا ہے۔ رحم دل اور ہمدرد ہو سکتا ہے۔ صاحب علم و حکمت ہو سکتا ہے۔ عادل و منصف ہو سکتا ہے۔ وہ کیا نہیں ہو سکتا؟ وہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کی ان تمام صلاحیتوں کا رخ کدھر ہے؟ اور وہ اپنی ان قوتوں کو کس مقصد کے حق میں صرف کر رہا ہے؟ کفرو اسلام کا فیصلہ اسی مقام پر آکر ہوتا ہے۔ بلاشبہ ہاشمی کافروں نے بھی بہ ظاہر وہی استقامت دکھائی جو مسلمان ہاشمیوں نے دکھائی۔ لیکن دونوں میں بہت بڑا اساسی فرق یہ تھا کہ مسلمانوں کی استقامت فقط خدا کی راہ میں تھی اور کافروں کی ساری ثابت قدمی صرف وقار ہاشمیت کے لیے تھی۔ دیکھنے میں پیتل بھی ویسا ہی چمکتا ہے جیسے سونا۔ لیکن پیتل' پیتل ہے اور سونا' سونا۔

قیاس یہ کہتا ہے کہ اس دوران محصوری میں شدائد سے گھبرا کر کافروں نے حضورؐ کو اور دوسرے مسلمانوں کو ملامت بھی کی ہوگی اور اسلامی تقاضوں کو ترک کرنے یا اس میں مداہنت پیدا کرنے کی ترغیب بھی دی ہوگی۔ لیکن قدرت کو یہ منظور تھا کہ یہ زیادہ سے زیادہ قریب رہ کر حضورؐ کے کیرکٹر' اعلیٰ کردار و اقدار' صداقت و استقامت اور حق پرستی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر متاثر ہوں اور مستقبل میں ان ہی منکروں کی ثابت قدمی اپنا رخ بدل کر اسلام کے کام آئے۔

موسیٰ بن عقبہ عن الزہری' ابن لہیعہ عن ابی الاسود عن عروۃ بن الزبیر اور ابن اسحاق وغیرہ کی روایت کے مطابق اس تیسرے سال کے آخر میں قریش کے اس حلف نامہ مقاطعہ کو دیمک چاٹ گئی اور اس کی خبر بھی حضورؐ نے ابوطالب کو دے دی تھی۔ یہ بھی ایک قدرتی مدد ہوگئی۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک نفسیاتی اصول ہے کہ بعض اوقات بڑے

سے بڑے ظالم کے اندر بھی ظلم کے رد عمل کے طور پر انسانی ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ کچھ تو بنی ہاشم کی غیر معمولی استقامت و مظلومیت نے اثر کیا اور کچھ شرکائے مقاطعہ کے اندر رد عمل پیدا ہوا اور ان کے ضمیر نے احساس ندامت کی چٹکی لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر ہی اس ظلم مقاطعہ کے خلاف جذبات ابھرنے لگے۔ ابو البختری بن ہشام' مطعم بن عدی' زہیر بن ابی امیہ بن مغیرہ' زمعہ بن اسود' ہشام بن عمرو بن حارث نے اعلان کر دیا کہ:

"ہم لوگ اس حلف نامے کے پابند نہیں۔" یہ تحریک سب سے پہلے ہشام بن عمرو ہی کے دل میں پیدا ہوئی تھی اور اسی نے باقیوں سے بھی اس کا ذکر کیا اور انھوں نے اس کا ساتھ دیا۔ ابوجہل نے شدید مخالفت کی مگر موثر نہ ہوئی۔ آخر مقاطعہ ختم ہو گیا۔ تمام مسلم و کافر بنی ہاشم گھاٹی (شعب بنی ہاشم) کے حصار سے باہر نکل آئے اور باہمی قبیلوی روابط پھر قائم ہو گئے۔

محصوری سے باہر آنے کے بعد

ظاہر ہے کہ اس سہ سالہ محصوری کی ذہنی اور جسمانی آزمائشوں نے سارے محصورین کو کمزور' نحیف اور خستہ حال کر دیا ہو گا۔ حضورؐ کا حال ان سے کچھ مختلف نہ ہو گا۔ دل چاہتا ہو گا کہ کچھ آرام کر لیا جائے اور تین سال کی کمی پوری ہو جائے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مادی لحاظ سے جتنی آزمائشیں ہوئیں' اتنا ہی زیادہ ایمانی پختگی اور عزیمت و استقامت میں اضافہ ہوتا گیا۔ حصار سے باہر آتے ہی حضورؐ کی تبلیغی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں۔ ہر گلی کوچے اور ہر مجمعے میں بے خطر پہنچ جاتے اور تبلیغ حق کا فرض ادا فرماتے رہتے۔ ابوجہل نے جابجا پہرے بٹھا دیے اور خود بھی حضورؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور کہتا پھرتا کہ: (خاک بدہنش) "اس دیوانے کی بات کوئی نہ سنے ورنہ برباد ہو جائے گا۔" اس کے باوجود اسلام روز بروز دلوں میں گھر کرتا اور پھیلتا گیا۔

آزمائش کا ایک اور دور (ابو طالب کی وفات)

محصوری اور مقاطعے کی بے پناہ تکلیفوں کے بعد بھی آزمائشوں کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ ابھی چند ہی ماہ گزرے تھے کہ شوال ۱۰ نبوی میں حضورؐ کے شفیق چچا ابو طالب اسی (۸۰) سال کی عمر میں راہی ملک عدم ہو گئے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ حضورؐ کو اپنے اس فدا کار د جاں سپار اور بے پناہ الفت رکھنے والے چچا سے محبت نہ ہوگی۔ چچا بھی وہ جس نے حضورؐ کو آٹھ سال کی عمر سے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ اپنے فرزندوں سے بڑھ کر خیر خواہانہ کفالت کا فرض ادا کیا۔ ہر سرد و گرم میں ساتھ دیا۔ کفار قریش کے متحدہ الٹی میٹم کے بعد بھی حضورؐ کو ان کے حوالے نہ کیا اور سارے بنی ہاشم کو خاندانی حمایت پر اکٹھا کر لیا اور تین سال تک گھاٹی میں محصور رہ کر وہ ساری مصیبتیں جھیلیں جو دوسرے مسلمان جھیلتے رہے۔ کیا یہ تصور میں بھی آسکتا ہے کہ حضورؐ کو ان سے غایت درجے کی احسان مندانہ محبت نہ ہوگی؟

اسی محبت اور قلبی لگاؤ کی وجہ سے حضورؐ کی دلی خواہش تھی کہ ابو طالب کی آخرت بھی ٹھیک ہو جائے۔ یقیناً حضورؐ نے اور بھی بہت سے مواقع پر انھیں اسلام لانے کی ترغیب دی ہوگی' لیکن آج جب کہ یہ شفیق و مہربان چچا اپنے بستر مرگ پر پڑا چند لمحوں کا مہمان تھا' حضورؐ نے ایک بار پھر آخری کوشش کی کہ یہ مہربان چچا بھی کسی طرح ایمان لے آئے اور کم از کم لا الہ الا اللہ تو اپنی زبان سے کہہ دے۔

ایک ناخوشگوار بحث

اس مقام پر آکر تقریباً سب ہی مورخین اور سیرت نگاروں کو ایمان ابو طالب کی بحث میں الجھنا پڑا ہے۔ بخاری کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خاتمہ ایمان پر نہیں ہوا کیوں کہ انھوں نے ایک بات تو یہ کہی کہ:

میں لا الہ الا اللہ ضرور کہہ دیتا لیکن قریش طعنہ دیں گے کہ موت سے ڈر گیا۔ نیز ان کا یہ قول بھی منقول ہے کہ: میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔ نیز ایک حدیث یہ بھی ہے کہ ابو طالب آگ کے کھولتے چشمے میں ٹخنوں ٹخنوں کھڑے ہیں جس سے ان کا دماغ پکتا رہتا ہے۔ (یہ تخفیف عذاب ہے)۔ اسی طرح طبقات ابن سعد' ابو داؤد اور نسائی کی روایتوں میں بھی حضرت علیؓ کا یہ قول منقول ہے کہ مَات عمک کافراً (حضورؐ! آپؐ کے چچا کی موت کفر پر ہوئی)۔

البتہ ابن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ: مرتے وقت ابو طالب کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ عباس بن عبدالمطلب نے (جو ابھی تک دین کفر ہی سے وابستہ تھے) کان لگا کر سنا اور حضورؐ سے کہا: ''آپؐ نے جس کلمے کی تلقین کی تھی' یہ اسی کو دہرا رہے ہیں۔''

اگر ابو طالبؓ جیسا شریف انسان نجات یافتہ مومن بن سکے تو یہ ان کے جہنمی کافر ثابت ہونے سے بدرجہا بہتر ہے۔ چنانچہ مولانا شبلی نعمانی یہی رجحان رکھتے ہیں اور ابن اسحاق کی روایت سے ایمان ابو طالب ثابت کرنا زیادہ بہتر تصور کرتے ہیں۔ ''اسنی المطالب فی ایمان ابی طالب'' میں بھی مومن ہی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' میں کفر ابی طالب پر بہت سے دلائل کا روایتی انبار جمع کر دیا لیکن ایک نکتے کی طرف نہ ابن کثیر کی نظر جاسکی ہے نہ مولانا شبلی کی۔ اور وہ ہے کتاب اللہ کا فیصلہ۔ یہ تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ آخری وقت میں حضورؐ نے انھیں کلمہ توحید کی تلقین فرمائی۔ ایسے وقت میں اگر کوئی ایمان لے بھی آئے تو قرآنی فیصلہ اس بارے میں یہ ہے:

لیست التوبہ للذین یعملون السیات حتی اذا ج
حضر احدھم الموت قال انی تبت الئن (النساء: ١٨)

توبہ ایسے لوگوں کے لیے نفع بخش ہی نہیں جو برائیاں کرتے
رہیں یہاں تک کہ ان میں سے کسی پر موت آنے لگے تو وہ
کہہ دے کہ اب میری توبہ۔

موت سر پر کھڑی دیکھ کر کوئی توبہ قابل قبول ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق قرآن نے ایک اور واضح واقعے کا ذکر یوں فرمایا ہے کہ:

حتی اذا ادرکہ الغرق قال امنت انہ لا الہ الا الذی امنت بہ
بنوا اسرائیل (یونس: ۹۰)

جب فرعون ڈوبنے لگا تو پکار اٹھا کہ میں ایمان لے آیا کہ
جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اس کے سوا کوئی
دوسرا الہ نہیں۔

بلاشبہ ابوطالب نے آٹھ سال کی عمر سے حضورؐ کی کفالت محبت کے ساتھ کی، لیکن فرعون نے اسی طرح شیر خواری سے تقریباً تیس سال تک سیدنا موسیٰؑ کی کفالت کی ہے۔ وہاں تو ابوطالب کے سامنے ہاشمیت اور برادر زادگی کی مجبورانہ عصبیت تھی اور یہاں تو جناب موسیٰؑ سے فرعون کا کوئی رشتہ خاندانی بھی نہ تھا۔ مرتے وقت وہ بھی ایمان لائے اور مرتے وقت فرعون بھی ایمان لایا۔ ابو طالب کا ایمان لانا ابن اسحاق کی روایت سے ثابت ہوتا ہے درآں حالیکہ بہت سی روایتوں سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ اور یہاں فرعون کا ایمان لانا ایک ایسی "خدائی روایت" سے ثابت ہے جسے آیت قرآنی کہتے ہیں اور اس کے مقابلے میں دنیا کی اور کوئی روایت پیش کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔

یہ تو مسلم ہے کہ اگر ابو طالب پہلے اسلام لاچکے ہوتے تو آخر وقت میں حضورؐ ان سے اقرار توحید کا مطالبہ نہ کرتے۔ علاوہ ازیں کوئی وجہ نہیں تھی کہ کفار ان کے ساتھ بھی وہی برتاؤ نہ کرتے جو دوسرے مسلمانوں کے ساتھ

کرتے رہے۔ مگر ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ کفار قریش نے ان سے یہ باز پرس کبھی نہ کی کہ تم مسلمان کیوں ہوئے؟ ان کا مطالبہ صرف یہ ہوتا رہا کہ تم اس دین کی تبلیغ کو روکتے کیوں نہیں یا محمدؐ کو ہمارے حوالے کیوں نہیں کرتے؟

بلاشبہ ابو طالب جیسے محسن عم رسولؐ کو غیر مسلم کہتے ہوئے روح لرزنے لگتی ہے۔ لیکن یہی تو وہ نازک مقامات ہوتے ہیں جہاں دینی اقدار کی پرکھ ہوتی ہے۔ رسول ہاشمیؐ اپنا ایجاد کردہ کوئی دین نہیں لائے تھے' نعوذ باللہ۔ حضورؐ خدا کا دیا ہوا دین لائے تھے۔ اور حضورؐ کی اقدار صداقت و عدالت کی صحیح پرکھ ہی یہاں ہوتی ہے کہ جو خدا کی دی ہوئی ایمانی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا' اسے حضورؐ نہ مومن قرار دیتے ہیں' نہ اسے دوسرے مومنین کی طرح نجات یافتہ بتاتے ہیں حالانکہ اس سے بڑا دنیوی محسن شاید کوئی اور نہیں۔ ان جیسا محبت کرنے والا بھی اور کون ہوسکتا ہے لیکن رشتے کی بشری محبت اور چیز ہے اور دینی محبت بالکل جداگانہ شے ہے۔ رسول کی صرف محبت بے اتباع کیا کام آسکتی ہے جب کہ خدا کی محبت بھی اتباع محمدؐ کے بغیر بے سود ہے۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فا تبعونی یحببکم اللہ (آل عمران: ۳۱) (کہہ دو اے رسول کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو پھر تو تم (صرف محب خدا ہی نہیں بلکہ) محبوب الٰہی بھی بن جاؤ گے)۔

ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ حضورؐ کو بھی اپنے چچا ابو طالب کی جدائی کا بے حد صدمہ تھا اور اسی لیے حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہونے لگے تھے لیکن یہ بھی بشری محبت تھی اور تقاضائے احسان مندی تھا۔ یہ ویسی ہی بشری محبت تھی جیسی سیدنا نوح کو اپنے فرزند سے تھی۔ حضرت نوحؑ کو کنعان سے ایسی ہی محبت تھی کہ اس کے ڈوبنے کا منظر نہ دیکھا گیا اور بے ساختہ فریاد کرنے لگے کہ.... ان ابنی من اھلی وان وعدک الحق (ہود: ۴۵) (میرا فرزند بھی میرے "اہل" سے ہے اور تیرا وعدہ (اہل کو نجات دینے کے متعلق سچا ہے)۔

یہ بھی بشری فطری محبت تھی لیکن خدا کی بتائی ہوئی کسوٹی پر نوح کا وہ محبوب فرزند پورا نہ اتر سکا کیوں کہ بشری محبت اور شے ہے اور دینی محبت چیزے دیگر۔

ایک پیچیدہ سوال

ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مرتے وقت ایمان مقبول نہیں تو حضورؐ نے ایسے وقت میں ابو طالب سے اقرار توحید کا مطالبہ ہی کیوں فرمایا؟ درآں حالاں کہ نفسے چند باقی تھے اور محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق جناب عباس کو ان کے ہلتے ہوئے لبوں کی آواز سننے کے لیے کان لگانے پڑے۔ ایسی آخری گھڑی میں حضورؐ نے انھیں مسلمان کرنے کی کوشش ہی کیوں فرمائی؟ ہماری سمجھ میں اس پیچیدگی کا جو حل آسکا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت تک وہ آیت ہی نازل نہیں ہوئی تھی جس میں بوقت مرگ توبہ کے نامقبول ہونے کا ذکر ہے۔ وہ آیت مدنی ہے اور یہ واقعہ مکی۔ پس حضورؐ کی تلقین توحید کی وہی صورت تھی جو حضرت ابرہیمؑ کی تھی۔ آپ نے اپنے باپ آذر سے کہا کہ ساستغفرلک ربی (مریم: ۴۷) (میں تیرے لیے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا)۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ قرآن کی زبان سے سنیے:

ماکان استغفار ابراھیم لابیہ الاعن موعدۃ وعدھا ایاہ ج فلما تبین لہ انہ عدوللہ تبرا منہ (التوبہ: ۱۱۴)

ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت طلب کرنا اس لیے تھا کہ آپ نے اس سے اس کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن جب یہ واضح ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہی ہے تو آپ اس سے دست بردار ہو گئے۔

تقریباً یہی صورت حضورؐ کے ساتھ بھی پیش آئی کہ ایک منافق (عبداللہ بن ابی بن سلول) کے لیے دعائے مغفرت فرمائی اور اگرچہ یہ کہہ

دیا گیا تھا کہ "تم ستر بار بھی استغفار کرو گے تو خدا نہیں بخشے گا۔" لیکن رحمت نبوی کا تقاضا ستر بار سے بھی زیادہ مغفرت طلب کرنے پر مصر تھا۔ آخر جب صاف لفظوں میں ممانعت آگئی تو حضورؐ باز آگئے۔ وہ ممانعت یہ تھی:

ماکان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین و لو کانوا اولی قربی (التوبہ: ۱۱۳)

نبی یا مومنوں کے لیے یہ جائز ہی نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے خواہ وہ ان کے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں' دعائے مغفرت کریں۔

جو نبی رحمت صاف ممانعت آنے سے پہلے مشرکوں اور منافقوں تک کو اپنی رحمت دعا سے محروم نہ کرے' وہ اگر ایک مرتے ہوئے محسن کو اقرار توحید کی ترغیب دے تو کون سی تعجب کی بات ہے؟ تقاضائے رحمت نبوی اور شے ہے اور اس کا نافع نہ ہونا الگ چیز ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضورؐ نے اس خیال سے اقرار توحید پر زور دیا ہو کہ خواہ مرنے والے کے لیے یہ سودمند نہ ہو مگر دوسرے زندوں کے لیے ایک بڑی ترغیب کا ذریعہ بن جائے گا۔

امتحان پر امتحان (وفات خدیجہؓ)

ابھی ابو طالب کی ابدی جدائی کا غم تازہ ہی تھا کہ تین ہی دن کے بعد ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ بھی داغ جدائی دے گئیں۔ یہی وہ رفیقہ زندگی ہے جو اول المومنین و المومنات ہے۔ یہی وہ بیوی تھی جس نے اپنی پچیس سالہ رفاقت میں ایک دن بھی اپنے شوہر کو آزردہ ہونے کا موقع نہ دیا۔ یہی وہ زوج صادقہ ہے جس نے اپنا تن من دھن اور اپنی ہر متاع عزیز کو حضورؐ پر نچھاور کر دیا۔ یہی جان نثار زوج ہے جس نے ہر مرحلہ امتحان پر پوری ثابت قدمی سے رسولؐ اللہ کا ساتھ دیا اور کبھی ماتھے پر بل نہ لائی۔ یہی وہ مومنہ صدیقہ ہے جس کی زوجی رفاقت ہر جوڑے کے لیے آئیڈیل کی حیثیت رکھتی

ہے اور یہی وہ تنہا رفیقہ زندگی ہے جس کے بطن اطہر سے رسولؐ کی نسلی نشانیاں باقی رہیں۔ کون اندازہ کرسکتا ہے اس صدمہ جانکاہ کا جو ان کی ابدی مفارقت سے رسولؐ اللہ کو پہنچا ہوگا۔ بلاشبہ یہ مومنہ صادقہ اپنے ظاہری حسن و جمال کی بہاریں کھو چکی تھی۔ پینسٹھ سال کی عمر ہو چکی تھی اور چہرے پر جھریاں آگئی تھیں، لیکن اس کی جھریوں کی ایک ایک شکن اس کی وفا، ایمان، ایثار اور استقامت کا نہ مٹنے والا نشان تھا۔

رسول اکرمؐ جن اقدار زندگی کو دنیا میں قائم کرنا چاہتے تھے، اس کا اندازہ اس بے پناہ محبت سے کیجئے جو خدیجہؓ کی زندگی ہی میں نہیں بلکہ ان کی جدائی کے بعد بھی حضورؐ ظاہر فرماتے رہے۔ حضورؐ اکثر اس پنج و شانزدہ (۶۵) سالہ کا ذکر خیر اس طرح فرمایا کرتے کہ حضرت عائشہؓ تقاضائے رشک سے پوچھ بیٹھتیں کہ کیا دنیا میں اور کوئی قابل ذکر عورت نہیں جو حضورؐ اسی مردہ بڑھیا کا ذکر کیے جاتے ہیں۔ اس پر حضورؐ فرماتے کہ اس میں فلاں اوصاف تھے اور فلاں خوبیاں تھیں۔ (شیخین و ترمذی عن عائشہؓ)۔ حضورؐ بعض اوقات کوئی بکری ذبح کرتے تو اس میں سے خدیجہؓ کی سہیلیوں کے لیے بھی حصہ بھیجتے۔

ذرا غور کیجئے اس گزری ہوئی بڑھیا کو حضورؐ کیوں یاد فرمایا کرتے تھے؟ کیا اس کے حسن و جمال کی وجہ سے؟ نہیں۔ پھر اس کی دولت مندی کے سبب سے؟ یہ بھی نہیں۔ پھر؟ صرف اس کی سیرت، بلند کرداری، ایمان، جاں سپاری، ایثار، وفا شعاری، استقامت، بردباری۔ یہ تھیں وہ اقدار جس نے حضورؐ کے دل میں خدیجہؓ کے لیے قابل رشک جگہ پیدا کر لی تھی۔ یہاں خدیجہؓ کی صورت سامنے نہ تھی، ان کی اعلیٰ سیرت کی کشش تھی۔

تین چار دن کے اندر اندر حضورؐ کو یہ صدمے ہوئے، ابو طالب جیسے ہمدرد و پشت پناہ کی موت اور خدیجہؓ جیسی مومنہ صادقہ اور رفیقہ زندگی کی جدائی۔ یہ شدید ابتلا اور آزمائش تھی۔ اس لیے حضورؐ اس سال کو عام الحزن

(غم کا سال) فرماتے تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وفات خدیجہؓ پہلے اور وفات ابو طالب بعد میں ہوئی۔

صدمات کے بعد تبلیغی سرگرمیاں

ایک انسان کی ہمتوں کو پست کرنے کے لیے یہ دو عظیم الشان صدمے ——— وہ بھی تین دنوں کے فصل سے ——— بہت کافی ہیں۔ لیکن پیغمبر کو انسانی اقدار کے قیام سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ حوادث سے وہ اتنا ہی بھر متاثر ہوتا ہے جو اس کے اصلی مشن کو مجروح نہ کرے' چنانچہ ان دو صدموں کے بعد حضورؐ کی تبلیغی سرگرمیوں میں نہ فقط یہ کہ کوئی کمی نہ آئی بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں بعض وہ اضافے ہوگئے' جو پہلے نہیں ہوئے تھے۔ ان دو ہمدردوں اور پشت پناہوں کا سایہ اٹھ جانے کے بعد کفار قریش اپنی ایذا رسانیوں میں اور زیادہ آزاد ہوگئے اور اسی نسبت سے حضورؐ اپنی سرگرمیوں میں اور زیادہ کمربستہ ہوگئے۔

ارض حبشہ سے مسلمانوں کی واپسی

اس درمیان میں ایک واقعہ اور بھی پیش آیا اور وہ یہ تھا کہ مہاجرین حبشہ کو یہ خبر ملی کہ مکے میں اہل اسلام اور اہل کفر کے درمیان مصالحت یا مفاہمت ہوگئی ہے یعنی یا تو اہل کفر اسلام لے آئے ہیں یا معاشری مفاہمت ہوگئی ہے' اس لیے حبشے سے کوئی تینتیس زن و مرد مکے واپس آگئے۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک موقعے پر حضورؐ نے سورہ نجم تلاوت فرمائی' اس لیے بہت سے مشرکین بھی اس مجمعے میں موجود تھے۔ حضورؐ نے آخری آیت (جو آیت سجدہ ہے) تلاوت فرمائی تو معاً" سجدے میں چلے گئے۔ جو مسلمان وہاں موجود تھے وہ بھی سجدے میں گر پڑے اور ساتھ ہی اس مجمعے کے مشرکین بھی سربسجود ہوگئے۔

یہ واقعہ بخاری، مسند احمد، نسائی وغیرہ میں موجود ہے اور اس میں ذرا بھی استبعاد نہیں۔ سورہ نجم پڑھتے پڑھتے حضورؐ پر اور سنتے سنتے اہل اسلام پر ایک خاص کیف طاری ہو جانا اور معاً" سر بسجود ہو جانا کوئی بعید از عقل بات نہیں ہو سکتی، اور اس وقت مشرکین کا اس کلام سے غیر معمولی طور پر متاثر ہونا اور اس ہمہ گیر فضا و ماحول میں از خود رفتہ ہو کر سب کے ساتھ سجدے میں گر جانا بھی بالکل قرین قیاس ہے۔ گزشتہ صفحات میں آپ نے کئی واقعات ایسے پڑھے ہیں اور آئندہ صفحات میں اس کا ذکر آئے گا کہ شدید معاندانہ اور منکرانہ جذبے کے ساتھ آنے والوں کے دل حضورؐ کی زبان سے قرآن سن کر ہاتھوں سے نکل گئے۔ پھر یا تو وہ اسی وقت ایمان لے آئے یا بدلے ہوئے چہروں کے ساتھ واپس ہوگئے۔ کلام و کلیم کی اس بے پناہ تاثیر سے کون انکار کر سکتا ہے؟ مشرکین کے اس وقتی اور بے خودانہ سجدے کی خبر کسی خاص رنگ میں سن کر اگر کچھ مہاجرین حبشہ نے یہ اندازہ لگایا ہو کہ مکے کے اہل کفر اور اہل اسلام میں مصالحت یا مفاہمت ہوگئی ہے تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔ وہ لوگ یہ تو نعوذ باللہ گمان ہی نہیں کر سکتے تھے کہ کفر و اسلام میں کوئی مفاہمت ہوگئی ہے، لیکن اہل کفر اور اہل اسلام میں کوئی سوشل قسم کی مفاہمت کا گمان پیدا ہو گیا ہو تو اس میں کوئی استبعاد نظر نہیں آتا۔

جناب ابوبکرؓ کا ارادہ ہجرت حبشہ

یوں تو جناب ابوبکر صدیقؓ کو بارہا کفار کے ہاتھوں سخت سے سخت جسمانی و ذہنی اذیتیں اٹھانی پڑی تھیں (جن کے تفصیلی ذکر کو ہم نے حذف کر دیا ہے) لیکن بنی ہاشم کی محصوری کے بعد ظالموں کے ظلم نے زیادہ شدت اختیار کر لی۔ جناب ابوبکرؓ بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ آخر ان مظالم سے عاجز آکر آپ نے بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح ہجرت حبشہ کا ارادہ کر لیا اور حضورؐ

سے اجازت لے کر چل کھڑے ہوئے۔ ایک دو دن چلے ہوں گے کہ برک الغماد کے پاس ابن الدغنہ ملا۔ (۱۵) یہ اس وقت احابیش (۱۶) کا سردار تھا اور اسلام نہ لایا تھا۔ اس نے پوچھا کہ: "ابوبکرؓ! کدھر کا ارادہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ: میری قوم مجھے نکال رہی ہے جس نے مجھے تکلیفیں پہنچا پہنچا کر میری زندگی تنگ کر دی ہے۔ ابن الدغنہ نے کہا:

"ابوبکرؓ! تم جیسا آدمی نہ نکل سکتا ہے نہ نکالا جاسکتا ہے۔ تم بے کسوں کے کام آتے ہو۔ صلہ رحمی کرتے ہو۔ دوسروں کا بار اپنے سر لیتے ہو۔ مہمان نواز ہو اور تمام پیش آنے والے حوادث میں حق کی حمایت کرتے ہو ————

میں تمھیں پناہ دیتا ہوں۔ واپس چلو اور اپنے شہر (مکہ) ہی میں رہ کر اپنے رب کی عبادت کرو۔"

ابن الدغنہ جناب ابوبکرؓ کو مکے واپس لے آیا اور اپنی پناہ کا اعلان کر دیا۔ قریش نے اس کی پناہ کو تو رد نہیں کیا مگر ابن الدغنہ کے ذریعے جناب ابوبکرؓ سے فرمائش کرائی کہ وہ نماز و تلاوت اپنے گھر ہی میں کریں اور آواز بلند نہ کریں، کیوں کہ اسے سن کر ہماری عورتیں اور بچے فتنے میں پڑ جاتے ہیں (یعنی متاثر ہوتے ہیں جس سے ان کے اسلام لے آنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔)

فنافی الرسول کا مقام

آگے چلنے سے پہلے ذرا ان الفاظ کو بار بار پڑھیے جن سے ابن الدغنہ نے جناب ابوبکرؓ کی سیرت و کردار کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نے قریش کے سامنے پناہ کا اعلان کرتے ہوئے ان ہی الفاظ کو دہرا کر انھیں شرم دلائی ہے کہ تم ان صفات کے انسان کو شہربدر ہونے پر مجبور کرتے ہو؟ ایسا انسان نہ نکل سکتا ہے اور نہ نکالا جاسکتا ہے۔ بہرکیف یہاں قابل غور مقام یہ ہے کہ جو الفاظ آغاز وحی

کے بعد ـــــــ جب کہ حضورؐ کو اپنی جان کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا ـــــــ حضورؐ کو تسکین دیتے ہوئے جناب خدیجہؓ نے حضورؐ کے متعلق فرمائے تھے۔ آج حرف بہ حرف ان ہی الفاظ سے ابن الدغنہ سیرت ابوبکرؓ کی شہادت دے رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جناب خدیجہؓ اول المومنین و المومنات تھیں اور ابن الدغنہ ابھی تک پکا کافر ہے' مگر سیرت صدیق کا اس کے دل و دماغ پر کتنا گہرا اثر ہے کہ یہ اس کا صرف اعتراف ہی نہیں کرتا بلکہ قریش کے سامنے یہی اوصاف بیان کر کے انھیں غیرت دلاتا ہے اور برک الغماد سے ان ہی صفات حمیدہ کی بنیاد پر واپس لاتا اور اپنی پناہ دینے کا اعلان کرتا ہے۔

صوفیائے کرام کے ہاں "فنافی الرسول" کا کیا مقام ہے' اس کا ادراک ہماری رسائی سے باہر ہے' لیکن اتنی بات ضرور عرض کی جاسکتی ہے کہ اس فنائیت فی الرسول کی قوی ترین اساس یہی سیرت کی ہم آہنگی ہو سکتی ہے جس کی شہادت ابن الدغنہ دے رہا ہے۔

واپسی کی خدائی مصلحت

جناب ابوبکرؓ جانے کو تو بہ ظاہر روانہ ہو گئے تھے لیکن قدرت ابن الدغنہ کو بہانہ بنا کر واپس لے آئی۔ وہ حبشہ یا کسی اور جگہ کیوں کر جاسکتے تھے جب کہ انھیں قدرت ایک اور بڑے کام کے لیے منتخب کر چکی تھی۔ انھیں حبشے کی طرف نہیں جانا تھا۔ انھیں تو مدینے کی طرف ہجرت کرنی تھی اور حضورؐ کے ساتھ تنہا یہ سفر کرنا تھا۔ ایک ایسی رفاقت میں خلا کیسے پیدا ہو سکتا تھا جسے بچپنے سے لے کر قبر تک قائم رہنا تھا۔

ثانی اسلام و غار و بدر و قبر

پناہ کی واپسی

ابھی آپ اوپر یہ پڑھ چکے ہیں کہ قریش کے کہنے سے ابن الدغنہ نے

جناب ابوبکرؓ سے یہ فرمائش کی تھی کہ اپنے گھر کے اندر نماز اور تلاوت میں آواز نہ بلند کریں کیوں کہ اس سے ہماری عورتیں اور بچے متاثر ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے چند دن تو اس فرمائش کی تعمیل میں پابندی قائم رکھی لیکن جب ذوق و شوق غالب ہوا تو جس طرح بوقت تلاوت اپنی آنکھوں پر قابو نہ تھا' اسی طرح اپنی آواز پر بھی اختیار نہ رہا۔ سننے والے پھر ان کے گرد جمع ہونے لگے اور قرآنی تاثیر اپنا کام کرنے لگی۔ یہ دیکھ کر قریش نے ابن الدغنہ سے شکایت کی۔ اس نے آپ کو ادھر توجہ دلائی تو آپ نے فرمایا کہ: بھئی! مجھے تمھاری یہ شرط منظور نہیں اس لیے تم اپنی پناہ واپس لے لو۔۔ حضرت ابوبکرؓ کی اس جرات کو ذہن نشین کرلیجئے' شاید آگے حضورؐ کی "پناہ طلبی" کی بحث میں اس کا بھی ذکر آئے۔

ضماد ازدی کا پیغام

چہ شد یا رب کہ زاہد بر در میخانہ می رقصد
نظر بر روئے ساقی دارد و رندانہ می رقصد

ضماد ازد شنورہ کے قبیلے کے ایک فرد تھے۔ یہ ٹونے ٹوٹکے اور جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ دل اچھا پایا تھا اور کچھ اللہ پر بھی بھروسہ رکھتے تھے' اس لیے اپنے "کرتب" پر بہت زیادہ ادعا نہ تھا۔ یہ گھومتے پھرتے کہیں مکے میں آگئے۔ لوگوں کو کہتے سنا کہ (خاک بدہن ایشاں) محمدؐ دیوانہ ہوگیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ: اگر میں اس سے ملوں تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ میرے ہی ہاتھوں سے اسے شفا بخش دے۔" یہ حضورؐ کے پاس آئے اور بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے کہ: اے محمدؐ! میں اپنی جھاڑ پھونک سے کام لیتا ہوں اور میرے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے شفا دے دیتا ہے۔ آپ اپنی شکایت بیان کیجئے۔ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ حضورؐ نے ان کی باتوں کا جواب

دینے سے پہلے یہ الفاظ فرمائے:

ان الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ من یھدہ فلا مضل لہ ومن یضلل فلاھادی لہ۔ واشھدان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ واشھدان محمدا عبدہ و رسولہ۔ امابعد۔

حمد اللہ ہی کے لیے ہے۔ ہم اسی کی حمد کرتے ہیں۔ اسی سے مدد طلب کرتے ہیں اور اسی سے مغفرت چاہتے ہیں۔ وہ جسے ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ میں اس حقیقت کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں اور اس بات کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔ امابعد۔

"امابعد" فرماکر حضورؐ ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے کچھ اور فرمانا چاہتے تھے کہ ضماد ازدی کا رنگ متغیر ہوگیا۔ اپنی جھاڑ پھونک بھول گئے۔ توحید کا یہ مرقع ان کے سامنے پہلی بار آیا تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے جملوں کا ایک ایک لفظ ان کے دل کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا اور حق پسندی کا فطری جذبہ ابھرتا جا رہا تھا۔ آگے کچھ اور باتیں سننے کا انتظار نہ کرسکے۔ ان ہی جملوں کی تاثیر میں کھو گئے۔ ایک طرف جذبہ امارہ اپنی طرف عزت نفس کا واسطہ دے کر کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف ایک انوکھا پیغام جذبہ حق پسندی کو ابھار رہا تھا۔ نفسی کش مکش ابھی کسی آخری فیصلے پر نہ پہنچی تھی۔ حقیقت طلبی کی پیاس اور تیز ہوگئی۔ وحدت ربانی کے حقائق پر دوبارہ غور کرنے کے لیے ایک بار پھر فرمائش کردی کہ: "ذرا ان کلمات کو ایک بار اور تو فرمایئے۔" حضورؐ نے پھر وہی کلمات توحید دہرائے جو ضماد کے کانوں نے اس سے پہلے نہیں سنے تھے۔

اس کے بعد حضورؐ نے "اما بعد" فرما کر کچھ اور کہنا چاہا ہو گا کہ ضماد ان مختصر سے "جادو بھرے" کلمات کو ایک بار اور سننے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ پھر فرمائش کی کہ: "ایک بار اور اس نرالے پیغام کو دہرائیے۔" حضورؐ نے پھر انھی کلمات کا اعادہ فرمایا۔ اب ضماد اپنی نفسیاتی کش مکش سے بہ تدریج بلند ہو کر اس مقام پر آچکا تھا جہاں ایک فیصلہ کن اعتراف کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔ ابھی حضورؐ "اما بعد" کے بعد کچھ اور فرمانا چاہتے ہوں گے کہ ضماد کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور وہ نفسی کیفیت کش مکش سے باہر نکل آیا۔ کچھ اور سننے سے پہلے بول اٹھا:

> "میں نے کاہنوں کے جادو منتر بھی سنے ہیں۔ میں جادوگروں کے ٹونے ٹوٹکے بھی سن چکا ہوں اور میں نے شاعروں کے اشعار بھی بہت سنے ہیں مگر آپ کے ان پاکیزہ کلمات جیسی کوئی چیز سننے میں نہیں آئی ہے۔ یہ کلمات تو حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اپنا ہاتھ لائیے کہ اس مبارک ہاتھ پر اسلام کی بیعت کر لوں۔"

ضماد اب کلمہ شہادت ادا کر چکے تھے۔ محمدیؐ جنون عشق الٰہی نے انھیں بھی جنون عشق حق کا سرشار بنا لیا تھا۔ وہ "جنون حق" کا علاج کرنے آئے تھے اور خود ان کے "جنون کفر" کا علاج ہو گیا۔ مکے والوں کے لیے یہ حادثہ کچھ کم تعجب خیز نہ ہوا ہو گا۔ ان میں اپنی ناکامی کی شرمندگی کے ساتھ ساتھ جذبات غیظ و غضب بھی اور بھڑک اٹھے ہوں گے اور اسی نسبت سے مظالم نے بھی اور شدت اختیار کر لی ہو گی۔ قیاس اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اہل اسلام نے اس ازدی اول المومنین کی رعایت میں جن انسانی اندار کو ملحوظ رکھا اس کا اندازہ صرف اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ مدنی زندگی میں حضورؐ نے ایک سریہ (۱۷) کہیں بھیجا تو یہ سریہ قبیلہ ازد کی طرف

سے بھی ہوتا ہوا گزرا۔ امیر لشکر نے دریافت کیا کہ: کیا تم لوگوں نے اس قوم کی کوئی چیز بھی اپنے قبضے میں لی ہے؟ ایک شخص نے بتایا کہ: ہاں مجھے ایک لوٹا ملا ہے۔ امیر لشکر نے کہا کہ: اسے فوراً واپس کردو کیوں کہ یہ لوگ ضماد کی قوم میں سے ہیں۔

طفیل بن عمرو دوسی کا قبول اسلام

طفیل بن عمرو قبیلہ دوس کے سردار تھے اور صرف رسمی سردار نہ تھے بلکہ ان کے دلوں پر بھی ان کی حکومت تھی۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ خود ان کی بیوی جب ان سے گفتگو کرتی تو دوران گفتگو عموماً ”فداک ابی وامی“ (آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں) کہا کرتی تھی۔ یہ ایک طرف تو بڑے ہوش گوش کے مالک تھے اور دوسری جانب غیر معمولی بلیغ شاعر بھی تھے۔ یہ جب مکے میں آئے تو اہل مکہ نے ان کے اثر و رسوخ کے مطابق ان کا شان دار استقبال کیا اور تمام بااثر لوگوں نے مل کر حضورؐ کے خلاف اس قدر ان کے کان بھرے اور اتنا موثر پروپیگنڈا کیا کہ انھوں نے یہ طے کر لیا کہ جب کبھی بیت اللہ کے احاطے میں آؤں گا تو کانوں میں روئی (پنبہ) ٹھونس لیا کروں گا۔ یہ فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ اور کسی جگہ تو اہل مکہ حضورؐ سے ملنے کا کوئی موقع پیدا ہی نہ ہونے دے سکتے تھے لیکن بیت اللہ کا اتنا احترام اب بھی ان کے دلوں میں موجود تھا کہ حضورؐ کو یہاں آنے سے نہ روکتے تھے۔ اس لیے یہ امکان تھا کہ اس موقعے پر طفیل کا حضورؐ سے سامنا ہو جائے اور حضورؐ کی کوئی بات ان کے کانوں میں پڑ جائے۔ حضورؐ کی تاثیر کلام کا خوف ان کے دل میں اس قدر بٹھا دیا گیا تھا اور انھیں نفرت و گریز کے ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا کہ یہ چاہتے ہی نہ تھے کہ میرے کانوں میں حضورؐ کی آواز پڑے۔ لہٰذا یہ جب بیت حرام میں جاتے تو اپنے کانوں میں اچھی طرح روئی ٹھونس لیتے۔ ایک دن ایسا اتفاق

ہوا کہ یہ بیت اللہ میں گئے تو دیکھا کہ حضورؐ نماز ادا فرما رہے ہیں۔ طفیل نے اس کعبہ حقیقت کو کعبۃ اللہ کے پاس مصروف نماز دیکھا۔ ایک نور مجسم نور السماوات والارض کی یاد میں غرق و محو تھا اور درودیوار اس کی نورانی شعاعوں سے منور ہو رہے تھے۔ اس کے روحانی انعکاس نے اپنی غیر محسوس مقناطیسی کشش طفیل کے قلب پر ڈالی جس کے طفیل یہ طفیل بھی کھنچ کر حضورؐ کے قریب آگئے۔ دل میں کہا میں کوئی دودھ پیتا بچہ تو نہیں، اعلیٰ درجے کا شاعر ہوں۔ عقل و شعور کا مالک ہوں۔ اچھی اور بری باتوں میں امتیاز کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہوں۔ ذرا سنوں تو سہی کہ اس شخص کے ہلتے ہوئے ہونٹوں سے کیا کلمات نکل رہے ہیں؟ ———— یہ سوچ کر طفیل نے اپنے کانوں سے روئی نکال لی اور حضورؐ کی زبان اقدس سے وہ کلمات سنے جو اس سے پہلے سننے میں نہیں آئے تھے۔ ظاہر ہے نماز کے یہ کلمات کچھ قرآنی ہوں گے اور کچھ ماثورہ۔ یہ سارا کلام آج بھی وہی ہے جو اس وقت تھا۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ تاثیر صرف کلام کی نہیں تھی۔ اس کلیم کی زبان و روح کا بھی اس اثر میں خاصا دخل تھا۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے:

اس میں کچھ کچھ مری نگاہ بھی ہے
حسن تنہا نظر نہیں آتا

بہرکیف جب حضورؐ نماز سے فارغ ہو کر چلے تو ایک نامعلوم کشش طفیل کو بھی پیچھے پیچھے لے چلی۔ انھوں نے حضورؐ کو بتایا کہ: "مجھے یہاں کے لوگوں نے آپؐ کے خلاف اتنا بھڑکایا تھا اور ایسی ایسی باتیں کہی تھیں کہ میں اپنے کانوں میں پنبہ ٹھونس کر بیت اللہ میں آتا تھا کہ آپؐ کی کوئی آواز بھی میرے کانوں میں نہ پڑنے پائے لیکن آج خدا نے آپؐ کی زبان سے کچھ پاکیزہ کلمات سنوا ہی دیے۔ اب میں آپؐ سے آپ کا پیغام سننا چاہتا ہوں۔" حضورؐ نے انھیں اسلام کا پیغام پہنچایا اور آیات قرآنی سنائیں۔ ابھی تو طفیل نے کانوں

سے صرف روئی نکالی تھی مگر اب غفلت کفر کی ڈاٹ بھی بلا ارادہ نکل گئی۔ یہاں سے اسلام کی دولت لے کر اپنے قبیلے میں واپس آئے۔ یہاں ان کے والد (عمرو) نے اور پھر ان کی بیوی نے بھی اسلام کا پیغام سن کر قبول کر لیا۔ یہی طفیل جو اپنے کانوں میں اس لیے روئی ٹھونسے رہتے تھے کہ محمدؐ کی کوئی آواز کانوں میں نہ پڑنے پائے' ایک ایک کے کانوں تک آواز محمدؐ کو پہنچانے لگے۔ ان کی قوم نے ان کے پیغام کو قبول نہ کیا۔ یہ عاجز آکر خدمت نبویؐ میں پھر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: "میری قوم زنا کاری میں بہت گرفتار ہے' اس لیے بددعا فرمائیے۔" حضورؐ نے بددعا کی بجائے یوں دعا فرمائی کہ: "خداوند! قبیلہ دوس کو ہدایت دے اور ان سب کو میرے پاس لے آ۔" طفیل واپس آکر اپنا کام کرتے رہے اور ستر (۷۰)' اسی (۸۰) گھرانوں کو مشرف بہ اسلام کر کے مدینے لائے۔ یہ سب غزوہ خیبر (۷ ھ) میں بھی شریک ہوئے اور غنائم میں حصے دار ہوئے۔ پھر یہی طفیل فتح مکہ تک حضورؐ کے ساتھ رہے بلکہ وفات نبویؐ کے وقت بھی مدینے میں موجود تھے۔ فتنہ ارتداد پھیلنے کے بعد یہ کئی جگہ جنگوں میں بھی شریک رہے۔

طائف کا رخ

اب تک حضورؐ کا دائرہ عمل وانذر عشیرتک الاقربین (الشعرا: ۲۱۴) سے آگے لتنذر ام القری تک پھیلا تھا۔ اب اس دائرے نے بفحوائے ومن حولھا (الانعام: ۹۲) اور زیادہ وسعت پیدا کی اور حضورؐ نے طائف کا رخ فرمایا۔ یہاں بیشتر آبادی بنی ثقیف پر مشتمل تھی۔ ان لوگوں کی درشتی مزاج اور ان کے کردار سے حضورؐ ناواقف نہ تھے۔ حضورؐ کو دس سال کا یہ بھی اچھی طرح تجربہ تھا کہ پیغام توحید مشرکوں کے عقیدہ و مذہب پر کیسی شدید ضرب ہے؟ کس طرح وہ پیغام سن کر بوکھلا جاتے ہیں؟ پیغام دینے والوں کو کیسی

کیسی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ اور کس طرح اہل ایمان کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں؟ ان سب باتوں کا محض قیاسی نہیں بلکہ تجربی علم حضورؐ رکھتے تھے۔ طائف والوں سے اسی قسم کی خطرناک توقعات ہو سکتی تھیں۔ لیکن اعتماد علی النفس، توکل علی اللہ اور ہمت مردانہ کا کیسا عجب نمونہ حضورؐ نے پیش فرمایا کہ اس پرخطر آبادی کے الاؤ میں بے خطر کود پڑے۔ صرف ایک اول المومنین زید بن حارثہؓ ساتھ تھا اور کوئی سامان تحفظ نہ تھا۔

اس ہمت نبوی کی حقیقت کو وہی سمجھ سکتا ہے جو یقین، صداقت، اخلاص اور عشق انسانیت کی بے پناہ قوتوں کو جانتا ہو۔ جس انسان کے دل میں ان اقدار کی آگ سلگ رہی ہو اس کی نگاہ میں بڑی سے بڑی جانی و مالی آزمائشوں کی بھٹی بھی گل زار خلیلؑ بن جاتی ہے۔ زید بن حارثہ جیسا محبوب فداکار اگر ساتھ نہ بھی ہوتا تو حضورؐ کے عزم و ہمت میں کوئی کمزوری نہ آتی اور تنہا نکل کھڑے ہوتے۔ زید کے عشق رسالت نے اسے ساتھ رہنے پر مجبور کیا اور حضورؐ نے اس کے شوق ہمراہی کو اس لیے پورا ہونے دیا کہ ایک شاہد یعنی امت کے سامنے ان تمام مصائب کی گواہی دے سکے جو حضورؐ کو راہ حق کی تبلیغ میں جھیلنی تھیں۔ راہ خدا میں شدائد کا تحمل کرنے والے امتیوں کے لیے اس سے بڑی ڈھارس اور کیا ہو سکتی تھی کہ ان کا ملجا و ماویٰ بھی تمام مصائب و آلام کو مردانہ وار جھیل رہا ہے مگر اپنے فرائض میں سرمو فرق نہیں آنے دیتا۔

حضورؐ طائف پہنچنے سے پہلے ان تمام قبائل کو بھی آواز حق سناتے رہے جو راستے میں جا بجا موجود تھے۔

طائف کی آبادی بنی ثقیف پر مشتمل تھی۔ ان کے رئیس قبیلہ تین بھائی تھے۔ عبدیالیل، مسعود اور حبیب۔ یہ تینوں عمرو بن عمیر بن عوف بن عقدہ بن غیرہ بن عوف بن ثقیف کے فرزند تھے۔ حضورؐ سب سے پہلے ان

ہی تینوں کے پاس تشریف لے گئے اور پیغام حق پہنچایا۔ مگر ان کی طرف سے بڑا مایوس کن اور طنز آمیز جواب ملا۔ ایک نے کہا: "کیا تمھارے سوا خدا کو کوئی اور نہ ملا تھا جو وہ اپنا رسول بناتا؟ رسول تو کسی سردار قوم کو ہونا چاہیے تھا نہ کہ تمھیں جسے کوئی سواری بھی نصیب نہیں۔" دوسرے نے کہا: "کعبۃ اللہ کی اس سے بڑی کوئی توہین نہیں کہ تم جیسا شخص رسول ہو۔" تیسرے نے کہا: اگر تم سچے ہو تو تمھاری باتوں کا جواب دینا خلاف ادب ہے اور اگر جھوٹے ہو تو تم سے بات کرنا میری کسر شان ہے۔ یعنی دونوں حالتوں میں تم لائق تخاطب نہیں ہو۔

مظلومیت اور استقامت کا مقابلہ

ان مایوس کن جوابات کے بعد یقیناً حضورؐ کو یہاں کی پوری آبادی کے مزاج کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ اس اندازے کے بعد فطری تقاضائے بشریت یہی ہو سکتا تھا کہ یہاں مزید وقت نہ ضائع کیا جائے۔ لیکن جس کے اندر ایک بلند نصب العین کی لگن سما گئی ہو وہ مایوسی کو پاس نہیں آنے دیتا۔ حضورؐ کو بلغ ماانزل الیک کے مطابق اپنا فریضہ تبلیغ بہرحال ادا کرنا تھا خواہ کسی شکل میں اس کا نتیجہ نکلے۔

حضورؐ نے طائف میں دس دن قیام فرمایا۔ جہاں جہاں ممکن تھا جا کر لوگوں کے کانوں میں آواز حق پہنچائی۔ مگر ایک شخص نے بھی اس آواز پر لبیک نہ کہی۔ معاملہ صرف انکار حق تک ہی محدود نہ رہا بلکہ یہاں وہ وہ ایذائیں پہنچائی گئیں جو بعض حیثیت میں اہل مکہ کی ایذاؤں سے بھی بڑھ گئیں۔ یہاں کے سرداروں نے لڑکوں' غلاموں اور بدمعاشوں کو حضورؐ کے پیچھے لگا دیا۔ حضورؐ جہاں تبلیغ کے لیے کھڑے ہوتے وہاں یہ سب شوروغل کرتے' گالیاں دیتے اور پتھروں سے مارتے۔ حضورؐ کے پائے مبارک لہولہان ہو گئے۔ حضورؐ

نے ایک باغ میں پناہ لی جو ربیعہ کے دو بیٹوں عقبہ اور شیبہ کا تھا۔

یہاں حضورؐ پر ایک بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ زید بن حارثہؓ نے زخموں کو دھویا۔ پانی کے چھینٹے چہرہ انور پر ڈالے۔ حضورؐ ہوش میں آئے تو زبان اقدس پر یہ الفاظ تھے:

> مولا! اپنی بے بسی و بے کسی کی فریاد تیرے آگے پیش کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! مجھے تو نے کن لوگوں کے سپرد کیا ہے؟ ایسے دشمنوں کے حوالے کیا ہے جو ترش روئی سے پیش آئیں؟ یا ایسے اپنوں کے سپرد کیا ہے جن کو تو نے میرے معاملات پر متصرف بنا دیا ہے؟ اگر یہ تیری ناراضی نہیں تو مجھے ان تکالیف کی کوئی پروا نہیں۔ تیری دوسری نوازشیں میرے لیے وسیع ہیں۔ میں تیرے اس نور ذات کی پناہ لیتا ہوں جس سے تاریکیاں بھی چمک اٹھتی ہیں اور جس کی برکت سے دنیا و آخرت کے تمام معاملات درست ہو جاتے ہیں۔ پناہ اس بات سے کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو یا تیری ناراضی' میری رضا تیری ہی رضا کے ساتھ پیوستہ ہے۔ ہر حرکت اور ہر وقت اللہ ہی کی توفیق سے وابستہ ہے۔

لمحہ فکریہ

حضورؐ کو اور بھی بہت سے مواقع پر سخت سے سخت ایذائیں پہنچائی گئی ہیں۔ لیکن صحیحین کی روایت (عن عائشہ) کے مطابق طائف سے زیادہ حضورؐ کی نگاہ میں اور کسی موقعے کی ایذائیں نہ تھیں' اور اس کا ثبوت اس فریاد سے ملتا ہے جو حضورؐ نے اس موقعے پر بارگاہ خداوندی میں پیش فرمائی ہے۔ یہ ایک

ایسے دکھے ہوئے دل کی فریاد ہے جو اگر کنگرۂ عرش میں زلزلہ ڈال کر طائف کے دونوں پہاڑوں کو بھی ہلا دیتا جو یہاں کی ساری آبادی کو پیس کر رکھ دیتے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ طائف کے سراسر ظالمانہ اور منافی انسانیت سلوک سے اگر حضورؐ میں مایوسی کے جذبات پیدا ہو جاتے جب بھی یہ تقاضائے بشریت ہی ہوتا' لیکن یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں انسان کی دو متضاد جذباتی قوتوں کے تقابل کا امتحان ہوتا ہے۔ ایک طرف مایوسی کے تمام عوامل بنیان مرصوص کی طرح درمیان میں حائل ہوتے ہیں اور دوسری جانب رجائیت کی اعلیٰ قدریں مایوسی کی دیواروں کو ہی نہیں بلکہ زمان و مکان کی حدود کو بھی چیرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہیں۔ رحمت الٰہی سے مایوسی تو شیوۂ کفر ہے:

لا تایئسوامن روح اللّٰہ ○ انہ لایا یئس من روح اللّٰہ الا القوم الکفرون ○ (یوسف : ۸۷) وہ مصلح اعظمؐ جو ساری انسانی اقدار کی اقامت کا بار اپنے سر پر لیے ہو اپنی رجائی قدروں کو کیوں کر ایک لمحے کے لیے بھی ترک کر سکتا تھا؟

انسانی سرشت تو یہ ہے کہ معمولی اذیت اور تھوڑی مایوسی پر بھی زبان قابو میں نہیں رہتی۔ وہ درست کلامی کی بجائے درشت کلامی پر اتر آتا ہے اور بددعائیں دے کر اپنے انتقامی جذبات کا بخار نکالنے لگتا ہے۔ رجائیت اس کی مایوسی سے مغلوب ہو جاتی ہے اور زبان سے وہ کلمات نہیں نکلتے جو متوازن حالت میں نکلتے ہیں۔ مگر اس بے کس' انتہا سے زیادہ ستائے ہوئے مظلوم فریادی کی اس فریاد کو بار بار پڑھیے۔ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے۔ اس کے کسی لفظ میں توازن کا بگاڑ ہے؟ کہیں سخت کلامی ہے؟ کسی جگہ ظالموں کے لیے بددعا ہے؟ کسی ٹکڑے سے مایوسی کا کوئی شائبہ پیدا ہوتا ہے؟ بات صرف اتنی ہی نہیں بلکہ ان دل کو ہلا دینے والی فریاد کا ایک ایک لفظ بے شمار بنیادی قدروں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ صحیح بندگانہ عجز و انکسار' خدا کی

رحمت پر کامل اعتماد' اس کی ناراضی سے پناہ طلبی' اس کی بے شمار نعمتوں کا اعتراف' دنیا اور آخرت میں رجائی قدروں کا اظہار' کامل تفویض اور سپردگی کا اعلان' راہ حق میں ہر مصیبت کو بے پروائی سے جھیلتے رہنے کا عزم۔ اللہ اللہ یہ محض ایک فریاد ہی نہیں۔ یہ پیغمبرانہ مشن اور اس کی قدروں کا ایک پورا سمٹا ہوا سمندر ہے جو ان چند لفظوں میں سمو دیا گیا ہے۔ پیغمبری عظمت و رفعت کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہ طائفی فریاد ایک مستقل اور کامل نمونہ ہے۔

ایک نبی کی رجائی قوت کا اندازہ حضورؐ کے اس جملے سے بھی کرنا چاہیے جس نے رجائیت کی ایک نئی قدر دنیا کو بخشی ہے۔ حضورؐ نے اس موقعے پر فرمایا:

> "مجھے امید ہے کہ (اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں تو) ان کی آئندہ نسل سے ایسے لوگوں کو اللہ پیدا فرما دے گا جو اسی کی بندگی کریں اور کسی شے کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔"
> (شیخین عن عائشہؓ) (۱۸)

عداس کی عقیدت

مظلومیت جب انتہا کو پہنچ جائے تو اس کا کچھ نہ کچھ رد عمل بھی ہوتا ہے۔ حضورؐ کے ساتھ جو کچھ بھی انسانیت کش برتاؤ اہل طائف کی طرف سے ہو رہا تھا اسے عتبہ اور شیبہ دونوں بھائی دیکھ رہے تھے اور خوشی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ لیکن آخر ان کا ضمیر بیدار ہوا اور دل بھر آیا۔ پھر حضورؐ نے جب ان ہی کے باغ میں پناہ لی تو جہاں ان دونوں کا دل مظلومیت کو دیکھ کر بھر آیا تھا' وہاں عرب کا ایک متوارث جذبہ مہمان نوازی بھی ابھر آیا۔ انھوں نے ایک طشت میں کچھ انگور رکھ کر اپنے ایک نصرانی غلام "عداس" کو حضورؐ کے پاس بھیجا۔ عداس نے حضورؐ کی خدمت میں انگور پیش کیے۔ حضورؐ نے "بسم اللہ"

فرما کر کھانا شروع کیا۔ اس کے بعد یوں گفتگو ہوئی:

"یہاں کے لوگ تو یہ لفظ استعمال نہیں کرتے۔"

"تم کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہارا کیا دین ہے؟"

"نصرانی ہوں اور نینوا کا باشندہ ہوں۔"

"ہاں یہیں کے رہنے والے تو میرے صالح بھائی یونس بن متی بھی تھے۔"

"آپ کو یونس بن متی کے متعلق یہ معلومات کیسے حاصل ہوئیں؟"

"بھئ وہ بھی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔"

عداس یہ سن کر آگے جھکا اور حضورؐ کے ہاتھ پاؤں اور سر کو بوسہ دیا۔ عتبہ اور شیبہ دونوں دور سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: یہ غلام ہمارے ہاتھ سے گیا۔ جب عداس واپس آیا تو ان دونوں بھائیوں نے پوچھا کہ: "تم اس شخص کے سر اور ہاتھ پاؤں کو کیوں چوم رہے تھے؟ اس نے جواب دیا کہ: "آقایان من! اس شخص سے بہتر روئے زمین پر کوئی شے موجود نہیں۔ اس نے مجھے بعض وہ باتیں بتائی ہیں جو ایک پیغمبر ہی بتا سکتا ہے۔ یہ سن کر دونوں بھائی بولے کہ: خبردار ایسا نہ ہو کہ یہ تمھیں تمھارے دین سے پھیر دے۔ تمھارا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔

عداس والی یہ پوری روایت ابن اسحاق کی ہے۔ بعض سیرت نگاروں نے اسے بہ نظر اختصار حذف کر دیا ہے لیکن ہم نے اسے اس لیے درج کیا ہے کہ اس سے حضورؐ کی اس قوت یقین اور جذبہ تبلیغ کا اندازہ ہوتا ہے جس سے حضورؐ کا ایک لمحہ بھی خالی نہ رہا۔ اتنی مصیبتوں' ایسی سخت آزمائشوں اور اذیتوں کے بعد بھی یہ پیغام پہنچانے میں کہ "یونس بھی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں" ادنیٰ تامل بھی نہ فرمایا۔

طائف کے بعد کی تبلیغی سرگرمیاں

طائف کے تلخ اور مایوس کن تجربے کے بعد بشری فطرت کا تقاضا یہ تھا کہ دل بیٹھ جاتا' مایوسی غالب آجاتی اور تبلیغ حق کی سرگرمیاں سرد پڑ جاتیں۔ مگر نبوت کی بے پناہ قوت عمل عام انسانی فطرت سے بہت بلند و بالا ہوتی ہے۔ مایوسی اس کے سامنے آکر خود مایوس ہو جاتی ہے۔ حضورؐ پر طائف کے تجربات نے الٹا اثر کیا اور اس کے رد عمل نے تبلیغی سرگرمیوں میں اور زیادہ چستی و تیزی پیدا کر دی۔ اگر رجائی استقامت بھی کوئی اعلیٰ قدر ہے ——————— اور یقیناً ہے ——————— تو یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ اس کا سب سے برتر عملی نمونہ حضورؐ ہی کی ذات ہے۔

طائف سے واپس آکر حضورؐ کی تبلیغی سرگرمیوں میں دو چند اضافہ ہو گیا۔ اب حضورؐ ایک ایک کے گھر جا کر پیغام حق پہنچانے لگے۔ ہر میلے میں' ہر مجمعے میں' ہر بازار میں' ہر گلی کوچے اور ہر قبیلے میں بے خوف و خطر گھس کر حق کی آواز سناتے۔ بنی عامر بن صعصعہ' بنی محارب' بنی فزارہ' بنی غسان' بنی مرہ' بنی حنیفہ' بنی سلیم' بنی عبس' بنی نضر' بنی کندہ' بنی کلب' بنی حارث بن کعب' بنی عذرہ اور بنی حضرم' غرض ایک ایک قبیلے کے سردار' خواص اور عوام سے مل مل کر دعوت حق دیتے رہے۔ کہیں مباحثہ ہوا' کہیں مذاق اڑایا گیا' کہیں دھمکیاں دی گئیں' کہیں ایذائیں پہنچائی گئیں اور کہیں جان کے لالے پڑ گئے۔ اکثر جگہ ابولہب یا ابوجہل اور ان کے ساتھی شور مچانے اور لوگوں کو برگشتہ کرنے کے لیے ساتھ ہوتے مگر ایک موقع بھی ایسا نظر نہیں آتا جہاں حضورؐ کے عزم و استقامت میں کوئی فرق آیا ہو یا غیر متوازن کلمات زبان پر آئے ہوں۔ چند جگہ بعض سعید روحیں متاثر بھی ہوئی ہوں گی مگر عام طور پر ہر جگہ انکار سے جواب ملا۔ لیکن ادائے فرض میں کوئی کوتاہی نہیں آئی اور دعائے ہدایت کے سوا خدا سے شکایت کا کوئی حرف زبان پر نہ آیا۔ یہ فوق الفطرت اقدار ایک نبی کے سوا اور کسی میں ہو سکتی ہیں؟

دائرہ تبلیغ کی وسعت (..... ومن حولہا) ۱۰ نبوت

حضورؐ کی اس مزید سرگرمی کے بعد بہ ظاہر اہل مکہ کے لیے کوئی پیغام موثر نہیں رہا تھا کیوں کہ منکرین کی شدت انکار میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہو رہا تھا جس نسبت سے حضورؐ کی سرگرمی تبلیغ میں اضافہ ہوا تھا۔ جہاں تک لتنذر ام القریٰ کے فریضے کا تعلق تھا وہ حضورؐ نے سو فی صد پورا فرما دیا بلکہ طائف کے سفر نے ومن حولھا میں بھی ابتدائی قدم رکھ دیا اور ام القریٰ سے باہر تبلیغ دین کے دوسرے قدرتی مواقع بھی پیدا ہو گئے تھے یعنی ایک طرف تو مہاجرین حبشہ نے تبلیغی فرائض انجام دیے اور دوسری طرف یہ ہوا کہ باہر سے جو سلیم الفطرت انسان مکے میں آتے اور ان کو حضورؐ کا پیغام سننے کا اتفاق ہوتا وہ ایمان لے آتے مثلاً ابوذر غفاری' ضماد ازدی' طفیل بن عمرو دوسی وغیرہ۔ گویا ام القریٰ کے ساتھ ہی ومن حولھا بھی تدریجی رفتار سے تبلیغی دائرے میں شامل ہو رہا تھا۔

مگر اب اس دائرے کی وسعت نے ایک نئی کروٹ لی اور اس کی وجہ سے اہل اسلام کے لیے ایک نئے دور زندگی کی بنیاد پڑ گئی۔ حضورؐ نے ایک ایک کے کان میں حکمت' موعظت اور مجادلہ حسنہ (۱۹) کے تمام پہلوؤں سے آواز حق پہنچانے کے بعد اب خاص طور پر باہر سے آنے والوں (خواہ وہ زائرین ہوں یا تجار) کی طرف اپنی توجہ مرکوز فرمائی۔

جاہلیت میں بھی ہمیشہ سے رسم حج ادا کی جاتی تھی اور لوگ ہر طرف سے حج و زیارت کے لیے ہر سال موسم حج میں آیا کرتے تھے۔ کسی نہ کسی شکل میں سیدنا ابراہیمؑ کی یہ دعا قبولیت کا رنگ دکھاتی رہتی تھی کہ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم (ابراہیم: ۳۷) (خداوندا! لوگوں کے دلوں کو ان ساکنان صحرا کی طرف مائل کر دے)۔ کعبتہ اللہ کی یہ مرکزیت بڑی قوت کے

ساتھ ہمیشہ مسلسل باقی رہی۔ یہی وہ پرزور مرکزیت تھی جسے توڑنے کے لیے ابرہہ نے اپنے ہاتھیوں اور پیل تن ساتھیوں کے ساتھ ناقابل مقاومت حملہ کیا تھا اور حملے سے پہلے ہی سارا لشکر بھونسے کی طرح اڑ گیا۔ یہ اتنا بڑا اور ناقابل یقین قسم کا واقعہ تھا کہ اس سنہ کا نام ہی "عام الفیل" رکھا گیا اور قرآن پاک میں سورت فیل اسی اعجوبہ روزگار واقعے کی یاددہانی کے لیے نازل ہوئی۔ ظاہر ہے اس واقعے کے بعد کعبتہ اللہ کی مرکزیت اعتقاداً" اور عملاً دو چند ہوگئی ہوگی۔ خدا نے بھی اسی کو مرکز عالم بنانا پسند کیا اور اسی مرکز ابراہیمی کو دعائے ابراہیمی ...... وابعث فیھم رسولا کی قبولیت گاہ بنایا۔

یہاں حج اور عمرہ ادا کرنے کے لیے ہر طرف سے زائرین آیا ہی کرتے تھے' اس لیے حضورؐ نے اب ان آنے والوں کی طرف خصوصی توجہ مبذول فرمائی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ منکرین نے شروع ہی میں یہ پکا بندوبست کر لیا تھا کہ باہر سے کوئی آنے والا حضورؐ سے نہ ملنے پائے۔ کسی کے کانوں میں کوئی آواز اسلام نہ پڑنے پائے۔ وہ ہر آنے والے کو حضورؐ کے خلاف پوری طرح کان بھر کر پہلے ہی ورغلا چکتے تھے اور ان کی ایک جماعت مستقل اسی کام پر لگی رہتی تھی کہ اگر کوئی موقع ایسا آئے تو شور' غل' استہزا اور مخالفانہ پروپیگنڈا کرنے سے کوئی دریغ نہ کرے۔ ان حالات میں حضورؐ کا علانیہ کسی کو تبلیغ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ لہٰذا قدرت نے اس مقصد کے لیے ایک خاص موقع پیدا کر دیا کہ ایک شب حضورؐ مقام عقبہ سے گزر رہے تھے کہ یثرب (مدینہ منورہ) کے قبیلہ خزرج کے کچھ آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ ان کے نام یہ ہیں: ابو امامہ اسعد بن زرارہ' عوف بن حارث' رافع بن مالک بن عجلان' ابوالہیثم' مالک بن تیہان' عقبہ بن عامر' قطبہ بن عامر' جابر بن عبداللہ' معاذ بن عفرا' زکوان بن عبد قیس' عبادہ بن صامت' ابو عبدالرحمان' یزید بن ثعلبہ' عویم بن ساعدہ' رافع بن مالک بن عفرا۔

یہ کل تیرہ ہوتے ہیں۔ بعض روایت کے مطابق چھ یا آٹھ تھے۔ پھر ان چھ یا آٹھ کے ناموں میں بھی اختلاف ہے کہ کون کون تھے؟ بہرحال اس وقت اس کی تحقیق ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ صرف اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ ان میں دو ——— عویم اور ابوالہیثم ——— قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دونوں خزرجی نہیں ہیں۔ ہمارا قیاس ہے کہ اس موقعے پر صرف خزرجی زائرین نہ ملے تھے بلکہ ایک یا دو اوسی بھی تھے خواہ ایک ساتھ ہی ملے ہوں یا الگ الگ' اور یہی سبب تھا کہ دوسرے سال اسی جگہ مزید اوسی بھی آئے۔

حضورؐ نے ان کے سامنے اسلام پیش فرمایا اور کچھ قرآن سنایا' اور ان چھ یا آٹھ آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا۔

خزرج و اوس

یہاں ایک ضروری چیز بھی سن لینی چاہیے۔ اوس اور خزرج مدینے کے دو بڑے اہم قبیلے تھے۔ ان دونوں میں ایک ایسی خوں ریز جنگ ہوئی تھی جو ایک سو بیس سال تک جاری رہی۔ جھگڑا اس بات پر شروع ہوا تھا کہ گھڑدوڑ میں ایک گھوڑا دوسرے سے آگے نکل گیا تھا۔ مدینے کے قریب ایک مقام ہے جسے بعاث کہتے ہیں۔ (۲۰) یہی مقام میدان جنگ تھا جس کی وجہ سے اس کا نام جنگ بعاث پڑ گیا۔ اس جنگ میں ابتداء" تو خزرج کو فتح ہوئی تھی لیکن بعد میں انھیں سخت شکست ہوئی۔ لہٰذا یہ مکے میں اس لیے آئے تھے کہ قریش کو اپنا حلیف بنائیں اور اوس سے انتقام لیں۔

یہ دونوں قبیلے قحطان کی اولاد ہیں۔ مدینے اور اطراف کے یہودیوں سے بھی ان کا جنگ و صلح کا تعلق قائم تھا جس میں کبھی فتح ہوتی اور کبھی شکست۔ ان اہل کتاب (یہودیوں) سے تعلق و ربط کی وجہ سے اوس و خزرج

کے کان بھی ایک نبی آخرالزمان کے ذکر سے آشنا ہو گئے تھے اور وہ بھی گویا یہود ہی کی طرح اس کے ظہور کے منتظر تھے کہ یہود کو یہ یقین تھا کہ یہ نبی آخرالزمان تمام دوسرے پیغمبروں کی طرح بنی اسرائیل ہی میں ظہور پذیر ہو گا۔ چنانچہ وہ بعض اوقات اپنے دشمنوں کو (اوس و خزرج کو خصوصاً) یہ کہہ کر دھمکیاں دیتے تھے کہ: "ذرا ٹھہرو۔ وہ آنے والا جب آئے گا تو ہم اس کی امت بن کر تم سے انتقام لیں گے۔" لیکن معاملہ کچھ الٹا سا ہو گیا۔ بعد میں یہود تو اس لیے حضورؐ کے مخالف ہو گئے کہ نبی آخرالزمان اور رسول منتظر کا ظہور بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں کیوں ہوا؟ اور ادھر یہ ہوا کہ مقام عقبہ پر جب خزرجیوں نے حضورؐ کا پیغام اور ساتھ ہی قرآن سنا تو معاً" ایک نبی منتظر کا نقش لوح دل پر ابھر آیا اور سب کے سب اسلام لے آئے۔

انسانی تاریخ میں یہ المیہ ہر جگہ نظر آئے گا کہ بعض اوقات راہبر خود بھٹک جاتا ہے اور راہرو منزل مقصود پا لیتا ہے۔ خزانے کا پتا بتانے والا خود اس سے محروم رہتا ہے اور سننے والا دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ کر اپنا جیب و دامن بھر لیتا ہے۔ ان انصار مدینہ کو نبی منتظر کی خبر یہود ہی نے دی تھی لیکن وہ خود اپنی کج عقلی اور اسرائیلی عصبیت و جنبہ داری کی وجہ سے اس فیض عام سے محروم رہے اور ان ہی سے سننے والے اوس و خزرج نے اس دولت کونین سے اپنے خزانے پر کر لیے۔ ان یہودیوں میں صرف چند سعید روحیں تھیں جنھوں نے حضورؐ کو اور حضورؐ کے پیغام کو صدق دل سے قبول کر لیا۔ ان میں سے بعض کا ذکر آگے آئے گا۔

مصعب بن عمیر کی روانگی مدینہ اور حکیمانہ تبلیغ

یہ خزرجی (اور اغلب ہے کہ دو ایک اوسی بھی) اسلام لانے کے بعد یثرب (مدینے) واپس گئے۔ (اسلام لانے کے بعد انہی دونوں قبیلوں کا لقب

"انصار" ہوگیا۔ اس نئے پیغام کے زور و قوت کا یہ اثر تھا کہ ان کے مدینے پہنچنے کے بعد تمام انصار کے گھروں میں حضورؐ ہی کا چرچا ہونے لگا اور ہر ایک انصاری دیدار نبوی کا مشتاق ہوگیا۔ ان لوگوں نے آئندہ سال پھر حاضر ہونے کا وعدہ کر لیا تھا، مگر یہ پورا سال اس شدید بے چینی میں گزارنا مشکل تھا اور دینی معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ ابھی نہ یہ خود آسکتے تھے نہ اکثر انصار کے قبول اسلام سے پہلے حضورؐ کو آنے کی دعوت دینا مناسب سمجھتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے معاذ بن عفرا اور رافع بن مالک کو خاموشی کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں بھیج کر درخواست کی کہ کسی کو دینی تعلیم کے لیے ہمارے پاس بھیج دیجیے۔" حضورؐ نے مصعب بن عمیر کو بھیج دیا جو مدینے میں اسعد بن زرارہ کے مہمان ہوئے۔ (۲۱)

جب مصعب مدینے پہنچ کر ہر روز کسی نہ کسی انصاری گھرانے میں جاتے اور تبلیغ کرتے اور شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہوگا جس میں ایک دو نئے مسلمان نہ ہو جاتے ہوں۔

ایک دن اسعد بن زرارہ اور مصعب بن عمیر بنی عبدالاشہل اور بنی ظفر کے محلوں کی طرف گئے۔ بنی عبدالاشہل کے سردار اس وقت سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر تھے۔ سعد بن معاذ اور اسعد بن زرارہ باہم خالہ زاد بھائی تھے۔ اسعد اور مصعب بنی ظفر کے محلے میں ایک کنوئیں (جس کا نام بئر مرق تھا) کے پاس بیٹھ گئے اور چند نو مسلم بھی وہیں جمع ہوگئے۔ یہ اطلاع پاکر سعد بن معاذ نے اسید بن حضیر سے کہا کہ: "تم ذرا ان دونوں (اسعد اور مصعب) کو جا کر دیکھو۔ یہ ہمارے محلے میں کمزور طبع لوگوں کو بے وقوف بنانے اور بھکانے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ انھیں جا کر ڈانٹ دو کہ ہمارے محلے میں نہ آیا کریں۔" یہ اسعد (بن زرارہ) میرا عزیز (خالہ زاد بھائی) نہ ہوتا تو میں اسے مزا چکھا دیتا لیکن اس عزیز داری کی وجہ سے میرا بس نہیں چلتا۔" یہ سن کر اسید

اپنا ہتھیار سنبھال کر چل پڑے۔ ان دونوں کو پہلے تو خوب صلواتیں سنائیں۔ پھر کہا کہ: "اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو یہاں کے کم عقلوں کو بے وقوف بنانے کی غرض سے یہاں پھر قدم نہ رکھنا۔" مصعب نے بڑی شرافت اور نرمی سے کہا: "کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ آپ ذرا بیٹھ جائیں اور دو چار باتیں سن لیں؟ اگر کوئی بات پسند آئے تو مان لیجیے گا اور اگر ناپسند ہو تو ٹھکرا دیجیے۔" اسید یہ کہتے ہوئے کہ "بات تو انصاف کی کہی" قریب آکر بیٹھ گئے۔ جناب مصعب بن عمیر ابتدائی اسلام لانے والوں میں تھے اور حضورؐ اکرمؐ کے تربیت یافتہ تھے۔ مدینے آکر اپنی تبلیغی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتے تھے اور اس دوران میں خاصے تبلیغی تجربات حاصل کر کے "پیغمبرانہ انداز" بھی پیدا کر چکے تھے۔ انھوں نے اسید کے سامنے ایسے حکیمانہ اور مخلصانہ انداز سے اسلام پیش کر کے قرآن سنایا کہ ان کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ قبول اسلام کی غمازی کرنے لگا جسے اسعد نے بھی بھانپ لیا۔ اسید نے کہا کہ: "کتنے پاکیزہ حقائق تم نے سنائے ہیں۔" اچھا اس دین میں داخل ہونے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے؟" مصعب نے کہا: "بس غسل کر لو۔ کپڑے پاک کر لو۔ پھر کلمہ شہادت ادا کر کے نماز ادا کر لو۔" اسید نے اسی وقت یہ سب کچھ کر کے کلمہ شہادت پڑھا اور دو رکعت نماز بھی ادا کر لی۔ پھر کہا: "میرے پیچھے ایک آدمی اور ایسا ہے کہ اگر وہ اسلام قبول کر لے تو اس کی ساری قوم ہی اسلام لے آئے گی۔ وہ ہے سعد بن معاذ۔ میں ابھی اسے کسی بہانے تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔" اسید روانہ ہو گئے اور سیدھے سعد بن معاذ کے پاس پہنچے جہاں ان کے اور بھی بہت سے اہل قبیلہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ذرا عربوں کی ذہانت و فطانت ملاحظہ فرمائیے۔ اسید کو دور ہی سے دیکھ کر سعد بن معاذ بول اٹھے: "میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسید جو چہرہ لے کر یہاں سے گیا تھا وہ چہرہ لے کر واپس نہیں آرہا ہے۔" اسید جب قریب آئے اور سعد نے کیفیت دریافت کی تو انھوں نے بتایا کہ: "میں نے اسعد اور مصعب میں کوئی

خاص خرابی تو نہیں پائی ہے۔ دونوں کو میں نے سمجھا دیا ہے اور وہ مان بھی گئے ہیں۔ البتہ یہ معلوم ہوا ہے کہ بنی حارثہ تمھارے خالہ زاد بھائی (اسعد بن زرارہ) کو صرف تمھاری تحقیر کی غرض سے قتل کرنا چاہتے ہیں۔" سعد کو یہ سن کر غصہ آیا اور وہ اپنا ہتھیار سنبھال کر ان دونوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے بھی برا بھلا کہہ کر وہی باتیں کہیں جو اس سے پہلے اسید نے کہی تھیں۔ پھر تقریباً اسی انداز سے مصعب ان سے پیش آئے اور سعد بھی اسید ہی کی طرح اسلام لے آئے اور اپنی قوم میں واپس آگئے۔ اسید نے بھی دور ہی سے دیکھ کر وہی کہا جو سعد نے اسید کے بارے میں کہا تھا: "بخدا یہ وہ چہرہ لے کر واپس نہیں آرہا ہے جو لے کر گیا تھا۔"

لیکن جو نئی بات ہوئی وہ یہ تھی کہ سعد نے اپنی قوم سے پہلے ایک سوال کیا کہ: "میرے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ: "ہمارے سردار ہو۔ سب سے افضل ہو۔ ایمن النقیبہ ہو۔" قوم کے اس جواب کے بعد سعد بن معاذ نے اپنے پروقار لہجے میں اپنے آخری فیصلے کا یوں اعلان کر دیا کہ "سن لو آج سے تمھارے تمام مرد وزن سے گفتگو مجھ پر حرام ہے تا آنکہ تم سب اللہ اور اس کے رسول ؐ پر ایمان لے آؤ۔" اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دن شام ہونے سے پہلے پہلے بنی عبد الاشہل کے تمام مرد وزن نے اسلام قبول کر لیا۔

اس کے بعد سعد بن معاذ اور مصعب بن عمیر دونوں اسعد بن زرارہ کے گھر آگئے اور سب نے مل کر تبلیغی مہم شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصے میں چند ایک قبائل کو چھوڑ کر انصار کے ہر گھر میں اسلام بڑی تیزی سے پھیلنا شروع ہو گیا۔

لمحہ فکریہ

یہاں آگے چلنے سے پہلے دو نکتوں پر غور کر لیجیے۔ پہلی چیز ہے رسول

خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر انتخاب۔ مدینے میں مبلغ، معلم یا مقری (۲۲) کی حیثیت سے حضورؐ نے جس ذات گرامی کو منتخب فرمایا وہ تھے سیدنا مصعب بن عمیرؓ۔ یہ انتخاب کتنا لاجواب تھا، اس کا اندازہ اوپر کے واقعات سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ان ہی کے حکیمانہ طرز تبلیغ کا نتیجہ تھا کہ بہت تھوڑے عرصے میں انصار کے تقریباً سارے گھرانوں میں اسلام پھیل گیا۔

دوسری قابل غور چیز یہاں یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں وحدت انسانی کا جو پیغام ہے، اس کا ایک مختصر مگر اعلیٰ نمونہ وہ اتحاد ہے جو صرف اسلامی پیغام ہی نے نہیں بلکہ حضورؐ کی شخصیت نے اوس و خزرج کے درمیان قائم فرمایا تھا۔ ابھی آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ ان دونوں قبیلوں کے درمیان بہت معمولی سی بات پر جھگڑا شروع ہوا تو پشتوں تک دونوں میں خوں ریز جنگ ہوتی رہی۔ لیکن کتنے پاکیزہ دل تھے یہ انصارؓ مدینہ کہ قبول اسلام کے بعد پھر کبھی ان دونوں میں کوئی جنگ نہ ہوئی، بنی امیہ اور بنی ہاشم میں تو جھگڑے زندہ ہوئے۔ بنی عباس اور بنی فاطمہ میں بھی ہاتھا پائی ہوتی رہی بلکہ ایک آدھ موقع پر خود مہاجرین و انصار کی کش مکش نے بھی سر اٹھایا اور فوراً دب گئی۔ لیکن اوس و خزرج میں پھر کبھی کوئی آویزش سننے میں نہ آئی۔ یہ کمال جہاں اسلامی پیغام کا، خود حضرت اکرمؐ کی عملی تعلیمات کا اور نیز مصعب و اسعد جیسے مبلغین کا تھا وہاں ان سارے انصار مدینہ کے ایمان و اخلاص کا بھی تھا۔

پہلی بیعت عقبہ اور "بیعت نساء"

دوسرے سال ۱۲ نبوی میں حسب وعدہ دس خزرجی اور دو اوسی حج کے لیے آئے۔ حضورؐ سے اسی مقام عقبہ پر ملے اور اسلام لائے۔ ان میں پانچ وہ بھی تھے جو گزشتہ سال آئے تھے۔ یعنی اسعد، عوف، رافع، عقبہ اور قطبہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اس بیعت کو دوسری بیعت عقبہ کہنا چاہیے۔ لیکن تمام

سیرت نگار اسے پہلی بیعت عقبہ ہی کہتے ہیں' اس لیے ہم بھی اسے اسی لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے موقعے پر تو چھ (یا آٹھ) انصار صرف ایمان لائے تھے اور تصدیق کی تھی۔ لیکن اس دوسرے موقعے پر باقاعدہ بعض خاص باتوں پر بیعت لی گئی تھی۔ یہ بیعت ان باتوں پر تھی کہ (۱) شرک نہ کریں گے (۲) چوری نہ کریں گے (۳) زنا نہ کریں گے (۴) قتل اولاد نہ کریں گے (۵) افترا و بہتان طرازی نہ کریں گے اور (٦) معروف میں رسولؐ کی نافرمانی نہ کریں گے۔

لمحہ فکریہ

سورہ ممتحنہ کی ایک آیت ہے:

یا یھا النبی اذا جائک المومنت یبا یعنک علی ان لایشرکن باللہ شیئًا ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولایا تین ببھتان یفترینہ بین ایدیھن وارجلھن ولا یعصینک فی معروف فبا یعھن واستغفرلھن اللہ ان اللہ غفور رحیم ○ (الممتحنہ: ۱۲)

اے نبی! جب تمھارے پاس مومن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ وہ شرک باللہ نہ کریں گی' چوری نہ کریں گی' زنا نہ کریں گی' اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی' کوئی ایسا بہتان نہ تراشیں گی جس کا تعلق ان کے ہاتھوں اور پاؤں کی افترا پردازی سے ہو اور معروف میں تمھاری نافرمانی نہ کریں گی تو تم ان کی بیعت لے لو اور ان کے لیے اللہ سے بخشش طلب کرو۔ اللہ تو بلاشبہ غفور' رحیم ہے۔

یہ آیت بلکہ پوری سورت ممتحنہ مدنی ہے جو بہت بعد میں نازل ہوئی ہے۔ ان شرائط بیعت کا تعلق خاص طور پر عورتوں سے ہے۔ چنانچہ اس نوع کی بیعت کا نام ہی بیعتہ النساء ہے۔ یہاں قابل غور چیز یہ ہے کہ حضورؐ اس آیت کے نزول سے بہت پہلے ان ہی شرائط پر انصار کی بیعت لے رہے ہیں۔ (مذکر کے صیغوں کے سوا) ساری باتیں ان ہی الفاظ آیت اور اسی ترتیب سے حضورؐ فرما رہے ہیں۔ ہم پچھلے صفحات میں کئی جگہ بہ تکرار اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ پیغمبر کی زندگی ابتدا ہی سے صحیح رخ پر ہوتی ہے۔ خدائی ہدایات کے بعد جو حقیقت واضح طور پر شعور کی گرفت میں آجاتی ہے' وہ قبل از نبوت لاشعور کے پردوں میں مستور ہوتی ہے۔ نبی کی دماغی ساخت اور اس کا فکری سانچہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ہر قدم قدرتی طور پر اسی طرف اٹھتا ہے جدھر اسے بعد میں جانا ہے۔ قبل از نبوت اس کی مثال اس راہ رو کی ہوتی ہے جو ہر چوراہے پر پہنچ کر اپنی وجدانی بصیرت یا یقین سے کسی ایک راہ پر چل پڑتا ہے اور ابھی کچھ دور جاتا ہے کہ اسے کوئی بتانے والا بتا دیتا ہے کہ تم ٹھیک رستے پر جا رہے ہو۔ جب تک توثیق کرنے والا توثیق نہیں کرتا اس وقت تک اگرچہ وہ صحیح راہ پر ہی چل رہا ہوتا ہے لیکن وہ ایک لحاظ سے کھویا ہوا سا ہوتا ہے۔ بس فرق یہ ہوتا ہے کہ پہلے وہ لاشعوری طور پر صحیح راہ رو تھا اور بعد میں وہ شعوری یقین حاصل کر لیتا ہے۔ ایک نبی کی بھی تقریباً یہی صورت ہوتی ہے کہ وہ بغیر وحی کے بھی ٹھیک راہ پر چلتا ہے' خواہ نبوت سے پہلے ہو یا بعد از نبوت کسی معاملے میں حکم خداوندی نازل ہونے سے پہلے ہو۔ لیکن یہ رہنمائی صرف عقل و بصیرت اور فطری افتاد مزاج کی ہوتی ہے۔ اس میں امکان خطا کا ایک پہلو بھی موجود ہوتا ہے مگر اس کے بعد جب وحی اس کی توثیق کر دیتی ہے تو اس توثیق کے بعد ایک ایسا شعوری یقین پیدا ہو جاتا ہے جس میں خطا کا امکان نہیں باقی رہتا۔ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے وہ یہ ہے کہ "ووجدک ضآ آلّا

فھدی" میں جس "ضلال" کا ذکر ہے وہ وہی عبوری راہ روی ہے جو توثیق وحی سے پہلے ہوتی ہے۔ یہ راہ روی گم راہی (بھٹک جانا) نہیں ہوتی بلکہ صحیح راہ روی ہوتی ہے۔ وحی صرف اس کی توثیق و تصدیق کر کے اسے امکان غلط روی کے شائبوں سے پاک کر دیتی ہے اور حقیقت کو آئینے کی طرح واضح شعور کے سامنے لے آتی ہے۔

شروع میں بھی آپ نے اس کی کئی مثالیں پڑھی ہیں اور اب یہ "بیعت النساء" بھی آپ کے سامنے ہے۔ حضورؐ کی زبان سے آج وہی شرائط بیعت ادا ہو رہی ہیں جو برسوں کے بعد قرآن بن کر نازل ہونے والی تھیں۔ آج یہ الفاظ محمد رسولؐ اللہ کے ہیں لیکن کل یہ وحی الٰہی کے الفاظ بننے والے تھے۔ اس وقت جو شرائط حضورؐ نے پیش فرمائی تھیں' وحی نے ان پر کوئی اضافہ نہیں کیا' صرف تصدیق و توثیق کی مہر ثبت کر دی۔

آپ کو آئندہ صفحات میں ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی جن سے ہمارے پیش نظر نظریے کی تائید ہوگی۔ مثلاً یہ کسے نہیں معلوم کہ حضورؐ نے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے مقام قبا میں جمعہ پڑھا اور خطبہ جمعہ بھی دیا۔ اس وقت تک جمعے کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ حکم بہت بعد میں آیا مگر عمل پہلے ہو گیا۔ یعنی حضورؐ کی پسند پہلے ہوئی اور قرآنی توثیق بعد میں۔ ان مثالوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کی زندگی کا رخ ابتدا ہی سے صحیح سمت میں ہوتا ہے اور پیغمبر ہو چکنے کے بعد کوئی وحی آنے سے پہلے بھی اس کا قدم صحیح منزل ہی کی طرف اٹھتا ہے۔

تقاضائے بشریت

ہاں یہ صحیح ہے کہ حضورؐ کے بعض طرز عمل ایسے بھی ہیں جن کی نشان دہی اور اصلاح وحی الٰہی نے کی۔ قرآن کریم میں یہ تصریحات موجود ہیں

اور اس وقت ان پر تبصرہ مقصود نہیں (مثلاً: عفا اللہ عنک لم اذنت لھم (التوبہ: ۴۳) قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا (المجادلہ: ۱) اور عبس وتولی..... وغیرہ کی تفسیر اور نوعیت واقعات کو ملاحظہ فرمائیے) لیکن اس قسم کے چند استثنائی واقعات سے ہمارا کلیہ نہیں ٹوٹتا۔ مستثنیات کسی کلیے کو توڑتے نہیں بلکہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ کوئی کلیہ ضرور موجود ہے جس سے چند مثالیں مستثنیٰ ہیں۔ علاوہ ازیں ان معاملات کے جلو میں اس قدر حسن و جمال اور اتنے افادی پہلو ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی نبوی سیرت کا ایک بڑا اہم باب ہیں۔ تفصیلی گفتگو کا یہ محل نہیں۔ بس اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ:

یہ چند بشری معاملے ہیں جو حضورؐ کی صداقت کا کمال ظاہر کرتے ہیں۔ ادھر وحی نے ان کی نشاندہی کی اور ادھر حضورؐ نے بے کم و کاست سارے عالم پر واضح فرما دیا۔ امانت وحی کی محافظت' طاعت الٰہی اور عبد و معبود کے فرق و امتیاز کے قیام کی اس سے بڑی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ حضورؐ نے ان باتوں کے ذکر کو قیامت تک کے لیے صحیفہ قرآنی میں محفوظ کر دیا اور وہ بھی یہ جاننے کے باوجود کہ ابد تک اربوں انسانوں کی نگاہ سے یہ ذکر گزرتا رہے گا۔ ایک پیغمبر کے سوا اور کس میں یہ جرات ہوسکتی ہے کہ اپنی خامیوں کو بھی حشر تک بے نقاب رہنے دے؟ اور اپنے اس طرز عمل سے آئندہ نسلوں تک کو اس عجیب و غریب قدر کی محافظت پر آمادہ کر دے؟

بہرحال کہنا یہ ہے کہ یہ بشریت کے تقاضے ہیں اور ان سے مذکورہ کلیے پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک بالائی نگراں قوت ایسی موجود ہے جو ایک نبی کو کسی غلط سمت میں نہیں جانے دیتی اور جب وہ اپنی فطرت سلیمہ یا بے مثال عقل و بصیرت سے صحیح راہ پر چل پڑتا ہے تو بعد میں وہی قوت اس کی تصویب و توثیق کر دیتی ہے اور اکثر و بیشتر یہی ہوتا رہا۔ چند مستثنیات اس اصول پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

مقام رسولؐ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق

ا۔ اپنی امت کے ساتھ ایسا نہیں جو ایک ڈاکیے کا مکتوب الیہ کے ساتھ ہوتا ہے کہ خط اس کے حوالے کرنے کے بعد مکتوب الیہ سے اور کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ حضورؐ وبالمومنین رؤف رحیم اور رحمتہ للعلمین ہیں اور رحمت کے وہ تمام تقاضے پورے فرماتے رہے ہیں جو اعلیٰ درجے کے بے لوث مہربان والدین اپنی چہیتی اولاد کے حق میں پورے کرسکتے ہیں ——— نہیں توبہ! ماں باپ کیا چیز ہیں؟ ان سے بڑھ کر۔ حضورؐ ان سے کہیں بڑھ کر ——— اپنی امت سے تعلق رکھتے ہیں۔ بابائنا ھو وامھاتنا۔

۲۔ اسی طرح یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حضورؐ کی حیثیت و مقام یہ نہیں کہ قبل از نبوت "کچھ بھی" نہ ہوں اور نبوت کے بعد "سب کچھ" ہو گیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ نبوت کی تمام صلاحیتیں روز اول ہی سے حضورؐ کو سونپ دی گئی تھیں۔ قدرت حضورؐ کی خاموش تربیت کر کے وہ ظرف تیار کر رہی تھی جو نبوت کا بوجھ اٹھا سکے۔ اس نے حضورؐ کو ابتدا ہی سے وہ افتاد مزاج' وہ ذوق سلیم اور وہ فطری راستی عقل بخشی تھی کہ جو قدم بھی اٹھے اس کا رخ درست ہی سمت میں اٹھے۔ نبوت تو وہ ہدایت ——— اور لازمی ہدایت ربانی ——— ہے جو برگ و بار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر گٹھلی کھجور کی ہوگی تو اس کے نمو کا ہر اقدام کھجور ہی کے برگ و بار کی شکل لیے ہوئے ہوگا۔ اس کی ہر پنکھڑی' ہر شاخ' ہر پتا' ہر پھول اور ہر پھل کھجور ہی سے متعلق ہوگا۔ اس کی کوئی شے بھی آم کی نمائندگی نہیں کرے گی۔ ایک پیغمبر کے متعلق یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ وہ پہلے آم ہو اور وحی آنے کے بعد دفعتہ "کھجور بن جائے۔ پیغمبر کی عقل سلیم عام نیک طینت انسانوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کی عقل عام انسانی عقل کی طرح بھٹکتی نہیں۔ بس کہیں کہیں بہ تقاضائے بشریت

خفیف سی کوئی بات ہو جاتی ہے اور وہ بھی ایسی ہوتی ہے جو اپنی آغوش میں ہزار رحمتیں لیے ہوئے ہوتی ہے۔ ایسی رحمتیں جو اگر وہ لغزش نہ ہوتی تو انسان ان رحمتوں سے محروم رہتا۔

۳۔ ایسی ہی ایک مثال ہے' وہ بیعت النساء جو مقام عقبہ اولیٰ پر انصار سے لی گئی تھی۔ یہ رسولؐ ہی کی عقل و فراست یا بصیرت و وجدان ہے جس کی سرحدیں وحی کی مملکت سے قریب تر ہوتی ہیں۔ نبیؐ پہلے کچھ کہتا یا کرتا ہے اور وحی خداوندی بعد میں اس کی تصویب و توثیق کرتی ہے۔ اگر ظہار کے معاملے میں اوس بن صامت کی بیوی خولہ بنت ثعلبہ کی بات کی تصویب میں قد سمع اللہ قول التی تجادلک (المجادلہ: ۱) نازل ہو سکتا ہے اور اگر جناب عمرؓ کی کئی باتوں کی تائید میں وحی الٰہی نازل ہو سکتی ہے تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے متعلق تصویب وحی میں کیوں شک ہو؟ اور محض چند مستثنیات کو آگے رکھ کر اس کلیے کو کہ ———— نبی کی زندگی کا رخ ابتدا ہی سے صحیح سمت میں ہوتا ہے ———— کیوں توڑا جائے؟ رسولؐ کی تربیت جناب عمرؓ کو اللہ ینطق علی لسان عمر (بخاری) کا بلند مقام عطا کر سکتی ہے تو خود خدا کی تربیت رسولؐ کو یہ بلند مقام کیوں نہیں بخش سکتی کہ وہ کہے اور کرے پہلے اور اس کی تصویب وحی ہو بعد میں؟ ———— خدا کرے کہ ہم صحیح مقام نبوت کو پہچان سکیں۔

دوسری بیعت عقبہ

ان گیارہ انصار کی بیعت اور واپسی کے بعد مدینے میں اشاعت اسلام اور بھی تیز ہو گئی اور دوسرے سال ۱۳ نبوی میں تہتر آدمی آئے۔ ان میں دو عورتیں ———— ام عمارہ نسیبہ بنت کعب اور ام منیع اسما بنت عمرو ———— بھی تھیں۔ یہ لوگ مسلمان تو مدینے ہی میں ہو چکے

تھے لیکن اب حج کے موقعے پر مکے میں اس لیے آئے تھے کہ حضورؐ کو ترک وطن کر کے مدینے میں (جو اب تک یثرب ہی تھا) آباد ہو جانے کی دعوت دیں۔ ان لوگوں نے عقبے پر بیعت کی۔ اس موقعے پر حضورؐ نے جس بات پر ان سے بیعت لی وہ یہ تھی کہ:

الف: طبیعت کی چستی اور سستی دونوں میں سمع و طاعت اختیار کرو گے۔

ب: تنگی و فراخی دونوں حالتوں میں انفاق (خرچ) کرو گے۔

ج: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو گے۔

د: اللہ کی بات کہنے میں کسی کی ملامت کی پروا نہ کرو گے۔

ر: میرے یثرب آنے کے بعد میری مدد و حمایت اسی طرح کرو گے جس طرح اپنے بال بچوں کی کرتے ہو۔

ان شرائط کی پابندی کے عوض تمھیں جنت حاصل ہوگی۔

یہ روایت مسند احمد کی ہے جو جابر سے مروی ہے۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اس موقعے پر حضرت عباس بن عبدالمطلب بھی حضورؐ کے ساتھ تھے۔ یہ اگرچہ ابھی تک اسلام نہ لائے تھے لیکن ہاشمی عصبیت رکھتے تھے۔ یہاں سب سے پہلے جناب عباس ہی نے گفتگو شروع کی اور ان انصار سے مخاطب ہو کر کہا:

"ہماری نگاہ میں محمدؐ کا جو مقام ہے وہ تم جانتے ہو۔ یہ اپنی قوم میں باعزت ہیں۔ ہم اپنی قوم کے ہم مذہب ہونے کے باوجود ان کی حمایت کرتے اور ان کی اس شہر میں حفاظت کرتے رہے ہیں۔ اب یہ تمھارے پاس جا کر تمھارے ساتھ رہنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ لہٰذا اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ جس مقصد کے لیے انھیں اپنے ہاں بلا رہے ہو اس میں وفا

سے کام لو گے اور ان کے مخالفوں کے مقابلے میں ان کی حمایت و حفاظت کرسکو گے تو اس ذمے داری کو اٹھاؤ اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ ان کے وہاں پہنچ جانے کے بعد تم انھیں دشمنوں کے حوالے کر کے الگ ہو جانے پر مجبور ہو جاؤ گے تو ان کو ابھی سے چھوڑ دینا بہتر ہے۔ یہاں بہرحال وہ اپنی قوم اور شہر میں محفوظ ہیں۔"

انصار نے یہ تقریر سن کر کہا کہ: ہم آپؐ کی باتیں سن چکے، اب رسولؐ اللہ فرمائیں کہ اللہ کے لیے اور اپنے لیے کیا چاہتے ہیں؟ حضورؐ نے تلاوت فرما کر اسلام کی طرف مزید رغبت دلائی اور فرمایا کہ: میں اپنے لیے تم سے صرف یہ شرط بیعت لیتا ہوں کہ جس طرح تم اپنے بال بچوں کی حمایت کرتے ہو اسی طرح میری حمایت بھی کرو۔ یہ سن کر برا ابن معرور نے حضورؐ کا ہاتھ پکڑ کر عرض کیا کہ: اس ذات پاک کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، ہم آپ کی اسی طرح حفاظت و حمایت کریں گے جس طرح آپ ارشاد فرماتے ہیں۔ ہماری بیعت لے لیجیے۔ بخدا ہم بھی تلوار کے دھنی ہیں اور جنگ ہمیں ورثے میں ملی ہے۔

برا کی بات کاٹ کر ابو الہیثم بن تیہان بولے کہ: یا رسولؐ اللہ! ہمارے اور یہود کے درمیان کچھ تعلقات ہیں جنھیں اب منقطع کرلیں گے۔ اگر ہم یہ کرلیں اور اللہ تعالیٰ حضورؐ کو غلبہ عطا فرما دے تو ایسا تو نہ ہو گا کہ حضورؐ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم میں واپس آجائیں گے؟ ــــــــــ حضورؐ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ: میری زندگی اور موت تمھارے ساتھ ہوگی۔ میں تمھارا اور تم ہمارے ہوگئے۔ جس سے تمھاری جنگ ہوگی اس سے میری بھی جنگ ہوگی، جس سے تمھاری صلح ہوگی اس سے میری بھی صلح ہوگی۔

اس کے بعد حضورؐ نے سب کی بیعت لے کر ان ہی میں سے بارہ نقیب

مقرر فرمائے جن کے نام یہ ہیں:
(۱) ابو امامہ اسعد بن زرارہ (۲) سعد بن الربیع (۳) عبداللہ بن رواحہ (۴) ارفع بن مالک (۵) برا بن معرور (۶) عبداللہ بن عمرو بن حرام (۷) عبادہ بن صامت (۸) سعد بن عبادہ (۹) منذر بن عمرو (۱۰) اسید بن حضیر (۱۱) سعد بن خثیمہ (۱۲) رفاعہ بن عبد المنذر (یاابوالھیثم بن تیہان)

ان میں نو متقدم الذکر خزرجی ہیں اور تین متاخر الذکر اوسی۔ ان بارہ نقیبوں کے انتخاب کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ: میں تو اپنی ساری قوم کا کفیل ہوں اور تم اپنی قوم کے اسی طرح کفیل ہو جس طرح بارہ حواری عیسیٰؑ کے کفیل تھے۔

ابن اسحاق کی ایک دوسری روایت میں جو عبداللہ بن ابی بکر سے مروی ہے' یوں ہے کہ جب یہ انصار بیعت کے لیے جمع ہوئے تو عباس بن عبادہ انصاری نے کہا کہ:

"اے خزرجی (او اوسی) بھائیو! تمھیں یہ علم ہونا چاہیے کہ حضورؐ کی بیعت کا کیا مطلب ہے؟ یہ سارے عرب و عجم سے جنگ کا اعلان ہے۔ اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ مالی اور جانی نقصانات کی وجہ سے تم حضورؐ کو دوسروں کے حوالے کر دو گے تو ابھی اس کا فیصلہ کر لو اور یہ بھی سمجھ لو کہ ایسا کرنا دنیا و آخرت کی رسوائی کا سبب ہو گا۔ اور اگر تمھیں یہ یقین ہو کہ تم حضورؐ کو جس مقصد کے لیے اپنے ہاں بلا رہے ہو' اس کی خاطر تم اپنے تمام جانی و مالی نقصانات کو برداشت کر لو گے اور اپنی وفا پر قائم رہو گے تو حضورؐ کی بیعت کرو اور یہ بھی سمجھ لو کہ یہ اقدام دنیا و آخرت کی سب سے بڑی خیر ہے۔"

تمام انصار نے جواب دیا کہ: ہم حضورؐ کے لیے تمام جانی و مالی خطرات کو قبول کرتے ہیں، مگر حضورؐ یہ فرمائیں کہ اگر ہم اس وفا پر قائم رہیں تو ہمیں اس کا کیا صلہ ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا: "جنت۔" اس کے بعد ان کی درخواست پر حضورؐ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور سب نے بیعت کرلی۔

بیہقی کی روایت (جو عامر شعبی سے مروی ہے) کا مضمون یہ ہے کہ حضورؐ سے ابو امامہ اسعد بن زرارہ نے سوال کیا کہ: اللہ کا اور اپنا جو کچھ حق مطلوب ہو وہ بھی بیان فرمائیے اور اس کا اجر بھی۔ حضورؐ نے فرمایا:

"میں تم سے اللہ کا یہ حق چاہتا ہوں کہ تم اس کی بندگی کرو اور کسی شے کو اس کا شریک نہ کرو۔ اور اپنے اور نیز اپنے اصحاب کے لیے یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی جانوں کی طرح ہم کو بھی ٹھکانہ دو اور ہماری حمایت و مدد کرو۔"

انصار نے پوچھا: "اگر ہم یہ سب کچھ کریں تو ہمیں کیا صلہ ملے گا؟"

حضورؐ نے جواب دیا: "جنت"۔

بیہقی میں رفاعہ سے بھی اسی قسم کی روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ہم نے فلاں فلاں باتوں پر جنت کے عوض حضورؐ کی بیعت کی۔

لمحہ فکریہ

ہم نے یہاں عقبہ اولیٰ کی بیعت کی چند روایتیں درج کی ہیں۔ بعض مجمل ہیں اور بعض مفصل۔ لیکن ان سب میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ از خود یا انصار کے سوال پر حضورؐ نے شرائط بیعت کی تکمیل کی، جو جزا جتائی ہے وہ ہے جنت۔ ہمارے خیال میں یہ مقام اپنے اندر خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ آج اس اہم بیعت کے وقت بھی اور اس سے پہلے بھی ہمیں کوئی موقع ایسا نہیں ملتا جہاں حضورؐ نے ایمان، اسلام یا بیعت کی جزا میں جنت سے نیچے کسی

پست چیز کا ذکر فرمایا ہو۔ ذرا خوب غور سے دیکھیے۔ کیا حضورؐ نے کسی سے زن' زر' زمین' اقتدار کا کوئی وعدہ فرمایا؟ کسی کو دولت' حکومت' منصب' عہدے کا لالچ دیا؟ کسی اور دنیوی عیش و طرب یا انعام یا دوسرے مادی فوائد کے حصول کا یقین دلایا جن کی طرف انسان فطری طور پر لپکتا اور اس کے حصول کے لیے سرتوڑ کوشش کرتا ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب صرف نفی میں ہے۔ ایک ظاہر پرست یہ کہہ سکتا ہے کہ جس کے قبضے میں ایسی کشش رکھنے والی کوئی چیز ہی موجود نہ ہو وہ دوسروں سے اس قسم کا وعدہ ہی کیوں کر کر سکتا تھا؟ لیکن سوال یہ ہے کہ "نادیدہ جنت" کے وعدے پر وہ کس طرح بے تامل مطمئن ہوگئے اور کس یقین نے انھیں بیعت کے لیے ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا؟ پھر ذرا یہ حقیقت بھی سامنے رکھیے کہ ہر ایمان لانے والا جانتا ہے کہ قبول اسلام سردھڑ کی بازی لگانا ہے:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے

انصار کے نمائندے عباس بن عبادہ بھی واشگاف لفظوں میں لوگوں کو بتا رہے ہیں کہ: "یہ بیعت عرب و عجم سے جنگ کا اعلان ہے۔" ان کو یہ بھی علم ہے کہ مکے میں ایمان لانے والوں کے ساتھ کیا کیا ظالمانہ برتاؤ ہوئے' اور ہو رہے ہیں اور ہر نومسلم کو کن کن سخت آزمائشوں کی بھٹی سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ چکے ہیں کہ جن مادی فوائد کی طرف انسان ہمیشہ لپکتا ہے اسلام تو ان ہی کی قربانیاں چاہتا ہے۔ ان مفادات کے حصول کا وعدہ تو الگ رہا' یہاں تو ان کی قربانی کا مطالبہ ہے۔ ان تمام حقائق کے علم کے باوجود آخر صرف "جنت" کے وعدے میں کون سی کشش تھی جو ہر اعلیٰ و ادنیٰ' ہر کہ ومہ پروانہ وار' بے اختیارانہ ادھر لپک رہا ہے اور ہر متاع عزیز کی بازی لگانے کے لیے دست مبایعت بڑھا رہا ہے؟

یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اہل مکہ یا اہل یثرب اتنے بھولے بھالے

بے وقوف تھے کیہ ایک شخص ۔نے جہاں اٹھ کر یہ کہہ دیا کہ "فلاں بات مانو یا فلاں قربانی دو تو تمھیں جنت مل جائے گی۔" اور وہ فوراً" بات بھی مان لیں اور قربانی پر بھی آمادہ ہو جائیں۔ ایمان لانے والوں کی عقل و فراست کا ثبوت ان کی آئندہ زندگی کی ایک ایک حرکت و سکون سے ملتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ دنیا کے بے شمار لیڈر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اپنی قوم میں بے پناہ ایثار و قربانی کی روح پھونکی ہے۔ لیکن ان کے سامنے کوئی محسوس مفاد رہا ہے اور اس طرز کے دوسرے لیڈروں کی کامیابی کا علم ان کو رہا ہے۔ ان کے سامنے اپنی قوم کا اقتدار' اپنے ملک کی سربلندی' اپنے نظام زندگی کی کامیابی وغیرہ رہی ہے جس کے متعلق ان کو یقین رہا ہے کہ ہم یا ہماری اولاد یا ہماری قوم اس مقصد سے ہم کنار ہوگی۔ نیز اگر کامیابی نہ ہو سکی تو کوئی دوسرا لیڈر چن لیا جائے گا اور ہماری آج کی قربانی اسی دنیا میں کل کام آئے گی۔ مگر یہاں جس "جنت" کا وعدہ کیا جا رہا ہے' اس کی یہاں کوئی تصدیق و تکذیب نہ زندگی میں ہو سکتی ہے نہ مرنے کے بعد۔ کون جانتا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہو گا؟ اگر کچھ نہ ہوا تو کون جھٹلانے اور باز پرس کرنے آئے گا؟

یہ صحیح ہے کہ ان نو مسلموں میں "جنت" کا تصور کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا ورنہ وہ جنت کا ذکر سنتے ہی سوال کر بیٹھتے کہ یہ کیا چیز ہے جس کا وعدہ کیا جا رہا ہے؟ ہاں یہ بتانا مشکل ہے کہ انصار میں یہ تصور کب سے اور کہاں سے آیا؟ انصار کے تعلقات یہود کے ساتھ عرصہ دراز سے تھے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے' ایک آنے والے نبی کا تصور ان ہی کی بدولت انصار میں آیا تھا لیکن یہود میں آخرت فلہذا جنت آخرت ــــــــــــ کا کوئی تصور موجود نہیں اور "عہد نامہ عتیق" اس ذکر سے خالی ہے۔ اس لیے گمان یہی ہوتا ہے کہ انصار میں آخرت و جنت کا تصور اہل مکہ کے میل جول سے پیدا ہوا تھا۔ جاہلیت کے اشعار میں نفیاً اور اثباتاً" آخرت کا تصور ملتا ہے۔ مثلاً:

اموت ثم یعث ثم نشر فتلک خرافہ یاام عمرو

(کیا موت کے بعد بعث و نشر ہوگا؟ اے ام عمرو! یہ سب باتیں خرافات ہیں)۔

بہرکیف کہنا یہ ہے کہ انصار مدینہ میں قبول اسلام سے پہلے (غالباً اہل مکہ کے میل جول سے) آخرت اور جنت کا تصور موجود تھا۔ اور جو چھ انصار اول اول ایمان لا کر مدینے واپس گئے تھے' انھوں نے آخرت اور جنت کے تصور کو اور بھی اجاگر کیا ہوگا۔ لیکن سوال صرف یہ ہے کہ اس جنت کے حصول کی ایسی زبردست لگن کس طرح پیدا ہوگئی کہ اس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو آمادہ ہوگئے؟ اگر فطری طور پر وہ جنت کی خواہش رکھتے تھے اور سب ہی رکھتے ہیں تو انھیں یہ کس طرح یقین آگیا کہ اس انسان ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر یہ جنت حاصل ہو جائے گی؟ پھر یقین بھی ایسا کہ آئندہ کی ایک نادیدہ اور بہ ظاہر "غیر مصدقہ" حقیقت کی قربان گاہ پر اپنی موجودہ اور حاصل شدہ تمام نعمتوں کو بھینٹ چڑھانے پر بخوشی راضی ہو جائیں اور عاجل کو آجل پر قربان کر دینے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہ پیدا ہونے دیں۔

اس سوال کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ یہ سب کچھ ایک لازمی کرشمہ ہے ذوق یقین کا اور جذبہ ایمان کا' جو دو چیزوں نے پیدا کیا تھا۔ ایک تھا کلام اور دوسرا تھا کلیم۔ کلام تو وہ پیغام ہے جو عقل سلیم کی ہر کسوٹی پر پرکھے جانے کے بعد کھرا نکلتا ہے۔ لیکن دین محض عقلیت کا نام نہیں۔ اس کے ساتھ ایک خاص نوع کا جذبہ عشق بھی ہو تو ایمان پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایمان و یقین محض پیغام سے نہیں آتا' بلکہ اس میں بڑا حصہ پیغام لانے والے کے کردار کا ہوتا ہے۔ کوئی پیغام اس وقت تک قبول نہیں ہوتا جب تک خود پیغام دینے والے کی عملی زندگی اس پیغام کے مطابق نہ ہو۔ اہل مکہ ہوں یا اہل مدینہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا یا یقینی اطلاع سے معلوم کر لیا کہ اس پیغام برؐ کی پوری

زندگی ان اقدار کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جن کا پیغام یہ دوسروں کو دے رہا ہے اور اس کی ہر ادا، ہر حرکت و سکون، ہر گفتار و کردار ان ہی افکار و کردار کا آئینہ ہے جن کو یہ دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے اور اسے اپنے سچے پیغام سے اتنی فنائیت کے ساتھ عشق ہے کہ یہ اس کی خاطر ہر پیش کش ٹھکرا رہا ہے اور ہر بڑی سے بڑی قربانی کو پیشانی پر بل لائے بغیر جھیلتا چلا آرہا ہے۔ محض وعدہ جنت میں کہاں سے اتنی کشش آسکتی ہے کہ انسان اپنا سب کچھ قربان کرنے پر بخوشی راضی ہو جائے؟ قربانی پر آمادگی صرف اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب بڑی سے بڑی قربانی کا عملی نمونہ بھی سامنے موجود ہو اور وہ اسوۂ قربانی پیش کرنے والے کی ساری زندگی عقل و فراست، اخلاص و صداقت اور امانت و استقامت کی قابل اعتماد چلتی پھرتی تصویر ہو۔ کسی پیغام بر کے پیچھے چلنے اور اپنا سب کچھ اس کے ہاتھ بیچ ڈالنے (بیعت کرنے) کے لیے پہلی شرط ہے غیر متزلزل اور کامل اعتماد و اعتقاد۔ اور یہ اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتا جب تک اس پیغام کی عقلی راستی کے ساتھ خود پیغام بر کی عقل و فراست، اخلاص و امانت، قربانی و ایثار، سیرت و کردار، ناقابل خرید و بے خوف استقامت، ان تھک سرگرمی، اور بے پناہ قوت عمل نہ ہو۔ یہی وہ نبوی کردار ہے جس نے دیکھنے والوں اور سننے والوں میں نور یقین پیدا کیا۔

اس ایمان و یقین کی حدود صرف اس دنیا کی زندگی ہی تک محدود نہ تھیں بلکہ انھوں نے اس پیغام بر کو ایسا راست باز صاحب وحی مان لیا کہ یہ جو کچھ کہے وہ صحیح ہے۔ جو خبر دے وہ درست ہے۔ انھوں نے اس کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی کہ پہلے دنیا میں کسی وعدے کی آزمائش کر لی جائے اور وہ صحیح ثابت ہو تو پھر آخرت کے وعدے کو بھی اس پر قیاس کیا جائے۔ بس رسالت پر ایمان لائے تو اس یقین کے ساتھ لائے کہ یہ جو کچھ کہتا ہے اس میں شائبہ کذب کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ امکان نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا کے متعلق جو وعدہ

کرے گا یا خبر دے گا وہ بھی سچ ہو گا اور جو کچھ آخرت کے متعلق بیان کرے گا وہ بھی یقیناً درست ہی ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسالت پر ایمان لانے کے بعد نہ دنیاوی معاملات میں کوئی تذبذب ہو سکتا تھا نہ اخروی مواعید میں۔

دنیا آخرت کی کھیتی (مزرعۃ الاخرہ) ہے۔ اس لیے جنت ہو یا دوزخ دونوں کا آغاز اسی زندگی سے ہوتا ہے۔ وجود کا پہلا رخ یہ دنیوی زندگی ہے اور دوسرا رخ حیات اخروی۔ بجز تبدیل مکان یا تبدیل لباس کے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں رخ ایک ہی جوئے رواں کے دو حصے ہیں۔ جس چیز کو ہم موت کہتے ہیں وہ دراصل ایک نئی زندگی کا نام ہے۔ بچپن کے بعد جوانی آتی ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ طفلی مر گئی تو شباب زندہ ہوا۔ جس طرح طفلی کی موت کا نام شباب ہے' اسی طرح جوئے حیات کے پہلے حصہ رواں (دنیوی زندگی) کے تمام ہونے کے بعد اس کا دوسرا حصہ (اخروی زندگی) شروع ہوتا ہے۔ پہلے حصے میں زندگی کا جو نقشہ ہو گا وہی ارتقا یافتہ شکل اختیار کر کے دوسرے حصہ زندگی میں نمودار ہو گا۔ آخرت کی جنتی زندگی ان ہی لوگوں کو حاصل ہوگی جنھوں نے پہلے دنیا میں جنتی زندگی کا ارتقا پذیر نمونہ تیار کیا ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک قوم دنیا میں ذلیل و خوار اور مغلوب و مقہور رہے اور آخرت میں اسے اعزاز و سربلندی حاصل ہو جائے۔ اس تصور کی قرآن نے سخت تردید کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو تم ہی سربلند رہو گے۔

انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین (آل عمران: ۱۳۹)

پس جو لوگ اقدار کو جنت سمجھ کر قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں' ان کو صرف آخرت ہی کی جنت حاصل نہیں ہوتی بلکہ دنیا کا قید خانہ بھی ان کے لیے بہشت ہو جاتا ہے۔ ان کی مادی زندگی بہ ظاہر جہنم کے پل سے گزر رہی ہوتی ہے لیکن ان کی روح اسی دنیا میں بہشت کی سیر کر رہی ہوتی ہے' کیوں کہ

انھیں چند ہی قدم کے فاصلے پر جنت دکھائی دیتی ہے۔ ہم یہاں بھی دیکھتے ہیں کہ محلوں میں رہنے والے اپنے تمام سامان عیش کی فراوانیوں کے باوجود جہنم کی زندگی گزارتے ہیں اور کٹیا میں رہنے والے فاقہ کش اللہ مست درویش جنت کے مزے لوٹتے ہیں۔ اس کی روح بے چین' دماغ مضطرب اور دل پریشان رہتا ہے۔ اور اس کی روح مطمئن' دماغ پرسکون اور دل شگفتہ رہتا ہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اس شگفتگی و سکون میں کہیں کہیں مجبورانہ تصنع کو بھی دخل ہوتا ہے لیکن یہ درویش بھی مصنوعی ہی ہوتے ہیں۔ اعلیٰ اقدار کو اپنانے والا مومن ہر وقت جنتی زندگی میں ہوتا ہے اور اس کی یہی جنت آگے آنے والی زندگی میں ارتقا یافتہ بہشت کی شکل میں حاصل ہوتی ہے۔ غرض جب جنت و جہنم کا یہ تصور ہو کہ جنت کی زندگی دنیا ہی میں شروع ہو کر آخرت میں پھلتی پھولتی ہے اور جنت ارضی کا تصور بھی عام تصورات سے الگ ہو تو یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ انصار یا دوسرے اہل ایمان نے صرف جنت آخرت کے وعدے پر کیوں قناعت کر لی اور دنیا کی کسی جنت کا بھی وعدہ کیوں نہ لیا؟ حضورؐ نے نہ آخرت کا ذکر فرمایا ہے نہ دنیا کا بلکہ صرف الجنۃ کو صلہ قرار دیا ہے اور یہ دونوں ہی جنتوں پر مشتمل ہے۔

ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ خدا مست مومن اس دنیا میں بھی جنت ہی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ محض انگور کو کھٹا مان کر تسکین دل کا سامان پیدا کر لیتا ہو۔ پیغمبر ہوں یا ان کی روش پر چلنے والے' یہ عقلی صلاحیتوں سے محروم نہیں ہوتے' یہ دنیا پرستوں سے بہت زیادہ عقل و فراست کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ اگر اپنی قوتوں کو دولت یا اقتدار حاصل کرنے کی طرف لگاتے تو بڑی آسانی سے اعلیٰ درجے کے دولت مند اور ذی اقتدار بن سکتے تھے' لیکن یہ اپنی صلاحیتوں کو ایسے پست مقاصد کی طرف نہیں لگاتے۔ ان کی ساری توجہ اعلیٰ اقدار کے حصول میں صرف ہوتی ہے' نتیجے میں دنیا پرست

اپنی زندگی جہنم بنا لیتا ہے اور یہ فقر کی اعلیٰ قدروں کی بہار بے خزاں میں جنت کے مزے لوٹتے رہتے ہیں۔ مادی اور روحانی قدروں میں بس یہی زاویہ نظر کا فرق ہے۔ اہل ایمان میں جب رسول کی نظر کیمیا اثر یہ زاویہ نگاہ پیدا کر دے تو صرف وعدہ جنت کے بعد اور کس نعمت کا انھیں انتظار ہوتا؟ بس رسول کی رسالت پر ایمان لائے اور اس نے جو کچھ کہا اس پر بھی کسی مزید تفصیل طلبی کے بغیر ایمان لے آئے اور کسی تاخیر کے بغیر بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ جذبہ ایمان و ایقان پیدا ہو چکنے کے بعد عقلی و منطقی موشگافیوں کی گنجائش ہی کہاں رہ سکتی تھی؟

* * *

حواشی

۱　ان حقائق کے تفصیلی مطالعے کے لیے طہ حسین مصری کی الوعد الحق پڑھیے جس میں بڑے دلچسپ انداز میں غلاموں کی ابتلا و استقامت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا شگفتہ اور رواں ترجمہ ادارہ ثقافت اسلامیہ سے شائع ہو گیا ہے، جس کا نام ہے "زیر دستوں کی آقائی۔"

۲　قرآن نے تخاطب کا انداز یہ بتایا ہے کہ...... وقل لهم في انفسهم قولاً بليغاً ان سب سے ایسی بات کرو جو دل میں اتر جائے۔

۳　طہ حسین مصری نے الوعد الحق میں تفصیلات درج کی ہیں۔ لیکن وہ صرف غلاموں یا نیم غلاموں سے متعلق ہیں۔ اس کا ترجمہ ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور سے شائع ہوا ہے جس کا نام ہے "زیر دستوں کی آقائی"۔

۴　طبرانی اور بزار نے عبداللہ بن ربیعہ کی بجائے عمارہ بن ولید کا نام لکھا ہے۔ ممکن ہے دونوں ہوں۔

۵　رواہ الطبرانی فی الکبیر والبزار۔

۶　ان کا نام نعیم بن عبداللہ ہے۔

۷　فاطمہؓ بنت خطاب

۸　سعد بن زیدؓ

۹　ان میں حضرت خباب بھی تھے جو بعد میں حضرت عمرؓ کو ساتھ لے کر

خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ جناب فاطمہ بنت خطاب انہی (خبابؓ) سے قرآن کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

۱۰ مسلمانوں کو کفار عموماً" صابئ کہا کرتے تھے۔ آگے چل کر حضرت عمرؓ نے بھی اپنے اسلام کا اظہار اسی لفظ سے کیا ہے جو یا تو طنزاً" ہے یا نقلاً"۔

۱۱ یعنی لفظ رحیم جس میں رحم مادر اس کی رحمت اور صلہ رحمی سب ہی کے تصور موجود ہیں۔

۱۲ اس وقت ارقم بن ابی ارقم کے گھر پر تھے۔ یہی تبلیغی مرکز تھا۔

۱۳ ایک روایت میں ہے کہ حضرت حمزہ بھی یہیں موجود تھے اور انھوں نے جرات سے کہا کہ: "دروازہ کھول دو۔ اگر عمر برے ارادے سے آیا ہے تو اسی کی تلوار ہوگی اور اسی کی گردن۔" جناب حمزہؓ کی یہی وہ شجاعت تھی جس نے ان کے اسلام لانے کے بعد منکروں میں کھلبلی پیدا کر دی تھی۔

۱۴ دوسری قوی روایتوں میں یہ تعداد ۳۹ ہے جن میں ۳۳ مرد اور ۶ عورتیں تھیں۔

۱۵ اس کا نام واقدی حارث بن یزید بتاتے ہیں اور سہیلی مالک بن الدغنہ۔

۱۶ احابیش سے مراد بنو کنانہ' خزیمہ اور خزاعہ اور قریش کے وہ افراد ہیں جو اسفل مکہ کے ایک پہاڑ حبشی نامی کے پاس ایک قوم کی حیثیت سے یک جا تھے۔ بخاری کی روایت کے مطابق ابن الدغنہ قبیلہ قارہ کا سردار تھا۔ یہ ایک بڑا تیرانداز قبیلہ تھا۔

۱۷ جیش یا لشکر جس میں عموماً" حضورؐ خود نہ ہوتے۔

۱۸ شیخین کی روایت کے مطابق حضورؐ نے یہ جملہ اس وقت فرمایا تھا

جب ملک الجبال نے عرض کیا کہ اگر حضورؐ فرمائیں تو میں یہاں کی آبادی کو دونوں پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دوں۔

۱۹ قرآنی حکم ہے کہ ادع الی سبیل ربک بالحکمتہ والموعظہ الحسنہ و جادلھم بالتی ھی احسن (اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دینے میں حکمت اور موعظہ حسنہ سے کام لو اور مباحثے کا بہترین انداز رکھو) درحقیقت یہ انسانوں کی تین قسموں کا ذکر ہے۔ کسی طبقے کے لیے حکمت کی باتیں موثر ہوتی ہیں۔ کسی کے لیے موعظہ حسنہ کی اور کسی کے لیے اعلیٰ انداز مباحثہ۔

۲۰ مجمع البحار میں بعاث کو اوس کے ایک قلعے کا نام بتایا ہے۔

۲۱ بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دوسرے سال بارہ انصار عقبہ آئے تب حضورؐ نے مصعب بن عمیر کو ان کے ساتھ کر دیا۔ بہرحال مصعب جب بھی گئے ہوں اس سے اصل مضمون میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۲۲ حضرت مصعب بن عمیر مدینے میں مقری کے لفظ سے یاد کیے جاتے تھے۔ مقری کے معنے ہیں پڑھانے والا۔

* * *

(۳)

ہجرت ——— نئے دور زندگی کا آغاز

اس اہم بیعت کے بعد اہل مکہ کے کانوں میں بھی اس کی بھنک پہنچ گئی اور اسے یہ رنگ دیا گیا کہ حضورؐ نے اہل مدینہ سے سازش کی ہے کہ اہل مکہ پر چڑھائی کر دی جائے۔ اس افواہ کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اہل مکہ کا خون کھولنے لگا اور جذبہ مدافعت نے جذبہ انتقام کی شکل اختیار کر لی اور ظلم و ستم کے نئے نئے طریقے ایجاد ہونے لگے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ایک طرف پانی سر سے گزر چکا تھا اور دوسری طرف قدرت نے ایک نئی پناہ گاہ کا راستہ کھول دیا تھا۔ یوں تو اب سے آٹھ سال پہلے حضورؐ نے اہل اسلام کو حبشے کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت دے ہی دی تھی، مگر اب مظالم کی انتہا ہو جانے کے بعد حضورؐ نے عام اجازت دے دی کہ مسلمان ہجرت کر جائیں خواہ یثرب (مدینے) کی طرف ہو یا کسی اور طرف ہو۔ حبشے میں ایک تو بہت سے مسلمان پہلے سے موجود تھے۔ دوسرے وہاں کا سفر نسبتاً دشوار بھی تھا کیوں کہ سمندر عبور کیے بغیر سفر نہیں ہو سکتا تھا۔ تیسرے وہاں کسی ذمے دار جماعت نے قبول اسلام کے بعد معاہدہ نصرت کے ساتھ آنے کی دعوت نہ دی تھی۔ اس لیے قدرتاً" مسلمانوں کا رجحان ایک نئے مامن یعنی یثرب ہی کی طرف ہوا اور اہل اسلام ایک ایک دو

دو کر کے خاموشی اور پوشیدگی کے ساتھ ہجرت کرنے لگے۔

حقیقت ہجرت

ہجرت مدینہ کے واقعات سننے سے پہلے یہاں ایک بڑی اہم حقیقت کو بھی پیش نظر رکھ لینا چاہیے۔ یہ حصہ ایک ایسا لمحہ فکریہ ہے جس کے لیے ہمیں علیحدہ عنوان قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اسلام کے پیغام کا نچوڑ وحدت انسانی ہے۔ وہ انسانوں کو ہزار فطری اختلافات کے ہوتے ہوئے ایک مرکز وحدت پر جمع کرنا چاہتا ہے۔ بنی آدم کے باہمی فطری اختلافات بے شمار ہیں۔ رنگ' زبان' پیشہ' رجحان' خاندان' مزاج' ثقافت' رسوم' غرض بہت سی چیزوں میں ایک انسان دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے۔ اور اسی طرح ایک قوم بھی دوسری قوم سے جدا ہوتی ہے۔ یوں ہی ملک و وطن بھی جدا جدا ہوتے ہیں۔ بس یہی چند بنیادیں ہیں جن پر قومیتوں کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اور فی الواقع ان بنیادوں پر جو قومیں بنتی ہیں وہ "قومیں" ہی ہوتی ہیں۔ اسلام انھیں اقوام تسلیم کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتا۔ لیکن اس نے اس قسم کی تمام قومیتوں سے بلند تر ایک اور تصور قومیت بھی دیا ہے اور وہ اتنا ہمہ گیر ہے جس میں ساری دوسری قومیتیں گم ہو جاتی ہیں۔ انبیا علیہم السلام نے اپنے تمام اہل کفر ہم وطنوں یا ہم خاندانوں کو "یا قوم" ہی کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

قومیت کی یہ ساری بنیادیں جتنے انسانی افراد کو اپنے دائرے میں سمیٹ سکتی ہیں اس سے زیادہ افراد کو اپنے دائرۂ قومیت سے خارج کر دیتی ہیں۔ ایک محدود طبقہ تو اس میں داخل ہو جاتا ہے' اور ساری دنیا اس سے خارج ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے یہ تنگ و محدود انداز کی قومیت اسلام کے پیغام وحدت انسانی کی طرح ہمہ گیر نہیں ہو سکتی ہے۔ اس باب میں سب سے زیادہ

فیصلہ کن آیت وہ ہے جس میں سیدنا ابراہیم اور آپ کے رفقائے کار کا آخری الٹی میٹم ان الفاظ میں بیان گیا گیا۔

قد كانت لكم اسوة حسنته في ابراهيم والذين
معه اذ قالوا لقومهم انا بر آؤا منكم و مما تعبدون
من دون الله كفرنا بكم وبدا بيننا وبينكم العداوة
و البغضاء ابدا حتى تؤمنوا بالله وحده (الممتحنہ: ۴)

(اے مسلمانو!) تمھارے لیے ابراہیم اور ان کے رفقا میں حسین اسوہ ہے جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم (اہل ایمان) تم سے بھی بیزار ہیں اور ان تمام غیر اللہ سے بھی جن کی تم بندگی کرتے ہو۔ ہم تم سے انکاری ہیں اور ہمارے تمھارے درمیان اس وقت تک عداوت و بغض کی دیوار حائل رہے گی جب تک تم تنہا خدا پر ایمان نہ لے آؤ۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ حضرت ابراہیم اپنی منکر قوم کو "میری قوم" ہی کہہ کر مخاطب کرتے رہے اور خدا بھی ان کو تو ھُم (ابراہیم اور ان کے رفقا کی قوم) کہتا ہے۔ لیکن اس قومیت یا ہم قومی کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب آیت کے ایک ایک لفظ میں موجود ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر قومیت بربنائے وطنیت مقصود ہوتی تو کیا اپنی ہی قوم کو اس طرح کا آخری الٹی میٹم دیا جاتا؟

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تمام انبیا کی طرح قومیت کی ساری فطری بنیادوں سے ایک اعلیٰ تر اساس بخشی ہے یعنی خدا کے پیش کردہ نظریہ زیست پر ایمان لانا۔ یہی بلند وحدت تصور یا ہم خیالی وہ وسیع اساس قومیت ہے جس میں سارے بنی آدم سمٹ کر آسکتے ہیں' اور جس میں تمام دوسری بنیادہائے قومیت

اپنی انفرادیت کے باقی رہتے ہوئے بھی سما کر گم ہو سکتی ہیں۔ قومیت کی باقی ساری بنیادیں وحدت انسانی کو پارہ پارہ کرنے والی ہیں۔ صرف آئیڈیالوجی اور تصور ہی قومیت کی ایسی ہمہ گیر اساس بن سکتا ہے جو تمام انسانوں کو اپنی آغوش قومیت میں لے کر انھیں ایک ہی خاندان کے افراد بنا لے۔

اسلام ان فطری اختلافات قومی کو فنا نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ ان "متنوع آیات" کو ایسے گل دستے میں تبدیل کرنا چاہتا ہے جس کے تمام پھول رنگ و بو اور شکل و خاصیت کے اختلافات کے باوجود ایک بلند مقصد ـــــــ زینت گل دستہ ـــــــ کے لیے ایک وحدت بن جائیں۔

انبیا کا پیغام قومیت یہی ہوتا ہے اور اہل ایمان اسی پر ایمان رکھتے ہیں' لیکن یہ باتیں صرف فلسفیوں کے تخیلات یا شاعرانہ تصورات یا خطیبانہ نکتہ آفرینیاں نہیں ہوتیں بلکہ ان کو اپنی زندگی پر اس طرح مسلط کرنا پڑتا ہے کہ اگر اس تصور قومیت سے کوئی دوسری بنیاد قومیت ٹکرائے تو اسے ختم کر دیں یا خود ختم ہو جائیں۔ اس دور امتحان سے ہر پیغمبر اور اس کی امت کو گزرنا پڑا ہے۔ ان کو خدا کی راہ میں ہر متاع عزیز سے دست بردار ہونا پڑا ہے اور بہت بڑا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب اپنے وطن عزیز کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔

وطن کسے عزیز نہیں ہوتا؟ آج اس روشن خیالی کے دور میں بھی وطنیت کی محبت کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ جان' مال' عزت' دل' دماغ' وقت غرض ہر شے وطن پر قربان کر دی جاتی ہے۔ اور وطنیت کی بنیاد پر جو قومیت تیار ہوتی ہے اس کی سربلندی کے لیے تمام صلاحیتیں اور قوتیں وقف ہو جاتی ہیں۔ لیکن انبیا جو اپنا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس وطن پر متاع عزیز قربان کر دی جاتی ہے ہم اس وطن کو بھی رضائے الٰہی جیسے بلند ترین مقصد پر سو بار قربان کر دیتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک مہاجر الی اللہ ابراہیمی للکار سے یہ اعلان کرتا ہے کہ: انی مهاجر الی

رہی۔ یہ مہاجرت ایک سرزمین سے دوسرے خطہ ارض کی طرف نہیں ہوتی بلکہ ہر محبوب شے سے خدا کی طرف ہوتی ہے۔ غرض ہجرت دراصل وطنیت کے بت کو توڑنے کا ایک عملی امتحان ہے۔

ہجرت کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن پاک میں بیس پچیس جگہ مختلف انداز سے ہجرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور مہاجرین و انصار اور ان کے متبعین کو واشگاف لفظوں میں رضائے الٰہی کا پروانہ اور جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

والسبقون الاولون من المھجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ واعد لھم جنت تجری تحتھا الانھر (التوبہ:١٠٠)

اول اول سبقت کرنے والے مہاجرین و انصار اور حسن کاری کے ساتھ ان کا اتباع کرنے والوں سے خدا راضی ہے اور وہ خدا سے راضی اور ان کے لیے اس نے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے تحت نہریں جاری ہیں۔

تمام قرآن میں "تجری" کے بعد "من تحتھا الانھر" آیا ہے' لیکن یہی صرف ایک ایسی جگہ ہے جہاں من تحتھا الانھار کی بجائے صرف تحتھا الانھر آیا ہے۔ ان مہاجرین و انصار اور ان کے حسن کار متبعین کی شان چوں کہ ساری دنیا سے نرالی ہے اس وجہ سے ان کے انعام کے لیے انداز بیان بھی نرالا ہی رکھا گیا ہے۔

ایک اور حقیقت پر بھی غور فرمائیے۔ حضورؐ کے لیے جن عورتوں سے رشتہ نکاح کو جائز کیا گیا ہے' ان میں حضورؐ کی چچا زاد' پھوپھی زاد' ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں بھی ہیں۔ تمام مسلمانوں کے لیے بھی ایسی بہنوں سے مناکحت جائز ہے لیکن ان تمام قسم کی بہنوں سے

حضورؐ کا ازدواج ایک ضروری شرط کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے ہجرت میں بھی حضورؐ کا ساتھ دیا ہو۔ ارشاد خداوندی ہے:

وبنت عمک و بنت عمتک وبنت خالک و بنت خلتک التی ھاجرن معک (الاحزاب: ۵۰)

ہم نے اے رسول تمھارے لیے حلال کیا ہے تمھارے چچا' پھوپھی' ماموں اور خالہ کی ان دختروں کو جنھوں نے ہجرت میں تمھارا ساتھ دیا ہو۔

اللہ اکبر! ہجرت کتنی عظیم الشان اہمیت رکھتی ہے جس کا اثر براہ راست رسولؐ کے نکاحی رشتوں پر بھی پڑتا ہے۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے زیادہ اپنا حضورؐ کا اور کون ہوسکتا تھا۔ یہ سیدنا علی مرتضٰی کی ہمشیر ہیں لیکن حضورؐ کے لیے ان سے رشتہ مناکحت صرف اس لیے ناجائز قرار دیا گیا ہے کہ ام ہانی نے ہجرت نہیں کی تھی۔ یہ ایمان ہی لائی ہیں فتح مکہ کے بعد۔

واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد ہی اسلامی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی تھی اور ہجرت ہی کے بعد ایک اسلامی نظام سلطنت کی بنیاد پڑی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمرؓ کے دور خلافت میں اسلامی سن رکھنے کی تجویز کی گئی تو ہجری سن کو اسلامی سن قرار دیا گیا اور محرم کو پہلا مہینہ قرار دیا گیا کیوں کہ آغاز ہجرت محرم ہی سے ہوا تھا۔ اہل اسلام کے لیے حضورؐ کی ولادت یا حضورؐ کی نبوت کچھ کم اہمیت نہ رکھتی تھی۔ وہ سن میلاد اور سن نبوت کو بھی اسلامی سن قرار دے سکتے تھے یا عربوں کے سن عام الفیل کو ہی باقی رکھ سکتے تھے لیکن ان تمام مہاجرین و انصار نے سارے سنین کو چھوڑ کر سن ہجری ہی کو منتخب کیا۔ اس انتخاب سے ہجرت کی عظمت و اہمیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ ہجرت ایک کسوٹی ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اللہ اور

اس کا رسولؐ زیادہ محبوب ہے یا وطن زیادہ پیارا ہے؟

مگر مسلمان قوم کی ایک عالم گیر بد قسمتی ملاحظہ ہو کہ ہر سال سن ہجری کا آغاز ہوتے ہی کچھ ایسی تقریبات' ایسی پر شور رسمیں اور ایسی ہنگامہ آرائی شروع ہو جاتی ہے جس میں ہجرت کی تمام قدریں مدغم ہی نہیں بلکہ فنا ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے صحائف و جرائد اور ہماری نشریات سب خاموش رہتے ہیں اور کسی جگہ بھی ہجرت مدینہ جیسی اہم اور انقلابی یادگار تقریبی حیثیت نہ اختیار کر سکی' بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس کی تمام اقدار مسلمانوں کے ذہن سے محو ہو چکی ہیں۔ دنیا میں اصول کو فروع کی خاطر ختم کرنے کی کوئی مثال اس سے بڑھ کر شاید نہ مل سکے گی۔

آغاز ہجرت

اس میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے ہجرت کی۔ یہ مسلم ہے کہ قریشی مخزومیوں میں سب سے پہلے ابو سلمہ عبداللہ بن عبدالاسد نے ہجرت کی۔ لیکن یہ ہجرت بیعت عقبہ ثانیہ سے ایک سال پہلے ہی کی تھی۔ یہ جب حبشے سے خبر مفاہمت سن کر آئے تو انھیں مکے میں روک لیا گیا اور بہت تکلیفیں دی گئیں' اور موقع پاتے ہی یہ نکل کھڑے ہوئے اور مدینے جا کر دم لیا۔ دوسرا نام مصعب بن عمیر (اور عبداللہ بن ام مکتوم) کا لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی بہت پہلے کی بات ہے۔ یہ تو انصار مدینہ کی درخواست پر بحیثیت معلم کے بھیجے گئے تھے' جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ یہاں ہم اس ہجرت کا ذکر کر رہے ہیں جو انصار کی دعوت و بیعت کے بعد ہوئی ہے۔ لہٰذا یہ دونوں ہجرتیں میرے موضوع سے خارج ہیں۔ البتہ اول الذکر کے ہم کنیت ایک اور ابو سلمہ کا نام بھی لیا جاتا ہے' اور یہ ہیں عامر بن ربیعہ۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔

بہرکیف اس معمولی تقدم و تاخر کا فرق کوئی قابل ذکر فرق نہیں۔

قرآن نے ان سب کو ملا کر السبقون الاولون کا لقب دیا ہے۔ اللہ کے لیے وطن کو چھوڑنا اگرچہ خود ایک بڑا امتحان ہے لیکن بہت سے لوگوں کو چلتے چلتے بھی بعض سخت آزمائشوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

ان ہی میں اول الذکر ابو سلمہ (عبداللہ بن عبدالاسد) بھی ہیں۔ یہ روانہ ہونے لگے تو بنی مغیرہ نے ان کی بیوی ام سلمہ کو یہ کہہ کر ان سے چھین لیا کہ ہم اپنے خاندان کی لڑکی کو تمھارے ساتھ کیوں جانے دیں؟ اور بنی عبدالاسد نے ان کے بچے سلمہ کو یہ کہہ کر قبضے میں لے لیا کہ ہم اپنے خاندان کے بچے کو تمھارے ساتھ نہیں جانے دیں گے —— ابو سلمہ کے لیے یہ کس قدر سخت ابتلا کا موقع تھا' اس کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جسے کبھی ایسی آزمائش میں پڑنے کا اتفاق ہوا ہو۔ بیوی صرف بیوی نہیں بلکہ ایک مومنہ بھی ہے۔ مومن والدین کی آغوش تربیت میں پلنے والا بچہ بھی یقیناً مومن ہی ہونے والا ہے۔ بیوی اور بچہ دونوں محبوب ہیں۔ آج یہ دونوں ابو سلمہ سے چھین لیے جاتے ہیں' مگر تحفظ دین کی خاطر ابو سلمہ اس کی کوئی پروا نہیں کرتے' اور کمال یہ ہے کہ بیوی بھی تحفظ دین کا وہی جذبہ رکھتی ہے' اس لیے وہ بھی اپنے شوہر کو روکنے کی کوشش نہیں کرتی۔ دونوں ایک دوسرے کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے رخصت کرتے ہیں۔ شوہر' بیوی اور بچے کو کچھ نہیں معلوم کہ یہ ایک دوسرے کو پھر کبھی دیکھ سکیں گے یا نہیں۔ زوج کی خاطر بڑے سے بڑا سفر ہو سکتا ہے' لیکن کون سا جوڑا ہے جو ایک دوسرے سے محض اللہ کے لیے جدا ہو کر سفر اختیار کر لے؟ ابو سلمہ کا ایمان بیوی بچے کی محبت پر غالب آگیا اور بیوی نے بھی شوہر کی جدائی پر صبر کر لیا۔

شوہر رخصت ہو گیا اور بیوی ہر روز اسی جگہ آتی جہاں سے رخصت ہوا تھا۔ وہ اپنے بے سہارا بچے اور اس کے مہاجر باپ کو یاد کر کر کے آنسو بہاتی اور خدا سے فریاد کرتی۔ یہ روزانہ کا مشغلہ تقریباً ایک سال تک جاری

رہا۔ آخر ایک فرد بنی مغیرہ کو اس پر ترس آگیا اور اس نے اس مظلومہ کو بنی مغیرہ سے ہجرت کی اجازت دلوا دی' اور بنی عبدالاسد سے اس کا بچہ بھی واپس دلوا دیا۔ ام سلمہ اپنے بچے سلمہ کو لے کر ایک اونٹ پر سوار ہوگئیں اور مدینے روانہ ہوگئیں۔ کوئی انسان یا رہبر ان کے ساتھ نہ تھا۔ جب یہ کوہ تنعیم کے پاس پہنچیں تو عثمان بن طلحہ اسے ملے' جو اونٹ کی مہار تھام کر پیدل ہی منزلیں طے کرنے لگے۔ یہ عثمان بن طلحہ ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے مگر اپنے اندر جوہر شرافت و حیا رکھتے تھے۔ راستے بھر کسی جگہ بھی ان کے دل میں کوئی جذبہ خیانت نہیں پیدا ہوا۔ اپنی آنکھوں پر بھی پورا قابو رکھتے رہے۔ خود ام سلمہ کہتی ہیں کہ عثمان بن طلحہ سے زیادہ شریف ساتھی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ تین سو میل کی مسافت طے کرنے کے بعد جب مقام قبا میں یہ مسافر پہنچے تو بنی عمرو بن عوف کے محلے کے قریب پہنچ کر انھوں نے ام سلمہ سے کہا کہ تمھارا شوہر یہیں مقیم ہے۔ اللہ کا نام لے کر اب تم روانہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد خود مکے آگئے۔

دیکھنے میں یہ ایک معمولی سا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ ذرا سوچیے آج کون ہے جو کسی پر بے لوث ترس کھا کر تین سو میل پیدل جائے اور آئے اور تنہائی کے ہزار موقعے ملنے کے باوجود اپنی عصمت اور ایک بے بس عورت کی عفت کی محافظت بھی کرتا رہے؟ بلاشبہ عثمان ابھی ایمان نہ لائے تھے لیکن اپنے اندر غیر معمولی جوہر شرافت رکھتے تھے' اور اسی کی برکت سے انھیں صلح حدیبیہ کے بعد ایمان لا کر ہجرت کرنے کی توفیق نصیب ہوئی اور فتح مکہ کے بعد ان ہی کو کلید بردار کعبہ بنایا گیا۔ مفصل ذکر فتح مکہ کے بیان میں آئے گا۔ یہ تمام واقعات ہجرت خود ام سلمہ کی زبانی ابن اسحاق نے بیان کیے ہیں۔

صہیب رومی کی ہجرت

ابن ہشام نے ابو عثمان نہدی سے ہجرت صہیب کی جو روایت نقل کی

ہے وہ یوں ہے کہ سب سے آخر میں جب انھوں نے ہجرت کا ارادہ کیا تو کفار قریش نے کہا کہ: "تم جب یہاں آئے تھے تو بالکل مفلس و قلاش تھے لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم یہاں سے اپنی جان بھی لے جاؤ اور مال بھی۔ صہیب نے کہا اگر اپنا سارا مال دے دوں تو مجھے جانے دو گے؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ چنانچہ صہیب نے اپنا سب کچھ دے کر بے سروسامانی کو اپنا زاد راہ بنا لیا اور چل کھڑے ہوئے:

بے برگ و بے نوائی ساماں شدہ ست مارا

یہ حضورؐ سے قبا میں جا کر مل گئے۔ حضورؐ نے دیکھتے ہی فرمایا صہیب (اپنا سارا مال دینے کے بعد بھی) نفعے میں رہا۔"

اسی طرح جس کی ہجرت کی بھنک قریش کو پہنچی اسے مقدور بھر آخری اذیت پہنچائی۔ ہشام بن عاص جانے لگے تو انھیں پکڑ کر قید کر لیا۔ بلکہ کمال تو یہ کیا کہ عیاش بن ربیعہ کو ایک دھوکا دے کر مدینے سے واپس لے آئے اور قید کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ زیادہ تر لوگ اکا دکا کر کے خاموشی کے ساتھ ہجرت کر گئے۔

ہجرت عمرؓ کی دلچسپ ہجرت

لیکن سیدنا عمرؓ کی ہجرت توقع کے مطابق ذرا دلچسپ رہی۔ کسی سے ڈرنا تو ان کی فطرت ہی میں نہ تھا۔ ابھی چند ہی مسلمانوں نے ہجرت کی تھی کہ ایک دن حرم میں پہنچے اور ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ اپنا تیر کمان مجمع قریش کو دکھا کر للکارتے ہوئے فرمایا: "سن لو۔ میں ہجرت کر رہا ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ ڈر سے بھاگا جا رہا ہوں۔ جس کی یہ خواہش ہو کہ اس کی ماں اس کی لاش پر روئے وہ مجھے حرم سے باہر روک کر تماشہ دیکھ لے۔" یہ اپنے خاندان اور قبیلے کے بیس افراد کو لے کر روانہ ہو گئے اور قبا میں رفاعہ بن عبدالمنذر

کے پاس ٹھہر کر حضورؐ کا انتظار کرنے لگے۔

دارالندوہ میں سازش قتل

اب تقریباً تمام مسلمان ہجرت کر چکے تھے۔ مشہور صحابہؓ میں سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا علیؓ رہ گئے تھے۔ کفار قریش کا غصہ روز بروز تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اب اپنے لیے زیادہ خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جس مشن کو اور اس کے حاملین کو فنا کرنے کے درپے تھے' ان کو ایک محفوظ ٹھکانا (یثرب) ہاتھ آگیا ہے۔ کل کلاں کو یہ اور طاقت پکڑ لیں گے تو ہماری معاش اور اقتدار دونوں ہی کا صفایا ہو جائے گا۔ ان کے سامنے اب بہ ظاہر میدان بھی صاف تھا۔ نہ عمر جیسا دبدبے والا انسان موجود تھا نہ دوسرے جاں نثار مکے میں باقی رہے تھے۔ صرف چند ہی باقی رہ گئے۔ یہ سوچ کر انھوں نے ایک دن مشورہ کیا۔ یہ شوریٰ دارالندوہ میں ہوئی۔ دارالندوہ قصی بن کلاب کے محلے میں گویا پارلیمنٹ ہاؤس تھا جہاں تمام اہم امور کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ اس شوریٰ میں بہت سے قریشی شریک ہوئے تھے' جن میں چودہ سرداران قریش خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عتبہ' شیبہ' ابوسفیان' طعیمہ بن عدی' جبیر بن مطعم' حارث بن عامر' نضر بن حارث' ابوالبختری بن ہشام' زمعہ بن اسود' حکیم بن حزام' ابوجہل بن ہشام' نبیہ بن حجاج' منبہ بن حجاج اور امیہ بن خلف۔ بعد میں ان کے تین افراد ابوسفیان' جبیر بن مطعم اور حکیم بن حزام تو ایمان لے آئے اور باقی سب بدر میں ہلاک ہوئے۔

اس کمیٹی میں ایک شخص اور بھی شریک ہوگیا تھا جس کے متعلق روایتوں میں ہے کہ وہ ابلیس تھا اور صورت بشری اختیار کر کے آگیا اور اپنے آپ کو "شیخ نجدی" بتایا تھا۔ انتہائی خبیث اور بدطینت انسان کو بھی "شیطان و ابلیس" کہتے ہیں۔ اس پوری کمیٹی میں کون تھا جو ابلیس یا شیطان نہ ہو؟ اگر

نجدی ابلیس بھی اس مشورے میں شریک ہو گیا ہو تو کون سی تعجب کی بات ہے جو اسے "غیر مرئی ابلیس بہ صورت بشری" ہی قرار دیا جائے؟ دوسرے شرکائے شوریٰ بھی تو انسانی ہی شکل کے شیاطین و ابالسہ تھے۔

اس مشورہ میں ایک شخص نے یہ تجویز پیش کی کہ: "محمدؐ کو لوہے میں جکڑ کر ایک کمرے میں بند کر دو اور باہر سے دیوار کو چن دو کہ وہ خود اپنی موت مر جائے۔ شیخ نجدی نے اس تجویز کے متعلق اپنی رائے یوں دی کہ: "یہ تجویز معقول نہیں کیوں کہ یہ خبر پوشیدہ نہیں رہ سکے گی اور اس کے رفقا تم پر حملہ کر کے اسے چھڑا لیں گے۔" پھر ایک دوسری تجویز یہ پیش کی گئی کہ: "اسے ایک سرکش اونٹ پر بٹھا کر وطن بدر کر دو۔ پھر اس کا جہاں جی چاہے چلا جائے مگر ہم لوگ تو امن و عافیت میں ہو جائیں گے۔ شیخ نجدی نے اس تجویز کی بھی مخالفت کی اور کہا: "تم کو اس کی سحر بیانی اور دلوں کو موہ لینے والی گفتگو کا اندازہ نہیں؟ وہ جس عربی قبیلے میں بھی جا گھسے گا اسے اپنا گرویدہ بنا لے گا' پھر تم سب کو روند ڈالے گا اور تمھارا اقتدار چھین کر جو چاہے گا کرے گا۔" اس کے بعد ابوجہل نے رائے دی کہ: ہر ہر قبیلے میں سے ایک ایک پھرتیلا' بہادر نوجوان لے لو۔ یہ سب موقع پا کر محمدؐ پر ایک ساتھ تلوار سے حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیں۔ اس میں یہ فائدہ ہے کہ اس خون کے ذمے دار تمام قبائل ایک ساتھ شمار ہوں گے اور بنی عبدمناف ان سارے قبائل سے جنگ نہ کر سکیں گے اور آخر انھیں خوں بہا پر راضی ہونا پڑے گا جو ہم سب مل کر ادا کر دیں گے۔

اس تجویز پر سب کا اتفاق ہو گیا اور اسی دن شب کے وقت کاشانہ نبوت کو خاموشی کے ساتھ گھیر لیا گیا۔

ہجرت کی تیاری پہلے سے تھی

یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ حضورؐ نے صحابہ کو ہجرت کی اجازت اس لیے

ہرگز نہ دی تھی کہ وہ سب کے سب چلے جائیں اور حضورؐ خود مکے ہی میں رہ جائیں۔ غرض تو یہ تھی کہ پہلے امت کے لیے ٹھکانا ہو جائے پھر اپنی فکر کریں۔ محمد بن اسحاق وغیرہ کی روایت ہے کہ آغاز ہجرت سے چار چھ ماہ پہلے جناب ابوبکرؓ نے بھی ہجرت مدینہ کی اجازت چاہی تھی لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ: جلدی نہ کرو شاید اللہ تمھارے لیے ایک ساتھی کا بھی سامان فرما دے —— زیرک و فریں ابوبکرؓ نے اشارہ سمجھ لیا اور دو اونٹنیاں اسی وقت خرید لیں جن کی قیمت واقدی کی روایت کے مطابق آٹھ سو درہم تھی۔ ان سواریوں کو آپ نے خوب کھلا پلا کر پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ دارالندوہ کی شوریٰ سے چند دن پہلے ہی حضورؐ خلاف معمول حضرت ابوبکرؓ کے پاس دوپہر کو پہنچے اور اطلاع دی کہ اللہ نے مجھے ہجرت کا حکم دے دیا ہے اور ساتھ ہی جناب ابوبکرؓ کے استفسار پر یہ بھی بتا دیا کہ تمھیں رفاقت کا شرف حاصل ہوگا۔ اس خوش خبری کو سن کر حضرت ابوبکرؓ خوشی سے رونے لگے اور فرمایا کہ میں نے یہ دو سواریاں پہلے ہی سے مہیا کر رکھی ہیں۔

شب ہجرت

آج خون کے پیاسے رات کی تاریکی میں کاشانہ نبوی سے باہر فجر کا انتظار کر رہے ہیں کہ حضورؐ باہر تشریف لائیں تو دفعتہً سب کے سب ایک ساتھ اپنی اپنی سیف بے نیام کے جوہر دکھائیں اور اس ناکردہ گناہ معصوم ہستی پر اپنی تلواریں آزمائیں جس نے آج تک کسی ظالم دشمن پر بھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ یہ اس کے خون سے زمین حرم کو رنگین کرنا چاہتے ہیں جس سے زیادہ کسی نے انسانی خون کا احترام نہیں کیا۔ آج کائنات کی نظریں اس مرکز کائنات پر لگی ہوئی ہیں اور معاملے کی نزاکت اپنے انتہائی نقطہ عروج پر پہنچ چکی ہے۔ زندگی آج ایک بالکل نئے موڑ پر قدم رکھنے والی ہے۔

ان عربوں میں کفر کے باوجود رسم و رواج کی اتنی بھر رعایت موجود تھی کہ بے دھڑک کسی کے گھر کے اندر گھس جانا معیوب سمجھتے تھے' اس لیے باہر ہی انتظار کرتے رہے۔ اور وہاں مقصود کائنات نے ایک مشت غبار اٹھا کر سورہ یٰسین کی آیات فھم لا یبصرون تک تلاوت فرمائیں اور مشت خاک ان کی طرف پھینک دی۔ اب تک تو وہ بصیرت کے لحاظ سے فھم لا یبصرون کے مصداق تھے۔ اب تھوڑی دیر کے لیے ان کی بصارت پر بھی فھم لا یبصرون کا پردہ پڑ گیا اور حضورؐ خاموشی سے نکل کر اپنے رفیق (ابو بکرؓ) کے گھر پہنچ گئے۔

گھر سے باہر آتے وقت حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ: ''تم میرے بستر پر میری یہ (حضرمی سبز) چادر سر سے پاؤں تک اوڑھ کر سو رہو۔ تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ میں ہجرت کر رہا ہوں۔ میرے پاس فلاں فلاں کی امانتیں ہیں۔ یہ ساری امانتیں واپس کر کے تم بھی روانہ ہو جانا۔

لمحہ فکریہ

ذرا اس مقام کو غائر نگاہوں سے دیکھیے۔ ایک نمونہ وہ تھا کہ صہیب رومی سے ان کی ساری کمائی اہل مکہ چھین لیتے ہیں اور ابو سلمہ سے ان کی بیوی بچے کو بھی لے لیتے ہیں' اور ادھر اقدار انسانی کا یہ مظاہرہ ہو رہا ہے کہ خون کے پیاسوں کی امانتیں واپس کی جا رہی ہیں۔ اپنے اول المومنین بھائی (علیؓ) کی جان کو اس پر خطر ماحول میں اس لیے چھوڑا جا رہا ہے کہ لوگوں کی امانتیں واپس کر دی جائیں۔ جہاں جان خطرے میں پڑ رہی ہو وہاں ان انسانی قدروں کا کون لحاظ رکھ سکتا تھا؟ وہی رسول امینؐ جس کی بعثت کا مقصد ہی ان اخلاقی اقدار کا قیام تھا۔ یہ بھی قابل غور حقیقت ہے کہ ہزار عداوتوں کے باوجود دشمنوں کو بھی حضورؐ پر یہ اعتماد کامل تھا کہ یہ امانت میں خیانت نہیں کر سکتے۔ حضورؐ کے پاس

ان میں سے ہر شخص اپنی جان اور اپنے مال کو محفوظ ہی یقین کرتا تھا۔ جو حقیقت یہ نہیں سمجھ سکے وہ یہ تھی کہ بندوں کا امین پیغام الٰہی اور انسانیت کا بھی سب سے بڑا امین ہے۔

مرتضوی ایمان

حضورؐ نے جناب علیؓ کو یہ حکم دیا تھا کہ میری چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو رہو اور ساتھ ہی یہ خوش خبری بھی دے دی کہ تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ پھر یہ بھی فرما دیا کہ امانت والوں کی امانتیں واپس کر کے تم بھی چل کھڑے ہونا۔ ایسی بھیانک رات میں کیسے نیند آسکتی ہے جب کہ جان و ایمان سے بڑھ کر محبوب جدا ہو رہا ہو اور باہر تلواریں خون کی پیاس سے بے تاب ہو رہی ہوں؟ بظاہر اوپر تلوار کی نوکیں ہیں اور نیچے کانٹوں کا فرش ہے۔ مگر تعمیل حکم کے آگے گردن جھکا دیتے ہیں۔ اور صرف تعمیل ارشاد ہی نہیں اس خوش خبری پر اتنا یقین بھی ہے کہ آرام کی نیند سو جاتے ہیں۔ ایسی میٹھی اور خوش گوار نیند جو شاید اس سے پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ ایمان کی یہ پختگی اور قلب کا یہ ایمان علی مرتضیٰؓ کے سوا اور کسے حاصل ہو سکتا تھا۔

مکے سے روانگی

حضورؐ محاصرہ کفار سے خاموشی کے ساتھ نکل کر جناب ابوبکرؓ کے ہاں پہنچے۔ جناب ابوبکرؓ نے دو سواریاں تو پہلے ہی سے مہیا کر رکھی تھیں' لیکن ہجرت کی خدمات صرف دو سواریوں تک محدود نہ تھیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ہجرت کا سارا کریڈٹ نہیں تو اس کا زیادہ سے زیادہ حصہ جناب ابوبکرؓ کے گھرانے ہی کو ملتا ہے۔ آپؓ نے ان دونوں سواریوں کو عبداللہ بن اریقط دئلی کے سپرد کر دیا تھا کہ جب اور جہاں ضرورت ہو اسے لے آئے اور وقت ضرورت تک ان کو چراتا اور ان کی حفاظت کرتا رہے۔ یہ ابن اریقط مشرک تھا لیکن حضرت

ابوبکرؓ کا راز دار تھا۔ اسے آپؐ نے کہہ رکھا تھا کہ تم سے کسی وقت مدینے کا راستہ بتانے کا کام لیا جائے گا۔

لمحہ فکریہ

زندگی کے اتنے نازک موڑ پر ایک مشرک کو راز دار بنانا یہ ثابت کرتا ہے کہ عام اصول زندگی تو یہی ہے کہ اپنے خاص معاملات میں غیر مسلموں کو شریک نہ کیا جائے لیکن اگر کسی کے طرز عمل اور دوسرے قوی قرائن سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ وقت معین تک راز دار رہے گا اور اس وقت کے بعد اگر افشا بھی ہو جائے تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو اس پر اعتماد کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ زندگی میں ایسے مراحل بھی آسکتے ہیں کہ ایک غیر مسلم کسی معاملے میں مسلمان سے زیادہ راز دار اور قابل اعتماد ثابت ہو۔ خود حاطب بن ابی بلتعہ جیسے بدری اور ابو لبابہ جیسے صحابی سے بعض اہم ترین راز فاش ہو گئے۔ (تفصیل غزوہ بنی قریظہ اور فتح مکہ کے بیان میں دیکھیے) اور ہجرت کے موقعے پر عبداللہ بن اریقط اور عباس بن عبدالمطلب نے جو اب تک مسلمان نہ ہوئے تھے پوری رازداری سے کام لیا۔ ہماری مملکت پاکستان میں یہ بحثیں کئی موقعوں پر سامنے آئی ہیں کہ غیر مسلم کو کوئی کلیدی منصب دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس معاملے میں اقتضائے احوال کے مطابق ہر ممکن احتیاط تو مقدم اصول ہے لیکن اس سلسلے میں حضورؐ یا جناب ابوبکرؓ کے طرز عمل سے ہمیں روشنی مل سکتی ہے۔

بہرحال عبداللہ بن اریقط کو جو اب ابوبکرؓ نے راز دار دلیل راہ بنانے کے علاوہ اپنے صاحب زادے عبداللہ بن ابی بکر کے سپرد یہ ڈیوٹی کی کہ اہل مکہ کی سرگرمیوں کی اطلاع شب کی تاریکی میں آکر غار ثور میں دے دیا کریں۔ نیز اپنے غلام عامر بن فہیرہ کے ذمے یہ کام کیا کہ دن بھر ادھر ادھر بکریاں چراتا رہے اور رات کو انھیں ہنکار کر غار کے پاس لے آئے اور دودھ فراہم کرے

اور گوشت بھی۔ عبداللہ بن ابی بکر شب کو ضروری خبریں پہنچا کر واپس آجاتے اور عامر بن فہیرہ بکریاں اسی راستے پر لے جاتے تاکہ ان کے نشان قدم مٹ جائیں۔ مزید برآں حضرت ابوبکرؓ کی صاحب زادی اسما کے سپرد یہ خدمت ہوئی کہ وہ شب کو کھانا پہنچا جایا کریں۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق جناب ابوبکرؓ اپنی اندوختہ رقم بھی جو پانچ یا چھ ہزار درہم تھے' ساتھ لیتے گئے تھے۔

غرض یہ تمام انتظامات حضرت ابوبکرؓ نے کر لیے تھے اور خود سائے کی طرح حضور کے ساتھ ساتھ رہے۔

اہل مکہ نے جس شب کو محاصرہ کیا تھا وہ تاریک تھی یعنی ماہ صفر ۱۲ نبوی کی ستائیسویں شب (مطابق ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء) غالباً یہ وقت اس لیے انھوں نے رکھا تھا کہ چاندنی میں محاصرے کا علم آسانی سے ہو جاتا۔ مگر حضورؐ کو ان کے محاصرے سے صاف بچ نکلنے میں اسی تاریکی نے مدد دی۔ حضورؐ نے جناب ابوبکرؓ کے گھر پہنچ کر فوراً" تیار ہونے کا حکم دیا۔ اسما بنت ابی بکر نے جھٹ پٹ کچھ کھانے کی چیزیں مہیا کیں اور ایک تھیلی میں رکھ دیں۔ تھیلی کا منہ باندھنے کو کوئی رسی نہ ملی تو اپنے پٹکے کو بیچ سے پھاڑ کر دو حصے کر لیے اور ایک سے تھیلی کا منہ باندھ دیا۔ ان کی یہ ادا کچھ ایسی پسندیدہ ہوئی کہ ان کا لقب ہی ذات النطاقین ہو گیا یعنی ایک پٹکے کو پھاڑ کر دو کرنے والی۔

اس تاریک شب میں حضورؐ اپنے رفیق کے ساتھ پیدل روانہ ہو گئے۔ مکے سے باہر جا کر ایک حسرت بھری نگاہ کعبتہ اللہ پر ڈالی اور فرمایا: "اے بیت اللہ! تو مجھے بہت عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔"

رات کی تاریکی اپنی سیاہ چادر میں لپیٹے ان دونوں رفیقوں کو لیے جا رہی ہے جن میں ایک سید الانبیا ہے اور دوسرا افضل الناس۔ مستقبل کائنات اور مستقبل انسانیت کا سارا انحصار ان دو ہستیوں پر ہے۔ ان دونوں کا یہ سفر کون و مکاں کی زندگی میں ایک ایسا موڑ (Turning Point) ہے جس سے

زیادہ نازک مرحلہ کبھی نہیں آیا۔ قدم قدم پر یہ صدیق عجیب عجیب انداز سے اپنا حق رفاقت ادا کر رہا ہے۔ اسے نہ اپنا ہوش ہے نہ اپنی ہستی کی فکر۔ شمع نبوت خراماں خراماں چلی جا رہی ہے۔ کائنات کی ساری قوتیں اس سراج منیر کی محافظت پر مرتکز ہیں مگر اس رفیق کی بے چینی' اضطراب' شیفتگی اور پروانگی دیکھنے کے قابل ہے۔ یہ کبھی آگے ہو جاتا ہے' کبھی پیچھے' کبھی دائیں آ جاتا ہے' کبھی بائیں۔ بس ایک پروانہ ہے جو اپنی شمع کے گرد چکر کاٹ رہا ہے اور استفسار نبوی پر خود ہی اس کی وجہ بتا دیتا ہے کہ جدھر سے خطرے کا وہم بھی گزرتا ہے' یہ پروانہ ادھر ہی جان نثاری کے لیے لپک پڑتا ہے:

من و دل گر فنا شدیم چہ باک
غرض اندر میاں سلامت اوست

چلتے چلتے حضورؐ کے پائے مبارک میں آبلے یا خراش پیدا ہو گئی۔ یہ کیفیت دونوں ہی کی ہوئی ہو گی لیکن صدیق نے اس تاریکی میں حضورؐ کے انداز رفتار سے اسے محسوس کر لیا اور حضورؐ کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ نوکیلے سنگ ریزوں اور پتھروں نے اب جناب ابوبکرؓ کے پاؤں کو اور زیادہ مجبور کرنا شروع کیا ہو گا لیکن اب یہ رفیق پہلے سے زیادہ چستی کے ساتھ سنبھل سنبھل کر چلنے لگا۔ کار نبوت کو (حضورؐ کے بعد) وہی سنبھال سکتا تھا جو آج بار نبوت سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس رفیق نے کتنی مسافت اس طرح طے کی اور راستے میں کتنے نشیب و فراز کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن یہ بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ ابوبکرؓ کے اس محشر بداماں اور رحمت بدوش خرام کے ایک ایک قدم پہ زندگی کی ساری عبادتیں قربان ہیں۔ صدیقؓ نے خود اس شرف سے سبک دوش ہونے کی کوئی خواہش نہ کی ہو گی۔ اگر حضورؐ کو اتارا ہو گا تو خود حضورؐ ہی کے اصرار سے اتارا ہو گا۔

لمحہ فکریہ

مکے سے کوئی چار میل پر ایک پہاڑ ہے جس کا نام ثور ہے۔ اس کی بلندی پر ایک غار ہے جسے غار ثور کہتے ہیں۔ پہاڑ کی بلندی کے بعد نشیب میں ایک ڈھلوان اور دشوار گزار راستہ ہے جس کے اختتام پر یہ غار ہے۔ یہ دونوں آقا و خادم اس کے دہانے پر پہنچ گئے۔ جناب ابوبکرؓ حضورؐ کو باہر ہی ٹھہرا کر پہلے خود اندر گئے۔ اس کے اندر بیٹھ کر بلکہ رینگ کر جانا پڑتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں دو ہی غار ہیں جن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک ہے غار حرا جہاں پہلی وحی آئی تھی اور دوسرا ہے غار ثور جہاں حضورؐ اور صدیقؓ نے تین دن گزارے تھے۔ غار حرا کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں مگر غار ثور کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے غار کے اندر جا کر پہلے اسے صاف کیا۔ صاف کرتے ہوئے ان کی انگلی بھی زخمی ہو گئی۔ جہاں درزیں نظر آئیں' ان کو پتھروں یا کپڑوں سے بند کیا۔ پھر حضورؐ کو اندر بلا لیا۔ حضورؐ بہت تھک گئے تھے' اس لیے اپنے رفیق کے زانو پر سر رکھ کر سو گئے۔ گویا:

رکھی ہوئی رحل پہ خدا کی کتاب ہے

تلاش اور تشدد

فجر ہوتے ہی محاصرین نے بسترے پر حضرت علیؓ کو پایا۔ پوچھا: محمدؐ کہاں ہیں؟ آپ نے جواب دیا: مجھے کیا معلوم؟ اس جواب پر انھیں غصہ آیا۔ جناب علیؓ کو کچھ مارا پیٹا اور تھوڑی دیر حرم میں محبوس رکھ کر چھوڑ دیا۔ یہ ظالم غصے میں حضرت علیؓ کو قتل بھی کر سکتے تھے۔ لیکن اولاً تو ان کا مقصد علیؓ نہ تھے۔ یہ تو اس ہستی کو ختم کرنا چاہتے تھے جو اس مشن (اسلام) کا مرکز ہے۔ دوسرے انھوں نے سوچا کہ جتنا وقت علیؓ سے پوچھ گچھ کرنے' یا ان پر تشدد کرنے میں صرف کیا جائے گا وہی وقت حضورؐ کی تلاش میں کیوں نہ لگایا جائے۔ ایسا نہ ہو

کہ ہم ادھر لگے رہیں اور اصلی شکار ہاتھ سے نکل جائے۔ اس لیے انھوں نے حضرت علیؓ کو تو وہیں چھوڑ دیا اور ہر طرف مکے میں حضورؐ کو ڈھونڈنے کے لیے بکھر گئے۔ انھیں علم تھا کہ جناب ابوبکرؓ ہی سب سے بڑے رفیق و راز دار ہیں اور سب سے زیادہ سراغ بیت صدیق ہی سے مل سکتا ہے' اس لیے پہلے یہیں پہنچے۔ اور دیکھا تو ابوبکرؓ بھی غائب تھے۔ جناب اسما بنت ابی بکر سے سراغ لیا گیا تو انھوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ اس پر ابوجہل نے تاؤ کھا کر اس زور کا طمانچہ رسید کیا کہ اسما کے ایک کان کی بالی نیچے گر پڑی۔ ان کا مقصود اسما بھی نہ تھیں' اس لیے انھیں وہیں چھوڑ کر حضورؐ کی تلاش میں مکے کا کونا کونا ڈھونڈ مارا۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ حضورؐ مکے میں نہیں بلکہ باہر جا چکے ہیں تو مکے سے باہر تلاش کے لیے نکلے۔

دشمن سر پر

عربوں کو بعض وجدانی قسم کے علوم و فنون پر بڑی مہارت تھی۔ مثلاً علم قیافہ کے یہ بڑے ماہر تھے۔ ہماری فقہ اسلامی تک کے بعض مسائل کا دارومدار اس علم پر رکھا گیا ہے۔ حتیٰ کہ زید بن ثابت کا پاؤں دیکھ کر ایک قائف نے فیصلہ دے دیا تھا کہ ثابت کا فرزند ہے۔ اسی طرح بعض عرب بڑے اعلیٰ درجے کے عریف بھی تھے جو نہ فقط انسان کے نقش قدم کو پہچان لیتے تھے بلکہ گھوڑے کے نشان سم کو دیکھ کر اس کی نسل کا حال بتا دیتے تھے۔ یہ فن اب تک وہاں موجود ہے۔ ہمارے ملک کے "کھوجیوں" کی طرح نشان قدم سے مجرم کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ اس وقت اس فن کا بڑا ماہر سراقہ بن جعشم تھا۔ یہ ایک جماعت کے ساتھ چلا اور ان دونوں (حضورؐ اور صدیقؓ) کے پورے' ادھورے' نمایاں اور مٹے ہوئے پنجوں اور ایڑیوں کے نشان کی مدد سے کوہ ثور کی بلندی پر پہنچ گیا جہاں سے دہانہ غار کا فاصلہ ابن عساکر کی روایت کے مطابق

دو سو ہاتھ رہ گیا۔ اس سے آگے انھیں کوئی نشان قدم نہ ملا‘ غالباً اس لیے کہ وہ کوہی راستہ پتھریلا تھا‘ مٹی یا ریت سے خالی تھا۔ یہاں وہ حیران کھڑے سوچتے رہے۔ سامنے ڈھلوان میں غار نظر آیا اور یہ ادھر ہی روانہ ہوگئے۔ کوئی پچاس ہاتھ کا فیصلہ رہ گیا تھا کہ ابوبکرؓ نے انھیں دیکھ لیا اور رونے لگے۔ انھیں اپنی فکر نہ تھی۔ جو کچھ فکر تھی حضورؐ کی تھی۔

معاملے کی نزاکت اپنے انتہائی نقطہ عروج پر پہنچ گئی ہے۔ گویا موت اپنا بھیانک جبڑا کھولے آگے بڑھتی چلی آرہی ہے۔ جناب صدیق بلاشبہ اتنا بڑا ظرف رکھتے ہیں کہ وفات نبوی کے بعد کوئی انسان ان کے سوا ایسا نہ تھا جس نے اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھا ہو۔ اس کے باوجود اس وقت صدیق بھی تقاضائے بشریت سے مغلوب ہوگیا۔ یہی وہ اہم مقام ہے جہاں ایک نبی اور غیر نبی کے ظرف میں واضح فرق کا پتا چلتا ہے۔ صدیقؓ گھبرا گیا۔ اپنے لیے نہیں حضورؐ کے لیے‘ مگر پیغمبر کا اطمینان اور ظرف ایقان دیکھیے۔ وہ اپنے رفیق سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ:

> یہاں صرف ہم دو ہی نہیں۔ ایک تیسرا بھی ہے اور وہ خدا ہے۔ لٰہذا لاتحزن ان اللّٰہ معنا کوئی فکر نہ کرو۔ خدا ہم دونوں کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جناب صدیقؓ کا دل بھی انوار سکینہ کے نزول میں ہم رنگ رسول ہوگیا۔ یہ مقام تاریخ انسانی کا اتنا اہم موڑ تھا کہ بعد میں قول رسولؐ اور صدیقؓ کے نزول سکینہ کا ذکر قرآن نے بھی یوں کیا:

> اذ اخرجه الذين كفروا ثانی اثنين اذهما فی الغار
> اذيقول لصاحبه لاتحزن ان اللّٰه معنا فانزل اللّٰه
> سكينته عليه و ايده بجنود لم تروها (التوبہ: ۴۰)

خدا نے رسول کی اس وقت بھی مدد کی جب اہل کفر نے
اسے نکالا اور وہ دو میں ایک تھا۔ اس وقت وہ دونوں غار
(ثور) میں تھے اور وہ (رسول) اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ
رہا تھا کہ فکر نہ کر خدا ہم دونوں کے ساتھ ہے۔ (بس یہ
کہتے ہی) خدا نے اپنی سکینت اس (ابوبکر) پر نازل فرما
دی اور اس کی تائید ایسے (کائناتی قوتوں کے) لشکروں سے
کی جو تمھیں نظر نہیں آسکتے تھے۔

معارف و حقائق کا ناپیدا کنار سمندر اس آیت کے کوزے میں سمو دیا گیا۔ اس کی تشریح اس وقت پیش نظر نہیں' تاہم چند نکات سن ہی لینا چاہیے:

۱۔ ثانی اثنین کہہ کر واضح کر دیا گیا ہے کہ دونوں کا مشن ایک ہی تھا۔ روح و جان ایک ہی تھی اور قالب دو تھے۔

۲۔ لصاحبہ فرما کر یہ اعلان کر دیا گیا کہ جناب ابوبکرؓ کی صحابیت کاملہ کا منکر قرآنی ارشاد کا منکر ہے کیوں کہ دنیا کی کوئی ہستی نہیں جو جناب ابوبکر کے علاوہ رفیق غار تسلیم کی گئی ہو۔

۳۔ لاتحزن سے یہ واضح ہے کہ ہزار بار فنافی الرسول ہونے کے باوجود بھی مقام نبوت اصل اور مقام صدیقیت اسی کی فرع ہے۔

۴۔ علیہ سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ ابوبکر ہی کا سینہ انوار سکینت کا مہبط تھا کیوں کہ رسولؐ تو پہلے ہی صاحب سکینت تھا۔ اس سکینت کی ضرورت تو ابوبکرؓ کو تھی نہ کہ رسولؐ کو۔

۵۔ لہٰذا وایدہ بجنود لم تروھا بھی جناب صدیق ہی کے متعلق ہے۔ یہ جنود ـــــ نظر نہ آسکنے والے لشکر ـــــ یہ وہی کائناتی قوتیں ہیں جن کو ہم ملائکہ بھی کہتے ہیں۔ یہی وہ انوار ہیں جو ثبات قلب بخشتے ہیں۔

یہ غار کی رفاقت وہ رفاقت ہے جس کی وجہ سے رفاقت کاملہ کے لیے

"یار غار" ہمیشہ کے لیے ایک یادگار محاورہ بن گیا۔ ہجرت کی یہ رات اور جناب ابوبکرؓ کی یہ فدویت ایسی عجیب انداز کی تھی کہ جناب عمرؓ فرماتے تھے کہ: "ابوبکرؓ کی یہ رات عمرؓ اور عمرؓ کے سارے خاندان کے اعمال حسنہ پر تنہا بھاری ہے۔ یہ رات ہی نہیں بلکہ ابوبکرؓ کا ایک دن بھی عمرؓ اور آل عمرؓ سے بہتر ہے۔" (رواہ البیہقی)

سامان محافظت

ذرا اس منظر کو آنکھوں کے سامنے لائیے کہ دہانہ غار سے چند گز کے فاصلے پر خون کے پیاسے کھڑے ہیں جن کو یہ دونوں بزرگ وار نشیب غار سے دیکھ رہے ہیں۔ خود جناب ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ: "اگر یہ لوگ اپنے پیروں کو (جھک کر) دیکھتے تو ہمیں بھی دیکھ لیتے۔" اس نازک مرحلے پر خدا نے محافظت کا نہایت عمدہ سامان کیا۔ مسند امام احمد میں ہے کہ: "جب یہ لوگ دہانہ غار پر پہنچے تو وہاں ایک مکڑی کا جالا دیکھا اور یہ سوچا کہ اگر یہاں اندر کوئی جاتا تو جالا سلامت نہ رہتا۔"

اس روایت میں صرف تار عنکبوت کا ذکر ہے (کبوتر یا درخت کا کوئی ذکر نہیں جیسا کہ بعض لوگ بیان کرتے ہیں)۔ غار میں داخل ہونے کے بعد تھوڑی دیر میں مکڑی کا جالا تان دینا کوئی بعید از فہم بات نہیں۔ یہ ضرور ہوا ہوگا اور اسی اوھن البیوت نے ان کی عقلوں پر پردہ ڈال دیا ہوگا۔ ورنہ غار کے اندر انھیں تلاش کرنے میں کیا چیز روک سکتی تھی؟ یہ خدا کی شان ہے کہ اس نے کم زور ترین تار عنکبوت سے وہ کام لے لیا جو بڑی سے بڑی میگزین بھی نہیں کرسکتی تھی۔

تلاشی کی ناکامی کے بعد یہ تمام لوگ واپس ہوگئے اور آفتاب نبوت کوکب ولایت کے ساتھ تین دن اسی برج ثور میں مقیم رہا جہاں جناب صدیقؓ

کے انتظام کے مطابق کھانا اور دودھ وغیرہ بھی ملتا رہا اور ضروری خبریں بھی پہنچتی رہیں۔ تین شبانہ یوم اس غار میں گزارے اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اب لوگ اس راستے کی طرف نہیں آئیں گے دونوں بزرگ وار چل کھڑے ہوئے۔ حسب وعدہ عبداللہ بن اریقط سواریاں لے آیا تھا۔ عامر بن فہیرہ بھی ساتھ تھا۔ یہ چاروں ساحلی راستے سے مدینے کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ بھی واضح رہے کہ حضورؐ جس اونٹ پر سوار ہوئے وہ اگرچہ حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ ہی کے لیے خرید رکھا تھا لیکن حضورؐ اس وقت اس پر سوار ہوئے جب حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کی خواہش کے مطابق اس کی قیمت لینا گوارا کر لیا۔

تلاش مزید

ادھر کفار قریش نے تلاش مزید کی تدبیر کے لیے یہ اعلان کر دیا کہ: جو شخص محمدؐ یا ابوبکرؓ کو زندہ گرفتار کر لائے یا ان کے سر لے آئے اسے سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے۔ اس اعلان نے تلاش میں مزید سرگرمی پیدا کر دی۔ اسی دوران میں ایک مدلجی شخص نے سراقہ بن مالک بن جعشم کو اطلاع دی کہ میں نے کچھ آدمیوں کو ساحلی راستے پر جاتے دیکھا ہے اور میرا گمان ہے کہ وہ محمدؐ اور ان کے ساتھی ہی ہوں گے۔ سراقہ نے سوچا کہ اگر کسی اور کو اس کی خبر ہو گئی تو ممکن ہے وہی سبقت کر جائے۔ لہٰذا اس نے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے کہہ دیا کہ نہیں وہ فلاں فلاں آدمی ہیں جو میرے سامنے ہی ادھر گئے ہیں۔ یہ کہہ کر سراقہ خاموشی سے گھر آیا۔ اپنا برچھا لے کر گھوڑے پر سوار ہوا' مگر گھوڑے نے اسے گرا دیا۔ سراقہ نے اپنے تیروں سے فال لی' جواب نفی میں آیا' مگر سو اونٹوں اور شہرت کے لالچ نے اسے پیچھا کرنے پر مجبور کر دیا۔ گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا حضورؐ کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت حضورؐ قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے' اور کچھ ایسی پر اطمینان محویت تھی کہ سراقہ کی طرف رخ

بھی نہ کیا۔ مگر رفیق غار بے چینی سے بار بار ادھر مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ یہاں ایک بار پھر نبوت اور صدیقیت کے حوصلوں کا فرق نمایاں ہو گیا۔ اتنے میں سراقہ کے گھوڑے کے دونوں اگلے پاؤں زمین میں دھنس گئے اور ایک طوفان غبار نے اسے اترنے پر مجبور کر دیا۔ اب اس نے پھر دور جاہلیت کے مطابق فال لی اور پھر نفی میں جواب ملا۔ اس وقت سراقہ کو یقین ہو گیا کہ میری کوشش رائیگاں جائے گی اور حضورؐ کو ایک دن غلبہ حاصل ہو گا۔ یہ سوچ کر اس نے آوز دی کہ: "اہل مکہ آپ کو گرفتار یا قتل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے انھوں نے سو اونٹ کا انعام رکھا ہے جس کے لیے میں نے پیچھا کیا تھا۔ مگر اب مجھے امان عطا کیجیے اور میرے پاس جو کچھ زاد راہ اور دوسری چیزیں ہیں سب لے لیجیے۔" اس کے جواب میں حضورؐ نے اور جناب صدیقؓ نے اتنا کہا کہ: ہم سے تم دور ہی رہو۔ سراقہ نے امان طلب کی اور حضورؐ کے حکم سے عامر بن فہیرہ نے ایک چمڑے (یا کپڑے یا ہڈی) پر امان نامہ لکھ دیا۔ یہ روایت بخاری کی ہے اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ اس پوری روایت میں کوئی بات ایسی نہیں جسے صحیح تسلیم کرنے میں کوئی تامل پیدا ہو۔ مگر یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ اس بے سروسامانی کے عالم میں حضورؐ کے پاس قلم' دوات اور کاغذ تھا؟ مولانا شبلی کی سیرت النبی دیکھی' فٹ نوٹ میں اس کھٹک کو دور کرنے کے لیے انھوں نے یہ لکھا ہے کہ:

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پریشانی کی حالت میں بھی
دوات قلم ساتھ رہتا تھا۔"

لیکن بات یوں معلوم ہوتی ہے کہ سراقہ نے امان طلب کی اور حضورؐ نے زبانی امان دے دی۔ اس نے امان نامہ لکھنے کی درخواست کی تو سامان کتابت موجود نہ ہونے کی وجہ سے چمڑا یا کوئی چیز بطور علامت مرحمت فرمادی۔ یہ علامت بعد میں "امان نامہ" بن گئی' اور اس امان نامے کے لیے "کتابت" کا

نام تجویز کر لیا گیا۔

یہ سراقہ غزوۂ طائف کے بعد "جعرانہ" میں حضورؐ سے ملے اور اسلام لے آئے۔ حضورؐ نے انھیں بشارت دی تھی کہ: میں تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کا طلائی کنگن دیکھ رہا ہوں۔ حضورؐ کی یہ خوش خبری سید نا عمرؓ کے عہد خلافت میں پوری ہوئی جب کہ سراقہ صاحب فراش تھے۔ یہ پیش گوئی حضورؐ نے اس وقت فرمائی تھی جب انھیں امان نامہ دیا گیا تھا۔ اہل مکہ نے صرف اونٹوں کا وعدہ کیا تھا اس شرط پر کہ حضورؐ یا صدیقؓ کی گرفتاری بھی عمل میں آئے۔ مگر حضورؐ نے کسی شرط کے بغیر امان بھی دی اور کسریٰ کا کنگن بھی۔ (استیعاب)

اقرار صداقت اور صدیقیت

اس سفر ہجرت میں ایک اور دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک موقعے پر ایک شخص ملا جو جناب ابو بکرؓ کا شناسا تھا مگر حضورؐ کو نہیں پہچانتا تھا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے حضرت ابو بکرؓ سے پوچھا کہ: "یہ تمھارے ساتھ دوسرا کون آدمی ہے؟" ذرا سوچیے جناب ابو بکرؓ کی جان اس وقت کیسی ضیق میں پڑ گئی ہو گی۔ اگر غلط بتائیں تو جھوٹ ہوتا ہے جو صدیق کے صدق و راست گفتاری کے خلاف ہے اور اگر سچ بتائیں تو ڈر ہے کہ دشمنوں کو علم ہو جائے جو صداقت و یاری کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ ایسے نازک مواقع پر جب کہ دو قدروں میں کش مکش ہو رہی ہو حواس کا قائم رکھنا دشوار ہوتا ہے اور انسان اس کش مکش سے نکلنے کے لیے سوچ میں پڑ جاتا ہے، لیکن جناب صدیق فوراً اسے یہ برجستہ جواب دے کر آگے بڑھ گئے کہ: رجل یھدینی السبیل یہ ایک آدمی ہے جو مجھے راستہ دکھاتا ہے۔ آپ کا مقصد تو یہ تھا کہ حضورؐ ہمیں راہ ہدایت دکھاتے ہیں اور سائل یہ سمجھا کہ ابو بکرؓ نے اس سفر کے لیے کوئی رہنما

ساتھ رکھ لیا ہے۔ ایسے کلام کو "توریہ یا ایہام" کہتے ہیں۔ اس کی مثالیں دنیا میں بہت ہیں لیکن یہ مثال برجستگی اور حاضر دماغی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

سراقہ یہاں سے نہ فقط خود واپس گئے بلکہ راستے میں جو بھی ملا اسے کسی بہانے سے واپس کر دیا۔

اسی سفر میں حضورؐ، ابوبکرؓ، عبداللہ بن اریقط اور عامر بن فہیرہ چاروں ایک خیمے سے گزرے جہاں ام معبد بیٹھی تھیں۔ یہاں سب نے ذرا دیر آرام کیا اور حضورؐ کی برکت سے ایک مریل سی بکری کے دودھ سے سب سیراب ہوئے۔ جب یہ قافلہ آگے بڑھ گیا تو اس کا شوہر ابو معبد پہنچا، اور واقعات سن کر اس نے اندازہ لگایا کہ یہ وہی قافلہ ہے جسے قریش گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے ام معبد سے مزید حالات و اوصاف دریافت کیے۔ ام معبد نے اس وقت جو حضورؐ کا سراپا بیان کیا وہ ایسی نعت نبوی ہے جس کا جواب عربی ادب میں ملنا مشکل ہے۔ اس نے کہا:

قالت: رایت رجلًا ظاہر الوضاءۃ ابلج الوجہ، حسن الخلق، لم تعبہ ثجلہ، ولم تزربہ صلعہ، وسیم قسیم، فی عینیہ دعج، و فی اشعارہ وطف، و فی صوتہ صحل، و فی عنقہ سطع، و فی لحیتہ کثافہ، ازج، اقرن۔ ان صمت فعلیہ الوقار، وان تکلم سما و علاہ البہاء۔ اجمل الناس وابہاہ من بعید واحلاہ واحسنہ من قریب۔ حلوالمنطق لاہذر ولانزر۔ کان نطقہ خرزات نظم۔ ربع لا تشنؤہ من طول، ولا تقتحمہ من قصر۔ غصن بین غصنین۔ فہو انضر الثلاثہ منظراً وا حسنہم قدرا۔ لہ رفقاء یحفون بہ۔ ان

قال انصتوا لقوله وان امرتبا دروا امرہ' مجفود۔ محشود۔ لاعابس ولامفند۔

قال ابو معبد هو واللہ صاحب قریش الذی ذکر لنامن امرہ ماذکر بمکہ ولقد هممت ان اصحبہ' ولا فعلن ان وجدت الی ذلک سبیلا...... (کبیر نجفی)

"کہ یہ برکت ہے ایک شخص کی جو ابھی ادھر سے گزرا تھا۔ اس نے کہا کہ ذرا اس کا حال تو بتاؤ۔ اس پر وہ بولی: میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کی نظافت نمایاں' جس کا چہرہ روشن' اور جس کی بناوٹ (خلق) میں حسن تھا' نہ موٹاپے کا عیب نہ دبلا پے کا نقص' خوش رو' حسین' آنکھیں کشادہ اور سیاہ' پلکیں لمبی' آواز میں کھنک' گردن صراحی دار' داڑھی گھنی' بھویں کمان دار اور جٹی ہوئی' خاموشی میں وقار کا مجسمہ' گفتگو میں صفائی اور دلکشی' حسن کا پیکر اور جمال میں یگانہ روزگار' دور سے دیکھو تو حسین ترین' قریب سے دیکھو تر شیریں ترین بھی اور جمیل ترین بھی۔ گفتگو میں مٹھاس۔ نہ فضول گفتگو کرے اور نہ ضرورت کے وقت خاموش رہے۔ گفتگو اس انداز کی جیسے پروئے ہوئے موتی۔ ایسا میانہ قد جس میں نہ قابل نفرت درازی' نہ حقارت آمیز کوتاہی۔ اگر دو شاخوں کے درمیان ایک اور شاخ ہو' تو وہ دیکھنے میں ان تینوں شاخوں سے زیادہ تروتازہ دکھائی دے اور قدروقیمت میں ان سب سے زیادہ بہتر نظر آئے۔ اس کے کچھ جاں نثار تھے جو اسے

گھیرے رہتے۔ جب وہ بولتا تو سب خاموش ہو جاتے۔
جب کوئی حکم دیتا تو اس کی تعمیل کے لیے ٹوٹ پڑتے۔ سب
کا مخدوم' سب کا مطاع' ترش روئی سے پاک اور قابل
گرفت باتوں سے مبرا۔

ابو معبد بولے کہ خدا کی قسم یہ وہی قریشی معلوم ہوتا
ہے جس کا ذکر میں مکے میں سن چکا ہوں۔ میں ارادہ بھی کر
چکا ہوں کہ اس کی صحبت نصیب ہو۔ اگر اس کی سبیل نظر
آئی تو میں یہ ضرور کروں گا۔"

بریدہ بن خصیب اسلمی کا اقدام

اس سفر ہجرت کے دوران بریدہ بن خصیب اسلمی ملے جو تنہا نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ ستر آدمی اور بھی تھے۔ یہ سب حضورؐ کو گرفتار کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔ لیکن ہوا کیا؟ حضورؐ نے ان پر اسلام پیش کیا اور یہ سب کے سب خود اسلام کی زنجیر میں گرفتار ہو گئے۔ بریدہ نے اپنی سفید پگڑی کھول کر اپنے نیزے کی انی میں اٹکالی اور امن و سلامتی کا یہ سفید جھنڈا لے کر آگے آگے چلنے لگے:

همه آهوان صحرا سر خوده نهاده بر کف
به امید آں که روزے به شکار خواهی آمد

راستے میں حسن اتفاق سے زبیر بن عوام ملے جو شام کے تجارتی قافلے کے ساتھ واپس آ رہے تھے۔ انھوں نے ایک سفید حلہ حضورؐ کو اور ایک جناب ابوبکرؓ کو ہدیتہ" پیش کیا۔

❋ ❋ ❋

(۴)

قبا میں داخلہ

اہل یثرب نے جس دن سے یہ سنا تھا کہ حضورؐ مکے سے روانہ ہو چکے ہیں' اس دن سے ان کا معمول سا ہو گیا تھا کہ ہر روز سرراہ آکر بیٹھ جاتے اور حضورؐ کی آمد کا انتظار کرتے۔ جب دھوپ تیز ہو جاتی تو واپس چلے جاتے۔

آٹھویں (بروایتے بارھویں) ربیع الاول ۱۳ نبوی یا ۱ ہجری روز دوشنبہ (مطابق ۲۳ ستمبر ۶۲۲ء) کو حضورؐ قبا میں پہنچے جو مدینے سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اہل مدینہ حضورؐ کا انتظار دیکھ کر اپنے اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے۔ ایک یہودی ایک مکان یا کسی پہاڑی پر کھڑا تھا۔ اس نے جو چند نورانی شکلوں کو آتے دیکھا تو بھانپ لیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ یہ محسوس کر کے وہ زور سے چلایا کہ: اے عربو! یہ دیکھو تمھارا مقصود چلا آرہا ہے۔ اس آواز کا سننا تھا کہ ہر طرف سے تکبیروں کی گونج نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا اور انصار اپنے ہتھیاروں کی سج دھج کے ساتھ باہر نکل پڑے۔

حضورؐ قبا میں ایک انصاری خاندان کے سردار کلثوم ہدم کے مہمان ہوئے اور یہاں کم و بیش دو ہفتے قیام فرمایا۔ انصار جوق در جوق قبا میں آتے اور زیارت نبوی کی دولت سے بہرہ مند ہو کر جاتے۔

ایک موقعے پر کچھ لوگ باہر سے آئے۔ انھوں نے اس سے پہلے حضورؐ یا جناب ابوبکر وغیرہ کو نہ دیکھا تھا۔ یہ آپس میں اشاروں سے بات کرنے

لگے۔ کوئی حضورؐ کی طرف اشارہ کرتا یہ ہیں رسولؐ اللہ' اور کچھ حضرت ابوبکرؓ کی طرف توجہ کر کے ادھر اشارہ کرتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ منظر دیکھا تو سمجھ گئے کہ ان کو شناخت کرنے میں پس و پیش ہو رہا ہے۔ صدیق کی حساس' نکتہ شناس اور زیرک طبیعت کو یہ تشابہ اور التباس گوارا نہ ہو سکا۔ فوراً" اٹھے اور دھوپ سے بچانے کے بہانے حضورؐ پر اپنی قبا یا چادر کا سایہ کر دیا تاکہ لوگ شبہے میں نہ رہیں اور اچھی طرح ذرہ و آفتاب کا فرق اور قطرہ و دریا کا امتیاز معلوم کر لیں اور خادم و آقا کو الگ الگ پہچان لیں۔

بہ ظاہر یہی کہا جائے گا کہ شاید دونوں کے جسم پر زبیر بن عوام کے پیش کیے ہوئے ایک ہی رنگ کے لباس نے التباس پیدا کر دیا تھا اور سن و سال میں بھی زیادہ تفاوت نہ تھا اس لیے لوگوں کو امتیاز کرنے میں دشواری ہوئی ہوگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بات صرف اتنی ہی سی نہ تھی۔ ان دونوں کے جمال ظاہری میں بھی وہی فرق تھا' جو ماہتاب اور ستاروں میں ہوتا ہے۔ لیکن یہاں التباس پیدا ہونے کی وجہ وہ صلہ تھا جو صدیق کی خدمات کے عوض قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ خدا نے ثانی اثنین کہہ کر دونوں کو اتنا قریب کر دیا ہے کہ مشن کے لحاظ سے دونوں کی حیثیت گویا یکساں ہو گئی ہے۔ ابوبکرؓ رسول نہ تھے مگر فنا فی الرسول ہونے میں تو شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ کسی شخصیت میں فنا ہونے کے بعد اس کے افکار ہی نہیں بلکہ رفتار و گفتار میں اور ہر ہر ادا میں اسی طرح کی یکسانی و ہم رنگی پیدا ہو جاتی ہے' اور وہ اپنے ظاہری جمال میں بھی اس کا مثنیٰ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ ثانی اثنین بھی اسی طرح کا مثنیٰ ہو گیا ہو اور لوگوں کو التباس پیدا ہو گیا ہو تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے:

یہ جو صورت ہے تری صورت جاناں ہے یہی
یہی نقشہ ہے' یہی رنگ ہے' سامان ہے یہی

من و تو نیست میان من و تو
شرک محض ست گمان من و تو

لمحہ فکریہ

اس چھوٹے سے واقعے کو سیرت نگار یوں ہی مختصراً" لکھ کر گزر جاتے ہیں' یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ دو چار لفظوں میں جناب صدیقؓ کی نزاکت احساس اور جذبہ فدویت کا ذکر کر دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جناب ابوبکر نے اپنے اس طرز عمل سے جذبہ تعلی اور شوق ہم سری کو کچل کر رکھ دیا اور ان کی نزاکت خیال نے ایک منٹ کے لیے بھی یہ گوارا نہ کیا کہ آقا کی موجودگی میں غلام کی طرف بھی کسی کا خیال جائے اور حقیقت شناسی میں کوئی اشتباہ پیدا ہو۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن اس چھوٹے سے واقعے سے خود حضورؐ کی زندگی کے ایک بڑے اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی نشست و برخاست میں' اپنے طرز بود و ماند میں' اپنی معاشی زندگی میں' اپنے لباس و پوشاک میں غرض کسی بات میں بھی اپنے آپ کو افراد امت سے نمایاں اور ممتاز رکھنے کی کوشش نہ فرمائی۔ خدا نے اور اس کی بخشی ہوئی فطرت سلیمہ نے جو امتیاز حضورؐ کو سارے عالم میں عطا کیا تھا وہ تو اپنی جگہ تھا' اسے کون مٹا سکتا تھا۔ لیکن خود حضورؐ نے اپنی طرف سے اپنے لیے ایسا کوئی نمایاں امتیاز قائم رکھنا پسند نہ فرمایا۔ نمائش اور تکلف سے حضورؐ ہمیشہ کوسوں دور رہے۔ مسلمانوں کی جان و مال کے مختار ناطق ہونے کے باوجود' مال غنیمت میں اپنا حصہ وہی لگایا جو دوسرے اسلامی سپاہیوں کا رکھا۔ اگر تین آدمیوں میں ایک سواری ہوئی تو پیدل چلنے اور سواری پر چلنے کا خود بھی وہی تناسب رکھا جو دوسرے دو ساتھیوں کے حصے میں آیا۔ اگر تعمیر مسجد یا خندق کی کھدائی ہو رہی ہے تو خود بھی

مزدور بن کر وہ سارے کام کرتے ہیں جو دوسرے جان نثار کرتے ہیں۔ کھانا پکانے کی نوبت آتی ہے تو سہل کام دوسروں کے سپرد کر دیتے ہیں اور خود جنگل سے لکڑیاں لانے کا ذمہ لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کہیں کسی راستے سے گزر رہے ہیں تو اپنے ساتھی کو آگے کر دیتے اور خود پیچھے چلتے —— یہ واقعات اپنے اپنے موقعوں پر آئیں گے جن سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ حضورؐ نے اپنے لیے کوئی نمائش و امتیاز پسند نہیں فرمایا۔ ایک سچے لیڈر کی پہچان بھی یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بلند تر رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ (بجز نیکیوں کے) اور ایسے ہی لیڈر کے ساتھ اس کے متبعین کو عشق ہو سکتا ہے۔

حضورؐ جب کبھی اپنے جاں نثاروں کے مجمعے میں ہوتے تو نہ کبھی ممتاز قسم کا لباس زیب تن فرماتے نہ حضورؐ کے لیے کوئی الگ گدی اور تخت بچھایا جاتا۔ حضورؐ سب لوگوں میں گھل مل کر عام انسانوں ہی کی طرح بیٹھے تھے۔ یہ بے امتیازی ہی حضورؐ کا سب سے بڑا نشان امتیاز تھی اور اسی سادگی' بے تصنعی اور مساویانہ ہم مجلسی کی وجہ سے باہر سے نئے آنے والے کو شناخت میں دشواری پیدا ہوئی۔

علی مرتضیٰؓ کی آمد

یہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو مکے میں اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ لوگوں کی امانتیں واپس کر کے آجائیں۔ حضرت علیؓ نے تمام امانتیں ان مالکوں کو پہنچا دیں اور تین دن کے بعد خود تنہا روانہ ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب علیؓ پیدل ہی روانہ ہوئے تھے اور قبا میں حضورؐ ان ہی کا انتظار فرمانے کے لیے ٹھہر گئے تھے۔

مسجد قبا کی تعمیر

اس دوران میں ایک بڑا کام یہ ہوا کہ یہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی گئی

جسے مسجد قبا کہتے ہیں۔ یہ سب سے پہلی مسجد ہے جو اسلام میں تعمیر ہوئی۔ دیکھنے میں یہ ایک معمولی جھونپڑے سے زیادہ نہ تھی لیکن اس مسجد کی رفعت و بلندی کا کون اندازہ کرسکتا ہے جس کے معمار نہ فقط یہ اولون سابقون مہاجر و انصار تھے بلکہ خود محمد رسولؐ اللہ بھی اس کی تعمیر میں برابر کے شریک تھے۔ یہ سب اللہ کے ایسے مزدور ہیں جن کی مزدوری و اجر ان اجری الا علی اللّٰہ پر ایمان لانا ہے۔ جہاں تمام جاں نثاران اسلام پتھر اور مٹی اٹھا رہے تھے وہاں انہی کی طرح حضور بھی یہ سارے کام کر رہے تھے۔ جب حضورؐ کوئی پتھر اٹھاتے اور کوئی جاں نثار آکر عرض کرتا کہ حضورؐ تکلیف نہ فرمائیں مجھے دے دیں تو حضورؐ اس کی دلداری کے لیے وہ پتھر اسے دے دیتے اور دوسرا ویسا ہی پتھر اٹھا لیتے۔ یہ وہی پہلی مسجد ہے جس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:

لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم احق
ان تقوم فیه ط فیه رجال یحبون ان یتطهروا واللّٰه
یحب المطهرین (التوبہ:۱۰۸)

اس میں اختلاف ہے کہ یہ آیت مسجد قبا کے بارے میں ہے یا مسجد نبوی کے بارے میں (جس کا ذکر آگے آئے گا)۔ احمد بن جنبل کی کئی سندوں سے نیز ترمذی' نسائی اور مسلم کی کئی روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ نے اس آیت کا مورد مسجد نبوی ہی کو قرار دیا ہے' اور ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے۔ حضرت عمرؓ' عبداللہ بن عمرؓ' زید بن ثابت' سعید بن مسیب بھی اسی کے قائل ہیں اور ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام مالک اور اصحاب مالک تو مسجد نبوی کو مسجد حرام سے بھی افضل بتاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ معمار کعبہ سیدنا ابراہیم ہیں اور معمار مسجد مدینہ محمد رسولؐ اللہ ہیں۔

لمحہ فکریہ

راہنما اور لیڈر عموماً یہی کرتے ہیں کہ ایسے مواقع پر دور ہی دور رہا کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ایک بنیادی پتھر رکھ دیا یا ایک پھاوڑا چلا دیا اور الگ ہوگئے۔ کام دوسروں سے لیتے ہیں اور اس کا فائدہ (کریڈٹ) یا اعزاز خود حاصل کر لیتے ہیں اور اپنا امتیاز بہرحال باقی رکھتے ہیں۔ اس طرز عمل سے پیروؤں کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اعلیٰ و ادنیٰ کا فرق باقی رہتا ہے۔ حضورؐ کا سب سے بڑا مشن یہی تھا کہ شاہ و گدا' آقا و غلام' اعلیٰ و ادنیٰ' اسود و احمر کا فرق و امتیاز مٹا دیا جائے اور جس مرحلے پر بھی موقع ملے اسی رنگ کی انسانی مساوات کا عملی درس دیا جائے۔ کسی کام یا پیشے کو ذلت کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے اور لیڈر اپنے متبعین کے ساتھ کسی کام میں شرکت کرنے میں کوئی جھجک یا عار محسوس نہ کرے۔

جذبہ امتیاز انسانی فطرت میں داخل ہے اس لیے حضورؐ نے اس کے لیے نئی قدریں بخشیں کہ کام چوری سے یا عوام سے الگ تھلگ اور ریزرو رہ کر متکبرانہ امتیاز قائم کرنا کوئی امتیاز نہیں۔ اگر امتیاز ہی قائم کرنا ہے تو گھل مل کر کام کاج میں برابر کے شریک رہو بلکہ حسن کارکردگی' محنت' ایثار' مساوات' دلداری اور دوسری اقدار میں اضافہ کر کے اپنے لیے امتیاز پیدا کرو۔ وہ امتیاز ہی کیا جو شاہانہ کروفر سے پیدا کیا جائے؟ امتیاز وہ ہے جو شان فقر سے' تواضع و انکسار سے' خدمت و ایثار سے اور ہمدردی و مساوات سے پیدا کیا جائے۔ اسی میں جذبہ مسابقت کی بھی تسکین ہو جاتی ہے اور اسی سے خواہش امتیاز بھی اعلیٰ قدروں کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اسی جذبہ مسابقت کی تسکین کے لیے فرمان الٰہی نے اس کا رخ صحیح سمت میں موڑ کر یہ حکم دیا ہے کہ اگر تمھیں مسابقت ہی کرنی ہے تو اس جذبے کا صحیح استعمال یہ ہے کہ "خیر" میں اور تعمیر

انسانیت کے کاموں میں مسابقت کرو فاستبقوا الخیرات (خیر کی طرف دوڑ لگاؤ)۔

محنت مزدوری کرنا کوئی عیب ہوتا تو حضورؐ خود اس میں کیوں شرکت فرماتے؟ حضورؐ نے اسے عبادت قرار دیا ہے۔ ایک انصاری صحابی نے حضورؐ سے مصافحہ فرمایا تو ان کی ہتھیلی حضورؐ کو کھردری نظر آئی اور نگٹے جیسے نشان نظر آئے۔ حضورؐ نے ان سے پوچھا کہ یہ نشان کیسے ہیں؟ عرض کیا کہ: "یا رسولؐ اللہ! میں نعل بندی کا کام کرکے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ یہ نشان اور کھردرا پن اسی کی وجہ سے ہے۔" اس کے بعد جانتے ہیں کہ کیا ہوا؟ اللہ اکبر کبیرا"۔ حضورؐ نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور فرمایا:

هذه يدلا تمسها النار

ایسے ہاتھ کو آگ نہیں چھوسکتی۔

صحابہ میں کتنے بلند پایہ قسم کے لوگ موجود تھے۔ لیکن یہ شرف' جس سے بڑا اور کوئی شرف ممکن نہیں کس کے حصے میں آیا؟ ایک ایسے مزدور کے حصے میں جو محنت کرکے حلال روزی کماتا ہے؟ جو راہنمائے عالمؐ اعزاز و امتیاز کی یہ نئی قدریں عطا کر رہا ہو' وہ آج مسجد قبا کی تعمیر میں اپنے جاں نثاروں کے ساتھ کیوں نہ شریک ہوتا؟

اسلام میں پہلا جمعہ

کم و بیش دو ہفتے قبا میں قیام فرمانے کے بعد حضورؐ یثرب کی طرف روانہ ہوئے۔ شمع رسالت کے ساتھ اس کے پروانے بھی تھے۔ جمعے کا دن تھا اور جب حضورؐ بنی سالم کی آبادی میں پہنچے تو وہاں جمعے کی نماز ادا فرمائی۔ یہ اسلام میں پہلی نماز جمعہ تھی اور اس موقعے پر حضورؐ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ بھی تاریخ اسلام کا پہلا خطبہ تھا۔ اختلاف الفاظ و رواۃ کے ساتھ تاریخ نے یہ

خطبہ نبوی اپنے سینے میں محفوظ کر لیا ہے۔ اس میں بڑی اعلیٰ اقدار کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ہم بخوف طوالت اسے یہاں چھوڑتے ہیں۔ اس وقت کم و بیش ایک سو صحابہ شریک جمعہ تھے۔

لمحہ فکریہ

یہاں پھر اس حقیقت کو سامنے لائیے جس کا ہم اوپر کئی جگہ ذکر کر چکے ہیں کہ پیغمبر کا ہر قدم ابتدا ہی سے صحیح سمت میں اٹھتا ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جب تک کوئی صریح حکم نہ آجائے اس وقت تک پیغمبر کوئی قدم ہی نہ اٹھائے۔ پیغمبر جہاں وحی کا انتظار کرتا ہے وہ انتظار ہی کا صحیح موقع ہوتا ہے ورنہ اس کی ذہنی ساخت ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہر قدم صحیح اٹھے اور بعد میں وحی اس کی تائید و توثیق کرے۔ وحی کی ضرورت عموماً وہاں پڑتی ہے جہاں پیغمبر معاملے کی نزاکت کی وجہ سے خود فیصلہ کرنے کی بجائے انتظار وحی کرے یا اس کی نیک نیتی کے باوجود اس کے اقدام میں غلطی کا احتمال ہو۔ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو عموماً پیغمبری اقدام درست ہی ہوتا ہے اور وحی اس کی توثیق کر دیتی ہے۔

اسی حقیقت کی مثال ہے۔ یہ نماز جمعہ جو پہلی بار بنی سالم بن عوف کی آبادی میں حضورؐ نے ادا فرمائی۔ یقیناً اس سے پہلے اجتماع جمعہ کے بارے میں کوئی قرآنی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ حضورؐ نے اس کا آغاز کسی حکم وحی کے بغیر ہی فرمایا تھا اور قرآن میں اس کا ذکر بہت بعد میں آیا۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ ایسے بہت سے کام حضورؐ نے وحی خفی (یا وحی غیر متلو یا وحی غیر ملفوظ) کے تحت کیے اور اپنی عقل و بصیرت سے۔ جمعے کے خطبہ و نماز کے متعلق کوئی ایسی روایت نظروں سے نہیں گزری جس میں یہ ذکر ہو کہ: مجھے خدا نے یا جبریل نے اقامت جمعہ کا امر یا حکم دیا ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ حضورؐ کا فیصلہ تھا جو قرآنی توثیق سے پہلے بھی واجب الاتباع تھا اور

قرآنی توثیق کے بعد بھی۔ ہم اس سے اور اس جیسے بہت سے واقعات سے، صرف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ پیغمبر کا ہر قدم ابتدا ہی سے صحیح سمت میں اٹھتا ہے۔ نبوت کا مزاج یوم پیدائش ہی سے الگ نوعیت کا ہوتا ہے۔ وہ ایک تخم ہوتا ہے جو اس کی روح میں ابتدا ہی سے پیوست ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ اس میں برگ و بار آتے رہتے ہیں۔

***

(۵)

تاج دار مدینہ مدینے میں

نماز جمعہ کے بعد حضورؐ مدینے کی طرف روانہ ہوئے۔ اس شہر کا نام پہلے یثرب تھا۔ آج کے بعد اس کا نام مدینۃ الرسول ہو گیا جسے اختصار کے لیے "مدینہ" کہتے ہیں۔ لفظ مدینہ کے معنے شہر کے ہیں۔ حضورؐ کا یہ داخلہ عجیب پرکیف اور روح پرور تھا۔ اس فقیرانہ استقبال کو ہزاروں شاہانہ استقبال ہمیشہ رشک کی نگاہوں سے دیکھتے رہیں گے۔ استقبال کے بہتیرے نظارے دنیا نے دیکھے ہیں اور دیکھتی رہے گی۔ لیکن شیفتگی، عقیدت، عظمت، محبت، فدویت اور مخلصانہ پروانگی کا جو وجد آفرین نظارہ آج نظر آرہا ہے اسے چشم کائنات نے نہ کبھی پہلے دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا۔

حضورؐ ایک اونٹنی پر جلوہ افروز ہیں۔ پروانوں کا ہجوم ساتھ ہے۔ سارے خرد و کلاں اور شیخ و شاب دو رویہ کھڑے مطلوب کائنات کے جمال کا نظارہ کر رہے ہیں۔ مخدرات مدینہ چھتوں پر کھڑی دولت دیدار سمیٹ سمیٹ کر اپنی روح کو مطلع انوار بنا رہی ہیں۔ آنکھیں فرش راہ ہو رہی ہیں:

زیر قدمت ہزار جان است

آ پیارے نینن میں پلک توہے موند لوں
نائیں دیکھوں اور کو نا توہے دیکھن دوں

ہر شخص ناقے کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے کہ حضورؐ اسی کے گھر کو اپنے قیام سے رشک فردوس بنائیں۔ حضورؐ نے یہ کش مکش محسوس کر کے ارشاد فرمایا: "اس ناقے کو چھوڑ دو۔ یہ قدرت کی طرف سے مامور ہے۔" مطلب یہ ہے کہ خدا اسے جہاں بٹھا دے گا وہیں کے قریب ترین گھر کو اپنی قیام گاہ بنالوں گا۔ حضورؐ کے اس فیصلے کے بعد ترجیح بلا مرجح کا کوئی ایسا شائبہ نہ رہا جس کے نتیجے میں ایک کی دلداری اور باقی سب کی دل شکنی ہو۔

کبھی پروانوں کی بلند تکبیر و تسبیح کون و مکان کو گرما دیتی اور کبھی حضورؐ کی جنبش لب پوری فضا پر سکون و سکوت طاری کر دیتی۔ اس وقت زبان رسالت پر یہ پر تاثیر جملے ہوتے:

ایھا الناس ! افشوا السلام' واطعموا الطعام' وصلوا الارحام' وصلوا باللیل و الناس نیام' تدخلوا الجنہ بسلام۔

اے لوگو! اسلام کو پھیلاؤ' (بھوکوں کو) کھانا کھلاؤ' صلہ رحمی کرتے رہو اور راتوں کو جب لوگ سو رہے ہوں نماز (تہجد) ادا کرو (بس اتنی ہی باتوں پر عمل کرنے سے) تم سلامتی کے ساتھ داخل بہشت ہو جاؤ گے۔

ذرا ان چھوٹے چھوٹے جملوں پر بھی غور کیجیے۔ کسی جملے میں صرف دو لفظ ہیں۔ کسی میں تین اور کسی میں چار۔ بندوں کا تعلق خدا سے اور خدا کے دوسرے بندوں سے کیا اور کس نوعیت کا ہو' عمل کی دنیا میں اس کا بنیادی پتھر کیا ہے اور اس کے نتیجے میں کس طرح جنت کی زندگی دنیا و آخرت میں نصیب ہوتی ہے؟ ان ساری معاشی و روحانی اقدار کے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔

تشریح ارشادات

افشوا السلام سے مراد محض السلام علیکم' و علیکم السلام کہہ دینا نہیں

بلکہ یہ دعاؤں کی شکل میں ایک ایسی عالم گیر آرزوؤں کا تبادلہ ہے جس کا عملی ظہور سارے عالم میں فساد کو دور کر کے ہر طرح کے امن اور سلامتی کا ضامن ہو۔

اطعموا الطعام کا یہ مطلب نہیں کہ مہاجرین کی خوب دعوتیں کرو' یا کبھی کبھی بھوکے سائل کو بھیک کے طور پر کچھ ٹکڑے دے دیا کرو۔ اس کا مقصد ایسا ہموار نظام معاش قائم کرنا ہے جو دنیا سے بھوک اور محتاجی کو ختم کر دے اور سب کے لیے آسودہ حالی کی فضا پیدا کر دے۔

صلوا الارحام سے یہ مقصد نہیں کہ اپنے گھرانے' خاندان یا قبیلے کے قریب و بعید کے ساتھ صلہ رحمی کا سلوک کر کے مطمئن ہو جاؤ بلکہ اس کا مقصد ایسی وسعت نظر اور ایسی بلند نگہی پیدا کرنا ہے کہ صلہ رحمی کا یہ دائرہ پھیلتے پھیلتے سارے کے سارے بنی آدم پر محیط ہو جائے' کیوں کہ سارے انسان آدم و حوا کی اولاد ہیں اس لیے ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ یہی وسیع القلبی ان تمام تعصبات کو ختم کر سکتی ہے جو وحدت انسانی کے درمیان حائل ہو کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

صلوا باللیل والناس نیام سے مراد صرف اسی قدر نہیں کہ چند کلمات و حرکات ادا کر کے یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم نے بہت بڑا وظیفہ پورا کر لیا۔ محض "وظیفہ" نہیں۔ یہ وظیفہ زندگی ہے اور خدا سے اپنا رابطہ قوی کرنے کی ایسی مشق ہے جو پوری زندگی پر پھیل جاتی ہے اور خدا کی مخلوق سے اپنا رابطہ قائم رکھتے وقت حدود اللہ کی نگہداشت پیش نظر ہو جاتی ہے۔

تدخلوا الجنہ بسلام صرف اس جنت کی ضمانت نہیں جو مرنے کے بعد ہوتی ہے بلکہ یہ پورا پروگرام اس دنیوی زندگی میں بھی جنت ارضی اور بہشت بہ کنار معاشرے کا ضامن ہے۔

گویا یہ چند بلیغ جملے سارے اسلامی مقاصد کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں

اور اسلامی معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو چھوٹ گیا ہو۔ اس تعلیم کا آغاز تو بہرحال ایک مختصر سے دائرے ہی سے محسوس شکل اختیار کرے گا لیکن مقصد اسے سارے زمان و مکان کے لیے ہمہ گیر صورت بنا دینا ہے۔

عبداللہ بن سلام کا پہلا تاثر

اس جلوس پر خلوص کا منظر دیکھنے کے لیے بہت سے غیر مسلم بھی آئے ہوئے تھے۔ انہی میں یہودیوں کے پیشوا (حبر) عبداللہ بن سلام بھی تھے جو ایک کھجور کے سائے میں کھڑے یہ پر کیف نظارہ دیکھ رہے تھے۔ خطبہ نبوی کے پہلے جملے میں لفظ سلام تھا (افشوا السلام) جو ایک طرف سارے عالم کے لیے سلامتی کا پیغام تھا تو دوسری طرف سلام کے فرزند عبداللہ کے دل میں پیوست ہوا جا رہا تھا۔ گویا عام تخاطب کے پردے میں فرزند سلام ہی کو مخاطب کیا جا رہا تھا۔ عبداللہ بن سلام غیر ارادی طور پر متاثر ہو رہے تھے۔ جب مسلمانوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا تو بے اختیارانہ انداز سے عبداللہ بن سلام نے بھی زور سے اللہ اکبر کہا۔ ان کی والدہ یا پھوپھی (خالدہ بنت حارث) ان کے پاس کھڑی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ: "تم تو اس طرح نعرہ لگا رہے ہو جیسے موسیٰ ہی تو آگئے ہوں۔" عبداللہ نے کہا: "ہاں ہاں بخدا یہ وہی ہے جس کی آمد کی خبر موسیٰ نے دی ہے۔ خدا کی قسم یہ نور جمال کسی جھوٹے کے چہرے پر نہیں ہو سکتا۔"

یہ عبداللہ کچھ دنوں کے بعد اسلام لے آئے جس کی دلچسپ تفصیل آگے آئے گی۔

استقبالی ترانے اور ان کی قدر افزائی

حضورؐ آگے بڑھے تو دیکھا کہ حبشی نوجوان ہتھیار لیے ہوئے فوجی انداز سے اچھل کود رہے ہیں اور جوش و مستی کے ساتھ سب مل کر یہ ترانہ الاپ رہے ہیں:

محمد نبی عبد صالح
محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے نبی اور صالح بندے ہیں۔
اس سے آگے انصار کی عورتیں یہ استقبالی گیت گا رہی ہیں:

طلع البدر علینا
من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا
ما دعا للّٰہ داع
ایہا المبعوث فینا
جئت بالامر المطاع

۱۔ آج ہمارے ہاں وداع کے ٹیلوں سے چاند اگا ہے۔
۲۔ جب تک دعا کرنے والا دعا کرتا رہے ہم پر اس نعمت کا شکر الٰہی واجب ہے۔
۳۔ اے وہ جو ہم میں مبعوث ہوا ہے تو واجب الاطاعت دین لے کر آیا ہے۔

اور آگے بڑھے تو دیکھا کہ معصوم لڑکیاں یہ ترانہ استقبال الاپ رہی ہیں:

نحن جوار من بنی النجار　　　　یا حبذا محمد من جار

ہم نجاری لڑکیاں ہیں۔ خوشا نصیب کہ محمد رسول اللہ ہمارے پڑوسی ہوگئے ہیں۔

حضورؐ نے ان بچیوں سے سوال کیا کہ: کیا تمھیں مجھ سے محبت ہے؟ بچیوں نے جواب دیا: ہاں یا رسولؐ اللہ۔ حضورؐ نے فرمایا: خدا گواہ ہے کہ میں بھی تم سے محبت رکھتا ہوں۔

ابو ایوب انصاری کی قسمت بیدار

حضورؐ کی سواری اسی درویشانہ کروفر کے ساتھ جا رہی تھی اور ہر

شخص اس انتظار میں تھا کہ دیکھیں یہ ناقہ کہاں جا کر از خود ٹھہرتا ہے۔ یہ ناقہ چلتے چلتے خود ایک جگہ رکا اور بیٹھ گیا۔ حضورؐ وہاں اتر پڑے اور فرمایا: یہی جگہ میرا مدفن بھی ہوگی۔ پھر معلوم ہوا کہ یہاں سے قریب ترین گھر ابوایوبؓ انصاری کا ہے' اس لیے حضورؐ وہیں فروکش ہو گئے۔ یہ مکان دو منزلہ تھا۔ ملنے والوں کی سہولت کے خیال سے حضورؐ نے نچلی منزل کو پسند فرمایا۔ ابوایوبؓ کے لیے یہ ایک بڑی کش مکش کا موقع تھا۔ ادب کا تقاضا یہ تھا کہ حضورؐ نیچے نہ ہوں اور حضورؐ کی خواہش کا احترام یہ تھا کہ ابوایوبؓ اوپر ہی رہیں۔ یہاں الامر فوق الادب کا اقتضا غالب آیا اور ابو ایوبؓ اپنے بال بچوں سمیت اوپر کی منزل پر چلے گئے۔ ٹھیک ہے جڑ نیچے اور شاخیں اوپر ہی ہوتی ہیں۔ لیکن بیہقی کی روایت کے مطابق ابو ایوبؓ اس شب کو کنارے کہیں پڑ رہے اور دوسرے دن بہ اصرار حضورؐ کو اوپر کی منزل پر پہنچا دیا۔ واللہ اعلم۔

حق میزبانی

دنیا میں نہ کبھی ایسا مہمان ہوا نہ ایسا میزبان۔ ابو ایوبؓ دونوں وقت حضورؐ کے لیے کھانا لاتے اور اس وقت تک ان کے ہاں کوئی نہ کھاتا جب تک حضورؐ نہ کھا لیتے۔ جب حضورؐ کھا چکتے تو حضورؐ کا پس خوردہ یہ واپس لے جاتے اور مع اپنی بیوی کے وہی پس خوردہ کھاتے۔ کھانے میں جس جگہ حضورؐ کی انگشت مبارک کا نشان ہوتا یہ بھی وہیں حصول برکت کے لیے اپنی انگلیاں لگا کر شروع کرتے۔ جو شخص نشان انگشت کا اتنا خیال رکھتا ہو وہ نقش قدم پر کیوں نہ چلتا ہوگا۔

بیہقی کی روایت ہے کہ ایک بار اوپر پانی کا گھڑا ٹوٹ گیا اور قبل اس کے کہ یہ پانی حضورؐ کی طرف نیچے گرے ابو ایوبؓ نے فوراً اپنا لحاف وغیرہ ڈال کر سارا پانی جذب کر لیا۔ مہمان نوازی کا یہ انوکھا انداز اور کہاں مل سکتا

ہے؟

حضورؐ نے یہاں سات ماہ قیام فرمایا اور ازواج مطہرات (یعنی حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ) کے حجرے بننے کے بعد حضورؐ یہاں سے منتقل ہوئے۔ حضورؐ نے یہیں سے زید بن حارثہ اور ابو رافع کو دو اونٹ دے کر مکے بھیجا جو حضورؐ کی دو صاحب زادیوں (حضرت فاطمہؓ اور حضرت ام کلثومؓ) اور ام المومنین سودہ بنت زمعہؓ اور اسامہ بن زیدؓ اور ان کی والدہ ام ایمن کو لے آئے۔ ساتھ ہی جناب ابوبکر نے اپنے صاحب زادے عبداللہ کو بھیجا تھا جو خاندان صدیقؓ کو (جن میں حضرت عائشہؓ بھی تھیں) جا کر لے آئے۔ حضورؐ کی ایک صاحب زادی رقیہؓ تو حضرت عثمانؓ کے ساتھ حبشے میں تھیں اور دوسری حضرت زینبؓ تھیں جن کو ان کے شوہر ابو العاص بن ربیع نے روک لیا تھا۔ یہ ابو العاص ابھی تک اسلام نہ لائے تھے۔

* * *

(٦)

پہلی ہجری ـــــــ قیام ریاست

ہجرت کے بعد اسلام نے ایک نئی کروٹ لی اور مسلمان قوم کی زندگی نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مدینے میں آنے کے بعد اسلامی ریاست کی بھی بنیاد پڑ گئی۔ حکومت کا قیام یا ریاست کی تعمیر اسلام کا کوئی مقصود نہیں۔ اسلام صرف ایک ایسا مثالی قسم کا صالح معاشرہ تعمیر کرنا چاہتا ہے جس میں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جنگ کوئی مقصود اسلام نہیں، مقصود امن ہے۔ لیکن بسا اوقات امن کا قیام جنگ ہی پر موقوف ہوتا ہے اور اس کے لیے مجبوراً" جنگ کرنی پڑتی ہے۔ مقصود امن اور رفع جنگ ہو تو ابتدا سے رجحان صحیح ہوتا ہے۔ اس وقت جنگ کے بہانے نہیں تلاش کیے جاتے بلکہ اسے ٹالنے کے حیلے تلاش کیے جاتے ہیں۔ گویا جنگ کی نہیں جاتی بلکہ مجبوراً" جنگ ہو جاتی ہے۔

بہرحال مدنی زندگی میں سٹیٹ یا ریاست کی بنیاد پڑ گئی جو حکومت سے بہت وسیع تر مفہوم رکھتی ہے اور نظام حکومت اس کا ایک ادنیٰ سا جز ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے سن ہجری ہی سے اس معاشرتی نظام میں ریاستی انداز پیدا ہو گیا جس میں آگے چل کر نظام حکومت کا رنگ بھی مجبوراً" آگیا اگرچہ حکومت مقصود نہ تھی۔

مواخات

ایک مملکت یا ریاست کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دائرے میں رہنے والے افراد کی معاشی زندگی ٹھیک کرے اور اس کی بنیادی مادی ضروریات پوری کرے۔ حضورؐ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ان مہاجرین کی معاشی زندگی کا تھا جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر مدینے چلے آئے تھے۔ حضورؐ نے اس گتھی کو نہایت حکیمانہ انداز سے یوں سلجھایا کہ مہاجرین و انصار کو بلا کر انصار سے فرمایا کہ: "تم میں سے ہر ایک شخص ایک مہاجر کو لے لے اور اپنے بھائی کی طرح اس کی کفالت کا ذمے دار ہو۔" انصار نے اس تجویز کو بڑی خندہ پیشانی و مسرت کے ساتھ تسلیم کیا۔ اس کے بعد حضورؐ ایک مہاجر اور ایک انصار کو بلا کر مواخات یعنی بھائی چارہ کراتے گئے۔ اس طرح کم و بیش پچاس مہاجرین کی مواخات انصار سے کرائی گئی، جنھیں وہ لے کر خوشی خوشی اپنے گھر رخصت ہوئے۔

مواخات کا عجیب عملی نمونہ

مہاجرین کو ان انصار نے اپنے حقیقی بھائیوں سے زیادہ محبت و عزت کے ساتھ رکھا۔ ہر انصاری اپنے مہاجر بھائی کو گھر لے جاتا۔ رہنے کو مکان دیتا یا زمین پیش کر دیتا۔ گھر کے اسباب تک میں برابر کا شریک کر لیتا۔ مگر اکثر مہاجرین ایسے تھے جنھوں نے ضرورت سے زیادہ کوئی عطیہ قبول نہ کیا۔

انصار کی فراخ دلانہ محبت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ عبدالرحمٰن بن عوف کی مواخات سعد بن ربیع انصاری سے ہوئی تھی۔ یہ عبدالرحمٰن کو اپنے گھر لے گئے اور کہا کہ: "ان تمام مال و اسباب میں آدھا آپ کا ہے، وہ لے لیجیے اور سنیے میری دو بیویاں ہیں۔ آپ جس کو پسند کریں اسے میں طلاق دے دوں گا۔ اس سے آپ نکاح کر لیجیے۔" حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ان کا

شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ: ”آپ کے مال و عیال میں اللہ برکت دے۔ مجھے تو بازار کا راستہ بتا دیجیے۔“

انھوں نے تجارتی کاروبار شروع کیا اور اس میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ مٹی سے سونا پیدا ہونے لگا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے مال کا آٹھواں حصہ چار بیویوں پر تقسیم کیا گیا تو ہر ایک کو اسی (۸۰) اسی (۸۰) ہزار درہم ملے۔ (صاحب اولاد میت کی بیوی کو آٹھواں حصہ ملتا ہے)۔ علاوہ ازیں ان کے ترکے میں سونا اتنا تھا کہ اسے کلہاڑوں سے کاٹنے والوں کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے تھے۔

مواخات علیؓ کی روایت

بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی مواخات کسی سے نہیں کرائی گئی تھی۔ آپ نے گلہ کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ:

انت اخی فی الدنیا والاخرۃ

تم تو دونوں جہان میں میرے بھائی ہو۔

جناب علیؓ کے اخوالرسول فی الدنیا والاخرۃ ہونے میں شک ہی کیا ہوسکتا ہے؟ لیکن اس موقعے پر جب کہ ایک مہاجر اور ایک انصار کے درمیان مواخات ہو رہی ہے یہ روایت کچھ چسپاں معلوم نہیں ہوتی۔ یہ مواخات صرف ایک معاشی مسئلہ تھا تاکہ ہر انصاری ایک بے سروسامان مہاجر کی کفالت کا ذمہ دار ہو جائے۔ ان میں سے کچھ مہاجرین ایسے بھی تھے جن کی کسی انصاری سے مواخات ہی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ خود حضورؐ کی بھی کسی سے مواخات نہیں ہوئی تھی۔ اگر جناب علیؓ کی بھی کسی انصاری سے مواخات نہ ہوئی ہو تو اس میں کون سا محل استعجاب ہے؟ آپ کے کفیل تو خود حضورؐ تھے' اس لیے کسی سے مواخات کی ضرورت نہ سمجھی ہوگی۔ لیکن اگر واقعی حضرت علیؓ کو اپنی

مواخات نہ ہونے کا کوئی گلہ ہوا ہو گا تو اس مواخات کو انصار میں تلاش کرنا زیادہ بہتر ہے۔ حضرت سہل بن حنیف کے تذکرے میں ابن حجر نے لکھا ہے کہ انہی سے حضرت علیؓ کی مواخات ہوئی تھی اور یہی قرین قیاس ہے' کیوں کہ مہاجر کی مہاجر سے مواخات قابل غور ہو جاتی ہے' اور سہل بن حنیف سے حضرت علیؓ کی مواخات کچھ مستبعد نہیں معلوم ہوتی۔

مسجد نبویؐ کی تعمیر

جس جگہ حضورؐ کا ناقہ جا کر بیٹھ گیا تھا وہ قطعہ زمین دو یتیم بچوں کا تھا جن کے نام سہل اور سہیل تھے۔ حضورؐ نے اسی قطعے میں مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ فرمایا۔ سہل و سہیل نے یہ قطعہ زمین اپنی طرف سے پیش کیا مگر حضورؐ نے گوارا نہ کیا اور انھیں اس کی پوری قیمت لینے پر آمادہ کر لیا۔ جناب صدیقؓ نے یہ قیمت ادا کی۔ زمین پر کچھ قبور مشرکین بھی تھیں اور چند کھجور کے درخت بھی۔ زمین ہموار کرنے کے بعد تعمیر شروع ہوئی۔

اسلامی تاریخ کی سب سے پہلی مسجد تو قبا میں تعمیر ہوئی تھی' جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ یہ تعمیر کچھ اس سے بھی زیادہ روح پرور کیف کے ساتھ ہوئی۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسی سے ملے ہوئے ایک گوشے کو مدفن رسولؐ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی میں حضورؐ اور صحابہؓ نے سب سے زیادہ نمازیں ادا کیں اور اسی میں بیٹھ کر دنیا اور اقوام عالم کی قسمتوں کے فیصلے ہوئے۔

اس خانہ خدا کے شرف و عزت کا کیا ٹھکانا ہے جس کے معمار خود حضورؐ اور مہاجرین و انصار ہوں۔ اینٹ' پتھر اور مٹی اٹھانے میں حضورؐ سارے جاں نثاروں کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ حتیٰ کہ رجز الاپنے میں بھی حضورؐ سب کا ساتھ دے رہے تھے۔ حضورؐ اور صحابہ اس وقت یہ رجز پڑھ

رہے تھے۔

اللّٰھم لاخیر الا خیر الا خرہ　　　　فاغفر الا نصار و المھاجرہ

خداوند خیر تو بس آخرت کی ہی خیر ہے۔ لہٰذا تو انصار و مہاجرین کی مغفرت فرما کہ انھیں بھی یہ نعمت حاصل ہو۔

(مختلف روایتوں میں یہ شعر مختلف الفاظ سے آئے ہیں۔ ایک روایت میں خیر کی بجائے دونوں جگہ عیش یعنی زندگی ہے)۔

اس کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں۔ ستون کھجور کے تنوں کے تھے اور چھت پر کھجور کے پتے ڈالے گئے تھے۔ اس کا رخ پہلے بیت المقدس کی طرف تھا کیوں کہ ابھی تک اہل اسلام کا قبلہ ادھر ہی تھا۔

اصحاب صفہ

صحن مسجد میں ایک صفہ (چبوترا) بھی تھا جس پر اسی طرح کے ستون اور سایہ تھا۔ یہ ان لوگوں کے لیے تھا جو بے گھر تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد کچھ لوگ تو وہ ہوتے تھے جو پہلے ہی سے بے گھر تھے اور کچھ وہ لوگ تھے جو باہر سے تعلم دین کے لیے آتے تھے اور یہاں مدینے میں ان کے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہ تھی اور کوئی معاشی سہارا بھی نہ تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ بھی جو احادیث کے سب سے بڑے راوی ہیں' ان ہی اصحاب صفہ کے ایک فرد ہیں۔ حضورؐ کو ان بے گھر اور بے مایہ اصحاب صفہ کا بے حد خیال رہتا۔ جب حضورؐ کے پاس کچھ کھانا وغیرہ آتا تو حضورؐ پہلے انہی کو بھیجتے۔ یہ عجیب درویش صفت لوگ تھے جو اسلام کے معاشی نظام کی روح سے محض واقف ہی نہ تھے بلکہ اس پر عامل بھی تھے۔ ان میں جب کوئی شخص محنت مزدوری کر کے کچھ لاتا تو اس میں اپنے ان سب بھائیوں کو شریک کرتا۔

نیم نانے گر خورد مرد خدائے

بذل　درویشاں　کند　نیمے　دگر

پر ان کا پورا پورا عمل تھا۔ یہ لوگ کاروبار میں انہماک نہ رکھتے تھے۔ قرب نبوی اور تعلم دین کو ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ حضورؐ کی اس سے بڑی خوشی کوئی نہ تھی کہ ان میں جو شخص بھی کچھ کمائے وہ اس میں اپنے سب بھائیوں کو شریک کرے۔ مسند احمد میں ایک روایت حضرت علیؓ سے ہے کہ:

"اہل صفہ میں ایک شخص دو دینار یا دو درہم چھوڑ کر مرا تو حضورؐ نے فرمایا کہ: اس قدر اس نے جمع کر رکھا تھا؟ جاؤ تم لوگ جا کر اس کی نماز جنازہ پڑھ لو (میں نہیں پڑھتا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی نظام اور قناعت میں حضورؐ ان لوگوں کو نمونہ اور آئیڈیل بنانا چاہتے تھے اور یہ پسند نہ فرماتے تھے کہ تعلم دین اور درویشی کو مفت خوری اور جمع مال کا بہانہ بنائے۔ دینی اقدار کے فہم میں جب انحطاط پیدا ہوا تو یہی سمجھا جانے لگا کہ اصحاب صفہ کے توکل کا مطلب ہے ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا' محنت مزدوری سے جی چرانا اور دوسروں کی کمائی پر مفت خورانہ گزارا کرنا اور اس عجیب توکل کو دولت جمع کرنے کا بہانہ بنانا۔ اگر کوئی شخص اصحاب صفہ بننا چاہتا ہے تو اسے خدمت دین کے لیے وقف ہونا چاہیے اور محنت مزدوری سے بھاگنا نہیں چاہیے۔ پھر جو مزدوری حاصل ہو اس میں ان لوگوں کو شریک بھی کر لینا چاہیے جنہیں باوجود کوشش کے مزدوری نہ مل سکی ہو اور اپنے پاس کوئی جمع پونجی نہ رکھنی چاہیے۔

حجرات اہل بیت

اس وقت تک حضورؐ کے نکاح میں یا تو حضرت سودہؓ تھیں یا حضرت عائشہؓ (ان کی ابھی تک رخصتی نہ ہوئی تھی)۔ اس مسجد کے متصل ہی صرف دو حجرے بنائے گئے۔ باقی حجرات بعد میں بنتے گئے۔ یہ دونوں حجرے بھی کچی

اینٹوں کے تھے اور چھتیں کھجور کے پتوں کی۔ ان کمروں کی دیواریں کھجور کی چٹائیوں کی تھیں۔ یہ کاشان ہائے نبوت چھ سات ہاتھ چوڑے اور دس ہاتھ لمبے تھے۔ چھتوں کی اونچائی اتنی تھی کہ کھڑا ہونے والا اپنا ہاتھ اٹھا کر چھو لے۔ دروازوں پر کواڑ کی بجائے کلیمی پردے آویزاں رہتے۔

اذان

کچھ دنوں تک اس مسجد میں نماز یوں ادا ہوتی رہی کہ لوگ وقت کا اندازہ کر کے آجاتے لیکن اس طرح جماعت کا نظام پورا نہ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح تمام لوگوں کو جماعت نہ ملتی ہوگی اور لوگ متفرق جماعتوں سے یا انفرادی طور پر نماز ادا کر کے واپس جاتے ہوں گے۔ یہ صورت حال حضورؐ کو پسند نہ آئی۔ اجتماعی روح' وحدت امت' ڈسپلن' مساواتی یکسانی' طاعت امیر' پابندی وقت اور ایک آواز پر یک جا ہونے کی تربیت وغیرہ ان تمام اقدار کا تقاضا نماز باجماعت ہی میں پورا ہوتا ہے اور یہ جب ہی ممکن تھا کہ تمام اہل ایمان ایک اجتماعی رنگ میں ایک وقت پر یک جا ہوں اور اقدار انسانی کو بلند کرنے کے لیے اپنی ساری منتشر قوتوں کو ایک جگہ مرتکز کرنے کی عادت ڈالیں۔ حضورؐ نے اس مقصد کے لیے مشورہ فرمایا تو لوگوں نے بہت سے مشورے دیے۔ مثلاً ناقوس بجانا' آگ روشن کرنا وغیرہ لیکن حضورؐ نے پسند نہ فرمایا۔ آخر خود حضورؐ کو اور بعض دیگر صحابہ مثلاً عبداللہ بن زیدؓ اور عمرؓ بن خطاب وغیرہ کو خواب میں اذان کی آواز سنائی دی اور حضورؐ نے اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنایا۔

اجتماعی عبادت کے لیے اذان سے بہتر اور کوئی بلاوا ممکن نہیں۔ اس میں جو خوبیاں ہیں وہ نہ ناقوس میں آسکتی ہیں نہ گھنٹے میں' نہ آگ روشن کرنے میں ہوسکتی ہیں' نہ کسی اور طریقے میں۔

۱۔ سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اذان ہر آبادی و ویرانہ میں' ہر سفر حضر میں سہل العمل اعلان ہے۔ کوئی چیز ساتھ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایک ہلکا پھلکا آدمی کسی ساز و سامان کے بغیر ہر جگہ یہ اعلان بڑی خوبی سے کر سکتا ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ کسی اور طریقہ اعلان میں اس مشن کی دعوت نہیں اور اذان صرف بلاوا ہی نہیں بلکہ ایک تبلیغی دعوت بھی ہے اور اپنے مشن کا پنج وقتہ اعلان بھی۔ اس کے چند جملوں میں پورا اسلامی نظریہ زیست سمٹا ہوا ہے جس کی بار بار یاددہانی ہوتی ہے۔

۳۔ اہل اسلام ہی کے لیے نہیں بلکہ سارے عالم کے لیے یہی کلمہ جامعہ ہے۔ دنیا کے لیے اس کے سوا اور کوئی نقطہ وحدت انسانی ممکن نہیں۔ اذان وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حضرت بلالؓ اور دوسرے موذن دیتے رہے' اور آنحضرتؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ صدیق سے لے کر حضرت علیؓ کی خلافت تک جن الفاظ میں ہوتی رہی۔

یہودیوں سے معاہدہ

تاریخ اسلام کا ایک بہت بڑا واقعہ وہ معاہدہ ہے جو حضورؐ نے یہود مدینہ سے پہلی ہجری میں کیا ہے۔ یہ بڑا اہم واقعہ اس لیے ہے کہ:

۱۔ ایک اسلامی ریاست کی بنیاد پڑنے کی نشان دہی اسی معاہدے سے ہوتی ہے ورنہ یوں تو قبائل آپس میں مختلف معاہدے کر ہی لیا کرتے تھے۔ ان قبائل میں سب سے بڑا معاہدہ محالفہ ہوا کرتا تھا۔ یعنی باہم حلیف بن جانا اور اس کی رو سے محالفہ کرنے والے قبائل زندگی کے سرد و گرم میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ مگر حضورؐ نے جو معاہدہ یہودیوں سے کیا اس کے خدوخال وہ نہیں جو دو قبیلوں کے درمیان محالفے کے ہوتے ہیں بلکہ یہ معاہدہ اس نوعیت کا ہے جو دو قوموں کے درمیان ہوتا ہے اور سیاسی بنیاد پر ہوتا ہے بغیر اس کے کہ

دینی زندگی کو مجروح کیا جائے۔

۲۔ یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جو بین الاقوامی معاہدوں کی اساس ہے۔ آئندہ کے تمام معاہدے بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ اس معاہدے میں دوسرے قبائل بھی شریک ہو گئے۔

۳۔ اس معاہدے میں بڑی اعلیٰ اقدار ہیں۔ اس میں عمیق سیاست و حکمت کارفرما ہے، لیکن ابلیسی سیاست نہیں بلکہ مسلمان قوم کے لیے مستقبل کے تمام معاہدوں میں روشنی کے مینار کا کام دیتی رہی اور دنیا کو پہلی بار درس ملا کہ احترام انسانیت کی بنیاد پر اعلیٰ مقاصد کو بروئے کار لانے میں کس طرح تعاون کیا جاتا ہے اور دوسری قوموں کو مذہب و ضمیر کی کتنی فراخ دلانہ آزادی دی جاتی ہے۔

۴۔ فراخ دلی اور رواداری کے ساتھ اس معاہدے میں یہ حقیقت بھی مستور ہے کہ دین جبر سے نہیں پھیلایا جاتا اور دوسرے انسانوں سے مذہب کی بنیاد پر اتنی نفرت و عصبیت نہ برتنی چاہیے کہ اعلیٰ اقدار میں تعاون نہ ہو سکے۔ مذہب کا مقصد ہی اعلیٰ اقدار انسانی کا قیام ہے اور تنگ دلانہ تعصب و تفریق کوئی اعلیٰ قدر نہیں۔ اگر مذہب محض رسم ہے تو بے معنی ہے اور اگر انسانی قدروں کا قیام مقصود ہو تو مذہبی تعصب دور ہو کر ہی باہمی قرب پیدا ہو سکتا ہے جس کا آخری نتیجہ وحدت انسانی ہے۔ جب مقصد اعلیٰ ہو تو چھوٹے چھوٹے اختلافات دور ہونے میں بڑی مدد ملتی ہے، اور اس کے بعد اگر فراخ دلی اور رواداری ہو تو بڑے اختلافات بھی دور ہو جاتے ہیں اور قبول حق میں روایاتی تعصب حائل نہیں ہوتا۔

غرض یہ معاہدہ ہر لحاظ سے بڑا اہم اور بنیادی ہے اور اپنے اندر بڑے دور رس اثرات رکھتا ہے۔ اب ذرا ان دفعات کو دیکھیے جو اس کے اندر رکھی گئی تھیں۔

دفعات معاہدہ

مختلف روایات میں معاہدے کے مختلف الفاظ ہیں۔ ان سب کو ملا کر ہم نمبروار اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں:

۱۔ یہود (بنی عوف) اور مسلمان ایک ہی امت شمار ہوں گے۔

۲۔ یہود کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔

۳۔ یہود اور مسلمان ایک دوسرے کے دوست رہیں گے اور کسی تیسرے حملہ آور کے مقابلے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔

۴۔ دونوں کے درمیان خیر سگالی اور خیر خواہی کے تعلقات ہوں گے' مگر صرف نیکی میں نہ کہ بدی میں۔

۵۔ فریقین میں سے ہر ایک دوسرے کے دوست کو دوست اور دوسرے کے دشمن کو دشمن سمجھے گا۔

۶۔ قریش کو کوئی امان نہ دے گا۔

۷۔ مظلوم کی حمایت کی جائے گی۔

۸۔ مدینے میں کشت و خون سب پر حرام ہو گا۔

۹۔ خوں بہا اور فدیے کا قدیم دستور باقی رہے گا۔

۱۰۔ ایک فریق کی صلح جو دشمن سے ہو' دوسرے فریق کی صلح متصور ہو گی۔ صرف دینی جنگ اس سے مستثنیٰ ہو گی۔

۱۱۔ ہر اختلافی معاملہ جو اس معاہدے سے متعلق ہو' اللہ اور اس کے رسول محمدؐ کے سامنے پیش ہو گا۔

اس معاہدے میں حضورؐ نے تمام دوسرے قبائل یہود و غیر یہود کو بھی شریک کر لیا۔ اس کی مزید توسیع کے لیے حضورؐ نے باہر کے بھی دورے کیے۔ ودان پہنچ کر بنی حمزہ کو' رضوئی جا کر اہل جبل بواط کو اور ذی العشیرہ میں بنی

مدلج کو بھی اس معاہدے میں شریک کر لیا۔

اس معاہدے میں جو خاص فوائد مد نظر تھے' وہ یہ تھے:

۱۔ عرب قبائل باہمی خوں ریزی کے عادی تھے۔ وہ اس معاہدے کی وجہ سے آپس میں کچھ ایسے گتھ گئے کہ معمولی معمولی باتوں پر فساد و خوں ریزی سے باز رہنے پر مجبور سے ہو گئے' کیوں کہ اس معاہدے کی رو سے سب ہی گویا ایک دوسرے کے حلیف ہو گئے۔

۲۔ مدینہ بھی اس معاہدے سے حرم ہو گیا۔ یہ مسئلہ بڑا اہم ہے۔ قرآن نے تو صرف مکے کے ایک خاص حصہ زمین کو حرام قرار دیا ہے۔ مدینے کے حرام ہونے پر کوئی قرآنی نص نہیں۔ لیکن یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ایک مسجد بننے کے معنی یہ نہیں کہ وہی عبادت گاہ ہے بلکہ جعلت لی الارض طھورا و مسجداً (میرے لیے ساری زمین ہی مطہر اور سجدہ گاہ بنائی گئی ہے ـــــ حدیث) یعنی انسانی اقدار کا جو احترام مسجد میں ہوتا ہے اسے مسجد سے باہر بھی وسیع کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ سارے عبادت گزاروں کے لیے یک ساں مشترک ملکیت ہے تو اسی طرح ساری زمین بھی تمام بنی آدم کے لیے ذریعہ انتفاع ہے۔ بس یہی شکل حرم کی بھی ہے۔ مسجد حرام میں خوں ریزی ممنوع ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے باہر ضرور خوں ریزی کی جائے' بلکہ اس سے غرض یہ ہے کہ اس مرکز تربیت سے باہر بھی ایسی فضا پیدا کرو کہ خوں ریزی بند ہو جائے۔ اس مقصد کی طرف حضورؐ نے یہ پہلا قدم بڑھایا کہ حدود مدینہ کو بھی حرام قرار دیا۔ اس میں صرف مسلمانوں ہی کا فائدہ نہ تھا بلکہ مدینے سے تعلق رکھنے والے تمام انسانوں کا بھلا تھا۔

۳۔ ایک بڑا فائدہ اس معاہدے سے یہ بھی ہوا کہ آئندہ آنے والا ایک بڑا خطرہ کمزور پڑ گیا۔ حضورؐ کی دور رس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ قریش کی حد سے بڑھی ہوئی عداوت تین سو میل دور آنے کے بعد بھی چین سے نہ بیٹھنے

دے گی۔ لہٰذا اس معاہدے کی رو سے قریش کی ممکن الوقوع سازشوں کا بڑی حد تک سدباب ہو گیا۔

۴۔ پھر اس معاہدے میں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ ایک سیاسی معاہدے کی بنیاد اخلاقی قدروں پر رکھی گئی ہے جو اصل مقصود ہے۔ مثلاً دیکھیے:

ایک اعلیٰ مقصد کے لیے مذہبی اختلافات کو برطرف رکھ کر اتحاد عمل کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے بلکہ نسل' رنگ' وطن' مذہب اور پیشے کے تمام اختلافات کے باوجود سب کو ایک امت قرار دیا گیا۔ اس سے اسلام کے اس مشن کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے جسے ہم وحدت انسانی کہتے ہیں۔

ایک بڑا مشن اس سے یہ پورا ہوا کہ مذہبی تنگ نظری کی بجائے فراخ دلی اور رواداری کی بنیاد رکھی گئی۔ اور لا اکراہ فی الدین کی اساس مستحکم کی گئی ہے۔

پھر اس معاہدے کی اساس ان اخلاقی قدروں پر رکھی گئی ہے جن کی افادی اور انسانی حیثیت سے کوئی عقل سلیم منکر نہیں ہو سکتی۔ یعنی مظلوم کی امداد' بر و تقویٰ میں تعاون' اثم و عدوان میں عدم تعاون' امن و امان کا قیام اور فساد و خوں ریزی سے اجتناب وغیرہ۔

پہلی ہجری کے کچھ اور واقعات

اس سنہ میں جہاں مذکورہ بالا اہم واقعات ہوئے وہاں چند اور واقعات بھی ہوئے جو اپنی اولیت کی وجہ سے اہم ہو گئے۔

۱۔ کلثوم بن ہدم نے وفات پائی۔ ان کے ہاں مہاجرین ٹھہرے تھے۔ نیز حضورؐ کے داخلہ مدینہ کے چھ سات ماہ بعد اسعد بن زرارہ نے بھی رحلت کی۔ یہ تینوں موقعوں پر مقام عقبہ پر موجود تھے۔ بارہ نقیبوں میں سے ایک یہ بھی تھے۔

۲۔ عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے۔ ہجرت کے بعد سب سے پہلی ولادت یہی ہے۔ ان کے کام و دہن نے جس اول چیز کا مزہ چکھا وہ کھجور تھی جو حضورؐ نے چبا کر ان کے منہ میں تحنیک کے لیے ڈالی تھی۔

۳۔ اسی سال سلمان فارسیؓ بھی اسلام لائے۔ اور "سلمان منا اھل البیت" کے لقب سے فائز ہوئے۔

۴۔ حافظ ابن کثیر نے حضرت عائشہؓ کی رخصتی کو بھی اسی سنہ کے واقعات میں لکھا ہے لیکن یہ ان کا سہو ہے۔ (اس کا ذکر ۲ھ کے واقعات میں آئے گا)۔

عبداللہ بن سلام کا اسلام

۵۔ اسی سال یہودیوں کے حبر حضرت عبداللہ بن سلام بھی ایمان لائے۔ داخلہ مدینہ کے آغاز میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ انھوں نے حضورؐ کو دیکھتے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ "یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔" اور یہ وہی ہے جس کی خبر موسیٰؑ نے دی ہے۔" اب اس جذبہ صادقہ کا اظہار باقی تھا۔ انھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کہا کہ: یا رسولؐ اللہ! میری قوم عجیب خود غرض، بہتان طراز واقع ہوئی ہے۔ حضورؐ مجھے ایک کمرے میں چھپا دیں اور یہود کے چند افراد کو بلا کر میرے بارے میں دریافت فرمائیں۔ اس کے بعد ملاحظہ فرمائیں کہ وہ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں اور میرے اسلام لانے کی اطلاع پانے کے بعد کیا خیال ظاہر کرتے ہیں؟ حضورؐ نے چند یہودیوں کو بلا کر پہلے اسلام پیش کیا۔ انھوں نے شدت سے مخالفت کی۔ اس کے بعد حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ: یہ عبداللہ بن سلام تم میں کیسے آدمی ہیں؟ انھوں نے کہا کہ: سبحان اللہ ان کے کیا کہنے ہیں، وہ تو ہمارے آقا ہیں اور آقا زادے ہیں۔ سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے عالم کے صاحب زادے ہیں۔ حضورؐ نے پوچھا کہ: اگر

اسلام لے آئیں تو؟ انھوں نے فوراً کہا: توبہ کیجیے، وہ کیوں آپ پر ایمان لانے لگے؟ حضورؐ نے عبداللہ بن سلام کو آواز دی کہ ذرا باہر تو آؤ۔ عبداللہ بن سلام نے باہر آکر کلمہ شہادت ادا کیا اور کہا کہ: اے یہود! خدا سے ڈرو اور تم بخدا خوب جانتے ہو کہ حضورؐ اللہ کے رسول ہیں —— یہ سننا تھا کہ یہود چلا اٹھے کہ: عبداللہ! تم بالکل جھوٹ بکتے ہو۔ تم بدترین انسان ہو۔ اور تمھارا باپ بھی نہایت نالائق تھا۔ غرض وہ جس عبداللہ بن سلام کی ایک منٹ پہلے مداحیاں کر رہے تھے، اسی کو ملاحیاں سنانے لگے۔ عبداللہ بن سلام نے عرض کیا کہ: حضورؐ نے ملاحظہ فرمالیا؟ یہ ہے ہماری قوم۔ اور مجھے پہلے معلوم تھا کہ میرے اسلام کا علم ہوتے ہی کیا کچھ کہیں گے۔

٦۔ اسی سال راس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول بھی بہ ظاہر اسلام لایا، اس کی کارگزاریوں اور فتنہ پردازیوں کا ذکر آگے مختلف صفات میں آئے گا۔

٧۔ یہ بھی روایت ہے کہ ظہر، عصر اور عشا کی نمازیں اب تک تو صرف دو دو رکعتیں تھیں۔ پھر اسی سال چار چار ہوگئیں اور سفر میں وہی دو باقی رہیں۔

✷ ✷ ✷

(۷)

۲ ہجری کے واقعات

۲ ہجری میں بعض بڑے اہم واقعات ہوئے مثلاً: (۱) تحویل قبلہ (۲) روزوں کا حکم۔ نیز پہلی نماز عید اور صدقہ فطر (۳) حضرت عائشہؓ کی رخصتی (۴) کفرو اسلام کی پہلی ٹکر' غزوہ بدر (۵) حضرت فاطمہؓ کا نکاح۔

ہم ان کو الگ الگ لکھیں گے کیوں کہ ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن پر سیرت نگاروں نے زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔

تحویل قبلہ

حضورؐ کا یہ معمول تھا کہ جن باتوں کے متعلق کوئی حکم نازل نہ ہوتا ان پر عموماً" خاموش رہ کر وحی کا انتظار فرماتے یا صحائف آسمانی (بائبل) کی پیروی فرماتے یا اپنے ذوق سلیم سے کوئی اقدام فرماتے' اور عموماً" وحی حضورؐ کی تائید کرتی جس کی کئی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں اور کچھ آئندہ بھی آئیں گی۔

شعبان ۲ ھ تک مسلمانوں کا قبلہ نماز بیت المقدس رہا (یعنی مدینے میں بھی سترہ مہینے تک) حضورؐ عموماً" یوں نماز ادا فرماتے کہ کعبہ اور بیت المقدس ایک سیدھ میں آجاتے۔ یعنی اہل کتاب کا قبلہ بھی سامنے رہتا اور اپنی فطری خواہش بھی پوری ہو جاتی جو ملت ابراہیمی سے لگاؤ کا فطری نتیجہ تھی۔ تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ کعبے سے پہلے دنیا میں کوئی عبادت خانہ جسے "قبلے" کی حیثیت بھی حاصل ہو موجود نہ تھا۔ قرآن نے اسی حقیقت کی طرف یہ فرما کر

اشارہ کیا ہے کہ:

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکہ (آل عمران:۹۶)

سب سے پہلا گھر جو انسانوں کے لیے وضع کیا گیا وہ وہی ہے جو مکے میں ہے (یعنی کعبتہ اللہ)۔

سچ پوچھیے تو اہل کتاب اور اہل اسلام کے علاوہ تمام اسماعیلی اور غیر اسماعیلی مشرکین کا متفق علیہ اور مرکزی قبلہ وہی ہو سکتا تھا جس کی بنیاد ان سب کے متفق علیہ پیغمبر سیدنا ابراہیم خلیل اللہ نے رکھی تھی' اور یہی گھر ان سب کے لیے وحدت انسانی کے پیغام کا مرکز بن سکتا تھا۔ یوں بھی عام طور پر اس کی مرکزیت اس قدر مسلم تھی کہ ابرہہ کو اس کی مرکزیت ختم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی' اور جب وہ اپنے اس حملے میں بری طرح ناکام ہوا تو اس کی مرکزیت کی دھاک اور بھی زیادہ بیٹھ گئی۔

یہ قبلہ خود کیا چیز ہے؟ یہ درحقیقت قومی ثقافت و تہذیب کا ایک محسوس تمثیلی مرکز (Symbolic Center) ہے۔ یہ مرکز توجہ ہے۔ محض چہرے کا رخ پھیرنے کے لیے مخصوص سمت نہیں۔ ملت ابراہیمی کا جو سرچشمہ اس سرزمین سے پھوٹا اور اس نے اہل ایمان کو جو اقدار انسانی بخشیں' اسی کا ایک محسوس نشان ہے یہ بیت اللہ۔ ادھر رخ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ اقدار وہی ہیں جس کا سردفتر یہ بیت عتیق ہے۔ جس طرح ایک قومی پرچم کپڑے اور ڈنڈے سے زیادہ کچھ نہیں' مگر صرف ایک نشان قومیت ہونے کی وجہ سے واجب الاحترام شعائر میں داخل ہے' اور جس طرح قربانی بجز خوں ریزی و گوشت خوری کے کچھ نہیں' بلکہ صرف ایثار و قربانی اور تقوے کا ایک درس ہے۔ لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤ ھاو لکن ینالہ التقوی منکم (الحج:۳۷) اسی طرح بیت خلیل بظاہر محض چوب و خشت کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کا احترام صرف اس لیے ہے کہ یہ سردفتر ہے

انسانی نظام زندگی کا۔ مرکزی درس گاہ ہے اقدار حیات کی تعلیم و اشاعت کی۔ نقطہ آغاز ہے صحیح ثقافت و تہذیب کا۔ اولین تربیت گاہ ہے حقائق دین کی۔ اس کے تمام شعائر' سارے مناسک بظاہر فقط رسوم ہیں۔ مقصد اور روح کچھ اور ہے۔ اسی طرح اسے قبلہ نماز بنانے کا مقصد محض ادھر منہ کر لینا نہیں۔ خدا کی ہمہ جہت ذات بحت کعبے کی دیواروں میں مقید نہیں۔ فاینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ (البقرہ: ۱۱۵) ساری سمتیں خدا ہی کی سمتیں ہیں۔ وللہ المشرق و المغرب (البقرہ: ۱۱۵) محض اس طرف منہ کر لینا طاعت پذیری یا بلند قدریں نہیں۔ اقدار کچھ اور ہیں:

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق و المغرب ولکن البر من امن باللہ والیوم الاخر و الملئکہ والکتب والنبین ج واتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتمی والمسکین وابن السبیل والسائلین و فی الرقاب ج واقام الصلوۃ واتی الزکوۃ ج والموفون بعھدھم اذا عھدوا ج و الصبرین فی الباساء والضراء وحین الباس اولئک الذین صدقوا ط واولئک ھم المتقون ○ (البقرہ: ۱۷۷)

بر یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لیا کرو۔ بلکہ صاحب بر وہ ہیں جو اللہ' آخرت' فرشتے' کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت میں قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں' مسافر' حاجت مندوں پر اور غلامی سے رہا کرنے کی راہ میں مال صرف کرے۔ نماز قائم کرے' زکوٰۃ ادا کرے' نیز جو عہد کرے' اسے پورا کرے'

تنگ دستی' بیماری اور قتال کے موقعوں پر ثابت قدم رہے۔ ایسے ہی لوگ صادق اور یہی اصحاب تقویٰ ہیں۔

آپ نے دیکھا؟ یہ ہیں وہ اقدار جو اصل مقصود ہیں۔ صرف کسی جہت کی طرف منہ موڑ دینا کوئی مقصد نہیں۔ منہ موڑنا تو صرف اس یاددہانی کے لیے ہے کہ ان تمام اقدار کے چشمے جس مقام سے پھوٹتے ہیں اور جس انداز سے پھوٹتے ہیں ان کا مرکز محسوس شکل میں کعبتہ اللہ ہے۔

بیت اللہ محض رکوع و سجود کی ایک سمت نہیں بلکہ قومی' سیاسی' روحانی' معاشی اور سارے معاشری و انسانی نظام حیات کا قبلہ توجہ ہے' وہ دین خداوندی ہے جو خلیل اللہ اور حبیب اللہ سارے بنی آدم کے لیے لائے ہیں۔

حضورؐ کی تمنا یہی تھی کہ بیت المقدس سے زیادہ قدیم اور زیادہ جامع اور مرکزیت کا حامل خانہ خدا یعنی کعبتہ اللہ قبلہ قرار پائے۔ پیغمبر کی ہر ادا کا رخ صحیح سمت ہی ہوتا ہے اس لیے خدا نے تحویل قبلہ کا حکم دے کر اس آرزو کی عملی توثیق فرمادی۔

اس تحویل کی ایک بڑی مصلحت خدا نے خود بتادی کہ:

لنعلم من یتبع الرسول (البقرہ: ۱۴۳)

دیکھیں رسول کا اتباع کون کرتا ہے۔

یہ ایک بڑا امتحان تھا جس سے اہل اسلام نہایت آسانی و خوشی کے ساتھ گزر گئے لیکن سفہا کو باتیں بنانے کا موقع ملا جس کا قرآن میں ذکر ہے۔ اس حکم سے کھرے کھوٹے کا امتیاز ہوگیا' اور یہود کو یہ تحویل قبلہ سخت ناگوار ہوئی جس سے ان کے بعض منافقین بھی کھل کر سامنے آنے لگے۔

روزوں کا حکم

تحویل قبلہ سے متصل ہی صوم رمضان کا حکم نازل ہوا۔ روزہ تمام

قوموں میں مختلف انداز سے موجود ہے۔ اہل اسلام پہلے بھی روزے رکھتے تھے جیسا کہ جعفر طیارؓ کے اس خطبے سے مترشح ہوتا ہے جو آپ نے نجاشی کے دربار میں دیا تھا۔ اس وقت روزے کا فلسفہ پیش نظر نہیں لیکن اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اعلیٰ ترین اقدار کی تخلیق کرتا ہے۔ جس طرح حج یاترا سے مختلف چیز ہے اسی طرح روزہ بھی برت اور محض فاقہ کشی اور ہنگر سٹرائک سے جداگانہ قسم کی شے ہے۔ تسلیم و رضا یعنی رضاکارانہ جذبہ اتباع و طاعت کے علاوہ اپنا آپ محاسبہ کرنے کی صلاحیت' اعلیٰ و ادنیٰ میں یک رنگی' صبر اور جفاکشی کی قدریں پیدا کرتا ہے اور دوسرے فاقہ کشوں کی تکلیف کا احساس دلاتا ہے اور اسی سے نعمات الٰہی کی صحیح قدر اور شکر پیدا ہوتا ہے۔ فاقہ کش انسان اپنی زندگی سے عاجز آجاتا ہے اور پیٹ بھرنے کے لیے ارتکاب جرائم تک سے دریغ نہیں کرتا۔ لیکن یہی فاقہ کشی جب روزے میں تبدیل ہو جائے تو اندرونی مسرتیں پیدا ہوتی ہیں اور معاصی سے بچنے بلکہ کچھ اور نیکیاں کرنے پر ابھارتا ہے۔ روزے کی ان تمام اقدار کو سمیٹ کر قرآن نے دو لفظوں میں یوں بیان کر دیا ہے۔

لعلکم تتقون ○ (البقرہ: ۱۸۳)

امید ہے کہ تم صاحب تقویٰ بن جاؤ گے۔

نماز عید و صدقہ فطر

اسی رمضان کے بعد پہلی بار حضورؐ نے نماز عید پڑھی اور صدقہ فطر نکالنے کا بھی حکم دیا۔ اسلام میں کسی غم کو مذہبی تقریب کی حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ اگر تقریبیں ہیں تو خوشی ہی کی تقریبیں ہیں۔ لیکن یہ تقریبات بھی محض تہوار نہیں بلکہ زندگی اور اس کی اقدار پیدا کرنے والے اجتماعات ہیں۔ محض "ہجوم مومنین" نہیں بلکہ "شوکت قوم و دین" ہے۔

یہ پہلی عید الفطر قدرتی طور پر فتح بدر کی خوشی کا اظہار بن گئی اور کیا

عجب کہ یہ نماز عید دراصل اسلام میں اس پہلی جنگ کی پہلی فتح کی یادگار ہی ہو۔

منافقین مدینہ

مدینے میں پہنچ کر اہل اسلام نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ یہاں مسلمان اس پوزیشن میں نہ تھے کہ اہل مکہ کی طرح جو چاہے انھیں اپنی مرضی کے مطابق سزائیں دے یا قید کرے یا نکال باہر کرے۔ یہاں انھیں ایک اجتماعی قومی قوت حاصل ہو گئی تھی۔ یہاں مہاجرین بھی یک جا تھے اور انصارؓ بھی' اور ہر مسلمان اپنی جگہ سربکف شمشیربدست مجاہد تھا۔ بعض یہودیوں کے اسلام لانے کی وجہ سے عام یہود آتش زیرپا تھے مگر اپنے اندر اتنی قوت نہ پاتے تھے کہ قریش کی طرح وہ اہل اسلام کو اپنے مظالم کا تختہ مشق بنا سکیں۔ وہ کوئی کھلا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے' اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ اہل اسلام سے معاہدہ بھی کر چکے تھے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ اس معاہدے میں یہود اس لیے بھی کوئی رخنہ نہ ڈال سکتے تھے کہ اس میں تنہا وہی شریک نہ تھے' بلکہ جیسا کہ آپ اوپر معلوم کر چکے ہیں آس پاس کے بہت سے قبائل اس میں شریک ہو گئے تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود مدینے میں ایک بڑے شدید اور انوکھے فتنے نے سر اٹھایا جو اپنے دور رس اثرات میں قریشی فتنوں سے کہیں زیادہ سخت تھا۔ یہ فتنہ ایسا تھا جو حضورؐ کے دم واپسیں تک رہا۔ نہیں' بلکہ اس کے بعد بھی رہا اور کہنے دیجیے کہ آج تک قائم ہے۔ مکی زندگی تک اسلام بھی واضح تھا اور کفر بھی اس کے مقابلے میں علانیہ نمایاں اور عیاں تھا۔ لیکن مدینے کے یہود نے اسلام کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک نیا حربہ ایجاد کیا اور وہ تھا نفاق یا منافقت۔ یعنی باہر سے دوست' اندر سے دشمن۔ بہ ظاہر مسلمان اور بہ باطن کافر

——— قرآن ان کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ ان کا پروگرام مختصراً" یہ تھا:

۱۔ مسلمانوں سے کہنا کہ ہم مسلمان ہیں اور کافروں کو یقین دلانا کہ ہم دراصل تمہارے ساتھ ہیں۔ مسلمانوں کو تو ہم احمق بنا رہے ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کا ہمدرد بن کر ان کو اسلام سے بدظن کرنے کے علاوہ مخبری کرنا۔

۳۔ صبح اسلام لا کر شام کو مرتد ہو جانا تاکہ اہل اسلام کے دلوں میں شکوک پیدا ہوں اور ان کی استقامت میں کمزوری آجائے۔

۴۔ جہاں موقع ملے اہل اسلام میں تفریق' بدگمانی' تھڑدلی اور ہراس پھیلانے کے لیے ہر ممکن علانیہ و خفیہ پروپیگنڈا کرنا۔

۵۔ غیر مسلموں سے مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشیں کرنا اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کی دعوت دینا اور خود ان کو امداد دینا۔

۶۔ حقیقت کو اس طرح توڑ مروڑ کر دوسروں کے سامنے پیش کرنا کہ بات کچھ کی کچھ ہو جائے۔

۷۔ بے حقیقت اور ناقابل اعتنا باتوں کو اتنی اہمیت دے کر پھیلانا کہ لوگ اصلی کاموں کی طرف سے ہٹ کر ادھر متوجہ ہو جائیں۔

۸۔ نئی نئی باتیں اور جھگڑے تصنیف کر کے اذہان کو تشویش میں ڈالنا۔

۹۔ حق کے ساتھ باطل کو اس خوب صورتی سے ملا کر پیش کرنا کہ سطحی فہم رکھنے والے مسلمان اس کو فوراً یقین کر لیں۔

۱۰۔ اہل اسلام کا غلبہ دیکھ کر ان کے ساتھ ہو جانا اور کم زوری کے وقت الگ ہو جانا جو مفاد پرستوں (Oppurtunists) کا خاصہ ہوتا ہے۔

غرض یہ تھا ان منافقین کا پروگرام جس پر وہ عمل کرتے رہے۔ ان کا ذکر اپنے مواقع پر آئے گا۔ ان کا مقابلہ مسلمانوں کے لیے بے حد دشوار

تھا' اس لیے کہ یہ بہ ظاہر کلمہ شہادت پڑھ کر اسلام میں داخل ہو جاتے تھے۔ مسلمانوں کی طرح احکام الٰہی بھی بجا لاتے تھے' لیکن اندر گھن کی طرح گھس کر جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے اور منکروں کے مخبر بن کر مسلمان سوسائٹی میں گھس جاتے۔ مسلمان ان کے ظاہری اسلام کی وجہ سے انھیں مسلمان شمار کرنے پر مجبور تھے کیوں کہ قانون صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور باطن کو خدا کے سپرد کرتا ہے۔ ان پر اس وقت تک ہاتھ نہیں اٹھایا جاسکتا تھا جب تک گرفت کے قابل کوئی فعل سرزد نہ ہو جائے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کا (قرائن قویہ سے معلوم کر لینے کے بعد) حضورؐ نے مواخذہ کیوں نہ فرمایا اور ان کے معاملے میں ڈھیل کیوں دیتے رہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے اور بڑی بڑی اقدار اس سے وابستہ ہیں۔ اس ڈھیل کی وجوہ ہماری سمجھ میں یہ آتی ہیں:

۱۔ حضورؐ تو اپنی اعلیٰ ترین بصیرت سے منافقوں کی صحیح دار و گیر کر لیتے لیکن بعد والوں کے لیے یہ اسوہ کس طرح بنتا؟ اس کا نتیجہ تو یہ ہوتا کہ بعد کے اولی الامر جس کو چاہتے' منافق قرار دے کر سخت سے سخت سزا حتی کہ سزائے موت تک دے دیتے حالاں کہ یہ عین ممکن ہے کہ وہ دراصل منافق نہ ہوتا یا کوئی شخص اپنے ذاتی انتقام کی آگ بجھانے کے لیے اس پر منافقت کا الزام لگا دیتا۔ اس صورت میں انسانی خون کی کیا قدر و قیمت رہ جاتی؟

۲۔ جو اہل اسلام فی الواقع مسلمان ہوں ان کے مسلمان ہونے کی کیا ضمانت ہو سکتی تھی جب کہ فیصلے کا انحصار ظاہر پر نہیں بلکہ صرف باطن پر ٹھہرا ہو۔

۳۔ ایک بڑی مصلحت اس ڈھیل میں یہ بھی تھی' ان منافقین کو اصلاح حال کا موقع دینا بھی مقصود تھا۔ منافقوں میں جہاں پکے منافق تھے وہاں ایسے بھی تھے جو اپنی منافقت میں پختگی نہ رکھتے تھے یا ان کے اندر کوئی گوشہ

شرافت موجود تھا۔ ان سے اصلاح حال کی توقع بجا طور پر منقطع نہیں ہوئی تھی۔ ان میں کتنے ایسے تھے جو اسلامی سوسائٹی کی برکات سے آخر متاثر ہوئے یا قدرتی گرفت نے انھیں دوسروں کے لیے نمونہ عبرت بنا دیا۔

۴۔ اس ڈھیل کی ایک بڑی اخلاقی و سیاسی وجہ یہ تھی کہ انہی منافقین کے بعض قریبی رشتے دار سچے مومن بھی تھے۔ اگر ان منافقین کو قتل کر دیا جاتا تو ان کے مومن رشتے داروں کے دل پر ناخوش گوار اثر پڑتا ایک فطری بات ہوتی۔ مثلاً عبداللہ بن ابی بن سلول کے صاحب زادے حضرت عبداللہ سچے مومن تھے۔ ایسے سچے مومن کہ حنین کے موقعے پر اپنے منافق باپ کا سر کاٹنے کی حضورؐ سے اجازت مانگی تھی مگر حضورؐ نے اجازت نہ دی۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ جب حضورؐ نے یہ گوارا نہ کیا کہ بیٹا اپنے باپ کا سر قلم کر دے تو یہ کب گوارا فرما سکتے تھے کہ بیٹے کے سامنے خود اپنے حکم سے اس کا سر قلم کرا دیں؟ یہ تو خیر حالت امن تھی، حضورؐ نے حالت جنگ میں بھی گوارا نہ فرمایا۔ احد کے میدان جنگ میں ابو عامر قریش کے لشکر کی قیادت کر رہا تھا۔ ان کے صاجزادے حضرت حنظلہ (غسیل ملا ئکہ) نے اپنے باپ سے دو دو ہاتھ کرنے کی اجازت چاہی مگر رحمتہ للعالمین نے اسے پسند نہ فرمایا۔ تفصیل آگے آئے گی۔

بات یہ ہے کہ یوں تو حضورؐ کا سب سے بڑا مشن انسانی خون کا احترام تھا۔ یہ خود ایک بہت بڑی قدر ہے لیکن حالت جنگ یا حالت امن میں خون ریزی ناگزیر ہونے کی حالت میں بھی حضورؐ ایک اور اعلیٰ قدر کی محافظت کو ضروری سمجھتے تھے اور وہ تھا بڑوں کا احترام اور چھوٹوں پر رحم۔ جیسا کہ حضورؐ کا ارشاد ہے:

من لم یوقر کبیرنا ولم یرحم صغیرنا فلیس منا۔

جو ہمارے بڑے کا ادب اور ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے وہ ہم

سے باہر ہے۔

اس حدیث کے الفاظ قابل غور ہیں۔ حضورؐ دوسروں کے بڑے کو اپنا بڑا اور دوسروں کے چھوٹے کو اپنا چھوٹا فرما رہے ہیں۔ اگر حضورؐ ان منافقین کو سخت سزا یا سزائے موت دیتے اور وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ وہ جنگی مقابلہ نہیں کر رہے ہیں تو ان کے بڑوں اور ان کے چھوٹوں دونوں ہی کے جذبات کو ٹھیس لگ سکتی تھی اور رحمت نبوی کو یہ گوارا نہ تھا' اس لیے آخر وقت تک درگزر ہی سے کام لیا۔

۵۔ حضورؐ کا فیصلہ اپنے دور کے منافقین کے لیے تو بہرحال صحیح ہوتا لیکن بعد والوں کے لیے یہ حدود قائم کرنا بہت مشکل تھا کہ کس نوع کی منافقانہ کارروائی پر سزا دی جائے اور کس کارروائی سے درگزر کیا جائے۔ بعض سچے اہل ایمان (مثلاً حاطب بن ابی بلتعہ) سے بھی ایسی لغزشیں ہوگئیں جن پر منافقت کا گمان کیا جاسکے۔ بعض اہل ایمان سے نادانستہ بھی ایسی لغزشیں ہوگئیں۔ ایسی صورت میں وہ کون سا واضح خط امتیاز ہے جو ان اہل ایمان کی لغزشوں اور منافقین کی دانستہ کارروائیوں کے درمیان کھینچا جاسکے؟ آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ حضرت عمرؓ ذرا ذرا سی باتوں پر تلوار کھینچ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور حضورؐ سے بعض اہل خطا کی گردن اڑا دینے کی اجازت چاہنے لگتے تھے۔ اگر حضورؐ نے منافقین سے درگزر کا یہ وسیع انداز نہ رکھا ہوتا تو حضرت عمرؓ کا جوش اپنے دور میں اتنا متوازن نہ ہو سکتا تھا۔ اور بعد میں تو یہ ہوتا کہ ہر امیر منافقت کو بہانہ بنا کر جسے چاہتا ختم کر کے اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنا ایک مشغلہ بنا لیتا اور اس صورت میں عفو' عدل' رحم اور احترام خون کی تمام قدریں مجروح ہو کر رہ جاتیں۔

غرض یہ تھے وہ اسباب جن کی وجہ سے منافقین کو برداشت کرنا پڑا۔ ان کے بارے میں تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنے کے بعد قابل عمل روش یہی

ہو سکتی تھی کہ اسلامی سوسائٹی کے افراد ان سے ہوشیار رہیں اور اس وقت تک کوئی ہلکی یا سخت سزا نہ دیں جب تک وہ سزا ناگزیر نہ ہو۔ اس ناگزیری میں پھر مسلم و کافر و منافق کے درمیان کوئی قانونی فرق نہیں ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ اسلام تو ظاہر و باطن دونوں ہی کی اصلاح چاہتا ہے اور اس کا ہر قانون دونوں ہی پر حاوی ہے لیکن کسی قانون کی گرفت باطن پر نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شخص منافقت کے ساتھ اسلام قبول کر لے تو اگرچہ وہ مومن تو نہ ہو گا لیکن اسے مسلم تو کہنا ہی پڑے گا۔ پس اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار نہیں کہ قانون (شریعت) صرف ظاہر کو دیکھے جیسا کہ تمام دنیا کے قوانین دیکھتے ہیں اور باطن کے متعلق اس کا سلوک یہ ہو کہ وحسابہ علی اللہ اس کے ساتھ ساتھ سوسائٹی تطہیر نفاق کی کوشش میں لگی رہے۔

یہود کی عداوت کے اسباب

یہ تو اوپر بیان ہو چکا ہے کہ یہود نے کن مجبوریوں کی وجہ سے کھلے مقابلے کی بجائے منافقت کو اپنی دشمنی نکالنے کا حربہ بنایا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ انصار کی طرح یہ سب کے سب یا ان میں سے اکثر ایمان کیوں نہ لے آئے اور حق کو قبول کرنے کی بجائے اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی کو اپنا شعار کیوں بنا لیا؟ اور چند سعید روحوں کے سوا یہ سب کے سب آخر وقت تک عداوت پر کیوں قائم رہے؟ اس کے کئی اسباب ہیں اور ان کا جاننا اس لیے ضروری ہے کہ خود ہمارے موجودہ احوال و کوائف سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

۱۔ قوم یہود کی خصوصیات کو قرآن مجید نے بڑی تفصیل سے کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ ان سب کو سمیٹنے کا یہاں موقع نہیں۔ مختصراً" یوں سمجھ لیجیے کہ روحانی اقدار کو برطرف کر کے لفظی موشگافیوں کے پیچھے پڑے رہنا تنگ

دلی اور تقشف' خاندانی برتری کا غرور' جاہ و اقتدار کی ہوس' مال و دولت کی حرص میں فنائیت اور حصول زر کے لیے اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈال دینا' قانونی انطباق میں اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق وغیرہ ان کی وہ خصوصیات ہیں جن کے ذکر سے قرآن بھرا پڑا ہے۔ انھوں نے اپنی شرارتوں سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو عاجز کر رکھا تھا۔ سیدنا مسیحؑ کا پیغام ان کے ان ہی افکار و کردار کے خلاف ایک بغاوت تھا۔ آج ہماری قوم میں یہودیوں کی یہی خصوصیات پوری طرح نمایاں ہیں' اور ارشاد نبویؐ ہے کہ تم لوگ (مسلمان) بھی ان ہی کے نقش قدم پر چل کر رہو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی اس میں گھس کر رہو گے۔ یہ واقعہ ہے کہ جب پیغام وحی سے بے نیازی ہوتی جائے اور انسانوں کو مقام نبوت پر بٹھا دیا جائے تو قوم کی تمام بلندیاں پستیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور قبول حق میں شخصیتیں اور ان کے پیدا کردہ غلط تصورات حائل ہو جاتے ہیں۔ پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی خدائی فیصلہ اس کی خواہش کے مطابق ہو تو بڑی خوشی سے اسے گلے لگاتی ہے اور اگر اس کی مرضی کے خلاف ہو تو خدا کا نام لیتے ہوئے بھی وہ اسے رد کر دیتی ہے۔

یہودیوں کی جاہ طلبی اور خاندانی فخر و غرور نے حضورؐ کا انکار کرنے پر مجبور کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اب تک چوں کہ سارے انبیا و مرسلین بنی اسرائیل میں آتے رہے ہیں اس لیے نبوت اسی خاندان کی اجارہ داری ہے۔ کسی دوسرے خاندان (بنی اسرائیل) میں نبوت کہاں سے آسکتی ہے؟ اور لطف یہ ہے کہ یہ یہود خود اسرائیلی پیغمبروں کی تکذیب کرتے رہے ہیں' بلکہ قتل تک سے دریغ نہیں کیا۔ بنی اسماعیل میں ایک پیغمبر آخرالزمان کا پیدا ہو جانا انھیں سخت ناگوار تھا اور یہ اسے بنی اسرائیل کے لیے ایک سبکی سمجھتے تھے۔ انھیں ایک پیغمبر کا انتظار ضرور تھا' اور آپ بیعت عقبہ کے بیان میں پڑھ چکے ہیں کہ ایک آنے والے پیغمبر کا چرچا ان کے اندر ہوتا رہتا تھا اور انصار مدینہ کو بھی

اس کے متعلق تھوڑا بہت علم ان ہی یہود کی بدولت ہوا تھا۔ یہ اپنے دشمنوں (اوس و خزرج) کو یہ کہہ کر دھمکی دیتے تھے کہ ذرا اس منتظر پیغمبر کو آلینے دو۔ پھر دیکھنا کہ ہم اس کا ساتھ دے کر کس طرح تم سے انتقام لیتے ہیں۔ انھیں یہ یقین تھا کہ یہ آنے والا بنی اسرائیل ہی میں مبعوث ہو گا لیکن جب وہ مشیت کی نگاہ انتخاب بنی اسماعیل پر پڑی تو یہ یہود ناراض ہو گئے۔ ان کا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ وہی نبی منتظر ہے اور اس کے تمام اوصاف ایک ایک کر کے اس کے اندر موجود ہیں۔ وہ جس طرح اپنے فرزندوں کو پہچانتے تھے اسی طرح حضور کو بھی پہچانتے تھے۔ یعرفونه کما یعرفون ابناء هم (البقرہ: ۱۴۶) مگر ہوا یہ کہ فلما جاء هم ما عرفوا کفروا به (البقرہ: ۸۹) پہچاننے کے باوجود منکر ہو گئے۔

خاندانی اقتدار و جاہ کو خطرے میں محسوس کرنے کے علاوہ ان یہود کو حرص مال و زر نے بھی قبول حق سے باز رکھا۔ یہ اپنا اقتدار بھی اپنی دولت ہی کی خاطر چاہتے تھے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کا صحیح مظہر تھے۔ حصول مال کا ہر جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اکل بالسحت یعنی استحصال اور ناجائز ذرائع معاش ان کی ممتاز خصوصیت تھی۔ شریعت موسوی میں سود خوری کو قطعاً حرام کیا گیا ہے لیکن یہود کی معاشی زندگی ہی سود خوری اور حرام خوری پر قائم تھی۔ مدینے کے انصار تک ان کے محتاج تھے۔ سودی قرضے لیتے اور مدت دراز تک ادا نہ کرسکنے کے باعث ذہنی طور پر ان کے غلام رہتے۔

قبول اسلام کے بعد اور خصوصاً حضورؐ کی آمد مدینہ کے بعد انصار اور دوسرے نومسلموں کی معاشی حالت سنبھلنے لگی تھی۔ ایک تو اس لیے کہ قبل از اسلام جن فضول یا ناجائز باتوں پر یہ پیسہ برباد کیا کرتے تھے اس سے باز آ گئے۔ وہ اب اپنے ضروری اخراجات میں بھی تخفیف کرنے لگے تھے اور رقم بچا کر

اپنے غریب (مہاجر و غیر مہاجر) بھائیوں کی امداد کرتے تھے۔ پھر رزق حلال کی کوشش سے مہاجرین و انصار دونوں کی معاشی حالت سنبھلنے لگی۔ سود کی حرمت اگرچہ ابھی نازل نہ ہوئی تھی لیکن اس کی کراہت تو مکی زندگی ہی میں مسلم ہو چکی تھی جیسا کہ دربار نجاشی میں خطبہ جعفر طیار سے واضح ہے۔ اس رجحان کی وجہ سے مسلمان سودی قرض سے بچتے تھے۔

غرض اہل اسلام کی معاشی حالت سنبھلنے کی وجہ سے اور اسلامی سادہ زندگی کی وجہ سے قرض کا لین دین بہت کم ہو گیا تھا۔ جب اعمال مکروہہ کے علاوہ غیر ضروری اخراجات سے بھی احتراز کیا جائے اور قرض لینے کی بجائے خدا کو قرض دینے کا جذبہ کارفرما ہو تو کوئی کیوں قرض لے اور وہ بھی سودی قرض۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں کے کاروبار پر خاصا اثر پڑا کیوں کہ ان کا سب سے بڑا ذریعہ معاش یہی سودی لین دین تھا اور اسی کی بدولت وہ اہل مدینہ پر اور دوسروں پر اپنی آقائی قائم رکھے ہوئے تھے۔

یہ معاشی مار یہود کب برداشت کر سکتے تھے؟ سرمایہ دار سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر پیسے کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ یہودیوں کو یہ چیز کھائے جا رہی تھی کہ اہل اسلام ان کی اقتصادی غلامی سے آزاد ہو رہے تھے اور خود یہود کا معاشی کاروبار خطرے میں پڑ رہا تھا۔ یہی سب سے بڑی وجہ تھی جو انھیں حضورؐ کا پیغام قبول کرنے سے روک رہی تھی اور وہ اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی پر اتر آئے تھے۔

۳۔ انھیں ایک خطرہ اور بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ اگر مسلمان اسی طرح قوت پکڑتے گئے تو بہت ممکن ہے کہ کل کلاں کو یہاں ان کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے۔ لہٰذا یہ اس فکر میں تھے کہ کوئی موقع ایسا ہاتھ آئے کہ جس طرح اہل اسلام کو مکے سے نکلنا پڑا اسی طرح یہاں سے بھی انھیں نکال باہر کیا جائے یا یہیں انھیں ختم کر دیا جائے۔

۴۔ یہود کی ایک بڑی خفگی کا سبب اور بھی بعد میں پیدا ہو گیا اور وہ یہ تھا کہ پہلے شعبان ۱ھ تک مسلمانوں کا قبلہ نماز وہی تھا جو اہل کتاب کا تھا لیکن بعد میں وحی خداوندی سے یہ قبلہ بدل گیا اور اب خانہ خلیل ـــــــ کعبتہ اللہ ـــــــ اہل اسلام کا قبلہ قرار پا گیا جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

یہ تمام خیالات ان یہود مدینہ کے دل و دماغ پر کابوس بن کر مسلط ہو رہے تھے، مگر ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو ختم کر کے اپنے انحطاط معاش و اقتدار کی تلافی کر سکیں۔ وہ منتظر تھے کسی موقعے کے، اور سردست انھوں نے یہ عبوری دور گزارنے کے لیے منافقانہ اسلام کا ایک آسان حربہ استعمال کرنا شروع کیا تاکہ بظاہر مسلمان ان کی طرف سے مطمئن رہیں اور یہ اس دوران میں اپنے مفر کی راہیں تلاش کرتے رہیں۔

قریش کی ناراضی

یہ تو مدینے کا حال تھا۔ ادھر مکے والوں کو بھی اپنے اقتدار اور معاش کا مزید خطرہ ایک دوسرے انداز سے پیدا ہو گیا۔ انھیں ایک تو یہ صدمہ تھا کہ اسلام روز بروز پھیلتا جا رہا ہے اور تمام اہل اسلام مکے سے بچ کر نکل گئے اور انھیں ایک محفوظ ٹھکانا مل گیا۔ اہل مکہ کو اسلام کا اس طرح پھلنا پھولنا کب گوارا ہو سکتا تھا؟ صرف اتنی ہی بات نہ تھی بلکہ اس سے زیادہ دو بڑے خطرے اور بھی ان کے سامنے آ گئے۔ ایک یہ کہ اہل مکہ کے تجارتی قافلے جو شام کی طرف جاتے تھے اس کا سہل اور عام راستہ مدینے ہی کے قریب سے ہو کر جاتا تھا۔ انھیں خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اہل اسلام ہمارا راستہ روک دیں یا ہمارے قافلے لوٹنے لگیں۔ اگر یہ شکل ہوئی تو ہمارا سارا معاشی نظام تباہ و برباد ہو جائے گا۔ مزید برآں یہ بھی ہو گا کہ باہر سے آنے والے تجارتی قافلوں اور نیز زائرین کو اگر روک دیں تو معاش کا رہا سہا سہارا بھی ٹوٹ جائے گا اور یہ

بھی ممکن ہے کہ آئندہ مسلمان دوسرے دشوار گزار راستوں کی اور سمندر کے کنارے والے راستے کی بھی ناکہ بندی کر دیں۔

اس معاشی خطرے کے علاوہ ایک اور بڑا خطرہ انھیں یہ بھی پیدا ہو گیا کہ اگر اہل اسلام نے مزید قوت پیدا کر لی تو کل ہم پر حملہ کر کے ہماری آزادی، عیاشی، معاش، اقتدار اور مذہب وغیرہ سب کا خاتمہ کر دیں گے۔

انسان جب غیر معقول جذبات کی رو میں بہہ جائے تو اس کی چشم بصیرت اندھی ہو جاتی ہے۔ اہل مکہ اپنی عداوت و دشمنی میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ نہ تو انھیں اسلام پر غور کرنے کا موقع ملا اور نہ انھیں مسلمانوں کے بلند کردار کو نگاہ غور سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ رسولؐ خدا کے ہوتے ہوئے اہل اسلام سے ایسے گھٹیا کردار کا مظاہرہ نہ ہو سکتا تھا جس کی اہل مکہ توقع کر رہے تھے۔ انھیں اس حقیقت کا اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ حضورؐ جو پیغام لائے ہیں وہ ان خطرات مزعومہ کا حامل نہ تھا۔ وہ پیغام لوٹ مار کو روکنے کے لیے تھا نہ کہ اسے ہوا دینے کے لیے۔ وہ دین انسانوں کی اقتصادی، معاشی حالت درست کرنے کے لیے تھا نہ کہ اسے برباد کرنے کے لیے۔ وہ جذبہ انتقام کو عدل میں تبدیل کرنے کے لیے تھا نہ کہ اسے اور ابھارنے کے لیے۔ حضورؐ ان ہی اعلیٰ اقدار کو اجاگر کرنے کے لیے آئے تھے نہ کہ ان کے مزعومہ خطرات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے۔

بہرحال اہل مکہ اپنے لیے یہ خطرات حقیقت سے کہیں زیادہ محسوس کرنے لگے۔ اور انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اسلام اور اہل اسلام کے استیصال کے لیے ہر ممکن تدبیر کو عمل میں لانا چاہیے اور اس خطرے کو سر پر آنے سے پہلے ہی دور کر دینا چاہیے۔ اس کے لیے انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ منافقوں کے رئیس عبداللہ بن ابی بن سلول کو ایک خط اس مضمون کا لکھا کہ:

"تم لوگوں نے ہمارے قبیلے کے ایک شخص محمد (صلی

اللہ علیہ وسلم) کو اور ان کے ساتھیوں کو اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ (یعنی یہ ہم اہل مکہ پر زیادتی ہے) للذا یا تو ان سبھوں کو اپنے شہر سے نکال دو یا ان سے لڑ کر ان کو ختم کر دو۔ اگر ان دونوں باتوں میں سے تم کسی ایک کے لیے بھی تیار نہیں تو پھر اس وقت کا انتظار کرو کہ جب ہم اہل مکہ خود تمھارے اوپر حملہ کر دیں گے اور پھر تمھارے نوجوانوں کو قتل کر کے تمھاری عورتوں کو تصرف میں لائیں گے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ خاصے باخبر بھی تھے اور معاملہ فہم بھی۔ خط لکھنے کے لیے انھوں نے جس آدمی کا انتخاب کیا ہے اس سے بہتر آدمی قریشی نکتہ نگاہ سے اور کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ عبداللہ بن ابی ایک تو منافق بلکہ سردار منافقین تھا۔ دوسرے انصار کے دونوں قبیلوں اوس و خزرج پر یہ اپنا خاصا اثر رکھتا تھا۔ اہل مکہ کا یہی آلہ کار بن سکتا تھا۔ مکتوب الیہ کا یہ انتخاب بلاشبہ اہل مکہ کی دانائی کا ایک واضح ثبوت ہے۔ پھر خط کا مضمون بھی اتنا مکمل ہے کہ اس سے بہتر ممکن نہیں۔ اسی مضمون کے پیش نظر وہ انصار کو بہ ظاہر ہمدردانہ مشورہ دے سکتا تھا اور اسی سے وہ اپنی مطلب برآری کر سکتا تھا۔

انصار کی تمام شیفتگی حضورؐ کی ذات سے وابستہ ہوگئی تھی۔ یہ صورت حال تمام منافقوں پر گراں تھی' اور عبداللہ بن ابی پر تو بے حد شاق تھی۔ قریش کا خط آنے کے بعد ان تمام منافقوں کو بڑی ڈھارس ملی۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ گویا اہل مکہ کا بااثر جتھا ہمارا ہم خیال ہے جو وقت پڑنے پر ہماری امداد بھی کرے گا۔ منافقین کو یہ بہانہ ہاتھ آگیا اور انھوں نے معاملے کو گویا اس طرح پیش کیا کہ قریش کی اس دھمکی کے بعد اب ہمارا وجود باقی ہی اس طرح رہ سکتا ہے کہ مدینے کے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے خواہ انھیں مدینے سے باہر نکال کر ہو یا ان سے مدینے کے اندر جنگ کر کے ہو۔

آخر ان منافقوں نے یہ طے کیا کہ مسلمانوں سے جنگ ہی کرنا چاہیے کیوں کہ اس کے بغیر یہ مسلمان نہ مغلوب ہوں گے اور نہ مدینے سے نکلیں گے۔ حضورؐ کو ان کے اس فیصلے کی اطلاع ملی تو خود ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا:

> ”دیکھو تم کو قریش نے بڑے مغالطے میں ڈالا ہے۔ اگر تم یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ لڑو گے تو خود تمہارا ہی نقصان ہوگا کیوں کہ یہ تمھارے ہی رشتے دار ہیں جو مسلمان ہوئے ہیں۔ اور اگر تم قریش کی باتوں کو ماننے سے انکار کر دو اور تمھیں ان سے لڑنا پڑے تو یہ مقابلہ پھر بھی غیروں سے ہوگا۔“

یہ چند جملے تھے جو سننے والوں کے دلوں میں اتر گئے اور ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ ذرا ان جملوں کو پھر پڑھیے اور دیکھیے کہ بلاغت کا کتنا اعلیٰ مرقع ہے۔ بلاغت ایسے انداز کلام کو کہتے ہیں جو اقتضائے حال اور موقع محل کے عین مطابق ہو' جو دلوں میں اتر جائے۔ ان جملوں میں سیاست کا اعلیٰ نمونہ ہے مگر یہ محمدی سیاست ہے جس کا مقصد قیام امن ہے اور جنگ کے امکانات کو کم کرنا۔

قریش کی ایک اور سازش

قریش کو اپنی اس تدبیر میں ناکامی ہوئی تو انھوں نے دوسرا پینترا بدلا۔ اب انھوں نے یہود مدینہ سے خط و کتابت شروع کی۔ یہود پہلے ہی سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ قریش کی پشت پناہی سے انہیں شہہ ملی اور دونوں ہم خیال ہوگئے۔ اس اتحاد خیال پر قریش کو اتنا اعتماد پیدا ہوگیا کہ مسلمانوں کو یہ پیغام بھیج دیا کہ: ”تم اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ مدینے میں پہنچنے کے بعد امن و

اطمینان حاصل ہو گیا۔ یاد رکھو ہم وہیں آکر تمھیں ختم کر دیں گے۔"

بدر اولیٰ

اس دھمکی کے بعد قریش نے کچھ عملی اقدام بھی کیا۔ ایک قریشی سردار کرز بن جابر فہری مدینے کی ایک بیرونی چراگاہ میں پہنچا اور مسلمانوں کے بہت سے مویشی دن دہاڑے لوٹ کر لے گیا۔ گویا مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ ہم تمھیں تین سو میل کے فاصلے پر بھی چین سے نہ بیٹھنے دیں گے۔ اسی واقعے کو اہل سریر بدر اولیٰ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

بہ ظاہر تو یہ محض ایک شرارت سی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت یہ ایک بڑا سیاسی اقدام تھا۔ قریش ایسے بے وقوف نہ تھے کہ جو محض چند مویشی کے لیے تین سو میل کا سفر ضروری سمجھیں۔ کرز بن جابر فہری کا یہ اقدام صرف ایک آزمائشی اقدام تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت دفاع اور یہود کے جذبہ حمایت کا اندازہ کر لیا جائے۔ عموماً" اہل سیاست جب کسی پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو پہلے ایک چھوٹی سی چنگاری پھینک دیتے ہیں۔ اس سے ان کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس چنگاری کا کیا رد عمل ہوتا ہے؟ کتنا ہیجان پیدا ہوتا ہے؟ عام تاثرات کیا ہوتے ہیں؟ کون حمایت اور کون مخالفت کرتا ہے؟ دشمن کی قوت کتنی ہے اور اس کے حمایتی کتنے؟ اس کے حوصلے کا اور غیرت قومی کا کیا حال ہے اور اس کی تدبیر و سیاست کتنے پانی میں ہے؟ ان ہی باتوں کا جائزہ یا اندازہ لینے کے لیے یہ چھوٹی سی چنگاری مدینے کی چراگاہ میں ڈالی گئی تھی۔ محض اتفاقی شرارت نہ تھی۔

حضورؐ نے وادی سفوان تک جو بدر کے قریب ہے تعاقب فرمایا مگر کرز بن جابر ہاتھ نہ آیا۔

(۸)

قتال کی اجازت

اب تک اسلام میں قتال و جنگ کے متعلق کوئی حکم نازل نہ ہوا تھا۔ اب اس کے متعلق پہلا حکم یوں دیا گیا:

اذن للذین یقتلون بانهم ظلموا ط وان اللّٰه علی نصر هم لقدیرن ○ الذین اخرجوا من دیارهم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللّٰه ط ولو لا دفع اللّٰه الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبیع وصلوات و مسجد یذکر فیها اسم اللّٰه کثیراً ط (الحج: ۳۹'۴۰)

جن مسلمانوں سے جنگ کی جائے انھیں بھی جنگ کی اجازت دی جاتی ہے اس لیے کہ ان پر ظلم کیے گئے۔ اللہ ان کی مدد پر قدرت رکھتا ہے۔ ان کو محض اس جرم میں کہ یہ اللہ کو اپنا رب تسلیم کرتے ہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا ہے۔ اگر اللہ انسانوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا (اور اس طرح طاقت کا توازن برقرار نہ رکھتا) تو عیسائیوں کے گرجے' یہودیوں کے عبادت خانے' ترسا کے مندر اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں بکثرت ذکر الٰہی ہوتا ہے سب کے سب منہدم کر دیے جاتے۔

اسلام اور جنگ

اسلام میں پہلی جنگ غزوہ بدر ہے اور یہ حق و باطل کا پہلا معرکہ تھا' اس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔ یہاں تھوڑی دیر کے لیے رک جائیے اور اسلام میں جنگ کی اصلی حقیقت کی پردہ کشائی کرتے چلیے۔ جنگ بہ ظاہر ایک بے رحمی' ایک بھیانک تصویر اور ایک وحشیانہ فعل نظر آتی ہے اور فی الواقع ہے بھی کچھ ایسا ہی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ اس کے اندر بھی کچھ بلند اقدار ہوسکتی ہیں اور ایک پیغمبر جو دنیا میں آیا ہی اس لیے تھا کہ اعلیٰ اقدار کو قائم کرے کس طرح خوں ریزی کو روا رکھ سکتا ہے اور اس خدا نے کیوں کر جنگ و خوں ریزی کی اجازت دی جس کی سب سے بڑی صفت رحمان و رحیم ہے۔

ان حقائق کی پردہ کشائی کے لیے سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جنگ محض ایک حصہ ہے جہاد کا۔ اور "جہاد" ایک ایسا لازمی جزو زندگی ہے جسے زندگی سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ صرف انسانی زندگی ہی نہیں بلکہ ساری کائنات ایک مسلسل جہاد ہے۔ ہر شے شعوری یا غیر شعوری طور پر آگے بڑھنے کے لیے ہر آن مصروف جہاد ہے خواہ تکوینی انداز سے ہو یا اختیاری رنگ سے۔ ہر پودا برگ و بار لانے کے لیے جہاد کرتا ہے اور ہر حیوان اپنی منازل بقا طے کرنے کے لیے جہاد میں مصروف رہتا ہے۔ پھر انسان جہاد سے گریز کرکے کس طرح اپنا کوئی مقصد حاصل کرسکتا ہے؟ اور مسلمان تو جہاد سے الگ رہ کر مسلمان رہ ہی نہیں سکتا۔ لیکن یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ جنگ سراپا جہاد نہیں بلکہ جہاد کا صرف ایک حصہ ہے۔ جہاد نام ہے کش مکش حیات سے حسن و خوبی کے ساتھ گزرنے کا۔ لیکن بدقسمتی سے جہاد اور جنگ کو ایک ہی مترادف چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ بلاشبہ ہر جنگ ایک جہاد ہے لیکن ہر جہاد جنگ نہیں۔ ہر انسان

جان دار ہے لیکن ہر جان دار انسان نہیں۔

جہاد کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس کے بعد جنگ کی حقیقت بھی خود بخود واضح ہو جائے گی۔ یہاں چند احکام جنگ ملاحظہ ہوں:

اسلامی آداب جنگ

اسلامی قوانین جنگ کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے:

۱۔ فعاقبوا بمثل ماعوقبتم به ط (النحل:۱۲۶)

تم دشمنوں کے ساتھ اتنا ہی کر سکتے ہو جتنا تمھارے ساتھ کیا گیا ہے۔

۲۔ ولئن صبر تم لهو خیر للصبرین (النحل:۱۲۶)

اور اگر صبر و درگزر سے کام لو تو تمھارے لیے اور بھی بہتر ہے۔

۳۔ ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا ط اعدلوا هو اقرب للتقوی ز (المائدہ:۸)

کسی قوم کی دشمنی تمھیں عدل سے باہر نہ لے جائے۔ عدل کرنا ہوگا کیوں کہ یہی تقوے سے قریب تر ہے۔

۴۔ ان اللہ لا یحب المعتدین ○ (المائدہ:۸۷)

حد سے متجاوز ہونے والوں کو اللہ پسند نہیں فرماتا۔

کچھ فرامین نبویؐ بھی سنیے:

۵۔ اللہ کا نام لے کر اللہ ہی کی راہ میں اللہ کے نافرمانوں سے جہاد کرو۔

۶۔ بد عہدی اور خیانت نہ کرو۔

۷۔ لاشوں کو مثلہ نہ کرو۔

۸۔ راہبوں اور گوشہ نشینوں کو نہ چھیڑو۔

۹۔ کھجور یا اور کوئی پھل دار درخت نہ کاٹو۔

۱۰۔ عمارت کو نہ گراؤ۔
۱۱۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، مریضوں اور غیر محارب آدمیوں کو نہ چھیڑا جائے۔

فتح مکہ کے وقت کی ہدایات بھی سن لیجیے:

۱۔ حرم میں خوں ریزی نہ ہو۔
۲۔ صرف اسی کا مقابلہ کیا جائے جو سامنے آکر مقابلہ کرے۔
۳۔ جو شخص کعبے میں داخل ہو اسے پناہ۔
۴۔ جو شخص ابو سفیان کے گھر داخل ہو اسے پناہ۔
۵۔ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اسے پناہ۔
۶۔ بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔
۷۔ ہتھیار پھینک دینے والے کا تعاقب نہ ہو۔
۸۔ زخمی اور اسیر نہ قتل کیے جائیں۔

یہ ہیں مختصر نمونے ان قوانین کے جن کا ہر مجاہد کو جنگ کے موقعے پر پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بین الاقوامی اور عالم گیر جنگوں میں جتنا بھی ان باتوں کا لحاظ خیال رہا کیا ہے وہ آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی جہاد تو انسانیت کے لیے رحمت ہے، اور بربریت و درندگی دراصل ان کی جنگیں ہیں جو اسلامی جہاد کو بربریت قرار دیتے ہیں۔ اس حقیقت سے ہمارے معترضین بے خبر نہیں، لیکن ان کی بربریت چھپ ہی سکتی ہے اس صورت میں کہ وہ اسلامی جہاد کو بربریت و وحشت ثابت کرنے کی کوشش اور پروپیگنڈا کرتے رہیں۔ غرض ان تمام پروپیگنڈوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ اولاً" تو مسلمان اس اہم فریضہ زندگی سے کنارہ کش ہو جائیں اور ثانیاً" خود معترضین کی جنگی درندگیوں پر پردہ پڑا رہے۔

ہمیں ان تصریحات کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ایک تو جنگ اور

جہاد کا فرق واضح ہو جائے۔ دوسرے جہاد زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے اور جنگ بھی اسی جہاد کا ایک حصہ ہے جو ناگزیر حالات میں ضروری ہو جاتی ہے۔ نبوی زندگی روز ازل ہی سے ایک جہاد تھی۔ ہجرت تک پوری مکی زندگی بھی جہاد تھی۔ البتہ اس کے ایک حصے 'جنگ' کا آغاز مدنی زندگی میں ہوا کیوں کہ اب اسلامی مقاصد کا تحفظ اور محافظین اسلام کا دفاع اس کے بغیر ممکن نہ تھا۔

اس سلسلے میں ایک ضروری نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جنگ اگرچہ ناگزیر چیز ہے لیکن یہ بجائے خود کوئی مقصد نہیں۔ مقصد امن قائم کرنا اور فتنہ و فساد کو دور کرنا ہے۔ اس کی مثال عمل جراحی اور آپریشن کی سی ہے۔ اس میں اگرچہ تکلیف ہی ہوتی ہے لیکن مقصد آرام ہی پہنچانا ہے' اور یہ ایک ایسا مستقل آرام ہے جو اس عارضی تکلیف کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن اسی مقصد کو یوں واضح کرتا ہے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ:

الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض و فساد کبیر ○ (الانفال: ۷۳)

اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اس سے بھی بڑا فتنہ و فساد ہوتا رہے گا۔

جنگ خود ایک چھوٹا فتنہ اور غیر مطلوب شے ہے اس لیے اس سے گریز ضروری ہے' لیکن جب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہے تو ایک بڑے فتنے کو دور کرنے کے لیے اس چھوٹے فتنے کو اختیار کرنے سے مفر نہیں ہوتا۔ لیکن اس چھوٹے فتنے کو اختیار کرنے کے لیے بھی جو شرائط رکھی گئی ہیں وہ خود اتنی اعلیٰ اقدار کی حامل ہیں جن سے برتر قدروں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

جہاد کے اور اس کے ایک حصے یعنی جنگ کے مندرجہ بالا حقائق کے بعد اب پھر اصلی مرکز گفتگو کی طرف رجوع کیجیے۔ بیان یہ ہو رہا تھا کہ اب تک اسلام میں جنگ کا ـــــــ نہ کہ جہاد کا ـــــــ کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا' اب پہلی آیت یہ نازل ہوئی:

اذن للذین یقتلون بانھم ظلموا ط وان اللّٰہ علٰی نصرھم لقدیرن ط الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللّٰہ ط ولولا دفع اللّٰہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع و بیع وصلٰوت و مسجد یذکر فیھا اسم اللّٰہ کثیراً ط (الحج:۳۹،۴۰)

جن مسلمانوں سے جنگ کی جائے انھیں بھی (جوابی جنگ) کی اجازت ہے اس لیے کہ ان پر بہت ظلم ہو چکے اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ مظلوم وہ ہیں جو محض اللہ کو اپنا رب ماننے کے جرم میں گھروں سے نکالے گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسانی طاقتوں (کے توازن) کو ایک کو دوسرے سے دبا کر برابر نہ کرتا تو عیسائیوں کے گرجے، یہود کے عبادت خانے، ترسا کے مندر اور مسلمانوں کی مسجدیں، جن میں بکثرت ذکر الٰہی ہوتا ہے سب کے سب منہدم کر دیے جاتے۔

ذرا اس آیت کے حقائق پر غور کیجیے:

۱۔ اذن جنگ کی اجازت ہے۔

۲۔ بانھم ظلموا کیوں کہ ان پر کافی مظالم ہو چکے۔

۳۔ اخرجوا من دیارھم بغیر کسی جائز وجہ کے گھر بار، املاک (اور اقارب) سے جدا کر دیے گئے۔

۴۔ الا ان یقولوا ربنا اللّٰہ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ اللہ ہی کو اپنا رب تسلیم کیا۔ (اہل مکہ مسلمانوں کا جرم اس کے سوا اور کچھ نہ بتا سکے تھے)۔

۵۔ ولولا دفع اللّٰہ الناس جنگ تو ایک کے ذریعے دوسرے کی زیادتی کو دور کرنے کے لیے ہے۔ اس لیے جہاں اس کا غلط استعمال ہو سکتا ہے

وہاں صحیح محل استعمال بھی ہو سکتا ہے۔ اسلام صحیح محل ہی پر اس کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ اگر صحیح محل پر بھی اس کا استعمال نہ ہو تو ــــــــ

۶۔ لھدمت صوامع ..... تمام قوموں کے عبادت خانے برباد ہو جائیں، یعنی جنگ کا مقصد عبادت خانوں کو ڈھانا نہیں بلکہ ان کا بچاؤ ہے۔ زبردستی دین کو مسلط کرنا نہیں بلکہ دینی آزادی دینا ہے۔ تمام عبادت خانوں کے ذکر کے ساتھ مساجد کا ذکر اہل اسلام کو یہ تنبیہہ کر رہا ہے کہ اگر تم نے دوسری قوموں کے عبادت خانوں کو برباد کیا تو خود تمھاری مسجدیں بھی محفوظ نہ رہیں گی۔

ان آیات میں جنگ کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے اس سے کون صاحب عقل انکار کر سکتا ہے؟ ان مقاصد کو کس طرح عمل میں لایا گیا اور اس کے کتنے شان دار نتائج پیدا ہوئے اور ہر ہر جنگ کے موقعے پر اعلیٰ اخلاقی قدروں کی کتنی محافظت کی گئی، ان تمام باتوں کا ذکر اپنے اپنے مواقع پر آئے گا۔

اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ کرنے کے لیے کرز بن جابر فہری نے مدینے کی چراگاہ پر حملہ کیا اور کچھ مویشی لوٹ کر لے گیا۔ یہ اقدام اہل اسلام کے لیے یقیناً ایک انتباہ (Warning) کی حیثیت رکھتا تھا جس کے بعد ہی اجازت قتال کی یہ آیت نازل ہوئی۔

کرز بن جابر فہری کا یہ حملہ ایک اعلان تھا قریش مکہ کی جنگی تیاریوں کا۔ اس لیے حضورؐ نے حفظ ماتقدم کے طور پر آس پاس کے مختلف مقامات پر فوجی نقل و حرکت فرمائی۔ اس نقل و حرکت کا مقصد کوئی جنگ نہ تھا بلکہ:

۱۔ اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ آس پاس کی مختلف آبادیوں سے یہ خطرہ تھا کہ کہیں یہ قریش کا جنگ میں ساتھ نہ دیں اس لیے ان پر یہ اثر ڈالنا تھا کہ وہ اہل اسلام کو غافل نہ سمجھ لیں۔ بلکہ خود قریش کو بھی بتانا تھا کہ مسلمان جوابی کارروائیوں کے لیے دم خم رکھتے ہیں۔

۲۔ ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ جن قبائل سے اب تک کوئی معاہدہ نہ ہوا تھا ان سے معاہدہ ہو جائے۔ اور اگر معاہدہ ہو چکا ہو تو اس کی تجدید و توثیق ہو جائے اور وہ کسی دھوکے میں آکر قریش کا ساتھ نہ دیں۔

۳۔ ایک اور مقصد یہ تھا کہ جہاں دشمنوں کی کچھ سازشی کارروائیوں کا علم ہوا وہاں حالات کا جائزہ لینے کے لیے کوئی فوجی دستہ پہنچ گیا۔

۴۔ اور سب سے بڑا مقصد جو کسی آن حضورؐ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتا تھا یہ تھا کہ شاید کوئی بندہ خدا دعوت اسلام پر لبیک کہنے والا مل جائے۔

یہ تمام مقاصد نقل و حرکت سیاسی' فوجی اور دینی نقطہ نگاہ سے اتنے اہم ہیں کہ ان کو پیش نظر رکھے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس سے حضورؐ کے بین الاقوامی زاویہ نظر' بیدار مغزی' جزرسی اور چوکسی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

حضورؐ نے ماہ صفر میں ودان یا ابوا کا سفر فرمایا۔ یہ پہلا فوجی دستہ تھا جو حضورؐ کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس میں سیدنا حمزہؓ بھی علم لیے ہوئے تھے۔ یہ سفید جھنڈا تھا اور اسلام میں پہلا جھنڈا تیار کیا گیا تھا۔ پھر ماہ ربیع الاول میں ایک دستہ بواط کی طرف بھیجا۔ پھر ماہ ربیع الثانی میں مقام عشیرہ (یا عسیرہ) کی طرف تشریف لے گئے۔ پھر ایک دستہ سیف البحر کی طرف روانہ فرمایا۔ نیز ایک دستہ سیتہ المرار کی طرف اور دوسرا جمادی الاخریٰ میں نخلہ کی طرف روانہ کیا۔

چند قابل غور باتیں

آگے چلنے سے پہلے یہاں چند حقائق کی پردہ کشائی ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اب مدنی زندگی میں باقاعدہ ریاست و حکومت کا انداز پیدا ہو گیا تھا' اسی لیے آپ دیکھیں گے:

ا۔ یہاں جو معاہدے ہوئے وہ محض قبائلی قسم کے نہ تھے بلکہ بین الاقوامی انداز کے تھے۔

۲۔ پھر خطرات کے پیش نظر تجدید معاہدہ بھی ہو رہی ہے۔

۳۔ جہاں جہاں بھی قریش کی آمد یا تیاریوں یا سازشوں کا پتا چلتا ہے وہاں ایک دستہ روانہ کیا جاتا ہے' اور پھر یہ دستہ محض تبلیغی انداز کا نہیں بلکہ فوجی رنگ کا ہے۔

۴۔ جب حضورؐ باہر کسی دستے کے ساتھ جاتے ہیں تو ایک نہ ایک کو مدینے میں اپنا جانشین بنا کر جاتے تھے۔ چنانچہ بواط جاتے ہوئے مدینے کا عامل سائب بن عثمان بن مظعون کو (بروایت ابن ہشام) یا سعد بن معاذ کو (بروایت واقدی) بنا جاتے ہیں۔ عشیرہ (یا عسیرہ) کی طرف رخ کرتے ہوئے ابو سلمہ بن عبدالاسد کو مدینے کا عامل بناتے ہیں۔ جب کرز بن جابر فہری کے تعاقب میں وادی سفوان تک تشریف لے گئے تو زید بن حارثہ کو مدینے کا عامل مقرر فرمایا۔ وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ ہر دستے کے ساتھ ایک رایت (جھنڈا) بھی ہوتا ہے۔

غرض سارے انداز ریاست کے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کسی مرحلے پر بھی رئیسانہ شان و شوکت کا اظہار نہیں ہوتا۔

ان دستوں کو بعض جگہ قریشی جمگھٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن کسی جگہ کوئی جنگ نہیں لڑنی پڑی۔ صرف ایک موقع ایسا ہے جس میں پہلا قتال واقع ہوا۔ اس کا مختصر واقعہ یوں ہے:

حضورؐ نے عبداللہ بن جحش بن رئاب اسدی کو سات آٹھ مہاجرین کا امیر بنا کر بھیجا تاکہ قریشی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔ یہ اسلام میں پہلے شخص ہیں جن کو حضورؐ نے امیر بنایا۔ ورنہ اس سے پہلے کسی کو امیر نہیں بنایا گیا تھا۔ امارت ہوتی ہی ہے نظام ریاست قائم ہونے کے بعد۔ اس سے پہلے بہت لوگوں

کو حضورؐ نے قائدہ، رئیس، مبلغ، معلم، نقیب وغیرہ تو بنا کر وفود بھیجے ہیں لیکن "امیر" کا لقب کبھی کسی کو نہیں دیا گیا۔ خدا جانے یہ کب سے رواج ہو گیا کہ بے طاقت انجمنوں کے صدر کو امیر کہا جانے لگا۔ بہر کیف حضرت عبداللہ بن جحش مقام نخلہ میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں ایک قریشی قافلے کا سامنا ہوا۔ صحابہ نے باہم مشورہ کیا اور نتیجے میں حملہ کر دیا۔ واقد بن عبداللہ تمیمی کے تیر سے عمرو بن حضرمی قتل ہو گیا۔ دو شخصوں (عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان) کو اسیر کر لیا۔ عبداللہ بن جحش جب مال غنیمت اور دونوں قیدیوں کو لے کر حضورؐ کی خدمت میں آئے تو حضورؐ نے فرمایا کہ: "میں نے تمھیں ماہ حرام میں قتال کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔" یہ اتفاق تھا کہ اس واقعے کے دن رجب کی آخری رات تھی جس کے بعد شعبان شروع ہو جاتا ہے۔ رجب ماہ حرام ہے اور شعبان ماہ حلال۔ حضورؐ کے اس ارشاد سے عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کو شدید ندامت اور کوفت ہوئی اور خود مسلمانوں نے بھی ان کو بہت طعنے دیے اور قریش نے بھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عبداللہ بن جحش نے یہ اقدام اس لیے کیا تھا کہ ان کے خیال میں ماہ حرام رجب کا مہینہ ختم ہو چکا تھا، لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے بعد قریش نے اپنے دونوں اسیروں کی رہائی کے لیے فدیہ روانہ کیا۔ حضورؐ نے عمرو بن حضرمی کا تو خون بہا ادا فرمایا (اس کی تفصیل آگے آئے گی) اور دونوں اسیروں کو فدیہ لے کر رہا کرنے کی بجائے یہ فرمایا کہ ہمارے دو آدمی ——— سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان ——— جو مکے گئے ہوئے ہیں واپس آجائیں تو اپنے دونوں قیدیوں (عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان) کو واپس لے جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بعد میں حکم بن کیسان ایمان لے آئے اور حضورؐ ہی کے ساتھ رہے تاآنکہ بیر معونہ میں شہید ہوئے اور عثمان بن عبداللہ بحالت کفر مرا ——— کہا جاتا ہے کہ یہی واقعہ غزوہ بدر کی بنیاد بن گیا تھا۔

لمحہ فکریہ

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ اہل اسلام اور اہل کفر کے درمیان یہ پہلی جھڑپ تھی اور عمرو بن حضرمی پہلا مقتول ہے جو مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا اور عثمان بن عبداللہ و حکم بن کیسان وہ پہلے اسیر ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ چند حمار پہلا مال غنیمت ہے جو مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور یہی واقعہ غزوہ بدر کی بنیاد بنا۔ اب قدرتاً" آغاز جنگ کا الزام مسلمانوں ہی پر آتا ہے' اور ظاہر ہے کہ بمصداق البادی اظلم (ابتدا کرنے والا زیادہ ظالم ہے) مسلمان ہی قصور وار ٹھہرتے ہیں۔

دوسرا الزام یہ آتا ہے کہ مسلمانوں نے ماہ حرام کی حرمت کیوں نہ قائم رکھی جب کہ پورا عرب اس کا احترام کر رہا تھا۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ:

ا۔ آغاز جنگ کا الزام دراصل کفار قریش پر عائد ہوتا ہے جنھوں نے کرز بن جابر فہری کو بھیجا اور اس نے مدینے کی بیرونی چراگاہ پر حملہ کیا اور مویشی بھگا کر لے گیا۔ اگر مسلمانوں کو موقع ملتا تو یہیں ایک جھڑپ ہو جاتی اور وہ اسے مارتے یا اسیر کر لیتے۔ غزوہ بدر کا اصلی محرک یہی ہوا تھا نہ کہ ابن حضرمی کا قتل۔ یہی وجہ ہے کہ کرز بن جابر کے اس واقعے کا نام بدر اولیٰ (پہلا غزوہ بدر) ہے۔

۲۔ حضورؐ نے عبداللہ بن جحش کے اس اقدام کو خود ہی ناپسند کرتے ہوئے فرمایا کہ: "میں نے تمھیں ماہ حرام میں کسی قتال کی اجازت نہیں دی تھی۔ کسی امتی کی ذاتی غلطی سے حضورؐ پر یا اسلامی اصول پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ حضرت خالد بن ولید نے بھی ایک شخص کو محض اس گمان پر قتل کر دیا

تھا کہ یہ محض خوف سے منافقانہ اسلام لایا ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا کہ اس کا اسلام درست نہیں؟ پھر بار بار ہاتھ اٹھا کر فرمایا کہ خداوندا خالد نے جو کچھ بھی کیا ہے میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ ایسی غلطیاں اور بھی بعض لوگوں سے ہوئیں لیکن حضورؐ نے اسے کبھی پسند نہیں فرمایا۔

۳۔ پھر یہ کتنی بڑی بات ہے کہ حسب دستور حضورؐ نے اس مقتول (عمرو بن حضرمی) کا خون بہا دینا منظور فرما لیا۔ اگر حضورؐ اسے آغاز جنگ قرار دیتے یا اسے پسند فرماتے تو خون بہا دینے کا سوال ہی کب پیدا ہوتا تھا؟ خون بہا تو حالت امن میں ادا کیا جاتا ہے نہ کہ حالت جنگ میں۔

۴۔ پھر ایک حقیقت اور بھی فراموش نہ کرنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اہل مکہ کے سیزدہ سالہ مظالم کے مقابلے میں اس معمولی سی غلطی کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟ وہاں تو کئی قتل بھی ہوئے۔ یاسر اور ان کی بیوی سمیہ بڑے درد ناک طریقے سے شہید کیے گئے' جن کا کوئی خون بہا بھی ادا نہ کیا گیا۔ اسی حقیقت کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے جو دوسرے سوال کے جواب میں آگے مذکور ہوئی ہے۔

دوسرے سوال کا جواب جو ایک لحاظ سے پہلے سوال کا بھی جواب ہے یہ ہے کہ رجب یا کسی دوسرے ماہ حرام میں قتال کرنا عام رواج کے مطابق ممنوع تھا' لیکن اس کی ممانعت اسلام میں اس واقعے کے بعد ہوئی۔ اہل اسلام نے اس رواج کا ہمیشہ احترام کیا۔ آج یہ پہلی غلطی ہوئی جس پر حضورؐ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اس کے باوجود اگر اس رواجی قدر سے بے اعتنائی کا مقابلہ ان انسانی اقدار کی پامالی سے کیا جائے جو کفار قریش اب تک کرتے رہے تو یہ غلطی بہت ہی معمولی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن یوں بیان فرماتا ہے:

یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ ط قل قتال فیہ

كبير ط وصد عن سبيل الله و كفرم به والمسجد الحرام ق واخراج اهله منه اكبر عند الله ج و الفتنه اكبر من القتل (البقرہ: ۲۱۷)

لوگ آپ سے ماہ حرام میں جنگ کرنے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ ماہ حرام میں جنگ بڑا جرم ہے لیکن خدا کے انکار کے ساتھ دوسروں کو راہ خدا سے اور مسجد حرام سے روکنا اور وہاں کے بسنے والوں کو وہاں سے نکال باہر کرنا خدا کے نزدیک اس سے بھی بڑا جرم ہے' اور ان کو مسلسل آزمائشوں میں مبتلا رکھنا تو کسی کو قتل کر دینے سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔

ان حقائق کو دیکھنے کے بعد کون یہ تسلیم کرسکتا ہے کہ قریش کا اپنے تمام جرائم کو فراموش کر کے مسلمانوں کی ایک لغزش پر اعتراض کرنا حق بجانب ہو سکتا ہے؟ اور لغزش بھی ایسی جس کو حضورؐ نے خود پسند نہیں فرمایا اور اس کی تلافی بھی فرما دی۔

قافلہ ابوسفیان

واقعہ نخلہ یعنی قتل عمرو بن حضرمی کے دو ماہ کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک تجارتی قافلہ ابوسفیان (صخر بن حرب) کی سرکردگی میں شام سے مکے روانہ ہوا۔ قافلے میں تیس یا چالیس آدمی تھے اور ایک ہزار اونٹ زر و مال اور اسباب تجارت سے لدے ہوئے تھے۔ یہ سارا مال قریش کے مختلف افراد کا تھا۔ شام سے مکے جانے والے کو مدینے کے پاس ہی سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ اس لیے ابو سفیان کو قدرۃً یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں مدینے کے اہل اسلام اس مختصر سے قافلے پر حملہ کر کے جان و مال کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اس لیے ابو

سفیان نے ضمضم بن عمرو غفاری کو ایک تیز رفتار اونٹنی پر مکے بھیج دیا۔ اس نے مکے پہنچ کر زور دار دہائی دی کہ: "اے قریشیو! المدد' المدد' تمہارا مال و اسباب ابوسفیان کے قافلے کے ساتھ آرہا ہے' اور محمدؐ اور اصحاب محمدؐ درمیان میں حائل ہونے والے ہیں۔"

ادھر حضورؐ کو بھی اس قافلہ تجارت کی اطلاع ملی اور صحابہ میں چہ می گوئیاں شروع ہوگئیں۔ اکثروں نے خواہش ظاہر کی کہ یہ موقع اچھا ہے۔ افراد قافلہ کم ہیں اور مال و اسباب بے شمار ہیں۔ ایک جھڑپ میں فیصلہ ہو سکتا ہے۔

لمحہ فکریہ

ابن اسحاق نے عبداللہ بن عباس کی زبانی لکھا ہے کہ جب حضورؐ کو اس قافلہ تجارت کی اطلاع ملی تو حضورؐ نے فرمایا:

> هذه غير قريش فيها اموالهم فاخرجوا اليها لعل الله ينفلكموها۔
>
> دیکھو یہ قریش کا قافلہ مال سے لدا جا رہا ہے۔ تم ادھر جاؤ' شاید اللہ تمھیں یہ مال غنیمت دلوا دے۔

گویا نعوذ باللہ خود حضورؐ کی خواہش تھی کہ یہ قافلہ بغیر کسی اعلان جنگ کے لوٹ لیا جائے اور اس طرح پچھلے مظالم کا انتقام لیا جائے۔ ایسی ادنیٰ خواہش اس رسول کے دل میں کب پیدا ہو سکتی ہے جس کی بعثت کا مقصد ہی اعلیٰ اقدار کا قیام اور مکارم اخلاق کی تخلیق ہو؟ اور جس کے اعلیٰ اخلاق کی شہادت انک لعلٰی خلق عظیم کا خداوندی ارشاد دے رہا ہو۔ حضورؐ تو ایسے پست جذبات کو ختم کرنے آئے تھے نہ کہ انھیں باقی رکھنے کے لیے۔

بلاشبہ بعض صحابہ کے دل میں اس خیال کا آنا ایک بشری تقاضا تھا کیوں کہ:

۱۔ تیرہ سال تک ان ہی کفار قریش کے ہاتھوں مسلمان شدید ایذائیں جھیلتے رہے۔ حتی کہ گھربار چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی۔

۲۔ کفار مکہ نے مدینے کے یہود سے مراسلت کر کے مسلمانوں کے خلاف ان کو ابھارا تھا۔

۳۔ کرز بن جابر فہری نے دن دہاڑے مدینے کی چراگاہ پر ڈاکہ ڈالا اور بہت سے مویشی چرا لے گیا تھا۔ گویا یہ بتایا گیا تھا کہ مکے سے تین سو میل کے فاصلے پر بھی مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے۔

۴۔ مسلمانوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس قافلے کی واپسی کے بعد قریش مدینے پر حملہ کریں گے۔

۵۔ قافلے میں صرف چالیس آدمی ہیں جن کو ایک ہی حملے میں صاف کیا جاسکتا ہے۔ اور ابو سفیان جو تمام مخالفوں کا ہیرو ہے' اسی قافلے میں ہے۔ قافلہ مال و اسباب سے لدا ہوا ہے۔ یہی ابو سفیان اور اس کے ساتھی اسی مال و اسباب کے سہارے کمر کس کے چند دنوں بعد ہمارے خلاف آئیں گے۔ اس لیے اگر اس کو یہیں ختم کر دیا جائے تو نہ فقط مال و اسباب ہی ہاتھ آئے گا بلکہ جذبہ انتقام بھی سرد ہو گا اور قریش کے حوصلے بھی پست ہو جائیں گے۔

غرض عام مسلمانوں کے دل میں اس قافلے کے لوٹنے کا اگر کوئی بجا جذبہ پیدا ہوا ہو تو اس پر کوئی تعجب نہیں لیکن یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ خود حضورؐ بھی یہی جذبہ رکھتے تھے۔ یہ قافلہ رمضان میں آرہا تھا اور اس سے پہلے کرز بن جابر فہری کے چھاپے کے بعد حضورؐ نے مختلف دستے مختلف جگہ روانہ فرما دیے تھے۔ مثلاً ماہ صفر میں ودان اور ابوا تک۔ ربیع الاول میں بواط کی طرف' ربیع الثانی میں عسیرہ (یا عشیرہ یا ذی العشیرہ) سیف البحر اور ثنیتہ المرار کی طرف اور جمادی الاخریٰ میں نخلہ کی طرف فوجی دستے روانہ فرمائے مگر ان میں سے کوئی دستہ بھی مشورے کے بعد روانہ نہیں کیا گیا بلکہ حضورؐ نے مارچ کا

حکم دیا' اور دستے روانہ ہوگئے۔ پھر سوچیے کہ صرف چالیس آدمیوں کے قافلہ تجارت کو لوٹنا مقصود ہوتا تو حضورؐ کو مشورے کی کیا ضرورت تھی؟ مسلمان پہلے ہی سے بھرے بیٹھے تھے اور خواہش مند تھے۔ ذرا سا اشارہ کافی تھا مگر حضورؐ حکم دینے کے بجائے مشورہ کرنے بیٹھتے ہیں اور صرف مشورہ ہی نہیں فرماتے بلکہ مشورے کے بعد طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید کو قافلہ ابوسفیان کی خبر لانے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ غور کیجیے کہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟ ایک سیرت نگار نے بھی اس پر غور نہیں کیا۔

اگر واقعی حضورؐ کی یہ مرضی ہوتی کہ مکے سے شام جانے والے تجارتی قافلوں کو روک کر لوٹ لیا جائے تو ہجرت کے بعد قریش کا ایک قافلہ بھی نہ بچ سکتا تھا اس لیے کہ مکے اور شام والی سڑک مدینے سے کچھ دور نہ تھی۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ صلح حدیبیہ (٦ھ) کے بعد جب ابو بصیر عتبہ بن اسید مکے سے بھاگ کر مدینے آگئے تو حضورؐ نے معاہدہ حدیبیہ کے مطابق ان کو واپس کر دیا اور یہ سمندر کے کنارے ذوالمرہ کے پاس مقام عیص میں جاکر مقیم ہوگئے اور مکے کے دوسرے مسلمان قیدی بھی رفتہ رفتہ بھاگ بھاگ کر ان کے پاس پہنچتے گئے اور ان سب نے قریش کے تجارتی قافلوں کا ایسا ناک میں دم کر دیا کہ قریش مکہ نے معاہدہ حدیبیہ کی اس دفعہ کو ختم کرنے کی درخواست کی جس کی رو سے بھاگے ہوئے مسلمانوں کو مدینے سے واپس کرنا ضروری تھا۔ تفصیلی ذکر آگے آئے گا) اگر مسلمان چاہتے تو اس سے پہلے ہی قریش کے تجارتی قافلوں کا ناطقہ بند کر دیتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی حضورؐ نے کبھی اجازت نہ دی۔ حضورؐ نہ تو بے مقصد جذبہ انتقام کی پرورش چاہتے تھے اور نہ لوٹ مار جیسے پست مقصد سے اعلیٰ اسلامی اقدار کو مجروح کرانا پسند فرماتے تھے۔ اس وقت حضورؐ کے سامنے دو چیزیں تھیں۔

ایک طرف مسلمانوں کی مارشل سپرٹ تھی جسے آگے چل کر اعلیٰ

اقدار کی محافظت کے لیے وقف ہونا تھا۔ اس سپرٹ کو دبا کر ختم کرنا کسی صاحب عقل کے نزدیک درست نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس دباؤ سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہو کر کوئی نامناسب رد عمل پیدا ہوتا۔

دوسری طرف یہ خطرہ تھا کہ اگر ان مسلمانوں کو مارچ کا حکم دے دیا جائے تو یہ کوئی اعلیٰ مقصد نہ ہوگا۔ محض جذبہ انتقام ہوگا' نیز اسلامی اقدار جنگ کے بھی خلاف ہوگا۔ یعنی دشمن حملہ آور نہیں ہوتا' مٹھی بھر بے طاقت جماعت ہے اور وہ بھی قافلہ تجارت کی شکل میں۔ یہ کوئی شجاعت نہیں کہ کسی کو کمزور پاکر دبا دیا جائے اور وہ بھی کسی اعلیٰ مقصد کے لیے نہیں بلکہ محض لوٹ مار کے لیے۔

غرض فوجی جذبے (مارشل سپرٹ) کو دبا کر جذبات کو مجروح کرنا یا مارچ کا حکم یا اجازت دینا دونوں نامناسب تھے۔ اس لیے حضورؐ نے ایک ایسی راہ اختیار فرمائی کہ یہ حملہ بھی نہ ہو اور مسلمانوں کے جذبات بھی مجروح نہ ہوں۔ یعنی مارشل سپرٹ کو آئندہ کے لیے محفوظ رکھا جائے' اور اس قافلہ تجارت سے مڈبھیڑ ہونے کا موقع ٹال دیا جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے اپنی عدیم النظیر بصیرت سے یہی کچھ کیا۔ وہ اس طرح کہ کچھ وقت مشورے میں صرف کیا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے جذبات حملے کے حق میں ہیں تو کچھ مزید وقت اس لیے لے لیا کہ مزید حالات معلوم کر لیے جائیں۔ پھر دو شخصوں (طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید) کو خبر لانے کے لیے بھیجا۔ اس جنگ کو ٹالنے کی یہ بڑی اعلیٰ درجے کی حکیمانہ تدبیر تھی۔ چنانچہ اسی مشورے ... تگ و دو میں ابوسفیان کو اتنا موقع مل گیا کہ وہ دریا کے کنارے کا راستہ اختیار ... کے صاف بچ نکلا۔ یہی مقصد تھا جسے حضورؐ نے ایسی خوب صورتی سے پورا فرمایا کہ مسلمانوں کو ایک پست مقصد یعنی تسکین انتقام اور غیر شجاعانہ جنگ اور لوٹ مار سے بھی بچا لیا' اور قوت قتال کو ایک دوسرے اہم موقع ———

بدر ــــــــ کے لیے بھی محفوظ کر لیا۔

ہمیں قرآن پاک سے بھی کچھ اسی قسم کا اشارہ ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

واذ یعد کم اللّٰہ احدی الطائفتین انھا لکم و تودون ان غیر ذات الشوکہ تکون لکم و یرید اللّٰہ ان یحق الحق بکلماتہ ویقطع دابر الکفرین ○ (الانفال: ۷)

اور وہ وقت یاد کرو جب اللہ تم سے ان دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمھارے لیے مقدر ہے اور تم یہ چاہتے تھے کہ کمزور ہی جماعت ہمارے لیے ہو۔ حالاں کہ اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق ثابت کر کے ان کی جڑیں کاٹ دے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے وعدہ فرمایا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک پر مسلمانوں کو قابو حاصل ہو گا۔ ایک طاقت ور گروہ تھا اور دوسرا کمزور۔ اس کی تفسیر اب تک یہی کی جاتی ہے کہ ایک معرکہ بدر تھا اور دوسرا یہ تجارتی قافلہ۔ اور اس تفسیر کے علاوہ کوئی دوسری تفسیر ہمارے سامنے نہیں آئی۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کی فطری خواہش یہی تھی کہ کمزور گروہ (قافلہ تجارت) ہی ان کے قبضے میں آجائے کیوں کہ مقابلہ بھی آسان تھا اور مال غنیمت کی فراوانی بھی تھی۔ لیکن اللہ کی ــــــــ اور اللہ کے رسولؐ کی بھی ــــــــ خواہش یہ تھی کہ قافلہ تجارت کی بجائے اس گروہ کا مقابلہ ہو (یعنی محاربین بدر کا) جس کے بعد باطل و کفر کا زور ٹوٹ جائے۔ یہ کہنا کہ رسول اللہ کی بھی وہی خواہش تھی جو عام مسلمانوں کی تھی' یا خود رسولؐ اللہ ہی نے مسلمانوں کو قافلہ تجارت لوٹنے پر ابھارا تھا' ہمارے خیال میں روح قرآنی' سیرت رسول اور مقاصد اسلامیہ کے مطابق نہیں ہے۔

بہرکیف ادھر حضورؐ نے دو آدمیوں طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید کو اس تجارتی قافلے کی خبر لانے کو بھیجا اور ادھر ابوسفیان نے مکے جانے کے لیے معروف راستے کو ترک کر کے سمندر کے کنارے کنارے جانے والا راستہ اختیار کیا اور پورا قافلہ صحیح سلامت مکے پہنچ گیا۔ جب قافلہ مکے پہنچا تو معلوم ہوا کہ ضمضم بن عمرو غفاری کی فریاد پر قریشی کمک روانہ ہو چکی ہے۔ بعد میں ابن اسحاق کی روایت کے مطابق ابوسفیان نے اس کمک کو پیغام بھیجا کہ جس قافلہ تجارت کی حمایت و حفاظت کے لیے تم جا رہے تھے وہ صحیح سلامت واپس آگیا ہے۔ اس لیے اب خواہ مخواہ جنگ کے لیے نکلنے کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن ابوجہل بن ہشام نے کہا کہ بدر کے سالانہ میلے کی شرکت تو ضرور کرنی چاہیے تاکہ ہم اپنی جمعیت اور شان و شوکت سے سارے عرب کو مرعوب کر دیں۔ مگر بنی عدی اور بنی زہرہ کے تمام افراد ابوسفیان کی رائے پر عمل کرتے ہوئے واپس آگئے۔

ادھر حضورؐ کو بھی قریش کی روانگی کی اطلاع ملی' لہٰذا ۱۲ رمضان ۲ھ کو حضورؐ تین سو تیرہ آدمیوں کو لے کر روانہ ہو گئے۔ ان میں ساٹھ یا ستر سے کچھ زیادہ مہاجرین تھے اور باقی انصار۔ روانگی کے وقت عبداللہ بن ام مکتوم کو امام نماز مقرر فرمایا۔ بعد میں مقام روحا سے ابولبابہ کو مدینے کا عامل بنا کر واپس بھیج دیا اور مدینے کے بالائی حصے کا نگراں عاصم بن عدی کو متعین فرمایا۔ اس وقت ایک سفید جھنڈا مصعب بن عمیر کے ہاتھ میں تھا۔ ایک سیاہ جھنڈا جس کا نام عقاب تھا حضرت علیؓ کے ہاتھ میں اور دوسرا سیاہ جھنڈا سعد بن معاذ یا حباب بن منذر کے ہاتھ میں تھا۔ گھوڑے صرف دو تھے اور زرہیں آٹھ۔ اور ہر تین آدمیوں کے درمیان ایک اونٹ کی سواری تھی جس پر باری باری دو آدمی سوار ہوتے تھے۔ حضورؐ کے ساتھیوں میں علیؓ اور ابولبابہؓ تھے۔ ان دونوں نے خواہش ظاہر کی کہ صرف حضورؐ سوار ہوں اور ہم دونوں پیدل چلیں گے۔

حضورؐ نے فرمایا:

ما انتما باقوی منی ولا انا باغنی عن الاجر منکما (رواہ احمد عن ابن مسعود)

تم دونوں مجھ سے زیادہ قوی نہیں اور میں تم دونوں سے اجر الٰہی کا کم محتاج نہیں۔

اللہ اللہ کیا بندگانہ انکسار' مساوات حقوق' مسکین نوازی اور فقیرانہ زندگی کی اس سے بہتر بھی کوئی مثال مل سکتی ہے؟ عام طور پر سرداران قوم جس انداز سے نکلتے ہیں وہ کوئی پوشیدہ چیز نہیں۔ لیکن سرور کونینؐ جن انسانی و اخلاقی اقدار کو قائم کرنے آئے تھے اس کا ہر ہر قدم پر مظاہرہ ہو رہا تھا۔

مقام دوحا سے جب ابولبابہ عامل مدینہ بنا کر واپس کیے گئے تو مرثد ابن ابی مرثد نے ان کی جگہ لے لی۔

جب حضورؐ مقام زفران پر پہنچے تو حضورؐ کو اطلاع ملی کہ فی الواقع قریش اپنے تجارتی قافلے کے لیے روانہ ہو چکے ہیں اور اب کچھ زیادہ دور نہیں۔ ابوجہل نے اگرچہ محض بدر کے میلے میں شرکت کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہاں سے فارغ ہو کر وہ مدینے پر حملہ نہ کر دے گا؟ مکے سے دو سو بیس میل چل کر جو لشکر بدر میں پہنچا ہو اور مدینہ صرف ساٹھ میل رہ گیا ہو وہاں عقل و سیاست کا ایک ہی تقاضا ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے مزید اقدام کو روک دیا جائے' ایسا کرنا عین مدافعت ہی کا تقاضا ہے۔ مدافعت کے یہ معنی نہیں کہ جب مسلح دشمن گھر میں گھس آئے اور تلوار چلانی شروع کر دے تب تم مدافعت کے لیے آٹھو۔

خطرہ اب سر پر آچکا تھا اس لیے لشکر قریش کی خبر سنتے ہی حضورؐ نے ے مشورہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے گویا مہاجرین کی نمائندگی کرتے ہوئے پوری امداد کا وعدہ کیا۔ مگر حضورؐ کو انصار کے جواب کا انتظار تھا

جو اس وقت مہاجرین سے سہ چند زیادہ تھے۔ حضورؐ کا یہ انتظار محسوس کر کے مقداد بن عمرو (یا مقداد بن اسود) بولے: "یا رسولؐ اللہ! ہم وہ بنی اسرائیل نہیں جنہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ: اذھب انت و ربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون (تم اور تمہارا خدا جا کر جنگ کرو۔ ہم یہیں سے بیٹھے تماشا دیکھیں گے)۔ بخدا اگر حضورؐ ہمیں برک غماد تک بھی لے جائیں تو ہم وہاں بھی جانے کو حاضر ہیں۔" سعد بن معاذ نے کہا کہ ہم حضورؐ کے ہاتھ پر سمع و طاعت کی بیعت کر چکے ہیں اور حضورؐ کی دعوت پر ایمان لا چکے ہیں۔ خدا کی قسم ہمیں اگر سمندر میں بھی کودنا پڑا تو ہم میں سے کوئی پیٹھ نہ دکھائے گا۔

حضورؐ یہ جواب سن کر خوش ہوئے اور جیش اسلامی روانہ ہو کر ایک مقام پر فروکش ہوئے۔ آج ماہ رمضان کی سترھویں تاریخ ہے اور جمعے کا دن تھا۔ یہ میدان بدر تھا جہاں بدر نبوت اپنے تین سو تیرہ ستاروں کے ساتھ خیمہ زن ہوا۔ یہاں مختلف ذرائع سے معلوم ہو گیا کہ لشکر قریش دوسری جانب یہیں پڑاؤ ڈال چکا ہے۔ ابن اسحق کی روایت کے مطابق اس قریشی لشکر میں تقریباً ایک ہزار نبرد آزما تھے جن میں چھ سو زرہ پوش اور دو سو گھوڑے تھے۔ نو دس اونٹ روزانہ ذبح کیے جاتے تھے۔

حضورؐ نے اس میدان میں ایک جگہ منتخب فرمائی تو ایک صحابی حباب بن منذر بن جموح نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! کیا یہ جگہ حضورؐ نے خدا کے حکم سے پسند فرمائی ہے جس میں کوئی ردوبدل نہ ہو سکے یا جنگی تدبیروں کے متعلق حضورؐ کی اپنی رائے ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ اپنی صواب دید ہے جنگی تدبیر کے مطابق۔ حباب نے عرض کیا کہ فلاں جگہ جو پانی سے قریب بھی ہے زیادہ موزوں ہے۔ وہاں کے نشیب میں ایک حوض بنا کر ہم نالی کے ذریعے سارا پانی کھینچ سکتے ہیں۔ حضورؐ نے حباب کی رائے کو مان لیا اور انھیں کی بتائی ہوئی رائے پر عمل فرماتے ہوئے جگہ بدل لی۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ سعد بن معاذ نے عرض کیا کہ: یا رسولؐ اللہ! ہم سب حضورؐ کے لیے ایک عریش (سائبان) نہ بنا دیں جس میں حضورؐ تشریف رکھیں؟ اس سے ہماری غرض یہ ہے کہ حضورؐ کے سامنے ہی ہم روانہ ہو کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ اگر اللہ نے فتح دی تو فبہا' اور اگر خدانخواستہ معاملہ کچھ اور ہوا تو حضورؐ کے لیے مدینے واپس تشریف لے جانا اس لیے ضروری ہو گا کہ وہاں کے مسلمانوں کو حضورؐ کی ذات ہم سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ اگر انھیں یہ علم ہوتا کہ حضورؐ کو جنگ پیش آئے گی تو وہ یقیناً حضورؐ کے ساتھ ہی چل پڑتے۔ سعد بن معاذ کے الفاظ یوں ہیں:

ولو ظنوا انک تلقی حربا ماتخلفوا عنک۔

اگر انھیں یہ گمان ہوتا کہ حضورؐ کو جنگ پیش آئے گی تو وہ مدینے میں نہ رہتے (بلکہ حضورؐ کے ساتھ ہی آجاتے)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی روانگی بدر جنگ کی غرض سے نہ تھی ورنہ سب کو اس کا علم ہو جاتا۔ یہ روانگی اسی قسم کی فوجی نقل و حرکت تھی جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ میدان بدر میں آنے کے بعد یہ صورت حال پیدا ہو گئی کہ اگر دشمنوں کو یہیں روک نہ دیا جاتا تو مدینے پر چڑھائی کا قوی اندیشہ تھا۔

قدرت کی طرف سے ایک امداد و انعام یہ ہوا کہ پانی برسنے سے گرد بیٹھ کر زمین خوش گوار ہو گئی اور مسلمانوں کے حوض بھی پانی سے بھر گئے۔ قرآن مجید میں اس کا خاص طور پر یوں ذکر ہے کہ:

ولقد نصرکم اللّٰہ ببدر وانتم اذلہ ج فاتقوا اللّٰہ
لعلکم تشکرون ○ اذ تقول للمؤمنین الن
یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلثہ الف من الملائکہ
منزلین ○ بلی لا ان تصبروا وتتقوا ویاتوکم من

فورھم ھذا یمدد کم ربکم بخمسه الف من الملائکه مسومین ○ وما جعله الله الا بشری لکم و لتطمئن قلوبکم به ط وما النصر الا من عند الله العزیز الحکیم ○ لیقطع طرفا من الذین کفروا اویکبتھم فینقلبوا خائبین ○ لیس لک من الامر شئی اویتوب علیھم اویعذ بھم فانھم ظلمون ○ (آل عمران: ۱۲۳۔ ۱۲۸)

اور یہ بات محقق ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو بدر میں منصور فرمایا حالاں کہ تم بے سروسامان تھے' سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم شکر گزار ہو۔ جب کہ آپ مسلمانوں سے فرما رہے تھے کہ کیا تم کو یہ امر کافی نہ ہوگا کہ تمہارا رب تمہاری امداد کرے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ جو اتارے جائیں گے۔ ہاں کیوں نہیں اگر مستقل رہو گے اور متقی رہو گے اور وہ لوگ تم پر ایک دم سے آپہنچیں گے تو تمہارا رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو ایک خاص وضع بنائے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد محض اس لیے کی کہ تمہارے لیے بشارت ہو تاکہ تمہارے دلوں کو قرار ہو جائے اور نصرت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے جو کہ زبردست ہے' حکیم ہے' تاکہ کفار میں سے ایک گروہ کو ہلاک کر دے یا ان کو ذلیل و خوار کر دے۔ پھر وہ ناکام لوٹ جائیں۔ آپ کو کوئی دخل نہیں یہاں تک کہ خدا تعالیٰ ان پر یا تو متوجہ ہو جائے یا ان کو کوئی سزا دے دے کیوں کہ وہ ظلم بھی بڑا کر رہے ہیں۔

ادھر قریش نے عمیر بن وہب کو لشکر اسلامی کا اندازہ کرنے بھیجا۔ عمیر نے آکر بتایا کہ: "مسلمان کم و بیش تین سو ہیں جن میں سے کوئی بھی کم از کم ایک دشمن کو مارے بغیر خود نہیں مرے گا۔ اس طرح اگر ہمارے تین سو آدمی مارے گئے تو ہماری زندگیاں بے مزہ ہو جائیں گی۔" یہ سن کر حکیم بن حزام سیدھا عتبہ بن ربیعہ کے پاس مشورے کے لیے گیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ محض ایک شخص عمرو بن الحضرمی کے خون کا بدلہ لینے کے لیے کوئی بڑی خون ریزی مناسب نہیں۔ بہتر ہے کہ اس کا خون بہا ادا کر دیا جائے اور سب لوگ یہاں سے واپس چلے جائیں۔ (اگر اہل اسلام خون بہا نہ دیں تو) یہ خون بہا اور دوسرے مالی نقصانات کی طرح میں (عتبہ) ادا کر دوں گا۔ کیوں کہ میں ابن حضرمی کا حلیف ہوں۔ ابوجہل نے طنزاً کہا کہ عتبہ کا فرزند چوں کہ مسلمانوں کے لشکر میں ہے اس لیے یہ جنگ سے کتراتا ہے۔ اس کے بعد ابوجہل نے عامر بن حضرمی کو اکسایا اور اس نے اپنے مقتول بھائی عمرو بن الحضرمی کی دہائی دینی شروع کی۔ اس دہائی پر عرب کے دستور کے مطابق سب سربکف ہو کر میدان میں آگئے اور عتبہ کو بھی تیار ہونا پڑا۔

ادھر حضورؐ نے خود لشکر اسلامی کی صف بندی فرمائی۔ حضورؐ ایک چھڑی کے اشارے سے صف بندی فرما رہے تھے۔ اتفاق سے سواد بن غزیہ (بنی عدی بن نجار کے حلیف) صف سے ذرا آگے ہوگئے۔ حضورؐ نے ان کے پیٹ میں چھڑی کی نوک لگا کر پیچھے کیا۔ اس پر سواد بولے کہ مجھے آپؐ نے تکلیف پہنچائی۔ آپؐ کو اگر خدا نے حق اور عدل کے لیے بھیجا ہے تو مجھے بدلہ لینے کی اجازت دیجیے۔" اس وقت سواد کے جسم پر کوئی کرتا نہ تھا اس لیے حضورؐ نے اپنا شکم مبارک کھول کر سواد سے فرمایا کہ لو اپنا بدلہ لے لو۔" اللہ اللہ! آج سے پہلے آسمان کی آنکھوں نے نہ سواد بن غزیہ جیسا "بے باک" امتی دیکھا تھا اور نہ محمدؐ جیسا عادل انسان۔ صحابہ نے بھی یہ عجیب و غریب منظر کبھی نہ دیکھا

ہوگا کہ سید الانبیا اپنے ایک ادنیٰ امتی کے سامنے اپنی مطہر و مقدس ذات کو بدلہ لینے کے لیے پیش کر رہا ہے۔ جان نثاروں کی آنکھوں میں کس طرح خون اتر رہا ہوگا' اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ بہت ممکن تھا کہ کسی صحابی کی تلوار حرکت میں آجاتی اور میدان بدر میں پہلی لاش اسود ہی کی خاک و خون میں غلطاں نظر آتی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سارے واقعات چٹ پٹ ہی ہوگئے۔ اور صحابہ کے عالم تحیر نے کسی اقدام کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے چشم کائنات نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ ادھر حضورؐ نے اپنے نورانی شکم سے کرتا ہٹایا اور ادھر اسود دوڑ کر حضورؐ سے لپٹ گیا اور شکم مبارک کو بار بار بوسے دینے لگا۔ پھر عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! جنگ سر پر ہے اس لیے میری تمنا تھی کہ زندگی کی آخری سعادت اس طرح حاصل کروں کہ حضورؐ کے بدن سے میرا بدن مس ہو جائے۔" حضورؐ نے اس کے بعد سواد کے لیے دعائے خیر فرمائی۔ اے سواد! تو کتنا خوش بخت ہے اور کتنی مبارک ہیں تیری یہ حیلہ سازیاں۔

صف بندی کے بعد حضورؐ اپنے عریش میں واپس تشریف لے آئے۔ حفاظت کے لیے صرف سیدنا ابوبکرؓ تلوار لیے کھڑے رہے۔ اس دن (۱۶ رمضان ۲ھ) شب کے وقت حضورؐ نے اپنے رب سے راز و نیاز کی باتیں شروع کیں۔ یہ ایک دعا تھی جو زبان رسالتؐ سے کمال عاجزی اور کمال ناز کے ساتھ نکل رہی تھی۔ دعا کے یہ چند الفاظ ہی تھے جو سارے کائناتی قوتوں کو اپنی طرف سمیٹ رہے تھے۔ الفاظ یہ تھے:

اللھم ان تھلک ھذہ العصابہ لا تعبد بعدعھا فی الارض۔ اللھم انجزلی ماوعدتنی' اللھم نصرک۔

بارالہا! اگر تو نے اس جماعت مومنین کو ہلاک کر دیا تو اس کے بعد اس زمین پر تیری بندگی کبھی نہ ہوگی۔ خداوندا

جو وعدہ تو نے مجھ سے کیا ہے اسے پورا فرما۔ الٰہی تیری مدد درکار ہے۔

دعا کے وقت حضورؐ پر گریہ و زاری اور بے خودی کا عالم طاری تھا۔ باربار دوش مبارک سے چادر سرک جاتی اور حضرت ابوبکرؓ اسے اٹھا کر پھر دوش پر رکھ دیتے۔ حضورؐ کا اضطراب اور گریہ و تضرع جناب ابوبکرؓ سے دیکھا نہ جاتا تھا' اس لیے بار بار عرض کرتے کہ "یا رسولؐ اللہ! اب بس کیجیے۔ اپنے آپؐ کو اتنا ہلکان نہ کیجیے۔ اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ مدد ضرور پورا کر کے رہے گا۔" آخر خدائی وعدہ صریح لفظوں میں یوں نازل ہوا:

سیھزم الجمع ویولون الدبر ○ (القمر: ۴۵)

یہ دشمن شکست کھا کر بھاگیں گے۔

✻ ✻ ✻

(۹)

حق و باطل کا پہلا معرکہ

آج ۱۷ رمضان ۲ھ کی صبح ہے اور حق و باطل کا پہلا معرکہ میدان بدر میں شروع ہو رہا ہے۔ حضورؐ نے عین اس موقع پر انسانی اقدار کو ملحوظ رکھا اور حکم دیا کہ آغاز مسلمانوں کی طرف سے نہ ہو۔ صفیں دونوں طرف آراستہ ہوگئیں تو سب سے پہلے اسود بن عبدالاسد مخزومی یہ قسم کھا کر نکلا کہ: ”میں مسلمانوں کے حوض سے پانی پیوں گا یا اسے ڈھا دوں گا ورنہ پھر جان دے دوں گا۔“ جب یہ آگے حوض کی طرف بڑھا تو سیدنا حمزہؓ نے اس کی طرف لپک کر اس کے پاؤں پر زخم لگایا۔ وہ پیٹھ کے بل گرا مگر فوراً اٹھ کر تیزی سے حوض کی طرف گھسٹتا ہوا لپکا مگر حضرت حمزہؓ نے عین حوض کے کنارے ہی پر اس کا کام تمام کر دیا۔

اس کے بعد عتبہ بن ربیعہ اپنے دونوں بھائیوں ——— شیبہ اور ولید ——— کو لے کر میدان میں نکلا اور دعوت مبارزت دی۔ ان کے مقابلے کے لیے تین انصاری ——— معاذ بن حارث اور عوف بن حارث اور عبداللہ بن رواحہ ——— نکلے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ یہ مقابلے میں آنے والے انصار ہیں تو انھوں نے متکبرانہ انداز سے کہا کہ: ”تم ہمارے جوڑ کے نہیں ہو۔ ہماری قوم (قریش) کے آدمیوں کو بھیجو۔“ اس پر حضورؐ نے عبیدہؓ بن حارث، حمزہؓ بن عتبہ کو اور علیؓ بن ابی طالب کو بھیجا۔ تھوڑے سے مقابلے

کے بعد حمزہؓ نے عتبہ کو اور علیؓ نے ولید کو ڈھیر کر دیا۔ عبیدہؓ کو شیبہ نے زخمی کر دیا مگر حمزہؓ یا علیؓ نے لپک کر ایک ہی وار سے شیبہ کو ختم کر دیا۔ عبیدہؓ اپنے زخم سے جاں بر نہ ہو سکے۔ غزوہ بدر کے کئی دنوں کے بعد آپ نے وفات پائی۔ آخری وقت میں آپ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ "میں درجہ شہادت سے محروم تو نہیں رہا؟" حضورؐ نے فرمایا کہ تم شہید ہو۔

پھر عبیدہ بن سعید بن عاص دشمنوں کی صف سے نکلا۔ یہ لوہے میں غرق تھا۔ مقابلے کے لیے زبیر بن عوام آگے بڑھے مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس پر کس طرف سے وار کیا جائے۔ کیوں کہ کوئی جگہ آہن پوشی سے خالی نہ تھی۔ حضرت زبیر کو اس کے خود میں سے آنکھیں نظر آئیں اور یہی جگہ لوہے سے خالی نظر آئی۔ آپ نے ایسی ہوشیاری اور چابک دستی سے برچھی ماری کہ آنکھ کو چھیدتی ہوئی اندر گھس گئی اور عبیدہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ برچھی کو باہر نکالنے کے لیے آپ کو اس کے سر پر پاؤں رکھ کر زور سے کھینچنا پڑا۔ یہ برچھی حضورؐ نے زبیرؓ سے مانگ لی تھی جو یکے بعد دیگرے خلفائے راشدین کے پاس بھی رہی اور پھر عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس واپس آ گئی۔

عبیدہ بن سعید کے مارے جانے کے بعد گھمسان قسم کے حملے شروع ہو گئے' اس لیے اس کی صحیح ترتیب نہیں بیان کی جا سکتی تاہم جستہ جستہ واقعات محفوظ ہیں۔

یہاں ایک چیز پیش نظر رکھنی چاہیے کہ دشمنوں کی صف میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کئی وجوہ سے جنگ کرنا نہیں چاہتے تھے اور وہ محض اوپر کے دل سے مجبوراً" شریک ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے تھے جو دل سے حضورؐ کی صداقت کے قائل تھے لیکن اظہار کا موقع نہ پا رہے تھے۔ بعض وہ تھے جو اپنی قومی ہاشمی عصبیت کی وجہ سے حضورؐ کا مقابلہ نہ کرنا چاہتے تھے مثلاً عباس' عقیل' نوفل وغیرہ۔ اور چند ایسے بھی تھے جو کفر کے باوجود شرافت نفس کا جوہر

اپنے اندر رکھتے تھے۔ ان ہی میں ابوالبختری بن ہشام بھی تھا۔ یہ وہی شریف انسان تھا جس نے شعب ابی طالب کا ظالمانہ محاصرہ و مقاطعہ ختم کرنے میں ابوجہل کی کوئی پروانہ کی اور ایک مسلح جماعت کے ساتھ جاکر سارے بنی ہاشم کو اس گھاٹی سے باہر لے آیا۔ حضورؐ نے ایسے تمام افراد کی نشان دہی فرما دی تھی جو محض اوپر کے دل سے شریک جنگ تھے اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا تھا کہ ان میں سے جو ملے اسے قتل نہ کرنا کیوں کہ یہ جبراً" لائے گئے ہیں۔

مگر ہوا یہ کہ مجذر بن زیاد انصاری سے دوران جنگ میں ابوالبختری کی ملاقات ہوئی تو مجذر نے کہا کہ حضورؐ نے تیرے قتل سے منع کیا ہے' اس لیے تجھے زندہ گرفتار کروں گا ورنہ مقابلے سے ہٹ جاؤ۔ ابوالبختری نے کہا کہ اگر مجھے چھوڑتے ہو تو میرے ساتھی (جنادہ بن ملیحہ لیثی) کو بھی چھوڑ دو۔ مجذر نے کہا کہ حضورؐ نے صرف تیرے ہی بارے میں قتل سے باز رہنے کا حکم دیا ہے نہ کہ تیرے ساتھی کے بارے میں۔ ابوالبختری نے کہا کہ پھر میں بھی لڑ کر مروں گا کیوں کہ میں قریش کی عورتوں کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ ابوالبختری اپنے ساتھی کو چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ گیا۔ اس کے بعد دونوں میں جنگ ہوئی اور ابوالبختری مارا گیا۔ پھر مجذر نے آکر حضورؐ سے سارا قصہ بیان کیا۔

ایک دوسرا واقعہ امیہ بن خلف کے قتل کا ہے۔ اس سے عبدالرحمن بن عوف کا بھی معاہدہ ہوا تھا کہ وہ مکے میں ان کی اور یہ مدینے میں اس کی حفاظت کریں گے۔ بدر کے معرکے میں امیہ بھی آیا ہوا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ میدان جنگ میں ان عہود کی کہیں پابندی نہیں کی جاتی خصوصاً" اس صورت میں کہ معاہدہ قومی نہ ہو بلکہ محض انفرادی ہو۔ لیکن حضورؐ اکرم کی بعثت کا مقصد اعلیٰ انسانی اقدار کو قائم کرنا تھا۔ اس لیے عبدالرحمٰنؓ خاموشی کے ساتھ اسے لے کر ایک پہاڑی پر چڑھ گئے تاکہ اس کی حفاظت کا عہد پورا کریں۔ اس

کا ایک فرزند بھی اس کے ساتھ تھا۔ کہیں حضرت بلالؓ نے اسے دیکھ لیا۔ اور انصار کو آواز دی' اور چند انصاری اس کے پیچھے لپکے۔ عبدالرحمٰن نے بہتیری کوشش کی مگر انصار نے ایک نہ سنی۔ پہلے اس کے فرزند کو قتل کیا۔ اس کے بعد امیہ کی طرف بڑھے تو عبدالرحمٰن اسے لٹا کر اس پر اوندھے گر گئے تاکہ کسی طرح ان کی جان بچا کر اپنا عہد پورا کریں۔ مگر انصار نے ان کے نیچے سے تلواریں داخل کر کے اسے قتل کر دیا۔ اس کش مکش میں خود عبدالرحمٰن کا ایک پاؤں بھی زخمی ہو گیا۔ امیہ مدینے میں نہ تھا جو عبدالرحمٰن پر اس کی حفاظت لازم ہوتی۔ نیز یہ معاہدہ صرف عبدالرحمٰن سے تھا انصار سے نہ تھا۔ اس کے باوجود عبدالرحمٰن نے آخر وقت تک اس کی جان بچانے کی کوشش کی۔ یہ ہیں وہ اخلاقی قدریں جن کی محافظت جنگ کے میدان میں بھی کی گئی۔ بلالؓ اسی امیہ بن خلف کے غلام تھے اور آزاد ہونے کے وقت تک اس نے بلالؓ پر ظلم و ستم کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اسی لیے بلالؓ نے انصار کو اس کا پتا نشان بتا دیا۔ اگر بلالؓ ایسا نہ کرتے تو حضرت عبدالرحمٰن اس بدترین دشمن اسلام کی جان بچا کر اپنا عہد پورا کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔

اس معرکہ بدر میں ابوجہل بھی مارا گیا۔ دو نوجوان ——— معاذ اور معوذ (بعض روایتوں میں ان کی جگہ معاذ بن عمرو بن جموح کا نام ہے' لیکن یہ صحیح نہیں۔) ——— اس معرکے میں شریک تھے۔ ان کے والد کا نام حارث اور ماں کا نام عفرا ہے۔ ان دونوں نے عبدالرحمٰن بن عوف سے ابوجہل کا پتا پوچھا اور کہا کہ یہ بدبخت حضورؐ کی شان میں گستاخی کرتا ہے اس لیے آج یا یہ نہیں ہو گا یا ہم نہیں ہوں گے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے جب اشارے سے بتایا کہ "وہ ہے ابوجہل" تو یہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور تھوڑی دیر میں ابوجہل خاک پر تھا۔ عکرمہ بن ابی جہل نے عقب سے حملہ کیا اور ایک وار میں معاذ کا بایاں بازو کٹ کر ایک تسمے کے سہارے لٹک گیا مگر معاذ اسی

حالت میں لڑتے رہے۔ پھر ان کو محسوس ہوا کہ یہ بازو قتال فی سبیل اللہ میں کچھ کام نہیں کر رہا بلکہ کچھ رکاوٹ سا بن رہا ہے۔ لہٰذا اسے اپنے پاؤں سے دبا کر الگ کر دیا۔

ان بڑے بڑے قریشی سورماؤں کے مارے جانے سے لشکر قریش میں تھڑولی اور مایوسی پیدا ہوگئی اور ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مسلمانوں نے یہ آثار دیکھے تو ان کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ پھر انھوں نے دشمنوں کو اسیر بھی کرنا شروع کیا۔

اسی دوران میں حضورؐ کے حکم سے عبداللہ بن مسعود ابوجہل کی لاش کی تلاش میں نکلے۔ دیکھا کہ ایک جگہ پڑا سسک رہا ہے۔ ابن مسعود نے تلوار کو اس کے سر پر رکھ کر اس کا سر کاٹنا چاہا تو وہ بولا: "او چرواہے یہ کیا حرکت ہے؟ آپؓ نے کہا آج تجھ جیسے دشمن کو خدا نے رسوا کیا ہے۔ اس کے بعد جب سر کاٹنے لگے تو اس نے کہا نہ میری گردن نیچے سے کاٹو (تاکہ اس کے بعد بھی سر ذرا بلند رہے)۔ جب ابن مسعود نے اس کا سر لاکر حضورؐ کے قدموں میں ڈالا تو حضورؐ نے فرمایا: یہ تھا اس امت کا فرعون۔

اس جنگ میں چھ مہاجر اور آٹھ انصار شہید ہوئے۔ دشمنوں میں تقریباً ستر آدمی مارے گئے اور اتنے ہی اسیر ہوئے۔ ان مقتولین میں گیارہ وہ تھے جو دارالندوہ میں حضورؐ کو قتل کرنے کی سازش میں شریک تھے۔ یہ چودہ تھے جن میں سے گیارہ بدر میں مارے گئے اور باقی بالآخر اسلام لے آئے۔

جنگی قیدیوں میں حضورؐ کے چچا عباس بن عبدالمطلب بھی تھے۔ حضورؐ کے عم زاد بھائی عقیل بن ابی طالب بھی تھے۔ حضورؐ کے داماد ابوالعاص بھی تھے۔ نوفل بھی تھے اور جادو بیان خطیب قریش سہیل بن عمرو بھی تھے۔ جب قیدیوں کا معاملہ مشورے کے لیے سامنے آیا تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ: ان سبھوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ عام صحابہ کی بھی یہی رائے تھی اس لیے

کہ یہ سارے قیدی گویا اپنے ہی بھائی بند تھے۔ نیز مسلمانوں کی کچھ معاشی ضرورتیں زر فدیہ سے پوری ہو سکتی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے یہ رائے دی کہ: یہ سب کفر کے لیڈر ہیں اس لیے ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ حضورؐ نے عام رجحان کے مطابق یہ فیصلہ فرمایا کہ ان سے فدیہ لے کر انھیں رہا کر دیا جائے۔

ان میں کچھ لوگ تو ایسے تھے جو زر فدیہ ادا کر سکتے تھے اور چند ایسے بھی تھے جو ابھی اس کا موقع نہ رکھتے تھے۔ ان کے لیے جو فدیہ مقرر کیا گیا وہ ایسی چیز ہے جو رہتی دنیا تک ہر تشنہ علم کے لیے شمع ہدایت بنی رہے گی۔ رسول امیؐ نے فیصلہ فرمایا کہ ایسے غیر مستطیع قیدی کے لیے فدیہ یہ ہے کہ وہ انصار کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں ——— اس روایت سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ:

(الف) یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ عرب خصوصاً" اہل مکہ بالکل جاہل اور ان پڑھ تھے' وہ صحیح نہیں۔ پڑھنے لکھنے کا بہت عام رواج تھا ورنہ ان قیدیوں میں سے کوئی بھی تو کہتا کہ میں بچوں کو نوشت و خواند نہیں سکھا تا کیوں کہ میں خود ان پڑھ ہوں۔

(ب) اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تعلیم کا مسئلہ حضورؐ کی نگاہوں میں کتنی اہمیت رکھتا تھا۔

(ج) اس میں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسیروں یا قیدیوں سے فدیہ لیتے وقت ان کی مختلف حیثیتوں اور متفاوت صلاحیتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ چنانچہ آگے معلوم ہوگا کہ جن لوگوں سے زر فدیہ لیا گیا وہ خود اپنی مقدار میں مختلف تھا۔ کسی پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالا گیا جو اس کی استطاعت سے باہر ہو۔

قیدیوں کے ساتھ آج بھی مہذب ممالک میں منتقمانہ سلوک روا رکھا

جاتا ہے۔ لیکن حضورؐ جو اعلیٰ اقدار قائم فرمانا چاہتے تھے اور مواقع جنگ پر بھی ان اقدار کو برقرار رکھنا چاہتے تھے ان کے اظہار کا آج یہ پہلا موقع ہے جب کہ قیدیوں پر نہ فقط یہ کہ استطاعت سے باہر بوجھ نہیں ڈالا جاتا اور کوئی منتقمانہ کارروائی نہیں کی جاتی بلکہ ان قیدیوں کا بیان ہے کہ "یہ مسلمان خود سوکھی کھجوروں پر گزارا کر لیتے تھے اور ہمیں پکی ہوئی روٹیاں کھلاتے تھے۔ ہمیں ندامت ہوتی اور ہم انھیں روٹیاں واپس کرنا چاہتے تو وہ انکار کر دیتے۔"

لمحہ فکریہ

ذرا سوچیے کہ اہل اسلام تیرہ سال تک مکے میں انتہائی مظلومیت کی زندگی بسر کرتے رہے اور آخر کار گھربار اور املاک سے محروم کر کے نکال دیے گئے۔ مدینے پہنچنے کے بعد بھی انھیں چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔ اس کے بعد کفر و اسلام کا پہلا مقابلہ ہوا جس میں کفر کو شکست فاش ہوئی۔ جو بھاگ گئے یا مارے گئے ان کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں۔ لیکن جو قیدی ہاتھ آئے تھے ان سے انتقام لینے کا آج سے بہتر کون سا موقع ہو سکتا تھا؟ اگر انتقامی کارروائیاں کی جاتیں تو یہ عام تقاضائے بشریت ہوتا۔ لیکن انتقام تو الگ رہا یہاں تو خود خشک کھجوریں کھا رہے ہیں اور قیدیوں کو پکی پکائی روٹیاں کھلا رہے ہیں۔ ان کا مقصد نہ حصول اقتدار تھا نہ اقتدار کے نشے میں کوئی منتقمانہ کارروائی کرنی۔ ان کو جو تعلیم دی گئی اور جسے پھیلانا ان کا مقصد تھا وہ انسانی اقدار کے قیام کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان ہی اقدار میں قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا بھی تھا۔

صرف کھانے کا خیال نہیں رکھا گیا بلکہ جن لوگوں کو کپڑوں کی ضرورت تھی، انھیں حضورؐ نے کپڑے بھی دیے۔ عباس بن عبدالمطلب دراز قامت تھے ان کے جسم پر کوئی کرتا ٹھیک نہ آیا تو راس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول سے کرتا لے کر انھیں دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس منافق کے

مرنے کے بعد حضورؐ نے جو اپنا قمیض مبارک اتار کر اسے کفنانے کے لیے دیا وہ درحقیقت اس کے اسی احسان کا بدلہ تھا۔

جب ذی استطاعت قیدیوں سے زر فدیہ وصول کیا جانے لگا تو قیدیوں کے رشتے داروں نے مطلوبہ رقمیں بھجوائیں یا جن کے پاس رقم موجود تھی انھوں نے خود ہی ادا کر دی۔

آپ اوپر یہ پڑھ چکے ہیں کہ حضورؐ کی صاحب زادی سیدہ زینبؓ کو ان کے شوہر ابوالعاص نے مکے میں روک لیا تھا اور حضورؐ کے پاس مدینے میں نہ جانے دیا۔ اب جو ابوالعاص قید ہوئے اور ان سے زر فدیہ طلب کیا گیا تو ان کے پاس وہ موجود نہ تھا۔ لہٰذا ان کا زر فدیہ حضرت زینبؓ نے مکے سے بھجوایا۔ اس رقم فدیہ میں حضرت زینبؓ نے ایک قیمتی ہار بھی بھیجا تھا۔ یہ وہ ہار تھا جو سیدہ خدیجہؓ کے ترکے میں حضرت زینبؓ کو ملا تھا۔ حضورؐ کی نظر جب اس ہار پر پڑی تو وہ رفیقہ حیات یاد آگئی جو اس سقف آسمانی کے نیچے سب سے پہلے ایمان لائی تھی اور جس نے حضورؐ کی رفاقت میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ آہ دنیا میں کب کہیں یہ موقع آیا ہوگا کہ بیٹی اپنے شوہر کو رہا کرانے کے لیے اپنی ماں کا ترکہ اپنے باپ کے پاس بھیج رہی ہے۔ یہ منظر کتنا دل سوز ہوگا' اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ حضورؐ کی نظر ہار پر پڑی تو سراپا اخلاص خدیجہ یاد آگئیں اور چشمان مبارک آب دیدہ ہو گئیں۔

ذرا اس کش مکش کا اندازہ کیجیے کہ ایک طرف رفیقہ حیات کی یاد اور بیٹی کی محبت جذبات بشری کو ابھار رہی ہے کہ ساری کائنات بیٹی کے حوالے کر دو اور دوسری طرف تقاضائے عدل' مقتضائے جمہوریت' احترام قانون اور ایک اعلیٰ نصب العین کی راہ میں قربانیاں دینے والے جاں نثاروں کا لازمی لحاظ مجبور کر رہا تھا کہ جو برتاؤ غیروں کے ساتھ ہو وہی اپنوں کے ساتھ بھی ہو اور قرابتی دلداری پر رفقا کی دلداری کو ترجیح دو ــــــ اگر حضورؐ اشارۃً بھی

اپنی طرف سے حکم دے دیتے کہ یہ ہار اور سارا زر فدیہ واپس کر دیا جائے اور ابو العاص کو یوں ہی رہا کر دیا جائے تو کون بدبخت تھا جو حضورؐ کے اس حکم سے انکار کر دیتا؟ مگر حضورؐ نے اپنے بشری جذبات پر قومی عدل کو اور ذاتی حکم پر اقدار جمہوریت کو ترجیح دی اور صحابہ سے فرمایا کہ اگر تمھاری مرضی ہو تو یہ ہار ——— ماں کا ترکہ ——— بیٹی کو واپس کر دیا جائے۔ سب نے سر تسلیم خم کر دیا' ہار زینب کو واپس کر دیا گیا اور ابو العاص رہا ہو کر چلے گئے اور حضرت زینب کو مدینے جانے کی اجازت دے دی۔

سچ پوچھیے تو یہ عنایت بھی محض بیٹی کی خاطر نہ تھی۔ اس میں ایک بڑی مصلحت اور تھی جسے صرف پیغمبر کی عقابی نظریں ہی دیکھ سکتی تھیں۔ بدر کے چند سال بعد یہی ابو العاص شام سے ایک قافلہ تجارت لے کر واپس آ رہے تھے کہ مسلمانوں سے مڈبھیڑ ہو گئی مسلمانوں نے ان کے تمام مال و اسباب لے کر آپس میں بانٹ لیے۔ حضورؐ کو علم ہوا تو یہ انتقامی کارروائی پسند نہ آئی۔ کیوں کہ بظاہر یہ فی سبیل اللہ کارروائی کسی اعلیٰ نصب العین کی راہ میں نہ تھی' اس لیے فرمایا کہ اگر تم مناسب سمجھو تو ابو العاص کا مال ان کو واپس کر دو۔ ظاہر ہے کہ یہ مال تنہا ابو العاص کا نہ ہوگا' بہت سے افراد اس میں شریک ہوں گے اور ان سب کے مال و اسباب کے ذمے دار ابو العاص ہی ہوں گے۔ بہرکیف حضورؐ کے حکم کے آگے سب نے سر تسلیم جھکا دیا اور ایک ایک تنکا لا کر ابو العاص کو واپس کر دیا۔ ابو العاص مکے آئے تو تمام لوگوں کو ان کا مال و اسباب واپس کر کے اپنا حساب کتاب بالکل بے باق کر دیا اور مکے سے روانہ ہو کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ابو العاص شرکا کی رقم لے کر فرار ہو گئے۔ مدینے پہنچ کر وہ اسلام لے آئے۔ یہ تھا وہ کردار نبوی جس کے صدقے میں ابو العاص کو اسلام کی دولت نصیب ہوئی۔ محض ایک داماد کی جانب دارانہ ہمدردی کا معاملہ نہ تھا۔ ادھر اہل اسلام کو یہ اعلیٰ تعلیم دی کہ کسی

کو کمزور پا کر لوٹ لینا اور اپنے انتقام کی آگ کو سرد کرنا کوئی جہاد فی سبیل اللہ نہیں' اور ادھر اپنی بلند کرداری سے ابوالعاص کو اس طرح متاثر کیا کہ ہار واپس کیا تو زینبؓ کو مدینے جانے کی اجازت مل گئی' اور مال تجارت واپس کیا تو وہ دولت اسلام سے مالا مال ہو گئے۔ حضورؐ کی یہ عنایت صرف ابوالعاص ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی جسے نعوذ باللہ داماد کی پاس داری سے تعبیر کیا جائے۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ایسے بہتیرے مواقع آئے ہیں جہاں اپنوں اور بے گانوں سبھوں کے ساتھ حضورؐ نے ایسی ہی دریا دلی فرمائی ہے اور اس کا مقصد تالیف قلب کے سوا کچھ نہ تھا۔

سب سے بڑی اور قابل توجہ بات تو یہ ہے کہ حضورؐ نے سارے مسلمانوں کی جان و مال کے واحد متصرف ہونے کے باوجود یہ نہ کیا کہ محض اپنا حکم چلایا ہو اور دوسرے یارو انصار کی دل شکنی کی پروانہ کی ہو۔ سرکار دو عالم کی یہی وہ دل داریاں ہیں جنہوں نے فداکاروں کو اور زیادہ فداکار بنا دیا۔

بدر کے قیدیوں میں خطیب قریش سہیل بن عمرو بھی تھے (جو آگے چل کر ۶ھ میں بہ موقع صلح حدیبیہ سفیر قریش بن کر آئے) یہ اپنے زور خطابت سے قبائل میں آگ لگا دیتے تھے اور حضورؐ کے خلاف لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ سہیل کے سامنے کے دانت تڑوا دیے جائیں تاکہ ان کی طاقت لسانی ختم ہو جائے۔ مگر نگاہ نبوت جس طرح ابوالعاص کے مستقبل کو دیکھ رہی تھی اسی طرح سہیل کے آنے والے دن کو بھی ملاحظہ کر رہی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: نہیں ان کے دانت یوں ہی رہنے دو شاید اللہ تعالیٰ آئندہ ان سے کوئی اچھا کام لے لے۔ چنانچہ وفات نبوی کے بعد جس مضمون کا خطبہ حضرت صدیق اکبرؓ نے مدینے میں دے کر لوگوں کے ہوش و حواس بجا کر دیے' بالکل اسی مضمون کا خطبہ سہیل بن عمرو نے مکے میں دیا اور ارتداد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو یہ کہہ کر روک دیا کہ: "مکے والو! تم

نے اسلام لانے میں بڑی تاخیر سے کام لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ارتداد میں تقدیم کی غلطی کر بیٹھو۔"

ان ہی قیدیوں میں عباس، عقیل اور نوفل بھی تھے۔ حضورؐ نے عباس سے خود ان کا اور ان کے دونوں برادرزادوں ——— عقیل اور نوفل ——— کا فدیہ طلب فرمایا۔ عباس نے کہا کہ میرے پاس رقم فدیہ کہاں ہے؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں قریش سے بھیک مانگتا پھروں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ: "چچا جان! وہ سونا کیا ہوا جو تم نے اپنی بیوی (ام الفضل) کے پاس چپکے سے رکھوایا تھا اور کہا تھا کہ لڑائی سے اگر میں واپس نہ آسکوں تو یہ سونا تمھارے اور بچوں (عبداللہ، عبید اللہ، قاسم اور فضل وغیرہ) کے کام آئے گا۔" حضورؐ کا ارشاد سوال کی صورت میں بالکل واقعے کے مطابق تھا اور اس واقعے کی خبر بجز عباس اور ان کی بیوی کے کسی کو نہ تھی۔ آج حضورؐ کی زبان سے یہ اطلاع عباس کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی، اور وہ بے ساختہ کلمہ شہادت پڑھ اٹھے۔ اس سے پہلے بھی عباس حضورؐ کے پاس داروں ہی میں تھے لیکن اس کی بنیاد صرف حمیت جاہلیہ تھی۔ مگر آج یہ ایمانی بنیاد میں تبدیل ہو گئی ——— ان قیدیوں میں عقبہ، نضر اور طعمہ کے سوا کوئی قتل نہیں کیا گیا۔

حق و باطل کا یہ پہلا معرکہ تھا جس میں حق کو فتح مبین اور باطل کو شکست فاش ہوئی۔ اس قومی و اجتماعی مسرت کے ساتھ حضورؐ کو ایک صدمہ بھی اٹھانا پڑا۔ حضورؐ بدر سے واپس تشریف لائے تو حضورؐ کی صاحب زادی حضرت رقیہؓ زوجہ عثمان غنیؓ نے رحلت فرمائی۔ مدینے سے روانگی کے وقت یہ بیمار تھیں اور ان ہی کی تیمارداری کے لیے حضرت عثمانؓ غزوہ بدر کی شرکت نہ فرما سکے۔ حضرت رقیہؓ ہجرت حبشہ میں حضرت عثمانؓ کی شریک تھیں اور ہجرت مدینہ میں بھی۔ ان کا شمار مومنین اولین میں تھا۔ اس لیے حضورؐ کو خونی اور دینی دونوں طرح کے صدمے ہوئے، لیکن اس صدمے کو حضورؐ نے کوئی ذاتی

صدمے سے متجاوز نہ ہونے دیا' اسے قومی صدمہ نہ بننے دیا اور فتح بدر کی قومی خوشی کو اس صدمے پر غالب رکھا۔ یوں بھی اسلام وقف غم و ماتم ہونے کا حامی نہیں' اسی لیے اس نے جو دینی تقریبات رکھی ہیں وہ خوشی (عید) کی ہیں۔ غم کے کسی بڑے سے بڑے حادثے کو بھی تقریب غم کی حیثیت نہیں دی۔

غلبہ خواب اور باران رحمت

جنگ بدر کے سلسلے میں قرآن میں صحابہ کو نیند آجانے کا ذکر ہے۔ نیند آجانا اور پھر دور دراز مسافت طے کرنے والے مسافروں کو نیند آجانا کوئی ایسی چیز نہیں جس کا خاص طور پر ذکر کیا جائے' لیکن قرآن نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میدان جنگ سامنے ہو اور دشمن کے لشکر' اسلحہ اور رسد سہ چند ہوں اور ایک اعلیٰ ترین مشن کی فنا و بقا کا سوال درپیش ہو تو نیند کا آجانا یقیناً ایک غایت درجے کے سکون و اطمینان و اعتماد و بے خوفی کی دلیل ہے اور یہ ایسا انعام الٰہی ہے جس کا ذکر خاص طور پر قرآن میں یوں کیا گیا ہے:

اذ یغشیکم النعاس امنه منه (الانفال:۱۱)

وہ وقت یاد کرو جب خدا تم پر تمہارے چین کے لیے اپنی طرف سے اونگھ طاری کر رہا تھا۔

یہ واضح رہے کہ یہاں خواب غفلت یا گہری نیند کا ذکر نہیں بلکہ صرف نعاس کا ذکر ہے جس کے معنی اونگھ یا جھپکی کے ہیں اور یہ نیند کا بالکل ابتدائی زینہ ہوتا ہے۔ اس قلیل مگر گہری جھپکی نے اہل اسلام کے اندر ایک کایا پلٹ کر دی کہ جاگے تو بالکل تازہ دم تھے۔

اس کے ساتھ ہی قرآن نے ایک اور انعام کا بھی ذکر فرمایا ہے اور وہ ہے باران رحمت کا نزول۔ اس کا ذکر یوں ہے:

وینزل علیکم من السماء ماء لیطهر کم به ویذهب

عنکم رجز الشیطن ولیربط علی قلوبکم ویثبت بہ الاقدام ط (الانفال: ۱۱)

اور وہ تم پر آسمان سے پانی برسا رہا تھا تاکہ تمھیں اس کے ذریعے پاکیزہ بنا دے اور تم سے شیطانی پلیدی کو دور کر دے اور تمھارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تمھارے قدم جما دے۔

پانی کا سب سے بڑا مقصد پیاس بجھانا ہوتا ہے لیکن یہ چوں کہ محض حیوانی ضرورت ہے۔ اس لیے قرآن نے صاف لفظوں میں اس کا ذکر مناسب نہ سمجھا اور دوسرے اعلیٰ مقاصد کا ذکر کر دیا ہے۔ پہلی چیز ہے طہارت جس کی ہر مومن کو ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری چیز ہے شیطانی پلیدی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا مفہوم غسل جنابت ہو یا وہ مایوسانہ جذبات ہوں جو ایسے بے آب و گیاہ سرزمین میں پیدا ہوسکتے ہیں خصوصاً" اس وقت جب کہ کنوئیں پر دشمن کا غلبہ ہو۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں نے اس سے مراد پیاس بھی لی ہے کیوں کہ "شیطان الفلاۃ" (صحرا کا شیطان) شدت کی پیاس کو بھی کہتے ہیں۔ تیسری شے ہے دلوں کی ڈھارس بندھنا اور پانی کا ایک بہت بڑا سہارا ہاتھ آجانے سے ڈھارس بندھ جانا آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ چوتھی چیز ہے قدم جمنا' یہ ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے ہوا۔ جس طرف مسلمان تھے (جسے قرآن نے العدوۃ الدنیا کہا ہے) ادھر کی زمین گرد و غبار جمنے سے ایسی ہموار ہوگئی جس پر قدم دھنسنے نہ پائیں اور باطنی حیثیت سے ان تمام تائیدات غیبی نے ان کے قدم جما دیے۔

حقیقت کے خلاف تعداد کا نظر آنا

قرآن نے ایک اور عجیب چیز بتائی ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے

کی نگاہ میں کم تر نظر آ رہے تھے۔ ارشاد ہے:

اذیریکھم اللہ فی منامک قلیلًا ولو اریکھم کثیرا لفشلتم ولتنا زعتم فی الامر ..... واذیریکموھم اذالتقیتم فی اعینکم قلیلا و یقللکم فی اعینھم (الانفال: ۴۳، ۴۴)

وہ وقت یاد کرو جب اے رسول تمھیں خدا خواب میں ان کو تھوڑا تھوڑا کر کے دکھا رہا تھا اور اگر وہ زیادہ کر کے دکھاتا تو تم ڈھیلے پڑ جاتے اور (مقابلہ دشمن) کے معاملے میں باہمی جھگڑا کرنے لگتے...... اور وہ وقت بھی یاد کرو جب تمھاری مڈبھیڑ ہوئی تو اللہ ان دشمنوں کو تمھاری نگاہوں میں گھٹا کر اور تمھیں ان کی نگاہوں میں کم کر کے دکھا رہا تھا۔

گویا مسلمانوں کو اہل کفر اپنی اصلیت سے کم تر دکھائی دے رہے تھے یعنی تین گنے کی بجائے صرف دو گنے۔ اسی کو دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے کہ یرونھم مثلیھم رای العین (آل عمران: ۱۳) اور اسی طرح کفار کو اہل اسلام کم تر نظر آ رہے تھے اور اس کی غرض یہ تھی کہ ہونے والی بات ہو کر رہے، لیقضی اللہ امراً کان مفعولاً (الانفال: ۴۲) اس کا نتیجہ قدرۃ" یہ ہوا کہ اہل کفر بھی بے جگری سے لڑے اور اہل اسلام بھی۔ اگر دونوں ایک دوسرے کو اصلیت سے زیادہ نظر آتے تو دونوں ایک دوسرے سے خائف ہو جاتے اور ممکن تھا کہ جنگ نہ ہوتی اور غلبہ اسلام کو کفر کا زور توڑنے کا موقع نہ ملتا۔ لیکن چوں کہ ہر ایک فریق کو دوسرے نے کم تر محسوس کیا اس لیے آسانی سے نگلا جانے والا لقمہ تر سمجھ کر خم ٹھونکتا ہوا میدان میں نکل آیا اور جس زور کی ٹکر ہوئی اسی زور کا صدمہ بھی کفر کو برداشت کرنا پڑا۔

یہ کم تر نظر آنے والا معاملہ بہ ظاہر تو تعداد سے متعلق دکھائی دیتا ہے لیکن اگر اسے قوت کی کمی سے تعبیر کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مسلمان تو یوں بھی تعداد میں کم تھے' دوسرے بے سروسامان تھے' تیسرے وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ مسلمان آج تک کسی موقعے پر ہم سے مقابلہ نہ کر سکے یہاں تک ہم نے ان کو مکے سے نکال باہر کیا۔ وہ اسے صبر و استقامت نہیں بلکہ مسلمانوں کی کمزوری سمجھ رہے تھے۔ یہ تمام اسباب مسلمانوں کو ہیچ تر سمجھنے کے لیے کافی تھے۔ اہل کفر تعداد میں تو دوگنے دکھائی ہی دے رہے تھے اور یہ واقعیت کے خلاف بھی نہ تھا' وہ زیادہ تھے' لیکن اہل کفر کو ہیچ تر سمجھنے کے اسباب یہ تھے کہ ان کے پاس قوت ایمان نہ تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محمدؐ جیسا سہارا ان کے پاس نہ تھا جو خدا کو بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے اور فتح و نصرت کی بشارتیں بھی۔ یہ غیر معمولی قوت بجائے خود اتنی زیادہ حوصلہ افزا تھی کہ اگر دشمن دس گنے بھی ہوتے تو انھیں "تھوڑے" دکھائی دیتے۔

غرض قلیل یا قلت کا لفظ محض کمیت کے لیے نہیں ہوتا بلکہ کیفیت کے لیے بھی اسی طرح مستعمل ہے۔ اس لیے اسے "نظر بندی" جیسا کرشمہ ماننا ضروری نہیں بلکہ ایک ایسا اسوہ و نمونہ ہے جو ہر دور میں اہل صبر و تقویٰ کے ساتھ وابستہ رہے گا۔

عمیر بن وہب کا اسلام

رات کی تاریک تنہائی میں مقام حجر کے پاس صفوان بن امیہ اور عمیر بن وہب باتیں کرتے ہیں۔ مقتولان بدر کی یاد میں سوگواری کا اظہار کر رہے ہیں۔ (یہ واضح رہے کہ صفوان کا باپ امیہ بدر میں مارا گیا تھا اور عمیر بن وہب کے فرزند وہب بن عمیر بدر کے قیدیوں میں تھے) اتنے میں عمیر نے کہا کہ: "بخدا اب تو زندگی بے کیف سی ہو گئی ہے۔ اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بال

بچوں کی ذمے داری نہ ہوتی تو میں مدینے جا کر محمد کا قصہ ہی پاک کر دیتا۔ صفوان نے کہا کہ تمہارا قرض اور کفالت عیال میرے ذمے رہی۔ عمیر نے گھر آکر ایک خنجر زہر میں بجھایا اور مدینے کے طرف چل پڑا۔ اونٹ سے اترا تو حضرت عمرؓ کو کچھ شک گزرا' اور آپ کی رائے سے بہت سے صحابہ حضورؐ کے گرد حلقہ باندھ کر حفاظت کے لیے بیٹھ گئے۔ عمیر آکر حضورؐ کے سامنے بیٹھ گیا اور گفتگو یوں شروع ہوئی:

عمیر: انعم صباحایا محمد صبح بخیر۔

حضورؐ: قد ابدلنا اللہ خیراً منہاما اقدمک۔ اللہ نے اس سے بھی بہتر صبح بخشی ہے۔ اچھا تم یہاں کس سلسلے میں آئے ہو؟

عمیر: جئت افدی اسارآکم۔ قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے رہا کرانے کے لیے۔

حضورؐ: وماللسیف۔ یہ تلوار کیسی ہے۔

عمیر: اما انا قد حملناھا یوم بدر فلم یفلحن ولم ینحجن۔ ہم نے تو بدر کے دن بھی یہ تلواریں سنبھالی تھیں لیکن یہ نہ کام آئیں نہ کارگر ثابت ہوئیں۔

حضورؐ: فما شئی قلت لصفوان وانتما بالحجرلولا عیالی و دینی لکنت اناالذی قتلت محمد ابنفسی۔
اچھا جب تم اور صفوان حجر کے پاس اکٹھے تھے تو تم نے صفوان سے کیا کہا تھا؟ یہی نا کہ اگر میرے بال بچے نہ ہوتے اور مجھ پر قرض نہ ہوتا تو میں اپنے ہاتھ سے جا کر محمدؐ کو قتل کر دیتا۔

عمیر: ھاہ کیف قلت۔ ذرا پھر فرمایئے کیا باتیں ہم دونوں میں ہوئیں۔

حضورؐ نے پھر اس سازش کی تفصیل کو دہرایا۔ اس کے بعد وہب نے

کہا:

کنت تخبرنا خبر اھل الارض فنکذبک فاراک تخبر خبر اھل السماء اشھدان لا الہ الا اللہ وانک رسول اللہ

حضورؐ زمین والوں کی باتیں بتاتے تھے تو ہم جھٹلاتے تھے لیکن اب تو میں یہ دیکھتا ہوں کہ حضورؐ آسمان والوں کی باتیں بھی بتلانے لگے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور آپؐ اس کے رسول ہیں۔

اس کے بعد وہب کی درخواست پر حضورؐ نے اپنی دستار مبارک عطا فرمائی جسے وہ لے کر مکے لوٹ آیا۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ: جب عمیر مدینے میں آیا ہے تو اس وقت وہ میری نگاہوں میں خنزیر سے بھی زیادہ بدتر تھا لیکن جب وہ واپس گیا ہے تو وہ مجھے اپنی اولاد سے زیادہ پیارا تھا۔ اس کے بعد حضورؐ نے ان کے فرزند وہب بن عمیر کو بغیر فدیے کے رہا کر دیا اور یہ دونوں مکے آ گئے۔ اس کے بعد عمیر نے مکے میں تبلیغ اسلام شروع کر دی اور بہت سے لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام کر لیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کا نام عمیر بن وہب بتایا ہے اور طبری کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن طبرانی نے کبیر میں ان کا نام (بروایت حضرت انس) وہب بن عمیر بتایا ہے۔ نیز انھوں نے واقعہ بدر کے بعد ان کے اسلام قبول کرنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن طبرانی کے الفاظ صاف ہیں کہ: کان وھب بن عمیر شھد احدا کافرا۔ یعنی وہب بن عمیر بحالت کفر احد کے دشمن کیمپ میں تھے اور...... شدید زخمی ہونے کے بعد اچھے ہو گئے تھے ——— لہٰذا معلوم یہ ہوتا ہے کہ غزوہ احد کے بعد یہ ایمان لائے ہیں نہ کہ بدر کے بعد۔ واللہ اعلم۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پیغمبر کو اللہ تعالیٰ بہت سے غیوب پر مطلع کر دیتا ہے اور جب حجابات اٹھتے ہیں تو ایسی بہت سی محیر القول باتیں باذن الٰہی بتا دیتا ہے۔ یہ چیزیں مادہ پرستوں کی سمجھ میں مشکل ہی سے آتی ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ یہ حضرات Telepathy کو ایک عملی فن کی حیثیت سے تو مان لیتے ہیں اور نبوت کی اس قوت کو تسلیم کرنے میں انھیں تامل ہوتا ہے۔ دوسری طرف ایسے واقعات میں بہت ہی مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔

❋ ❋ ❋

(۱۰)

غزوۂ سویق

معرکہ بدر نے قریش کی کمر توڑ دی۔ ابو جہل کے مارے جانے کے بعد قریش کی قیادت ابو سفیان بن حرب کے ہاتھ آگئی اور انھوں نے اپنی قیادت کی لاج رکھنے اور آتش انتقام کے شعلوں کو سرد کرنے کی غرض سے یہ قسم کھائی کہ جب تک بدر کا بدلہ نہ چکا لوں گا اس وقت تک نہ غسل کروں گا اور نہ سر میں تیل ڈالوں گا۔ ابو سفیان نے اپنی قسم پوری کرنے کے لیے یہ کیا کہ دو سو شتر سواروں کو لے کر مدینے کی طرف چل پڑے۔ پہلے حی بن اخطب کے پاس گئے' مگر اس نے دروازہ ہی نہ کھولا۔ پھر اسلام بن مشکم کے پاس گئے۔ یہ یہود بنی نضیر کا سردار تھا۔ اس نے بڑی آؤ بھگت کی۔ صبح ابو سفیان نے مدینے سے تین میل کے فاصلے پر عریض پر حملہ کر دیا اور سعد بن عمیر انصاری کو قتل کر دیا۔ نیز چند مکانات کو آگ لگا دی۔ ابو سفیان نے اپنے خیال میں قسم پوری کر لی۔ حضورؐ کو خبر ملی تو ایک جماعت صحابہ کے ساتھ ابو سفیان کا تعاقب کیا مگر یہ پورا گروہ بھاگا اور اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے یا پیچھا کرنے والوں کی رفتار تعاقب کو سست کرنے کے لیے یہ گروہ مختلف مقامات پر ستو کی تھیلیاں گراتا گیا۔ ستو کو عربی میں سویق کہتے ہیں۔ اس لیے اس غزوے کا نام غزوہ سویق ہے اور اسی کو غزوہ قرقرۃ الکدر بھی کہتے ہیں۔

تزویج فاطمہ

اسی سال یعنی ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہوئے تھے اور رمضان ہی کی سترھویں کو غزوہ بدر پیش آیا تھا۔ اس کے بعد ہی جب مسلمان بدر سے فاتحانہ واپس ہوئے تو اس سال پہلی بار عید الفطر کی نماز باجماعت ادا فرمائی۔ یہ دراصل فتح بدر کی خوشی تھی جو آج تک بطور یادگار قائم ہے۔ اسی سال حضورؐ نے صدقہ فطر کو بھی لازم قرار دیا۔

اور اسی سال ذی الحجہ کے اواخر یا نئے سال کے آغاز یعنی اوائل محرم میں سیدہ فاطمہؓ زہرہ کا نکاح حضرت علیؓ سے ہوا۔ سیدنا علیؓ نے خود اپنے آپ کو دامادی کے لیے پیش فرمایا۔ حضورؐ نے خود ہی جناب فاطمہؓ سے اذن لیا اور خود ہی نکاح پڑھایا۔ حضرت علیؓ نے اپنی زرہ (حضرت عثمانؓ کے ہاتھ) فروخت کر کے کوئی سوا سو روپے کی رقم زر مہر میں پہلے ہی ادا کر دی۔

جہیز کی غلط فہمی

حضورؐ نے کچھ چیزیں حضرت فاطمہؓ کو اس موقع پر دی تھیں۔ مثلاً ایک بان کی چارپائی' ایک چمڑے کا گدا جس میں کھجور کی چھال بھری تھی' ایک بڑا اور ایک چھوٹا مشکیزہ' ایک چکی' دو مٹی کے گھڑے' فیل دندان کے کنگن' ایک چاندی کا ہار جو حضرت خدیجہؓ کے ترکے میں ملا تھا اور اس دن کے لیے محفوظ رکھا تھا——— اکثر لوگ غلط فہمی سے اسے جہیز سمجھتے ہیں حالانکہ جہیز کوئی اسلامی چیز نہیں۔ نہ قرآن میں اس کا کوئی ذکر ہے نہ حدیث میں اسے ضروری قرار دیا گیا اور نہ کسی فقہ میں اسے جزو شادی بتایا گیا ہے۔ جہیز صرف ہندوؤں کی رسم ہے اور وہ بھی اس لیے کہ وہاں بیٹیوں کا ترکے میں کوئی حصہ نہیں ہوتا اس لیے وہ ایک ہی بار بہت کچھ جہیز کے نام سے دے کر گویا حق میراث بھی ادا کر دیتے ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں نے ان سے یہ رسم لے لی اور

اس کا نام جہیز رکھ دیا۔ یہاں تک تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن غضب یہ کیا کہ اسے "سنت رسولؐ" بھی قرار دے دیا۔ اور ثبوت میں وہ چیزیں پیش کر دیتے ہیں جو حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کو دی تھیں۔ ذرا سی لغزش سے آگے چل کر کتنا غلط مسئلہ بن کر سامنے آجاتا ہے اور اس غلطی پر تہ بہ تہ پردے پڑتے چلے جاتے ہیں۔

ذرا سوچیے اگر جہیز کوئی سنت ہوتا تو یہ سنت محض حضرت فاطمہؓ ہی کے ساتھ ادا کی جاتی؟ کیا حضورؐ کی اور صاحب زادیاں نہ تھیں؟ اسے بھی جانے دیجئے۔ حضورؐ کی خود متعدد ازواج موجود تھیں۔ لیکن آپ نے کہیں سنا کہ حضورؐ نے رقیہؓ، ام کلثومؓ، اور زینبؓ کو بھی کوئی جہیز دیا ہو؟ کسی جگہ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ فلاں ام المومنین جب رخصت ہو کر حضورؐ کے پاس آئیں تو اپنے ساتھ فلاں فلاں چیزیں جہیز میں لائی تھیں؟ دوسرے بے شمار صحابہ کی اور خود سیدنا علیؓ کی شادیاں ہوئیں۔ کہیں آپ نے یہ پڑھا ہے کہ وہ اپنے ساتھ جہیز لائی تھیں؟ پھر آخر یہ کیا منطق ہے کہ جس حقیقت کا کہیں سراغ نہ ملے اسے نکاح فاطمہ کے سر تھوپ دیا جائے اور پھر اسے سنت نبوی بھی قرار دیا جائے؟ یہ عجیب سنت نبوی ہے کہ اس کی ایک سے زیادہ ـــــ اور وہ بھی غلط ـــــ کوئی نظیر ہی نہیں ملتی۔

حقیقت یہ ہے کہ رسم جہیز کو سنت رسول سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ اگر کوئی سنت ہے تو "سنت ہنود" ہے اور اب تو وہ بھی اس رسم کو ختم کر رہے ہیں اور بیٹیوں کو ترکہ دلوا رہے ہیں۔ مگر اہل اسلام اس ہندوانہ رسم پر قائم ہیں اور غضب یہ کہ اسے سنت رسولؐ سمجھے بیٹھے ہیں۔

بات صرف اتنی ہے کہ کوئی باپ اپنی بیٹی کو اس کے کپڑے اتروا کر گھر سے باہر رخصت نہیں کرتا۔ اس کی پدری شفقت اسے اپنی حیثیت کے مطابق ایک اچھی شکل میں رخصت کرنے پر مجبور کرتی ہے لیکن یہ داد و دہش صرف

رخصت ہوتے وقت ہی تک محدود نہیں رہتی۔ وہ ساری عمر اپنی استطاعت کے مطابق اس کی اعانت کرتا رہتا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک بڑی نیکی ہے لیکن ساری عمر کی یہ داد و دہش کوئی "جہیز" نہیں ہوتی۔

جناب فاطمہؓ کا قصہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے سرپرست حضورؐ ہی تھے اور دونوں کی مناکحت کا اہتمام حضورؐ ہی کو کرنا تھا۔ اس وقت حضرت علیؓ کے پاس کوئی الگ مکان نہ تھا۔ چوں کہ یہاں ایک نیا گھر بسانا اور بنانا تھا اس لیے حضورؐ نے اتنا کچھ بھی کیا۔ اگر حضرت علیؓ کے پاس کوئی الگ گھر ہوتا تو جس طرح اپنی دوسری بیٹیوں کے لیے حضورؐ نے الگ گھر بنانے کا کوئی اہتمام نہ فرمایا اسی طرح حضرت فاطمہؓ کے لیے بھی کوئی خاص اہتمام نہ فرماتے۔ حضرت عثمانؓ کا الگ گھر موجود تھا اس لیے حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کو بیاہتے وقت حضورؐ نے کوئی اہتمام نہ فرمایا۔ حضرت ابوالعاصؓ کا گھر بھی الگ موجود تھا' اس لیے حضرت زینبؓ کو بیاہنے کے لیے بھی حضورؐ کو کوئی اہتمام نہ فرمانا پڑا۔ لیکن حضرت علیؓ کے پاس کوئی الگ گھر نہ تھا۔ حضرت حارثہ بن نعمان انصاری نے اپنا ایک گھر خالی کر کے اس نئے پاکیزہ جوڑے کے لیے حضورؐ کو پیش کر دیا۔ اسی نئے گھر کے لیے حضورؐ کو گھرداری کے کچھ سامان مہیا کرنے پڑے۔ لوگوں نے خدا جانے کیوں اسے "جہیز" فرض کر لیا اور اپنے اوپر ایک ایسی مصیبت مول لے لی کہ محض جہیز کے تصور سے بیٹی جیسی نعمت الٰہی کو ایک وبال سمجھنے لگے۔ گویا اگر جہیز نہ ہو تو بیٹی کی شادی ہی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ جہیز کی بلا ایسی نازل ہوئی کہ گویا یہ شادی بیاہ کا محض ایک لازمی جزو ہی نہیں ٹھہرا بلکہ ایک ضروری سنت رسولؐ بھی بن گیا۔ گویا اب النکاح سنتی الخ کا مفہوم ہو گیا کہ "نکاح جو بغیر جہیز کے ہو ہی نہیں سکتا میری سنت ہے۔ دیکھ لیا آپ نے؟ غلط فہمی کہاں سے چلی اور کہاں جا کر ختم ہوئی؟

پھر ایک عجیب چیز اور بھی پیش نظر رکھیے کہ حضورؐ نے جو کچھ بھی دیا

اس میں کچھ تو وہ تھا جو جناب خدیجہؓ کے ترکے سے حضرت فاطمہؓ کو ملنا ہی تھا' اور کچھ حصہ وہ تھا جو حضورؐ نے اپنی طرف سے نہیں بلکہ حضرت علیؓ کے دیے ہوئے زر مہر سے منگوا کر حضرت فاطمہؓ کو دیا۔ اگر فی الواقع جہیز دینا کوئی سنت ہے تو اس کے صرف ایک ہی حصے کو کیوں اختیار کیا جاتا ہے؟ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ پہلے داماد سے زر مہر لے کر اس سے سامان منگوا لیں؟

جہیز کی غلط فہمی کی وجہ

بہت عرصہ ہوا ایک بار ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ایک بڑے وسیع النظر استاذ مولانا شاہ حلیم عطا سلونی سے جہیز فاطمہؓ پر گفتگو ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ: بیہقی وغیرہ کی روایت میں ہے کہ:

جهز رسول الله صلى الله فاطمه فى خميل..... الخ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے "جہیز" دیا۔ اور یہی جھز لفظ دوسری روایتوں میں چاندی کے ہار کے متعلق بھی ہے۔ اس لیے جہیز کے وجود سے انکار کیسے ممکن ہے؟ میں نے عرض کیا کہ "سورہ یوسف میں ہے:

فلما جهزهم بجهازهم...... الخ

تو کیا آپ اس کا ترجمہ یوں کریں گے کہ "جب یوسف نے اپنے بھائیوں کو جہیز دیا۔ تجہیز کے معنی ہیں سامان مہیا کرنا نہ کہ جہیز دینا۔ روایت میں جو جھز کا لفظ آیا ہے اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ حضورؐ نے فاطمہؓ کو یہ یہ سامان دیے' نہ یہ کہ یہ یہ سامان "جہیز" میں دیے۔ سامان خواہ آپ کسی مسافر کے لیے کریں یا کسی دلہن کے لیے یا کسی میت کے لیے جھز کا لفظ سب کے لیے آتا ہے۔ اصطلاحی "جہیز" کا مفہوم اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حضورؐ نے جناب فاطمہؓ کو کچھ بھی نہیں دیا۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا حضورؐ نے "جہیز" دیا؟ اور اس "دینے" سے جہیز دینے کو سنت نبوی قرار دیا

جاسکتا ہے؟"

مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی اس تجہیز کو اصطلاحی جہیز ہی لکھا ہے جو میرے خیال میں صحیح نہیں۔

اس رسم ہنود کو سنت نبوی سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا اور اس میں اتنا غلو پیدا ہو گیا کہ اس کی پابندی میں گھل گھل کر مرنا رہ گیا اور جس فرض کا قرآن' حدیث اور فقہ میں ہر جگہ ذکر ہے وہ محض رسم بن کر رہ گیا۔ وہ فرض ہے "مہر" یا صداق و صدقات یا اجر یا فریضہ' جسے محض ایک رسم یا مذاق بنا کر رکھ دیا گیا ہے اور جو چیز سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی اسے لازمہ ازدواج بنا دیا گیا' اور لازمہ بھی ایسا کہ گویا یہ سنت موکدہ سے کم نہیں۔

اگر بالفرض اسے جہیز ہی مان لیا جائے تو پھر اب بھی لڑکیوں کو وہی "جہیز" دینا چاہیے جو حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کو دیا تھا۔

اسی سال غزوہ بدر رمضان ۲ھ کے بعد ہی شوال ۲ھ میں حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہوئی۔

(۱۱)

غزوۂ بنی قینقاع

شوال ۲ھ

مدینے اور اس کے اطراف میں یہود کے تین باوقار قبیلے آباد تھے۔ بنی نضیر' بنی قریظہ اور بنی قینقاع۔ یہ آخر الذکر قبیلہ بڑا بہادر تھا۔ لیکن یہ نفسیاتی اصول ہے کہ جب اخلاقی رجحانات میں پستی آنے لگے تو شجاعت تہور سے بدل جاتی ہے۔ شجاعت کا خاصا ہے عفو' درگزر' تحمل' بردباری اور رواداری یعنی کمزوروں کے ساتھ عفو اور رواداری ہوتی ہے اور اگر قوی کا مقابلہ ہو تو قدم پیچھے نہیں ہٹتے۔ یہ تو ہوئی شجاعت جس کے پیچھے کئی دوسری اعلیٰ اقدار بھی ہوتی ہیں' لیکن تہور کے خاص اس سے مختلف ہیں۔ اس میں خود غرضی اور مفاد پرستی کا جذبہ ہوتا ہے اور بہادری کا اظہار کمزوروں پر ہوتا ہے۔ اگر قوی کا مقابلہ ہو تو ساری بہادری مسکینی و تملق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ شجاعت کا جوہر حمایت حق پر ابھارتا ہے یا مقابلہ باطل پر۔ لیکن تہور ہر اس جگہ حرکت میں آتا ہے جہاں ہوائے نفس مجبور کرے۔ بنی قینقاع کی بہادری کا بھی یہی حال تھا کہ ان میں مظاہرہ تو شجاعت کا ہوتا تھا لیکن عمل تہور پر تھا' جس میں اخلاقی پابندیاں ضروری نہیں ہوتیں۔

یہودیوں کو اب تک اہل اسلام نے کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

لیکن کئی وجوہ سے ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جذبات میں روز افزوں تلاطم برپا ہو رہا تھا۔ مثلاً:

۱۔ اہل اسلام کا اثر جس نسبت سے بڑھتا جا رہا تھا اسی نسبت سے ان کا اثر گھٹتا جا رہا تھا۔

۲۔ بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں ایک نبی کا آنا انہیں شروع سے ہی ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

۳۔ بیت المقدس کی بجائے بیت خلیل کا قبلہ اسلام بن جانا ان کی ناراضی میں دو چند اضافے کا باعث ہو گیا۔

۴۔ اور سب سے بڑی یہ بات ہوئی کہ انصار کے اندر نہ فقط اتحاد پیدا ہو گیا بلکہ ان کے اخلاق بے حد بلند ہو گئے اور اس کا اثر ان کی معاشی زندگی پر یہ پڑا کہ یہودیوں کی مقروضیت اور معاشی غلامی سے وہ آزاد ہو گئے۔

۵۔ فتح بدر سے ان کی یہ آس بھی گویا ٹوٹ گئی کہ قریش کی سازش سے وہ اہل اسلام پر غالب آسکیں گے۔

غرض ایسے بہت سے اسباب پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے یہود خار کھا رہے تھے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان میں کسی سے حسد و عناد پیدا ہو جائے تو وہ اپنی تعمیر کی بجائے دوسرے کی تخریب میں لگ جاتا ہے اور ہر وقت اسی تاک میں رہتا ہے کہ کون سا موقع آئے جو ہم اس سے اپنی دشمنی نکالیں۔ ظاہر ہے کہ جب حسد و بغض اور غیض و غضب پیدا ہو جائے تو دماغی توازن میں بھی فرق پڑ جاتا ہے اور بہت سی باتوں کا اندازہ بھی غلط کرنے لگتا ہے۔ یہود بنی قینقاع سے یہی غلطی ہو گئی جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

ایک دن ان کے بعض بدکرداروں نے ایک انصاری خاتون کو سر راہ چھیڑا جس پر اس نے شور مچایا۔ آواز سن کر ایک انصاری وہاں پہنچے' اور چھیڑنے والے کو روکا۔ اس سے تو تو میں میں ہوئی' اور انھوں نے اس یہودی

کو قتل کر دیا۔ اس پر اس کے دوسرے مددگار یہودیوں نے مل کر اس انصاری کو مار ڈالا۔ اس سے قدرتی طور مسلمانوں میں اور یہودیوں دونوں میں اشتعال پیدا ہو گیا اور اس اشتعال کو دور کرنے کی غرض سے حضورؐ خود وہاں تشریف لے گئے۔ حضورؐ نے یہودیوں کو خوف خدا کی تلقین کی اور فرمایا کہ: "کہیں تم لوگوں پر بھی اسی طرح غضب الٰہی نہ نازل ہو جس طرح مشرکین بدر پر نازل ہو چکا ہے۔" اس پر انھوں نے جواب دیا کہ: "مکے والے فن جنگ سے ناواقف تھے اس لیے شکست کھا گئے۔ اگر تم لوگوں کی ہم سے جنگ ہوئی تو تمھیں جنگ کا مزہ آجائے گا۔ معاملہ طول پکڑتا گیا' مگر پھر بھی حالات پر آسانی سے قابو پایا جاسکتا تھا۔ لیکن غضب یہ ہوا کہ یہود بنی قینقاع نے معاہدہ توڑنے کا اعلان کر دیا۔ معاہدہ توڑنے کا مطلب اعلان جنگ تھا۔ اندریں حالات حضورؐ کو ان پر فوج کشی کرنی پڑی۔ اس وقت دنیا کو علم ہو گیا کہ یہ بنی قینقاع اہل شجاعت نہ تھے' بلکہ اہل تہور تھے۔ مقابلے کی جرات نہ کر کے الٹا قلعہ بند ہو گئے۔ دو ہفتے محاصرہ رہا۔ آخر عبداللہ بن ابی بن سلول (راس المنافقین) کو یہودیوں نے صلح کی بات چیت کرنے کے لیے بیچ میں ڈالا اور فیصلہ جلاوطنی کو منظور کر لیا۔ سات سو یہود بنی قینقاع اپنے تمام مال و اسباب سمیت جلاوطن ہو کر شام کے علاقہ "اذرعات" میں آباد ہو گئے۔

بہ ظاہر یہ جلاوطنی ایک ظلم دکھائی دیتی ہے اور بادی النظر میں رحمتہ للعلمینؐ کی رحمت عامہ کے منافی بھی معلوم ہوتی ہے' لیکن یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ حضورؐ بڑے سے بڑے جرم کو معاف فرما دیتے تھے لیکن "غدر" (عہد شکنی) کو برداشت نہ فرماتے تھے۔ حضورؐ کی بعثت کا مقصد ہی تھا اعلیٰ اقدار کا قیام۔ اور وفائے عہد ایک ایسی اعلیٰ قدر ہے جس کے بغیر دوسری تمام اقدار بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اگر کسی فرد یا قوم سے کوئی معاملہ کیا جائے اور وہ ایک بار عہد شکنی کرے تو آئندہ اس کے عہد کا کیا اعتبار قائم رہ سکتا ہے؟ عہد

شکنی کے بعد اس پر کسی وقت بھی اطمینان نہیں کیا جاسکتا' اور جب یہ صورت حال ہو کہ باہمی اعتماد اٹھ جائے تو نظام امن قائم رہنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس بے اعتمادی کی حالت میں نہ تجارتی تعلقات قائم رہ سکتے ہیں نہ سفارتی۔ نہ سیاسی خوش گواری رہ سکتی ہے نہ بین الاقوامی امن و امان۔ اس سے پہلے دنیا میں اس طرح کی غداریاں' سیاسی فریب کاریاں اور عہد شکنیاں ہوتی رہی ہیں اور معاہدوں کو زیادہ سے زیادہ ایک ایسا مکڑی کا جالا تصور کیا جاتا رہا ہے جو کمزور کو پھانس لیتا ہے اور مضبوط کی ایک جنبش سے ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن حضورؐ سیاست کی اس خود غرضانہ بازی گریوں کی بھی تطہیر چاہتے تھے' اس لیے سیاسی عہود کو انسانی اقدار سے متجاوز ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ حضورؐ معاہدوں کی جس شدت کے ساتھ پابندی چاہتے تھے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ:

۱۔ حذیفہ اور ابو حسیل جب مکے سے ہجرت کرنے لگتے ہیں تو قریش انھیں روک لیتے ہیں اور اس وعدے پر انھیں چھوڑتے ہیں کہ مدینے جاؤ مگر محمدؐ کے ساتھ ہمارے مقابلے میں جنگ کے لیے نہ آنا۔ غزوہ بدر پیش آتا ہے تو ان دونوں کے اندر بھی شرکت قتال کا جذبہ پیدا ہوتا ہے لیکن وہ عہد بھی سامنے آجاتا ہے جو قریش سے کرچکے ہیں۔ یہ دونوں اپنی صورت حال حضورؐ کے سامنے پیش کرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ: انصر فانفی لھم بعد ھم و نستعین اللہ علیھم۔

یعنی تم دونوں واپس جاؤ۔ ہم بہرحال وفائے عہد کریں گے اور دشمنوں کے مقابلے میں اللہ سے مدد چاہیں گے۔

۲۔ صلح حدیبیہ کی ایک شرط یہ لکھی جاتی ہے کہ مکے سے جو مسلمان قیدی مدینے پہنچے گا اسے واپس کرنا ہوگا' لیکن قریش مدینے سے آیا ہوا کوئی آدمی واپس نہ کریں گے۔ اسی دوران میں ابو جندلؓ کسی طرح بھاگ کر یہاں

پہنچ جاتے ہیں اور اپنے نشان ضرب دکھا دکھا کر فریاد کرتے ہیں۔ ابھی عہد نامے پر دستخط بھی نہیں ہوئے ہیں لیکن قریش کے مطالبے پر حضورؐ ان کو واپس کر دیتے ہیں۔

۳۔ ابو بصیر (عتبہ بن اسید) کچھ دنوں کے بعد اسی طرح بھاگ کر مدینے پہنچے۔ قریش کے دو آدمی انھیں واپس کرنے کا مطالبہ لے کر گئے اور حضورؐ نے ان کو بھی ابو جندل کی طرح پہلے سے زیادہ پر خطر ماحول میں واپس کر دیا۔ راستے میں بمقام ذوالحلیفہ انھوں نے ان دو میں سے ایک کو مار دیا اور دوسرا بھاگ کر مدینے پہنچا اور ساتھ ہی ابو بصیرؓ بھی پہنچ گئے۔ حضورؐ نے انھیں پھر واپس کر دیا۔ یہ مکے تو نہ گئے بلکہ عیص میں اپنا اڈا جما لیا۔ لیکن بہرحال حضورؐ نے مدینے میں ان کا رہنا پسند نہ کیا۔

ایسے ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ اپنے جاں نثاروں کا موت کے دہانے میں بھیج دینا تو گوارا کر لیا لیکن وفائے عہد اور دوسری اخلاقی اقدار کو مجروح نہ ہونے دیا۔ خود ہی سوچیے کہ وفائے عہد کی خاطر جب حضورؐ بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے سے بھی دریغ نہ فرماتے تھے تو جن یہود بنی قینقاع نے عہد شکنی کا اعلان کر دیا ان پر ایک ساعت کے لیے بھی حضورؐ اعتماد فرما سکتے تھے؟ کیا ایسی قوم انسانی اقدار کے لیے ناسور کا حکم نہ رکھتی تھی؟ اس ناسور کا علاج ہی ایسا آپریشن تھا جو ناسور زدہ عضو کو کاٹ کر کیا جائے تاکہ آئندہ کسی کو اس کی جرات نہ ہو۔ لیکن حضورؐ کا یہ تقاضائے رحمت تھا کہ ایک ہلکی سی سزا دی، یعنی جلاوطنی کی سزا، تاکہ وہ معاشرہ جس کو حضورؐ خالص اخلاقی اقدار کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتے تھے ان کے متعدی اثرات سے پاک ہو جائے۔ یہ ایک ایسا عمل جراحی تھا جس کے بغیر انسانیت کا پورا دھڑ ہی مسموم ہو جاتا۔

✳ ✳ ✳

(۱۴)

۳ ہجری ـــــــ غزوۂ احد

معرکہ بدر کی اسلامی فتح نے کفار قریش کی آتش انتقام کو بے انتہا بھڑکا دیا تھا۔ اسی آگ کا ایک شعلہ تھا جو ابوسفیان نے عریض کی چراگاہ میں پھینک کر اپنی قسم پوری کر لی تھی۔ معرکہ بدر کے بعد سارے قریش کی کمان ابوسفیان کے ہاتھ میں آگئی تھی' اس لیے تمام قبائل قریش نے انتقام لینے کی درخواست ان ہی سے کی اور ابوسفیان نے اس کا پرجوش خیرمقدم کیا۔ ان سب کو نظر آرہا تھا کہ اگر جلد سے جلد انتقام بدر نہ لیا گیا تو نہ صرف یہ کہ اہل اسلام کا اقتدار بڑھتا چلا جائے گا بلکہ قریش کا رہا سہا وقار بھی خاک میں مل جائے گا۔ اس تصور کے تحت انھوں نے ایک نئی جنگ کی بڑے زور شور سے تیاری شروع کر دی۔ اس تیاری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ:

۱۔ شام سے آیا ہوا کل منافع جو قافلہ ابوسفیان کے ساتھ آیا تھا اور (جو کسی مڈبھیڑ کے بغیر ہی مکے پہنچ گیا تھا اور جس کی وجہ سے معرکہ بدر پیش آیا تھا) اس جنگی تیاری میں جھونک دیا گیا۔ اس کی مقدار پچاس ہزار مثقال سونا اور ایک ہزار اونٹ تھے۔

۲۔ اس کے علاوہ بھی لوگوں نے الگ سے چندے دیے تھے۔

۳۔ آتش بیان خطبا اور جادو اثر شعرا ہر طرف بکھیر دیے گئے تاکہ ہر طرف جوش انتقام کو بھڑکا کر دامے' درمے' سخنے' قدمے ہر طرح کا تعاون

حاصل کیا جائے۔ جو لوگ عربی ذہنیت سے واقف ہیں وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بجائے خود وہاں کے لیے کتنا بڑا حربہ تھا۔ ان میں ابو غرہ' عمرو جمحی اور مسافع وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر خطبا و شعرا ہیں۔ خطابت اور پرجوش شاعری آج بھی کچھ کم تاثیر کی حامل نہیں' لیکن اس دور میں تو گویا حکومت ہی زبان آوری کی تھی۔ ایک شعر سے جس قبیلے کو چاہا ذلیل کر دیا اور جسے چاہا آسمان پر چڑھا دیا۔ جب چاہا جوش کو ابھار دیا اور جب چاہا بڑے سے بڑا فتنہ پیدا کر دیا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ عمرو جمحی بدر میں قید ہوا تھا اور حضورؐ نے اسے بلا فدیہ رہا کر دیا تھا لیکن یہ اب مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔

۴۔ اس سے بھی زیادہ موثر حربہ یہ تھا کہ بڑے بااثر اور اونچے گھرانے کی خواتین بھی میدان جنگ میں ساتھ لے لی گئیں۔ ان میں اکثر وہ عورتیں تھیں جن کے رشتے دار بدر میں مارے گئے تھے اور ان کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ان کے سپرد یہ خدمت تھی کہ عین میدان جنگ میں باہر نکل کر مردوں کو جوش اور اس سے زیادہ غیرت دلائیں۔ یہ بجائے خود ہی شاعرات تھیں اور ان کا ایک ایک لفظ مردوں میں نئی روح پھونک کر کٹ مرنے پر ابھارنے کے لیے بہت کافی تھا۔ پھر ان کا وجود اس لیے بھی بڑا موثر تھا کہ ہر نبرد آزما یہ سمجھتا تھا کہ اگر ہم نے پیٹھ دکھائی تو ہماری یہ معزز خواتین دشمنوں کے قبضے میں چلی جائیں گی' اس لیے یہ تقاضائے غیرت مندی ہے کہ ان کے ناموس کی خاطر جان کی بازی لگا دی جائے۔

ان عورتوں میں خود ابوسفیان کی بیوی ہند بھی ہیں جن کا باپ عتبہ بدر میں مارا گیا تھا۔ عکرمہ کی بیوی ام حکیم بھی ہیں جن کا خسر ابو جہل بھی بدر میں قتل ہوا تھا۔ خالد کی بہن فاطمہ بھی ہیں جو خود اس جنگ احد میں موجود ہیں اور جن کی شجاعت کفر و اسلام دونوں میں مسلم تھی۔ رئیس طائف مسعود ثقفی کی بیٹی برزہ بھی ہے۔ عمرو بن العاص کی بیوی ریطہ بھی ہے اور عجیب تماشا یہ ہے

کہ حضرت مصعب بن عمیر تو لشکر اسلام میں ہیں اور ان کی ماں خناس لشکر کفار میں۔

۵۔ پانچ ہزار کا لشکر تیار ہوا جس میں تین ہزار شتر سوار اور دو سو اسپ سوار اور سات سو زرہ پوش تھے اور ہر شخص آتش انتقام سے ہمہ تن شعلہ جوالہ بنا ہوا ہے۔

ان تمام تیاریوں کے ساتھ لشکر قریش مدینے کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب اگرچہ فیصلہ بدر کے بعد ہی ایمان لا چکے تھے لیکن ہنوز مکے میں مقیم تھے۔ انھوں نے قریش کی تمام سازشوں اور تیاریوں کا حال لکھ کر ایک تیز رفتار قاصد کو حضورؐ کے پاس بھیج دیا۔

حضورؐ نے یہ اطلاع پا کر (شوال ۳ھ میں) دو آدمیوں ' انس اور مونس' کو لشکر قریش کی نقل و حرکت کی خبر لانے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے حضورؐ کو یہ اطلاع دی کہ لشکر قریش مدینے کے قریب آچکا ہے بلکہ عریض کی چراگاہ کو صاف کر چکا ہے۔ حضور نے پھر حباب بن منذر کو لشکر کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے واپس آکر صحیح تعداد کا تخمینہ بتایا۔ اس دن ساری رات حضرت سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ نے مسجد نبوی کا پہرہ دے کر قران سعدین پیش کیا اور دوسرے مسلمانوں نے دوسرے خطرے کے محاذوں پر پہرے دیے۔ قریش کی طرف سے حملے کا اندیشہ پیدا ہو چکا تھا۔ اس لیے صبح حضور نے صحابہ سے مشورہ لیا۔ حضورؐ کی خواہش تھی کہ مدینے کے اندر رہ کر ہی مقابلہ کیا جائے۔ اکثر مہاجرین و انصار نے بھی اسی رائے کی حمایت کی، مگر بعض جوشیلے نوجوانوں نے رائے دی کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ راس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول شہر کے اندر رہ کر مقابلہ کرنے کے حق میں تھا۔ جب پرجوش طبقے نے باہر نکل کر مقابلہ کرنے پر زیادہ اصرار کیا تو حضورؐ گھر کے اندر تشریف لے گئے اور مسلح ہو کر باہر تشریف

لائے۔ اب جوشیلے طبقے کو خیال آیا کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا خود حضورؐ کی مرضی کے مطابق نہیں، لیکن حضورؐ صرف ہم لوگوں کے اصرار سے مسلح ہو کر تشریف لے آئے ہیں۔ یہ سوچ کر ان سب نے اپنی رائے واپس لینی چاہی اور حضورؐ کی مرضی کے مطابق اندر رہ کر مقابلہ کرنے پر آمادگی ظاہر کی، لیکن حضورؐ نے فرمایا: "ہتھیار باندھ کر کھولنا ایک نبی کو زیب نہیں دیتا۔"

یہ جمعے کا دن تھا۔ نماز جمعہ سے فارغ ہو کر ایک ہزار کا جیش مدینے سے باہر روانہ ہو گیا۔ عبداللہ بن ابی نے عین وقت پر دغا دی اور بہانہ یہ پیش کیا کہ جب ہماری رائے ہی نہیں مانی گئی تو ہم شہر سے باہر نکل کر لڑائی کرنے میں کیوں ساتھ دیں؟ یہ منافق تین سو کی جمعیت لے کر واپس آگیا اور سرفروش مسلمان صرف سات سو رہ گئے۔ یعنی لشکر قریش میں جتنے صرف زرہ پوش تھے اتنے یہاں سارے مسلمان رہ گئے۔ گویا بدر میں تو ایک اور تین کی نسبت تھی لیکن آج اہل کفر کی تعداد مسلمانوں سے سات گنی سے بھی زیادہ تھی۔

جذبہ فدویت کی انوکھی مثال

مدینے سے باہر آکر حضورؐ نے جیش اسلامی کا جائزہ لیا۔ حضورؐ کم سن بچوں کو چھانٹنے لگے تاکہ انھیں واپس کر دیں۔ اتنے میں ایک کم سن بچے پر نظر پڑی۔ یہ تھے رافع بن خدیج جو اپنے پاؤں کے انگوٹھے کے بل کھڑے ہو کر یہ مظاہرہ کر رہے تھے کہ میں بھی بڑوں میں شامل ہوں اور اتنا کم سن نہیں ہوں کہ میدان غزا سے واپس کر دیا جاؤں۔ رافع کی تدبیر کامیاب رہی اور وہ لشکر میں شامل کر لیے گئے۔ اس کے بعد ایک دوسرے صاحب زادے کی باری آئی۔ یہ تھے سمرہ بن جندب۔ انھیں یہ تدبیر نہ سوجھی، اس لیے حضورؐ نے انھیں الگ کر دیا۔ الگ کرنا تھا کہ یہ مچل گئے اور عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ میں رافع سے زیادہ شہ زور ہوں۔ کشتی کرا کے دیکھ لیا جائے۔ چنانچہ کشتی ہوئی اور واقعی

سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا اور اس طرح اپنا استحقاق پیدا کر کے یہ بھی مجاہدین میں لے لیے گئے۔

یہاں بے ساختہ بنی اسرائیل کا یہ طرز عمل یاد آتا ہے جنہوں نے حضرت موسیٰؑ کو صاف جواب دے دیا تھا کہ "(عمالقہ کے مقابلے میں) آپ اور آپ کا خدا جائے ہم تو یہیں سے بیٹھے تماشا دیکھیں گے۔" اس کے مقابلے میں امت محمدیہ کے ان کم سن بچوں کو دیکھیے کہ کس کس حیلے بہانے سے میدان جنگ میں جانے کے لیے بے تاب ہیں۔

صف آرائی

حضورؐ اپنے ساتھ سرفروشوں کو لیے ہوئے مدینے سے تقریباً چار کوس کے فاصلے پر میدان احد میں پہنچے۔ کوہ احد کو اپنی پشت کی طرف رکھ کر صف آرائی شروع کی۔ مصعب بن عمیرؓ کو علم عنایت کیا۔ زبیر بن عوام کو رسالے کا افسر مقرر کیا۔ بے زرہ پوش فوج کی کمان حمزہ کے سپرد کی۔ پشت کی طرف جو گھاٹی تھی' اس کی ناکے بندی کے لیے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین کیا جس کے افسر عبداللہ بن جبیر تھے۔ ساتھ ہی اس دستے کو یہ ہدایت فرمائی کہ جنگ کا خواہ کوئی نقشہ بھی ہو مگر تم لوگ اس ناکے سے نہ ہٹنا۔

قریش کی صف بندی

قریش کو بدر میں مسلمانوں کی جنگی صلاحیتوں کا اندازہ ہو چکا تھا' اس لیے اب کے بڑی دانائی و ہوشیاری کے ساتھ اپنی صفیں مرتب کیں۔

میمنے میں خالد بن ولید کمان سنبھالے ہوئے ہیں جن کی بہن فاطمہ مردوں کو جوش دلانے کے لیے میدان جنگ میں موجود ہیں' اور جن کو چھوڑ کر بھاگنے کا خیال بھی خالد کے لیے ناقابل برداشت تازیانہ ہے۔ میسرے کے کمان دار عکرمہ ہیں جن کا باپ ابو جہل بدر میں ذلت کے ساتھ مارا جا چکا ہے اور جس

کے جذبہ انتقام سے عکرمہ کا خون کھول رہا ہے۔ پھر عکرمہ کی غیرت کو ابھارنے کے لیے ان کی بیوی ام حکیم رجز خواں ہے۔ سواروں کی افسری اس صفوان کے سپرد ہے جس کا باپ امیہ بدر میں قتل ہو چکا ہے اور جس نے جوش انتقام میں عمیر بن وہب کو حضورؐ کے قتل کے لیے مدینے بھیجا تھا۔ طلحہ کے ہاتھ میں علم ہے۔ تیر اندازوں کی کمان عبداللہ بن ربیعہ کے ہاتھ میں ہے۔ دو سو گھوڑے اس لیے الگ رکھ لیے گئے تھے کہ بوقت ضرورت فوراً میدان میں لائے جاسکیں' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرداران قریش ابو سفیان ہیں اور ان کی بیوی ہند بنت عتبہ رجز خواں عورتوں کی قیادت کر رہی ہیں' اور ان کا وجود سارے قریش کی حمیت و غیرت کو کوہ آتش فشاں بنا رہا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہند کا باپ عتبہ بدر میں حضرت حمزہ کے ہاتھ سے مارا گیا ہے اور اس کے انتقام میں وہ وحشی سے وعدہ کر چکی ہیں کہ اگر تو حمزہؓ کو قتل کر دے تو میں تجھے جبیر کی غلامی سے آزاد کرا دوں گی۔

آغاز جنگ

اس ساز و سامان کے ساتھ قریش نے طبل جنگ بجایا اور سب سے پہلے عورتیں آگے بڑھیں۔ آگے آگے ہند تھیں اور ان کے پیچھے پیچھے چودہ عورتیں۔ یہ سب کی سب جس انداز سے آگے بڑھی ہیں وہ مردان قریش کی غیرت و حمیت کے لیے سب سے بڑا چیلنج تھا۔ کہیں مقتولین بدر کا ندبہ تھا اور کہیں نبرد آزماؤں کو جوش انتقام میں آپے سے باہر کر دینے والے رجز تھے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ عورتیں یہ گا رہی تھیں:

نحن بنات طارق　　　نمشی علی النمارق

ہم دختران ستارہ آسمانی ہیں۔ ہم قالینوں پر چلتے ہیں۔

ان تقبلوا نعانق　　　ان تدبروا نفارق

اگر تم بہادری سے آگے بڑھے تو ہم تمھیں گلے سے لگالیں گے۔ اور اگر پیٹھ دکھائی تو قطع تعلق کرلیں گے۔

فراق غیر وامق

جیسے بے الفت الگ ہو جاتا ہے۔

ان جادو اثر الفاظ میں کیا آگ بھری ہوئی ہے۔ اس کا آج ہم اندازہ ہی نہیں کرسکتے۔ جاہلیت عرب کے ادب اور ان کے جذبات غیرت و انتقام' ان کے ولولہ و جوش' ان کی شجاعت و بے جگری سے جو مورخ واقف ہے وہی اس رجز کی تاثیر کو کچھ سمجھ سکتا ہے۔

اوپر آپ غزوہ بدر کے بیان میں پڑھ چکے ہیں کہ حضرت مجذر نے ابو البختری سے کہا تھا کہ حضورؐ نے تیرے قتل سے منع کیا ہے' اس لیے تجھے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابوالبختری نے کہا کہ میرے رفیق کو بھی جو اس وقت میرے ساتھ ہے' چھوڑ دو۔ مجذرؓ نے کہا کہ اس دشمن دین کو ضرور قتل کروں گا۔ اس پر ابوالبختری نے جو جواب دیا وہ عرب جاہلیت کی غیرت و حمیت کی پوری تصویر ہے۔ ابوالبختری نے کہا کہ: "میں خاتونان عرب کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ ابو البختری نے اپنی جان بچانے کی خاطر اپنے رفیق کا ساتھ چھوڑ دیا۔" یہ کہہ کر اس نے رجز خوانی کرتے ہوئے مجذر پر حملہ کر دیا اور مارا گیا۔

اس واقعے سے آپ اندازہ کر لیجیے کہ میدان احد میں اونچے گھرانوں کی عورتوں کی یہ طنز آمیز اور غیرت افروز رجز خوانی کیا اثر رکھتی ہوگی۔

اس کے بعد ابو عامر ڈیڑھ سو آدمیوں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے میدان میں آیا۔ یہ اصل میں مدینے ہی کا رہنے والا تھا اور ترک وطن کر کے مکے میں آباد ہو گیا تھا۔ قبل از طلوع اسلام یہ بڑا زاہد و پارسا سمجھا جاتا تھا۔ انصار پر بھی اس وقت اس کا اثر تھا۔ یہ پہلے اس لیے میدان میں آیا تھا کہ اپنی دیرینہ پارسائی کی یاد سے انصار کو متاثر کر کے مسلمانوں سے الگ کر لینا چاہتا

تھا۔ مگر ان پر کسی کی رسمی پارسائی کیا اثر ڈال سکتی تھی جب کہ ایک پارس ﷺ کی صحبت میں خود ان کی پارسائی زر خالص بن چکی تھی۔ ہر انصاری کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا۔

کہ دراز و دور بینم رہ و رسم پارسائی

اس کے بعد قریش کا علم بردار طلحہ نکل کر طنز آمیز اور حقارت آمیز لہجے میں مسلمانوں سے مخاطب ہو کر بولا کہ: "ہے کوئی تم میں جو مجھے مار کر دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھ سے مر کر جنت میں پہنچ جائے؟" اس آواز پر خدا کا شیر (علیؓ) بپھرتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے طنز کا جواب ایک ہی ضربت حیدری سے دیا جس کے بعد طلحہ کا طنز حقیقت بن گیا اور وہ مقتولان احد کا عنوان فہرست بن گیا۔

طلحہ کے گرتے ہی اس کے بھائی عثمان نے لپک کر علم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور رجز پڑھتا ہوا آگے بڑھا۔ عورتیں عثمان کے پیچھے رجز خوانی کر رہی تھیں۔ اتنے میں جناب حمزہؓ شہباز کی طرح اپنے شکار پر جھپٹے اور ایک ہی وار میں عثمان شانے سے کمر تک دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔

اس کے بعد لشکر قریش نے عام یلغار سے اس کا جواب دیا جسے حمزہؓ، علیؓ، طلحہؓ، ابو دجانہؓ، نضر بن انس نے اسی شدت سے حملے کو روک دیا اور دونوں بازوؤں کو دباتے چلے گئے۔ اس موقعے پر حضورؐ نے اپنی تلوار بلند کر کے پوچھا: "یہ تلوار کون لیتا ہے؟" بہت سے ہاتھ اس کی طرف لپکے۔ پھر حضورؐ نے فرمایا: "اس کا حق کون ادا کرے گا؟" اس سوال کے بعد سارے ہاتھ واپس ہو گئے۔ مگر ایک خوش قسمت تھا جس نے دریافت کر کے اس حق کو معلوم کر لیا اور لپک کر وہ تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حضورؐ نے اس تلوار کا حق یہ بیان فرمایا کہ اس سے دشمن کو مارتے مارتے اسے ٹیڑھا کر دو۔ یہ تھے سیدنا ابو دجانہؓ سماک بن خرشہ۔ کون جان سکتا

ہے کہ جسے رسولؐ اللہ اپنے دست مبارک سے اپنی مقدس تلوار دیں اور اس اعتماد کے ساتھ دیں کہ اس کا حق ادا کیا جائے گا' اس کی قسمت کا ستارہ کتنی بلندی پر پہنچ گیا ہوگا اور اس کی روحانی و نفسی کیفیات عظمت و سعادت کی کن کن رفعتوں سے ہم کنار ہو رہی ہوں گی۔ بس ہمیں صرف اتنا علم ہے کہ جناب ابودجانہؓ نے یہ تلوار ہاتھ میں لی تو ناز و تبختر کے ساتھ اکڑ اکڑ کر چلنے لگے۔ حضورؐ کی نگاہ ابودجانہؓ کی ظاہری صورت پر بھی تھی اور اس کی معنویت پر بھی۔ اس لیے فرمایا: "خدا کو اس طرح اکڑ کر چلنا پسند نہیں۔ مگر ابودجانہؓ کا اکڑنا اس وقت خدا کو پسند آرہا ہے۔"

یہ انداز اپنے اندر دو پہلو رکھتا تھا۔ ایک اپنی خوش بختی پر ناز تھا اور دوسرے اہل کفر کے مقابلے میں اکڑ تھی۔

ابودجانہؓ نے فی الواقع اس بابرکت تلوار کا کچھ حق بھی ادا کیا۔ ایسا حق جو شاید کسی دوسرے کے ذہن میں بھی نہ آتا۔ یہ اس تلوار کو ہاتھ میں لے کر یہ محسوس کر رہے ہوں گے کہ کائنات کی ساری فاتحانہ قوتیں اور بہادرانہ ولولہ و جوش سمٹ کر ان کے قبضے میں آگئے ہیں' اس لیے پوری بے جگری کے ساتھ لڑتے اور صفوں کو الٹتے جا رہے تھے کہ سامنے ایک عورت آگئی۔ کون؟ ساری عداوتوں کے ہیرو اور سردار قریش ابوسفیان کی بیوی ہند' جو اپنی اور اپنی رفیقاؤں کی رجز خوانی سے قریش میں آگ لگا رہی ہے۔ ہند کے سامنے آنے کے بعد اسے قتل کر دینے کا اس سے بہتر اور برمحل کون سا موقع مل سکتا تھے؟ ابودجانہؓ بجلی کی طرح لپکے اور ہند پر وار کر ہی دیا۔ ابھی تلوار ہند کے سر کے قریب پہنچی ہی تھی کہ ابودجانہؓ نے دفعتہً" یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ کھینچ لیا کہ:

رسولؐ اللہ کی تلوار کسی عورت پر چلانا اس تلوار کے احترام کے خلاف ہے۔

لمحہ فکریہ

ہر سیرت نگار ابودجانہؓ کے اس واقعے کو بس اسی قدر کہہ کر گزر جاتا

ہے' لیکن ہماری نگاہوں میں یہ واقعہ غزوہ احد کا ایک ایسا شاہ کار ہے جس میں بڑی اعلیٰ اقدار سموئی ہوئی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ عین حالت جنگ میں بھی جناب ابو دجانہؓ نے ان جنگی اقدار کا لحاظ رکھا جس کی تعلیم حضورؐ نے دی تھی۔ ان میں ایک قدر یہ بھی تھی کہ عورتوں' بچوں اور بوڑھوں کو نہ قتل کیا جائے۔

۲۔ جناب ابو دجانہؓ کو اپنے جذبات پر کتنا قابو تھا کہ گرمی قتال کے جوش و شدت میں بھی اپنے دماغی توازن کو اس طرح برقرار رکھا جب کہ عام طور پر لوگ اس بدحواسی میں اندھے ہو جاتے ہیں۔

۳۔ لاٹھی یا تلوار کی ضرب جب چل چکے تو چوٹ لگائے بغیر درمیان میں رک نہیں سکتی۔ لیکن سیدنا ابو دجانہؓ کی چابک دستی کا یہ کمال بڑا قابل غور ہے کہ تلوار کا بھرپور ہاتھ چل چکنے کے بعد بھی سر کے پاس پہنچ کر واپس ہو جاتا ہے۔ راقم الحروف ضرب و حرب (لاٹھی' گدکے' بنوٹ وغیرہ) سے کسی قدر واقف ہے اور وہ جب ابو دجانہؓ کی اس "قادر ضربی" پر غور کرتا ہے تو عقل حیران ہو جاتی ہے۔

۴۔ جناب ابو دجانہؓ کے دل میں سیف نبوی کے احترام کا یہ حال ہے کہ اس کو ایک کافرہ اور دشمن عورت کے خون سے رنگین کرنا نہیں چاہتا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خود صاحب سیف صلی اللہ علیہ وسلم کا اور آپؐ کے فرامین کا کس درجے کا احترام ہو گا۔

۵۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ یہ تلوار رحمتہ للعلمینؐ کی تھی' اور فی الواقع کسی عورت کے خون سے اس کا رنگین ہونا اس کے احترام کے خلاف تھا' تاہم ابو دجانہؓ کے ہاتھ سے یہ تلوار ایک عورت کا سر اڑانے کے لیے حرکت میں آچکی تھی۔ اس لیے یہ چلی بھی تو رحمت بن کر چلی۔ ہند کی گردن تو نہ کٹی مگر کفر کی گردن گویا اسی وقت اڑ گئی۔ یہی ہند فتح مکہ کے بعد

ایمان لاتی ہے اور یہی احد میں رجز خوانی کر کر کے اہل کفر کو ابھارنے والی کل جنگ یرموک میں اس شان سے آتی ہے کہ اپنی رجز خوانیوں سے مسلمانوں میں غیر معمولی جوش و ولولہ پیدا کر رہی ہے۔ ابو دجانہؓ کے ہاتھ میں رسولؐ اللہ کی تلوار تھی' اس لیے جب ہند پر چلی بھی تو رحمت بن کر چلی۔

شہادت حمزہؓ

بدر میں جبیر بن مطعم کا چچا طعیمہ بن عدی اور ہند کا باپ عتبہ دونوں حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے۔ اس سے جذبہ انتقام دونوں میں موجود تھا۔ ہند کے توجہ دلانے سے جبیر نے اپنے ایک حبشی غلام ——— وحشی نامی ——— سے کہا کہ اگر تو میرے چچا کے عوض محمدؐ کے چچا حمزہؓ کو قتل کر دے تو میں تجھے آزاد کر دوں گا۔ احد کے موقع پر یہ وحشی ایک درخت یا پتھر کی اوٹ میں چھپ گیا اور حضرت حمزہؓ کی تاک میں لگا رہا۔ حمزہؓ صفوں کو الٹتے ہوئے غبار آلود اونٹ کی طرح دوڑ رہے تھے اور کوئی ان کے مقابلے پر آ کر ٹک نہ سکتا تھا۔ اتنے میں سباع بن عبدالعزیٰ غبشانی کو قتل کر کے وحشی کے پاس سے گزرے اور اس نے نشانہ تاک کر حربہ (ایک چھوٹا نیزہ جسے پھینک کر مارنے میں حبشیوں کو کمال حاصل تھا) پھینکا اور حضرت حمزہؓ کی ناف یا سینے میں لگ کر آرپار ہو گیا۔ حمزہؓ وحشی کی طرف اس حالت میں بھی لپکے مگر لڑکھڑا کر گر گئے اور پھر نہ اٹھ سکے۔

یہاں یہ چیز دیکھنے کے قابل ہے کہ ادھر ایک عورت ہے اور حضرت ابو دجانہؓ اس پر تلوار چلانا سیف نبوی کے احترام کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس شرافت و انسانیت کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جب حضرت حمزہؓ شہید ہو جاتے ہیں تو دشمن ان کے کان ناک وغیرہ کاٹ کر ہار بناتے ہیں۔ لاش کا مثلہ کرتے ہیں اور وہی عورت (ہند) ان کا جگر نکال کر چباتی ہے' اور نگلنے کی کوشش میں

ناکام ہو کر تھوک دیتی ہے۔ اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ جنگی اقدار کا لحاظ کن لوگوں نے رکھا اور یہ کس کی تعلیم کا اثر تھا؟

حنظلہ کی شہادت

یہ منظر بھی دنیا میں کم دیکھا گیا ہو گا کہ ادھر قریشی لشکر کی قیادت ابو عامر کر رہا ہے اور ادھر اسی کے نوجوان فرزند حضرت حنظلہؓ ایک عجیب انداز سے سرفروشی کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ یہ نوجوان تھے۔ ابھی ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ یہ اپنی لذت گیریوں میں محو تھے کہ قتال کے لیے منادی سنی اور فوراً اٹھ کر روانہ ہو گئے۔ غسل کرنا چاہتے تھے لیکن یہ سوچا کہ اس پکار پر لبیک کہنے میں کہیں تاخیر نہ ہو جائے۔ ویسے ہی بے نہائے روانہ ہو گئے۔ میدان جنگ میں آئے تو حضورؐ سے اپنے باپ ابو عامر پر حملہ کرنے کی اجازت چاہی لیکن رحمتہ للعالمینؐ نے اسے گوارا نہ کیا۔ آخر یہ ابو سفیانؓ پر حملہ آور ہوئے لیکن راستے ہی میں شداد بن اسود نے ان پر وار کر دیا جس سے یہ جاں بر نہ ہو سکے۔

ابن اسحاق کی ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "حنظلہؓ کو ملائکہ غسل دے رہے ہیں۔" چونکہ منادی جہاد کے بعد ان کو غسل جنابت کا موقع نہ مل سکا اور وہ اسی حالت میں شہید ہو گئے' اس لیے یہ شرف انھیں حاصل ہوا۔ راہ مولیٰ میں جو بھی ہو اس کی کچھ قدر و قیمت ہوتی ہے۔ ایک بات عام حالات میں معمولی بلکہ مکروہ ہوتی ہے اور دوسرے موقعے پر بڑی قیمتی اور قابل قدر ہوتی ہے۔ خون ناپاک ہے لیکن قتیل فی سبیل اللہ کا خون پاک ہے اور انھیں ان ہی خون کے دھبوں کے ساتھ دفن کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جنابت ایک ناپاکی ہے لیکن راہ خدا میں یہ حالت بھی بڑی قابل قدر ہے۔ ان ہی مواقع کے لیے مولانا رومی نے کہا ہے:

خون شہیداں راز آب اولیٰ تر است
ایں خطا از صد صواب اولیٰ تر است
در حق او شہد و در حق تو سم
در حق او مدح و در حق تو ذم

فاش غلطی

یہ صحیح ہے کہ اس جنگ کے آغاز ہی میں مسلمانوں کی قیمتی جانیں کام آئیں تاہم جاں نثار بہادروں کے بے پناہ حملوں نے قریش کے چھکے چھڑا دیے اور انھوں نے میدان جنگ سے بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمان یہ سمجھے کہ اب جنگ کا نقشہ ہمارے حق میں پلٹ چکا ہے اور دشمن بھاگ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر انھوں نے مال غنیمت پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ تیر اندازوں نے جب یہ دیکھا تو ان کو بھی یہ گمان ہوا کہ اب اس درے کی حفاظت کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ سوچ کر وہ بھی مال غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے۔ ان کے افسر حضرت عبداللہ بن جبیر ان کو سمجھاتے رہے' روکتے رہے مگر کسی نے ایک نہ سنی اور کم و بیش دس کے سوا سب اس اہم ناکے کو چھوڑ کر چل دیے۔

اس فاش غلطی کا جو نتیجہ نکلا وہ بہت ہولناک تھا۔ قریش کے سپہ سالار اس وقت خالد بن ولید تھے۔ انھوں نے اس ناکے کو خالی دیکھا تو ایک دستہ لے کر ادھر پل پڑے۔ چند تیر اندازوں نے پوری بے جگری سے مقابلہ کیا۔ لیکن سب کے سب درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ اب کوئی روک نہ باقی رہی تھی' اس لیے خالد نے بھی پورے زور شور سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ غنیمت سمیٹنے والوں کو اب ہوش آیا لیکن انھیں محسوس ہوا کہ وہ خود دشمنوں کے نرغے میں آگئے ہیں۔

یہ مسلمانوں پر انتہائی نازک وقت تھا۔ ہر طرف افراتفری اور

سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی، حتی کہ بعض مواقع پر وہ اپنوں اور بیگانوں کی بھی تمیز نہ کر سکے۔ حضرت حذیفہ کے والد یمان خود مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے شہید ہوگئے۔ بہت سے جاں بازوں کے قدم اکھڑ گئے۔

حضرت مصعب بن عمیر حضورؐ سے کچھ ظاہری مشابہت رکھتے تھے۔ یہ لڑتے لڑتے مارے گئے تو افواہ پھیل گئی کہ حضورؐ شہید ہوگئے۔ اس جھوٹی افواہ سے مسلمانوں کے رہے سہے حواس بھی مختل ہوگئے اور سخت ابتری پھیل گئی۔ کچھ لوگ بدستور لڑ رہے تھے تو کچھ میدان سے واپس آ رہے تھے۔ بعض کنارے بیٹھ کر فکر انجام میں غرق ہو رہے تھے۔ اور بعض حضورؐ کی تلاش میں ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

انس بن نضر کی شہادت

انس بن نضر لڑتے ہوئے آ رہے تھے کہ ان کی نظر حضرت عمرؓ پر پڑی جو ہتھیار پھینک کر حیرانی کے عالم میں کھڑے تھے۔ انسؓ نے پوچھا کہ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ جناب عمرؓ نے جواب دیا کہ جب رسولؐ اللہ ہی نہ رہے تو اب لڑ کر کیا کریں گے؟ انس نے کہا کہ یوں کیوں نہیں کہتے کہ جب رسولؐ اللہ ہی نہ رہے تو ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے؟ جس نصب العین کے لیے حضورؐ نے جان دی اسی پر تم بھی اپنی جان دے دو۔ انس یہ کہہ کر لشکر اعدا پر ٹوٹ پڑے اور داد شجاعت دیتے ہوئے مقام شہادت پر فائز ہوگئے۔ ان کے جسم پر اسی زخم لگے تھے۔ لاش پہچانی نہ جاتی تھی۔ ان کی بہن نے انگلی دیکھ کر انھیں پہچانا۔

مرکز کائنات پر یورش

لشکر اعدا نے حضورؐ پر بھی حملہ کیا۔ اس وقت حضورؐ تنہا تھے اور ایک چادر سے منہ لپیٹے ہوئے تھے۔ دشمنوں نے حضورؐ کو تنہا پا کر حملہ کیا تو حضورؐ

نے مٹھی میں کنکریاں اٹھا کر دشمنوں کی طرف پھینکیں۔ یہ خدا بہتر جانتا ہے کہ ان کنکریوں میں کیا زور تھا؟ بہر حال دشمن پیچھے ہٹ گئے۔ غالباً" سب سے پہلے سعد بن ابی وقاص نے حضورؐ کو پہچان کر آواز دی اور ہر طرف سے لوگ حضورؐ کی حفاظت کے لیے دوڑ پڑے۔ اس افراتفری میں کون یقین کے ساتھ بتا سکتا ہے کہ پہلے حضورؐ کے پاس کون پہنچا۔ جو لوگ حضورؐ کے گرد جمع ہو گئے وہ یہ ہیں:

ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، عبدالرحمان بن عوف، سعد بن ابی وقاصؓ، طلحہؓ، زبیر، ابوعبیدہؓ، ابودجانہؓ، حباب بن منذر، عاصم بن ثابت، حارث بن صمہ، سہل بن حنیف، سعد بن معاذ، اسید بن حضیرا اور سعد بن عبادہ وغیرہم۔

سعد بن ابی وقاص کا درجہ

سعد بن ابی وقاص کا ترکش تیر چلاتے چلاتے خالی ہو گیا تو حضورؐ نے اپنا ترکش انڈیل دیا اور فرمایا۔ ارم یا سعد فداک ابی و امی اے سعد تیر چلائے جا، تجھ پر میرے ماں باپ قربان ہوں ـــــ اللہ! اللہ! حضورؐ کے اس ایک جملے میں سعد کی کتنی سعادتیں اور فضیلتیں سمٹی ہوئی ہیں۔ فضائل و مناقب کا ایک اتھاہ سمندر ایک کوزے میں بند ہے۔ دنیا کا کون خوش بخت ہے جس کا کوئی عمل اسے اس بلند مرتبے پر پہنچا سکے۔

ابو طلحہؓ کی شجاعت

ابو طلحہؓ اور سہل بن حنیف کے آگے بھی حضورؐ ہر گزرنے والے سے تیر ڈلواتے جاتے تھے۔ اس دن دو یا تین کمانیں ابو طلحہؓ کے ہاتھ سے ٹوٹیں۔

ابو دجانہؓ کی جاں نثاری

ابو دجانہؓ حضورؐ کو اس طرح گھیرے کھڑے تھے کہ دشمنوں کے جتنے

تیر حضورؐ کی طرف آتے وہ اپنی پشت یا کمر پر لے لیتے۔

عمارہؓ کا نصیبہ

عمارہ بن یزید بن سکن (یا زیاد بن سکن) کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ حضورؐ نے اس یورش میں اعلان فرمایا کہ آج کون جاں نثاری کا ثبوت دیتا ہے؟ یہ سن کر زیاد بن سکن (یا عمارہ بن زیاد) پانچ اور انصاریوں کو لے کر بڑھے اور ایک ایک نے اپنی جان کی قربانی دی۔ عمارہ (یا زیاد) میدان میں ایک بے حرکت لاش کی طرح پڑے تھے۔ حضورؐ نے انھیں لانے کا حکم دیا۔ لاش قریب آئی تو اس کی چند سانسیں باقی تھیں۔ حضورؐ کو دیکھتے ہی یہ بے حس و حرکت مقتول پھڑکا اور تڑپ کر اپنا رخسارہ حضورؐ کے قدموں پر رکھ دیا اور شہادت کی آخری ہچکی لے کر ختم ہو گیا۔

سر بوقت ذبح اپنا ان کے زیر پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

طلحہؓ کی جاں نثاری

حضرت طلحہؓ ہر اس تیر کو جو حضورؐ کی طرف آتا اپنے ہاتھ پر روک لیتے، آخر ان کا ایک ہاتھ شل ہو کر رہ گیا۔

نسیبہ خاتون کی بہادری

ایک خاتون نسیبہ بنت کعب مازنیہ مشکیزہ بھر بھر کر پیاسوں کو پانی پلانے کی خدمت انجام دے رہی تھی۔ حضورؐ پر جب یورش ہوئی تو اس نے مشکیزہ رکھ دیا اور تلوار سونت کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی چستی اور چابک دستی کا یہ عالم تھا کہ حضورؐ خود فرماتے ہیں کہ: "میں دائیں بائیں جس طرف بھی نظر کرتا تھا نسیبہ کو کسی نہ کسی پر تلوار سے حملہ کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔" اس بہادر

خاتون نے بارہ زخم کھائے لیکن کمزوری نہ دکھائی۔

ہند کی قربانیاں

ہند نامی ایک خاتون تھیں۔ یہ انصاریہ بنی دینار سے تھیں (بعض روایتوں میں ان کا نام ام ایمن اور بعض میں عاصمہ بتایا گیا ہے)۔ ان کے شوہر، بھائی اور فرزند جنگ میں کام آئے۔ ہر ایک کی خبر شہادت سن کر صبر کیا لیکن جب حضورؐ کی بابت غلط افواہ شہادت پھیلی تو بے اختیار گھر سے باہر نکل پڑیں۔ لوگوں نے میدان جنگ میں ان کو ان کے مقتول عزیزوں کی لاشیں دکھائیں، مگر انھوں نے کسی کی طرف توجہ نہ دی اور یہی کہتی گئی! حضورؐ کی خبر سناؤ۔ جب حضورؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو خوشی سے ہنس پڑیں اور بولیں: کل مصیبنه بعدک جلل یا رسول اللہ (یا رسول اللہ اب مجھے کسی کا کوئی غم نہیں رہا)۔

سعد بن الربیع کا پیغام

سعد بن الربیع اسی معرکہ احد میں کام آئے۔ ان کو تلاش کرنے کے لیے حضورؐ نے خود ایک آدمی بھیجا۔ جب یہ سعد کے پاس آیا تو اس وقت حضرت سعد دم توڑ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے آخری وقت میں ایک پیغام دیا کہ: "رسولؐ اللہ کو میرا سلام پہنچا دو اور مسلمانوں کو یہ پیغام دے دو کہ آخری وقت تک بھی اگر دشمن حضورؐ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو تم اللہ کی بارگاہ میں اپنا کوئی عذر نہ پیش کر سکو گے۔"

عمیر بن حمام کا شوق شہادت

جناب عمیر بن حمام میدان کے کنارے کھجوریں کھا رہے تھے۔ انھوں نے حضورؐ کو دیکھ کر عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! اگر میں راہ خدا میں لڑتا ہوا مارا

جاؤں تو مجھے کیا ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا: "جنت"۔ عمیرؓ نے اپنی مٹھی میں ساری کھجوریں ایک ہی بار منہ میں رکھ لیں اور چبانے لگے۔ مگر ابھی پوری طرح چبانے بھی نہ پائے تھے کہ ساری کھجوریں اگل دیں اور کہا کہ جنت لینے کے لیے اتنی تاخیر بھی (کہ چبا کر نگل جائیں) مناسب نہیں۔ کھجوریں اگل کر میدان میں گھس گئے اور جلد ہی جاں بازی دکھاتے ہوئے راہ خدا میں شہید ہو گئے۔

عورتوں کی خدمات

کچھ عورتیں دوسری قسم کے جہاد میں مصروف تھیں، اور وہ تھا پیاسوں کو پانی پلانا اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا۔ حضرت عائشہؓ، فاطمہ زہراؓ، ام سلیطؓ اور ام سلیمؓ وغیرہ یہ خدمت انجام دے رہی تھیں۔

حضورؐ کو اذیتیں

حضورؐ پر ایک پتھر اتنی زور سے لگا کہ حضورؐ پہلو کے بل گر پڑے۔ عتبہ بن ابی وقاص کے پتھر سے حضورؐ کے نیچے کا دانت ٹوٹ گیا۔ ابن قمیہ نے حضورؐ کے وجنہ (گال کا بالائی حصہ) کو زخمی کر دیا۔ وجنے میں خود کی دو کڑیاں بھی گڑ گئیں اور ہجوم کی زد سے حضورؐ ایک گڑھے میں گر گئے اور حضورؐ کے گھٹنے چھل گئے۔ ابو عبیدہؓ، ابو بکرؓ، اور عتبہؓ بن وہب نے اپنے اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچا تو یہ کڑیاں نکل سکیں۔ ابو عبیدہ کے دو دانت اسی کوشش میں ٹوٹ گئے۔ حضورؐ نے گڑھے سے باہر آنا چاہا تو حضرت طلحہؓ نے آپ کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیا اور حضورؐ کو گڑھے سے باہر لے آئے۔ حضرت طلحہؓ کے ایک پاؤں میں لنگ تھا لیکن اس موقعے پر انھوں نے اپنے پاؤں پر پورا زور ڈال کر حضورؐ کو اٹھا لیا اور اس دن سے ان کے پاؤں کا لنگ بھی دور ہو گیا۔

غلط افواہ

یہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حضرت مصعب بن عمیر حضورؐ سے بڑی شباہت رکھتے تھے۔ وہ جب شہید ہوئے تو یہ افواہ اڑ گئی کہ حضورؐ شہید ہو گئے۔ یہی وہ وقت تھا جب اہل اسلام میں انتہائی سراسیمگی پھیل گئی۔ حسن اتفاق سے کعب بن مالک انصاری نے مغفر (خود) کے اندر سے حضورؐ کی آنکھوں کو دیکھ کر پہچان لیا اور آواز دی کہ حضورؐ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ اس آواز نے پست حوصلوں میں تازہ روح پھونک دی اور سب کے سب تازہ دم ہو کر پلٹ پڑے۔

حضرت علیؓ سپر میں پانی لا رہے تھے اور حضرت فاطمہؓ حضورؐ کے زخموں کو دھو رہی تھیں۔ خون بند نہ ہوا تو چٹائی کو جلا کر زخموں پر لگایا۔

حضورؐ پہاڑی پر

اب جب کہ مسلمان نئی روح کے ساتھ پلٹے تو لشکر قریش مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور وہ بکھرنے لگا۔ اس وقت حضورؐ چند صحابہؓ کو لے کر پہاڑی پر چڑھ گئے۔ خالد اور ابو سفیان نے یہاں بھی کئی بار حملے کیے لیکن حضرت عمرؓ کے بے پناہ حملوں نے ہر بار انھیں پسپا کر دیا۔

جنگ کی عجیب قدریں

اس وقت حضورؐ کے زخموں سے خون جاری تھا۔ بعض صحابہؓ نے درخواست کی کہ یا رسولؐ اللہ ان ظالموں کے لیے بددعا فرمائیے۔ اس درخواست کے جواب میں زبان رسالت کو جنبش ہوئی اور یہ الفاظ نکلے کہ رب اھد قومی فانھم لا یعلمون (خداوندا میری قوم کو ہدایت دے کیوں کہ یہ علم و فہم نہیں رکھتے)۔

اللہ اکبر! اقدار انسانی کی کتنی وسیع دنیا اس ایک جملے میں سمٹی ہوئی ہے۔ ذرا سوچیے۔ جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ تلواریں انسانی خون سے رنگین ہو رہی ہیں۔ جو عداوت و دشمنی کفار قریش کو اہل اسلام سے تھی' بالکل وہی دشمنی اہل اسلام کو بھی کفار قریش سے ہونی چاہیے۔ اسی باہمی دشمنی کی وجہ سے دونوں گروہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو رہے تھے۔ بہ ظاہر جنگی سرگرمیاں اور نبرد آزمائیاں جیسی ادھر ہو رہی تھیں بالکل ویسی ہی ادھر بھی تھیں۔ دور سے اس جنگ کو دیکھنے والا صرف یہی سمجھے گا کہ نتیجہ جنگ میں محض ایک گروہ یا قوم کی فتح اور دوسرے کی شکست ہوگی۔ اگر وہ بے تعلق ہو گا تو اس کے لیے دونوں میں سے کسی ایک کی فتح اور دوسرے کی شکست تقریباً یکساں اثر رکھے گی۔ لیکن اگر وہ انسانی اقدار کے نقطہ نگاہ سے دیکھے تو صرف حضورؐ کے یہ کلمات (رب اھد قومی فانھم لایعلمون) دونوں متحارب گروہوں کی جنگ کی نوعیت اور مقصد کے فرق کو واضح کر دیں گے۔

دعا کیا ہے؟ ایک تمنائے دروں اور دلی آرزو ہے۔ اگر اہل کفر سے دریافت کیا جاتا تو ان کی تمنا اور آرزو یہی ہوتی کہ یہ لڑنے والے مسلمان برباد و ہلاک ہوں اور ذلت و نامرادی سے دوچار ہوں۔ بلکہ اگر کسی مسلمان سے بھی اس کی تمنا دریافت کی جاتی تو اس کی آرزو یہی ہوتی کہ کفار ہلاک ہوں اور اسی وجہ سے بعض مسلمانوں نے حضورؐ سے بددعا کی پہلی بار درخواست کی۔ لیکن جس رسول کا مقصد حیات ہی اقدار اخلاق کا قیام تھا وہ اسی مقصد جنگ کو واشگاف الفاظ میں اپنے ان مبارک کلمات دعا کے بین السطور سے بیان کرتا ہے کہ ہمارا مقصد کسی انسان کی بربادی نہیں بلکہ اس کی خیر خواہی ہے۔ جنگ تو صرف محافظین اقدار کے تحفظ کے لیے کی جا رہی ہے ورنہ مقصد ایسے اعلیٰ اقدار کا قیام ہے جو انسانی زندگی کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنا دیں۔ دشمنی کسی انسان سے نہیں بلکہ شر سے ہے۔ انسانی خدمت انسان کی بربادی نہیں بلکہ اس

شر کی بربادی ہے جو انسان کو گھیرے ہوئے ہے۔ ایک اچھے طبیب کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ مرض دور ہو نہ کہ مریض ختم ہو جائے۔ مریض سے ہمدردی ہونی چاہیے نہ کہ نفرت و عدوات۔ مریض کا کوئی عضو صرف اس وقت کاٹا جاتا ہے جب اس کے اچھے ہونے کی کوئی سبیل نہ باقی رہے اور اس کی وجہ سے دوسرے اعضا کے بھی خراب ہو جانے کا یقینی اندیشہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح اخلاقی و روحانی مریض کے ساتھ کمال درجے کی ہمدردی ہی تقاضائے انسانیت ہے۔ ہمدردی کا مقتضا یہ ہے کہ آخری سانس تک اس کی صحت کی کوشش کی جائے اور اس کی بربادی اس وقت تک نہ چاہی جائے جب تک اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار نہ ہو اور اس کا وجود دوسروں کے لیے یقینی خطرہ نہ بن چکا ہو۔ یہی ہے اخلاقی اقدار کی وہ اعلیٰ تعلیم جو حضورؐ کے ان دعائیہ کلمات میں موجود ہے' اور آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ ازلی بدقسمتوں کے سوا وہ تمام لوگ جو آج دشمنوں کی صف میں کھڑے تھے آخر کار اسلام لے آئے' اور اقدار انسانی کے خادم ثابت ہوئے۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ بعض صحابہ ان دشمنوں کی ہلاکت کی تمنا اور درخواست کر رہے ہیں لیکن حضورؐ ان دشمنوں کی طرف سے بارگاہ الٰہی میں الٹی وکالت فرما رہے ہیں۔ گویا یہ فرما رہے ہیں کہ یہ نادان ہیں اس لیے اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی کر رہے ہیں۔ ان کا مرض نادانی و جہل ہے۔ لہٰذا انہیں برباد نہ کر بلکہ ان کا وہ مرض دور کر دے جس کی وجہ سے یہ حق سے برسرپیکار ہیں۔ ان کے اندر جب علم صحیح پیدا ہو گا تو یہ خود ہی اپنی نادانی سے باز آجائیں گے ——— ذرا اچھی طرح غور کیجئے۔ کیا انسانیت کی محبت کی اس سے بڑی کوئی نظیر مل سکتی ہے؟

زبان کی جنگ

جب جنگ شروع ہوتی ہے تو ہر چیز کی جنگ ہوتی ہے۔ دل و دماغ کی

جنگ' ہاتھ پاؤں کی جنگ ہتھیاروں کی جنگ' مال کی جنگ' قلم کی جنگ اور زبان کی جنگ -آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ کفار قریش نے جنگ کی آگ کو زیادہ سے زیادہ مشتعل کرنے کے لیے اپنے جادو بیان خطبا اور آتش زبان شعرا کو ہر طرف دوڑا دیا تھا۔ عین میدان جنگ میں بھی ہند بہت سی عورتوں کے ساتھ رجز پڑھتی ہوئی مارچ کر رہی تھیں۔ آج کل منشورات' جرائد اور ریڈیو یہی کام کرتے ہیں۔ اسے بھی ایک ہتھیار ہی سمجھنا چاہیے۔ حربے صرف فولاد ہی کے نہیں ہوتے۔ یہ سب بھی اسلحہ ہیں اور جب دشمن ان سے غلط پروپیگنڈے کا کام لے تو ان ہی ذرائع سے کام لینا ہم پر بھی واجب ہو جاتا ہے۔

زبان کی جنگ اور دشمن کا اس چیز میں بھی مقابلہ کرنے کی مثال ہمیں غزوہ احد میں ملتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جنگ کے نتیجے میں دونوں فریق تھک چکے تھے اور جنگ گویا ختم ہو چکی تھی۔ ابوسفیان کو یہ گمان تھا کہ مسلمان ہمت ہار چکے ہیں اور ان کے حوصلے پست ہو چکے ہیں۔ قریش اپنی طرف واپس جا رہے تھے اور مسلمان اپنی طرف سمٹ کر پہاڑی پر یا ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ ابوسفیان نے مسلمانوں کے دم خم کا اندازہ کرنے کے لیے حضورؐ کا نام لے کر پکارا اور للکارا۔ حضورؐ نے صحابہ سے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد ابوسفیان نے ابوبکرؓ کا نام لے کر آواز دی۔ مسلمان پھر خاموش رہے۔ پھر اس نے حضرت عمرؓ کا نام لے کر آواز دی۔ مسلمان پھر بھی چپ رہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ: "معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ختم ہو گئے ہیں' اسی لیے کسی طرف سے جواب نہیں آتا۔" حضرت عمرؓ میں یارائے ضبط نہ رہا اور زور سے چلا کر بولے: "او دشمن خدا! ہم سب زندہ ہیں۔" پھر ابوسفیان نے کہا: اعلیٰ ھبل (ہبل دیوتا کا نام اونچا رہے)۔ صحابہ نے جواب دیا: اللّٰہ اعز وجل (اللہ سب سے بلند و بالا ہے)۔ پھر اس نے کہا: لنا العزیٰ ولاعزی لکم (ہمارے پاس عزیٰ ہے اور تم اس سے محروم ہو)۔ (عزیٰ دیوی کا نام بھی ہے اور عزت

کے معنی میں بھی ہے)۔ صحابہ نے جواب دیا: اللّٰہ مولنا ولا مولٰی لکم (ہمارا مولٰی اللہ ہے جس سے تم محروم ہو)۔ ابوسفیان کے ہر جملے کا جواب خود حضورؐ بتاتے جاتے تھے اور صحابہ اسے بلند آواز سے کہتے تھے۔

اس سوال و جواب کا مقابلہ اپنے دور کے متحارب پروپیگنڈے سے کیجیے تو آسمان زمین کا فرق نظر آئے گا۔ آج ایک جھوٹ کے جواب میں دس جھوٹ نشر کرنا پروپیگنڈے کے فن کا کمال سمجھا جاتا ہے لیکن یہاں دیکھیے۔ ابوسفیان کے جواب میں جو کچھ بھی کہا گیا اس میں صداقت بھی ہے اور شرافت بھی۔ گویا زبان کی جنگ میں بھی اعلیٰ اقدار ملحوظ ہیں۔

ایک ٹریجڈی

مدینے کے قریب کے بعض قلعوں میں مسلمان عورتیں محفوظ کر دی گئی تھیں جن کی نگرانی کے لیے حضرت ثابت اور حضرت یمان متعین تھے۔ جنگ کے حالات سن کر یہ دونوں بے تابانہ میدان جنگ کی طرف دوڑے۔ ثابت کو تو راستے ہی میں مشرکوں نے مار دیا اور یمان کو مسلمانوں نے نہ پہچانا اور ان پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت حذیفہ چلاتے رہے کہ ارے یہ میرے مسلمان باپ ہیں۔ مگر سراسیمگی اور افراتفری میں کسی نے توجہ نہ دی اور یہ مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے مارے گئے۔ مرتے وقت یمان نے کہا کہ خدا تمھاری اس غلطی کو معاف فرمائے۔ حضورؐ نے یمان کا خون بہا ادا فرمانا چاہا لیکن حذیفہ نے اسے پسند نہ کیا اور خون بہا معاف کر دیا۔

تعاقب کی مصلحت

جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن حضورؐ کو یہ خطرہ ہوا کہ لشکر قریش اہل اسلام کو مغلوب سمجھ کر پھر دوبارہ کہیں حملہ نہ کر دے۔ اس خطرے کے پیش نظر حضورؐ نے ایک جمعیت کو قریش کے تعاقب میں بھیجا جو مدینے سے آٹھ میل

پر حمراء الاسد تک گئی لیکن کسی دشمن کو نہ پا کر واپس آگئی۔ فوجی نقطہ نگاہ اور سیاسی زاویہ نظر دونوں لحاظ سے یہ تعاقب بڑا اہم تھا۔ اس سے دشمنوں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اہل اسلام ابھی پست حوصلہ نہیں ہوئے ہیں۔ اگر یہ نہ کیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ قریش پھر پلٹ کر حملہ کر دیتے۔

دفن شہدا

اس جنگ میں ستر اہل اسلام کام آئے تھے۔ اختتام جنگ کے بعد لاشوں کو دفن کرنے کا کام باقی تھا۔ مسلمان ایک تو تھک کر چور ہو چکے تھے' دوسرے کفن کی بڑی کمی تھی۔ اس لیے ہر شہید کے لیے الگ قبر نہ کھودی گئی' بلکہ ایک ایک کفن میں دو دو تین تین لاشوں کو لپیٹ کر ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔ نماز جنازہ بھی ہر ایک کی الگ الگ نہ پڑھی گئی بلکہ کئی کئی جنازے ایک ساتھ رکھے جاتے اور ہر نماز کے وقت سیدنا حمزہؓ کے جنازے کو شریک کر لیا جاتا۔

قزمان کی نماز جنازہ

ابن اسحاق کی ایک روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ قزمان نامی ایک شخص کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا کہ یہ جہنمی ہے۔ احد کے موقعے پر اس نے بڑی بہادری سے جنگ کی اور سات آٹھ مشرکوں کو قتل کیا۔ پھر یہ زخمی ہوا تو اس نے بتایا کہ:

والله ان قاتلت الاعن احساب قومی ولولا ذلک ماقاتلت

بخدا میں نے تو محض قومی ناموس کے لیے جنگ کی ہے۔ اگر یہ پیش نظر نہ ہوتا تو میں جنگ بھی نہ کرتا۔ (یعنی اعلائے حق اس کا مقصود نہ تھا بلکہ صرف اپنا قومی وقار مد نظر تھا اور اس جذبے سے کفار قریش بھی خالی نہ تھے)۔

اس کے بعد اس کو زخم کی تکلیف زیادہ ہوئی تو ایک تیر بھونک کر

خودکشی کرلی تاکہ جلدی جان نکل جائے۔

واقعات متفرقہ

اسی سال ۱۵ رمضان کو جناب حسنؓ پیدا ہوئے۔ اسی سال حفصہؓ بنت عمرؓ کو ام المومنین بننے کا اور حضرت عثمانؓ کو ام کلثومؓ بنت رسولؐ اللہ کا شوہر بننے کا شرف حاصل ہوا۔ (اس کی تفصیل اوپر واقعات بدر میں گزر چکی ہے)۔ کہا جاتا ہے کہ قانون وراثت بھی اسی سال نازل ہوا اور مشترکہ عورتوں سے نکاح کی ممانعت بھی اسی سال نازل ہوئی۔

❋ ❋ ❋

(۱۴)
۴ ہجری ——— چند معمولی جھڑپیں

اس میں شک نہیں کہ جنگ بدر نے کفر کی کمر توڑ دی تھی لیکن اہل کفر بھی معمولی حوصلہ نہ رکھتے تھے۔ جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں' میدان احد میں اور زیادہ تیاری کے ساتھ آئے اور اب کے گویا برابر کی چوٹ تھی جس نے دشمنوں کے حوصلے بلند کر دیے۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مختلف اطراف سے راکھ کے ڈھیر سے کئی چنگاریاں ابھریں۔ قریش نے آس پاس کے قبائل کو حملے پر ابھارنا شروع کیا۔

سریہ ابو سلمہ

فید کے کوہستانی علاقے میں ایک مقام ہے قطن۔ یہاں ایک قبیلہ آباد تھا جس کے دو فرد طلیحہ اور مسلمہ (فرزندان خویلد) نے جوش دلا کر مسلمانوں پر حملے کی تیاری کر دی۔ حضورؐ کو اطلاع ہوئی تو آپؐ نے اپنے رضاعی بھائی ابو سلمہؓ کو ڈیڑھ سو مہاجرین و انصار کے ساتھ ادھر روانہ فرمایا۔ کوئی مقابلہ نہ ہوا بلکہ جیش اسلامی کی خبر ملتے ہی سب کے سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ محرم ۴ھ کا واقعہ ہے۔ اس موقعے پر کچھ قیدی اور شتر و غنم بھی ہاتھ آئے۔ ابو سلمہؓ کے ایک کاری زخم احد میں لگا تھا جو اچھا ہو گیا۔ قطن سے واپسی کے بعد زخم کا منہ پھر کھل گیا اور ۲۷ جمادی الاولیٰ کو آپؓ کی وفات ہو گئی اور بعد عدت شوال میں ان کی بیوی ام سلمہؓ کو ام المومنین ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

سریہ ابن انیس

اسی مہینے میں حضورؐ کو اطلاع ملی کہ قبیلہ لحیان کا سردار سفیان بن خالد بھی مدینے پر حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ حضورؐ نے ایک مختصر سی جماعت عبداللہ بن انیس کی سرکردگی میں روانہ فرمائی ۔ عام مقابلے کی بجائے عبداللہ نے بڑی ہوشیاری سے صرف سفیان کو قتل کر کے دشمنوں کی جماعت کو بے سر کر دیا اور یہ فتنہ وہیں ختم ہو گیا۔

لمحہ فکریہ

بہ ظاہر یہ معمولی سی جھڑپیں تھیں لیکن فوجی و سیاسی حیثیت سے بڑی اہم تھیں۔ اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ محض ایک روحانی امام نہ تھے بلکہ ملکی و سیاسی حیثیت سے ہر آن چوکس رہتے تھے کیوں کہ ذرا سی غفلت بھی بعض اوقات دشمن کو یہ موقع دے سکتی تھی کہ اہل اسلام کو مغلوب کر کے اس پورے مشن کو ختم کر دیا جائے جس کے لیے یہ امت برپا ہوئی ہے۔ یہاں ہمیں سنت نبوی میں ایک خاص جنگی قدر یہ ملتی ہے کہ دفاع کے صرف یہی معنی نہیں کہ جب دشمن گھر کے اندر گھس آئے اور تلوار کی دھار گردن پر رکھ دے تب دفاع کے لیے اٹھو۔ یہ بھی عین دفاع ہی ہے کہ دشمن کا ہاتھ اٹھتے ہی اسے قلم کر دیا جائے۔ (اسلام اور جنگ کے عنوان سے ہم اس کی تشریح اوپر کر چکے ہیں)۔

نیا انداز دغا ——— واقعہ بیر معونہ اور عامر کا فریب

کفر و انکار جب کمینہ پن پر اتر آئے تو تقاضائے شجاعت اور کردار کی ستھرائی ختم ہو جاتی ہے اور غیر شریفانہ حرکتیں جنم لینے لگتی ہیں۔ اہل اسلام کو ختم کرنے کے لیے بعض لوگوں نے نئی تدبیریں پیدا کیں جن میں دو واقعے بڑے

اہم ہیں۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ اگلے مہینے ماہ صفر میں بنی کلاب کا سردار ابو برا کلابی خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ چند مبلغوں کو ہمارے ساتھ کر دیا جائے تاکہ وہ ہمارے قبیلے میں چل کر اسلام کی اشاعت کریں۔ حضورؐ نے نجدیوں کی طرف سے خطرے کا اظہار فرمایا مگر ابو برا نے مبلغین کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ حضورؐ نے منذر بن عمرو ساعدی انصاری کی سرکردگی میں ستر (۷۰) معلمین کو بھیج دیا۔ ان کو اس وقت کی اصطلاح میں قراء کہا جاتا تھا۔ ان میں اکثر وہ اصحاب صفہ تھے جو علم دین حاصل کرنے کے لیے وقف تھے اور ان کی معاشی زندگی یہ تھی کہ کچھ لوگ ادھر ادھر سے لکڑیاں لا کر فروخت کرتے اور اس میں خود بھی کھاتے اور اپنے بھائیوں کو بھی کھلاتے ——— قافلہ مبلغین بیر معونہ پہنچ کر مقیم ہوا۔ حرامؓ بن ملحان کو حضورؐ کا نامہ مبارک دے کر رئیس قبیلہ کلاب عامر بن طفیل عامری کے پاس بھیجا۔ عامر نے حرامؓ کو وہیں قتل کرا دیا۔ اور اردگرد کے قبیلوں ——— عصیہ، رعل، ذکوان ——— کے پاس آدمی دوڑا دیے۔ یہ سب مل کر ایک لشکر تیار ہو گیا اور عامر اپنی قیادت میں ان سب کو لے کر چلا۔ ادھر یہ مبلغین حرام کا تادیر انتظار کرنے کے بعد خود چل پڑے۔ راستے میں عامر اپنے جم غفیر کے ساتھ ملا اور ان سب مبلغین کو گھیرے میں لے لیا اور ان سب نہتوں کو قتل کر دیا۔ صرف دو آدمی بچ نکلے۔ ایک تھے کعب بن زیدؓ جو زخمی ہو کر گر گئے تھے۔ اور دشمنوں نے انھیں مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ دوسرے عمرو بن امیہ تھے۔ ان کو عامر نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ: "میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی لہٰذا میں تم کو چھوڑتا ہوں۔"

یہ عمرو بن امیہ واپس آنے لگے تو دو عامریوں کو بطور انتقام قتل کر دیا۔ ان کو حضورؐ امان دے چکے تھے لیکن عمرو بن امیہ کو اس کی خبر نہ تھی۔

حضورؐ کو جب ان تمام واقعات کی اطلاع ملی تو دو صدمے ہوئے۔ ایک یہ کہ عمروؓ بن امیہ نے ان دو عامریوں کو کیوں قتل کیا جن کو حضورؐ امان دے چکے تھے۔ حضورؐ نے دستور کے مطابق ان کی یوں تلافی فرمائی کہ ان دونوں مقتولوں کا خون بہا ادا کرنے کا اعلان فرما دیا۔ دوسرا صدمہ ان ارسٹھ (۶۸) مبلغین کے قتل کیے جانے کا تھا۔ یہ قتل چوں کہ دھوکے سے کیا گیا تھا اس لیے حضورؐ کو بڑا صدمہ ہوا اور ایک ماہ تک نماز صبح میں ان دغا بازوں کے لیے بددعا فرماتے رہے۔

لمحہ فکریہ

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جب ابوبرا کلابی نے حضورؐ سے مبلغین بھیجنے کی درخواست کی تو حضورؐ کو بجا طور پر دغا کا اندیشہ پیدا ہوا تھا کیوں کہ حضورؐ ایک ایک قبیلے بلکہ ایک ایک فرد کی فطرت سے واقف تھے۔ لیکن یہاں دو قدروں میں ٹکراؤ پیدا ہو گیا۔ ایک طرف جذبہ تبلیغ و اشاعت تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ ایک شخص درخواست کر رہا ہے اور مبلغین کی حفاظت کا ذمہ لے رہا ہے اور دوسری جانب اندیشہ فریب ہے جس کا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں۔ حضورؐ کو قرآن میں حریص علیکم فرمایا گیا ہے یعنی یہ رسولؐ تمھاری بھلائی کا ہوکا رکھتا ہے۔ بس یہی تبلیغ انسانیت کا ہوکا تھا جو اندیشہ دغا پر غالب آگیا اور حضورؐ نے مبلغین بھیج دیے۔ حضورؐ اپنے مزاج کے اعتبار سے رجائی اور پرامید تھے' اس لیے غالب توقع یہی ہو سکتی تھی کہ شاید یہ لوگ دین صحیح کو قبول کر لیں۔ یہی رجائیت تھی جو خود حضورؐ کو بڑے بڑے خطرناک مواقع پر لے گئی۔ اوپر اس کی بہت مثالیں گزر چکی ہیں' سفر طائف اس کی واضح مثال ہے۔ دھوکا قنوطیت اور سوئے ظن میں بھی ہو سکتا ہے اور رجائیت و حسن ظن میں بھی۔ اس میں کچھ کام کی چیزوں سے محرومی ہوتی ہے اور اس میں کچھ

کام کی چیزوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اقدار انسانی کی محافظت اسی میں ہے کہ ان دونوں نقصانوں میں وہ نقصان برداشت کیا جائے جو رجائیت اور حسن ظن سے ہو۔ کم از کم ایک بڑے قبیلے کی دغا کا پوری طرح علم ہو گیا اور اہل اسلام اور اہل کفر کی قدروں کا فرق نمایاں ہو گیا۔

یہاں بڑا غور طلب نکتہ یہ ہے کہ حضورؐ ان دغا بازوں کے لیے ایک ماہ تک بددعا فرماتے رہے۔ بددعا حضورؐ کے عام مزاج کے مطابق نہ تھی۔ حضورؐ کے اعلیٰ اخلاق کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ طائف میں انتہائی مظلومیت کے باوجود ظالموں کے لیے بددعا نہ فرمائی۔ احد میں سخت اذیتیں جھیلنے کے باوجود دعائے خیر ہی فرمائی۔ منافق (عبداللہ ابی بن سلول) تک کے لیے دعائے خیر سے باز نہ آئے۔ لیکن غدر (دغا بازی) کرنے والوں کے لیے ایک ماہ تک بددعا فرماتے رہے۔ اس سے یہ اندازہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے کہ حضورؐ کو فریب جیسی انسانیت کش حرکت سے کس قدر نفرت تھی۔ حضورؐ تو ایک ایسا نظام معاشرہ قائم کرنے آئے تھے جس سے انسانی اقدار اجاگر ہوں۔ زبان کا پاس ہو' سفیروں کا احترام ہو' دھوکا اور فریب قطعی نہ ہو' باہمی اعتماد ہو جو باہمی تعاون کی بھی جان ہے۔ جہاں بلائے ہوئے مہمانوں کے ساتھ یہ کمینہ پن ہو وہاں تو ایک لحظے کے لیے بھی امن و امان' باہمی اعتماد و تعاون' اور خوش معاملگی کا یقین نہیں ہو سکتا۔ ان ہی اعلیٰ اقدار کو حضورؐ قائم فرمانا چاہتے تھے اور یہ ظالم اسی کی جڑ پر کلہاڑا چلا رہے تھے۔ اس لیے حضورؐ کو یہ خفگی اور یہ بددعا بالکل حق بجانب تھی۔ اگر حکومتیں یا قبیلے آپس میں فریب و دغا سے کام لیا کریں تو امن و امان اور دوسری انسانی قدریں باقی ہی نہیں رہ سکتیں۔

کیا اس دغا کے جواب میں اہل اسلام کی طرف سے بھی ایسا کوئی فریب دیا گیا؟ نہیں بلکہ ان ہی غدر و فریب کرنے والوں کے دو افراد (جنھیں امان دی جا چکی تھی) جب ایک مسلمان (عمرو بن امیہ) کے ہاتھ سے نادانستگی امان کی

وجہ سے قتل کر دیے گئے تو حضورؐ نے ان کا خون بہا ادا کرنے کا وعدہ فرما لیا۔ وہ کافروں کا برتاؤ تھا اور اس کے جواب میں یہ حضورؐ کا سلوک تھا۔ دھوکا کرنے والوں کے جواب میں اس سے چھوٹا دھوکا کیا اس کے برابر بلکہ اس سے بڑا دھوکا بھی دنیا میں جائز تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں بے وفائی کا جواب وفا سے اور کمینہ پن کا جواب شرافت سے دیا جا رہا ہے۔ یہی ہیں وہ اقدار جن کی روشن مثالوں کے مجموعے کا نام سیرت مصطفٰیؐ ہے۔

بدعہدی کی عجیب مثال ——— واقعہ رجیع

واقعہ بیر معونہ ہی کی طرح کا ایک واقعہ ان ہی دنوں میں اور بھی پیش آیا اور یہ بھی بڑا اہم واقعہ ہے۔ قبیلہ عضل اور قبیلہ قارہ کے چند آدمی حضورؐ کے پاس آئے اور ایک نئے انداز سے مبلغین بھیجنے کی درخواست کی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ان کی دینی تعلیم کے لیے چند آدمیوں کی ضرورت ہے۔ حضورؐ پر جذبہ تبلیغ تو غالب تھا ہی' اس لیے حضرت عاصم بن ثابت کی سرکردگی میں دس مبلغوں کی ایک جماعت بھیج دی۔ مکے اور عسفان کے درمیان ایک مقام ہے رجیع۔ یہاں یہ قافلہ مبلغین ٹھہرا۔ ان بدعہدوں نے بنو لحیان کو ان مبلغین کے قتل پر اکسایا۔ دو سو آدمی جن میں ایک سو تیر انداز تھے' چڑھ دوڑے۔ مبلغین نے انھیں آتے دیکھا تو غداری اور بدنیتی واضح ہو گئی۔ یہ دسوں آدمی ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ تیر اندازوں نے کہا کہ تم نیچے اتر آؤ تو ہم تمھیں پناہ دے دیں گے۔ حضرت عاصم ان کی غداری دیکھ چکے تھے' اس لیے صاف جواب دے دیا کہ ہمیں تم کافروں کی پناہ میں آنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے دعا کی کہ: خداوندا! ہماری اس بے کسی کی خبر اپنے رسولؐ تک پہنچا دے اور میری لاش کو ان کافروں کے قبضے میں نہ آنے دے۔" پھر آپؓ نے اپنے ساتھیوں کو لڑنے کا حکم دیا اور

مقابلہ شروع ہو گیا۔ آٹھ آدمیوں نے لڑ کر جان دے دی جن میں ایک عاصم بھی تھے۔ عاصم کی دعا کے دونوں جز بارگاہ الٰہی میں قبول ہوئے۔ عین اسی وقت حضورؐ نے مدینے میں فرمایا کہ: عاصم اپنے ساتھیوں سمیت ظالموں کی دعا میں گھر گئے۔ دعا کا دوسرا جز یوں پورا ہوا کہ جب ظالموں نے بے حرمتی کی نیت سے عاصم کی لاش کی طرف رخ کیا تو اس کثرت سے شہد کی مکھیوں نے یورش کی کہ لاش پر چھا گئیں اور دشمنوں کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔ شب کو سیلاب لاش کو بہا لے گیا۔

اس مختصر سے قافلہ مبلغین میں سے فقط دو شخص زندہ بچے جو گرفتار ہو گئے۔ ایک تھے خبیب بن عدی اور دوسرے زید بن دثنہ۔ سفیان ہذلی ان دونوں کو مکے لے جا کر دو ہذلی قیدیوں کے عوض قریش کے ہاں بیچ آیا۔ خبیب نے حارث بن عامر کو جنگ احد میں مارا تھا۔ اس لیے اس کے اخیافی بھائی جحیر بن ابی اہاب نے قریش سے خرید کر عقبہ بن حارث کو دے دیا تاکہ وہ اپنے باپ کے عوض خبیب کو قتل کرے' اور زید کو صفوان بن امیہ نے خرید لیا کیوں کہ امیہ بدر میں مارا گیا تھا' اس لیے صفوان نے زید کو اپنے باپ کے عوض قتل کر کے کلیجہ ٹھنڈا کرنے کو خرید لیا۔ ان دونوں (خبیب اور زید) کی داستان قتل کی تفصیل بھی سن لیجیے۔

عقبہ نے خبیب کو کئی دن بھوکا پیاسا گھر میں بند رکھا۔ اس دوران میں ایک دن جحیر بن ابی اہاب کی کنیز (ماویہ) سے خبیب نے استرہ مانگا۔ اس نے اپنے کم سن بچے کے ہاتھ بھجوا دیا۔ اب خبیب کے ہاتھ میں استرہ ہے اور قاتلین کے گھرانے کا ایک بچہ اس کے پاس ہے۔ ماں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ خبیب نے اسے بھانپ لیا اور کہا: تجھے یہ خطرہ ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا۔ نہیں انشاء اللہ ایسا نہیں ہو گا۔ اللہ اکبر۔ اس چھوٹے سے واقعے پر اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کا اس سے بہتر کیا موقع مل سکتا تھا۔ مرتا کیا نہیں

کرتا۔ خبیب بڑی آسانی سے اس بچے کو قتل کر کے اپنے انتقام کی پیاس بجھا سکتے تھے۔ لیکن یہی تو وہ انسانی اقدار ہیں جن کی تعلیم انھوں نے حضورؐ سے حاصل کی تھی۔ مگر ہاں خبیب کی اس شرافت کا جواب جس کمینگی سے دیا گیا وہ یہ ہے کہ آپ کو حدود حرم سے باہر کوہ تیغم کے پاس لے جایا گیا۔ قتل سے پہلے انھوں نے دو رکعت نماز ادا کرنے کی اجازت چاہی۔ یہ نماز جناب خبیب نے ذرا جلدی ختم کر لی۔ پھر فرمایا: یہ آخری نماز ذرا دیر تک پڑھتے رہنے کو دل چاہ رہا تھا لیکن جلد اس لیے ختم کر دی کہ کہیں تم یہ گمان نہ کرو کہ موت کے ڈر سے دیر لگا رہا ہوں۔" اس کے بعد انھوں نے دس شعر للکار کر پڑھے جن میں سے دو یہ ہیں:

ولست ابالی حین اقتل مسلما
علی ای شق کان للہ مصرعی

جب میں مسلمان ہونے کے جرم میں قتل کیا جا رہا ہوں تو اس کی پرواہ نہیں کہ کس پہلو قتل ہو رہا ہوں۔

وذالک فی ذات الالہ وان شاء
یبارک علی اوصال شلو ممزع

یہ قتل ذات باری کی راہ میں ہے' اگر وہ چاہے گا تو جسم کے ٹکڑے ٹکڑے پر برکت نازل فرمائے گا۔

اس کے بعد خبیب کو سولی پر لٹکایا گیا اور نیزے مار مار کر شہید کر دیا گیا۔ پہلی دو رکعت تو نماز زہد تھی اور سولی پر نماز عشق ادا ہوئی۔

اللھم بلغنا رسالہ رسولک فبلغہ ما یصنع بی۔

خداوندا! ہم نے تیرے رسول کا پیغام تو پہنچا دیا' اب میرے ساتھ جو کچھ کیا جا رہا ہے اس کی خبر رسولؐ تک پہنچا دے۔

اس کے بعد زید بن وثنہ کو جب قتل کرنے کے لیے لے جایا گیا تو

بہت سے قریشی سردار تماشا دیکھنے کے لیے آئے۔

بجرم عشق تو ام می کشند غوغا نیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

اس وقت ابوسفیان بن حرب بھی موجود تھے۔ بولے: سچ بتاؤ کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ اس وقت تمہاری جگہ محمدؐ ہوتے اور تم آرام سے اپنے گھر ہوتے؟ زید نے کڑک کر جواب دیا: بخدا میں اپنی جان بچانے کے عوض حضورؐ کے جسم میں ایک کانٹا چبھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد نسطاس نے زید کو قتل کر دیا۔

❋ ❋ ❋

(۱۴)

غزوۂ بنو نضیر

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عمرو بن امیہ نے بنی عامر کے جن دو شخصوں کو قتل کر دیا تھا ان کا خون بہا ادا کرنے کا ذمہ حضورؐ نے لے لیا تھا۔ یہ بھی آپ معاہدہ یہود کے سلسلے میں پڑھ چکے ہیں کہ یہود سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ خوں بہا کا قدیم طریقہ قائم رہے گا۔ اس کی رو سے خوں بہا کا ایک حصہ ادا کرنا بنو نضیر کے لیے بھی ضروری تھا۔ حضورؐ اس مطالبے کے لیے بنو نضیر کے پاس چند صحابہ کو ساتھ لے کر تشریف لے گئے۔ بنو نضیر نے خوں بہا کا حصہ رسدی ادا کرنے کا وعدہ تو کر لیا لیکن ساتھ ہی چپکے سے حضورؐ کے قتل کی سازش بھی کر لی۔ حضورؐ ایک دیوار کے سائے میں تشریف فرما تھے۔ عمرو بن حجاش بالا خانے پر چڑھا تاکہ اوپر سے ایک بھاری پتھر گرا کر حضورؐ کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ حضورؐ نے اس خطرے کو بھانپ لیا اور مدینے واپس ہو گئے۔ بنو نضیر نے حضورؐ کو پھر آنے کی دعوت دی۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ: تم لوگوں پر اعتماد نہیں رہا۔ ہاں اگر معاہدے کی تجدید کر لو تو آنے کو تیار ہوں۔ انھوں نے تجدید معاہدہ سے انکار کر دیا۔ یہود کے دوسرے قبیلے بنو قریظہ نے معاہدے کی تجدید کر لی لیکن بنو نضیر نے اس لیے انکار کر دیا کہ انھیں اپنے مستحکم قلعوں پر گھمنڈ تھا۔ دوسرے انھیں یہ بھی اعتماد تھا کہ مدینے کے منافقین اور مکے کے قریش ان کی اعانت کریں گے۔ بنو نضیر کی غلطی یہ تھی کہ وہ خوں بہا کا حصہ

رسدی ادا کرنے میں لیت لعل کر رہے تھے۔ وہ خوں بہا کی رقم بھیج دیتے تو کوئی جھگڑا نہ ہوتا۔ باہمی بے اعتمادی پیدا ہی اس لیے ہوئی کہ انھوں نے معاہدے کی اس دفعہ پر عمل نہ کیا جس کی رو سے خوں بہا میں شرکت ضروری تھی۔ اس شرکت میں پس و پیش کی وجہ سے ان کی نیت کا مشتبہ ہونا قدرتی بات تھی۔ پھر اگر فی الواقع ان کی نیت صاف ہوتی تو بنو قریظہ کی طرح تجدید معاہدہ میں پس و پیش نہ ہوتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود حضورؐ چوں کہ مصالحانہ زندگی کو پسند فرماتے تھے' اس لیے ان کی دعوت پر وہاں جانے کو تیار ہو گئے۔ چند صحابہ کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے ہی تھے کہ ایک دوسری اطلاع ملی اور وہ یہ تھی کہ بنو نضیر تو تلواریں لیے تیار ہیں اور یہ دعوت محض ایک فریب ہے۔

اب چند باتیں جمع ہو گئیں:

۱۔ بنو نضیر نے خوں بہا میں شرکت کا وعدہ تو کر لیا مگر ادا نہ کیا۔

۲۔ حضورؐ کے قتل کی سازش کی اور ایک آدمی کو پتھر گرانے کے لیے اوپر چڑھا دیا۔

۳۔ معاہدے کی تجدید سے انکار کر دیا حالانکہ دوسرے یہودی قبیلے بنو قریظہ نے تجدید معاہدہ کر کے ایک اچھی مثال پیش کر دی ہے۔

۴۔ دوبارہ پھر قتل کی سازش کر کے حضورؐ کو تشریف لانے کی دعوت دی۔

۵۔ یہ تمام باتیں ان کے فتور نیت کو ظاہر کر رہی ہیں اور یہ قوی امکان ہے کہ کسی وقت وہ مدینے پر چڑھائی کر دیں اور اس حملے میں منافقین مدینہ' مشرکین مکہ اور خود بنو قریظہ بھی ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔

ان تمام حالات میں حفاظت خود اختیاری اور سیاسی پیش بندی کا لازمی تقاضا تھا کہ اس خطرے کو سر پر آنے سے پہلے ہی دور کر دیا جائے۔ حضورؐ نے اسی کے پیش نظر ایک جماعت صحابہ کو لے کر بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ ربیع

الاول ۴ھ کا واقعہ ہے۔ چھ دن وہ اپنے قلعوں میں محصور رہے اور آخر مجبور ہو کر اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ جس قدر مال و اسباب وہ اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں لے جائیں اور یہ علاقہ خالی کر دیں۔ حضورؐ نے اس محاصرے کے دوران کھجور کے کچھ درخت بھی کٹوائے تھے۔ علاوہ ازیں جب بنو نضیر جلاوطن ہونے لگے تو اپنے قلعوں کو ممکن حد تک توڑ پھوڑ کر برباد بھی کر گئے تاکہ اچھی حالت میں ان پر مسلمانوں کا قبضہ نہ ہو سکے۔ بہرحال یہ ٹوٹے پھوٹے قلعے اور ان کے علاوہ پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔ ان میں سے سلام ابن ابی الحقیق، کنانہ ابن ربیع بن ابی الحقیق اور حی بن اخطب خیبر کی طرف چلے گئے جہاں ان کی سرداری قائم ہو گئی اور باقی شام کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہاں آگے چلنے سے پہلے ایک نظر ان آیات قرآنی پر بھی ڈال لینی چاہیے جن میں اس واقعے کا ذکر ہے اور جن میں بعض اہم نکات بھی ہیں۔ ہم ان آیات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے نمبر بھی درج کر رہے ہیں:۔

هوالذی اخرج الذین کفروا من اهل الکتب
من دیارهم لاول الحشر ط ماظننتم ان یخرجوا و
ظنوا انهم مانعتهم حصونهم من اللّٰه فاتهم اللّٰه من
حیث لم یحتسبوا ق وقذف فی قلوبهم الرعب
یخربون بیوتهم بایدیهم وایدی المومنین ق
فاعتبروا یاولی الابصار ○ ولو لا ان کتب اللّٰه
علیهم الجلاء لعذبهم فی الدنیا ط و لهم فی
الاخرة عذاب النار ○ ذلک بانهم شاقوا اللّٰه و
رسوله ج و من یشاق اللّٰه فان اللّٰه شدید العقاب ○
ماقطعتم من لینه اوتر کتموها قائمه علی اصولها

فباذن اللّٰه و لیخزی الفسقین ○ وما افاء اللّٰه علی
رسوله منهم فما اوجفتم علیه من خیل ولا رکاب
ولکن اللّٰه یسلط رسله علی من یشاء ط واللّٰه علی
کل شئی قدیر ○ ما افاء اللّٰه علی رسوله من اهل
القری فللّٰه وللرسول ولذی القربی والیتمی
والمسکین وابن السبیل کی لایکون دوله بین
الاغنیاء منکم ط وما اتکم الرسول فخذوه ق وما
نهکم عنه فانتهوا ج واتقوا اللّٰه ط ان اللّٰه شدید
العقاب ○ للفقراء المهجرین الذین اخرجوا من
دیار هم واموالهم یبتغون فضلا من اللّٰه و رضوانا و
ینصرون اللّٰه و رسوله ط اولئک هم الصدقون ○
والذین تبوء الدار والایمان من قبلهم یحبون من
هاجرالیهم ولا یجدون فی صدورهم حاجه مما
اوتواو یؤثرون علی انفسهم ولوکان بهم خ قف
صاصه ومن یوق شح نفسه فاولئک هم المفلحون
○ والذین جاء و من م بعد هم یقولون ربنا
اغفرلنا ولا خواننا الذین سبقونا بالایمان ولا
تجعل فی قلوبنا غلاللذین امنواربنا انک رء وف
رحیم ○ (الحشر: ۲۔ ۱۰)

وہی اللہ تو ہے جس نے کفار اہل کتاب (بنو نضیر) کو ان کے گھروں سے پہلی مرتبہ نکال باہر کیا۔ تمھارے خیال میں تو وہ نکل ہی نہ سکتے تھے' اور خود وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کے قلعے انھیں بچالیں گے۔ مگر اللہ (کا عذاب) تو ان تک

ایسے رستے سے پہنچا جس کا انھیں گمان بھی نہ تھا' اور اللہ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا کہ وہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے یا مسلمانوں کے ہاتھوں برباد کراتے رہے۔ آنکھ والو! اس سے عبرت حاصل کرو۔ اگر اللہ ان کی جلاوطنی کو مقدر نہ کرچکا ہوتا تو (دوسرے طریقے سے) انھیں اس دنیا میں سزا دیتا اور آخرت میں تو ان کے لیے آگ کی سزا ہے ہی۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی اور جو اللہ کی مخالفت کرتا ہے' وہ سمجھ لے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ تم نے جو کھجور کے درخت کاٹے یا انھیں اپنی جڑوں پر باقی رکھا یہ سب کچھ اللہ ہی کے حکم سے ہوا اور اس کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ وہ فاسقوں کو رسوا کرے۔ اللہ نے ان سے جو کچھ اپنے رسول کو دلوایا ان پر تم نے گھوڑے یا اونٹ تو نہیں دوڑائے تھے بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ اللہ نے اپنے رسولؐ کو ان گاؤں والوں سے جو کچھ دلوایا وہ اللہ کے لیے ہے اور رسولؐ کے لیے اور قرابت مند' یتیموں' مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے تاکہ یہ (مال فے) تمھارے دولت مندوں ہی کے درمیان گردش کرتا نہ رہ جائے۔ جو کچھ رسولؐ تمھیں دے' لے لو اور جس سے روک دے' رک جاؤ۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اللہ بڑا سخت سزا دینے والا ہے۔ (یہ مال فے) ان مہاجر ناداروں کے لیے ہے جن کو ان کے گھروں اور املاک سے الگ کر دیا گیا جو اللہ کے

فضل اور خوشنودی کے طالب ہیں' اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں' یہی تو اہل صدق ہیں۔ اور (یہ مال فے) ان کے لیے بھی ہے جو اپنا گھر رکھتے ہیں اور (آمد مہاجرین سے) پہلے ہی ایمان لاچکے ہیں۔ ان کی طرف جو ہجرت کر کے آئے وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور (مہاجرین کو) جو کچھ بھی دیا جائے اس کی اپنے دلوں میں ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ وہ انھیں اس وقت بھی اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں جب کہ ان پر تنگی غالب ہو اور جو اپنی دل کی طمع اور بخالت سے محفوظ رہے تو ایسے ہی لوگ تو فلاح یافتہ ہیں۔ (یہ مال فے) ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو ان کے بعد آئیں گے جن کی دعا یہ ہوگی کہ اے ہمارے رب! پوشش کرنا ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ایمان لانے میں ہم پر سبقت لے گئے اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کی طرف سے کوئی کھوٹ نہ رہنے دے۔ اے ہمارے رب تو رؤف رحیم ہے۔"

۱۔ پہلی آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اگر یہ اب بھی ٹھیک نہ ہوئے تو دوبارہ یہی سزا دی جائے گی۔ چنانچہ یہ پیش گوئی سیدنا عمرؓ کے زمانے میں پوری ہوئی اور انھیں اطراف خیبر سے پھر شام کی طرف جلاوطن کیا گیا۔

۲۔ ویسے تو حضورؐ نے بہ موقعہ جنگ درختوں کو کاٹنے سے عمومی ممانعت فرمائی ہے لیکن اگر جنگی ضرورت ہی اس طرح کی پیش آجائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بعض اوقات اس لیے بھی درخت کٹوائے جاتے ہیں کہ یہ دشمن کی کمین گاہ ہوسکتی ہے اور اس لیے بھی کہ ادھر سے دشمن خاموشی کے ساتھ نکل کر بھاگ سکتا ہے۔ اسی طرح کی دوسری ضرورتیں بھی ہوسکتی ہیں

اور ایسے مواقع پر درختوں کو کٹوا دینا تقاضائے مصلحت ہوتا ہے۔ اسی کو فباذن اللہ کہا گیا ہے۔

۳۔ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب رسولؐ نے بھی کوئی گھوڑا یا اونٹ نہیں دوڑایا' یا یوں کہیئے کہ جتنا کچھ رسولؐ نے کیا اتنا ہی کچھ شرکائے قتال (بلکہ محاصرین) نے بھی کیا تو خود حضورؐ کے فیصلے کے مطابق اس مال فے میں یا تو سب کی شرکت ہونی چاہیے یا پھر کسی کی نہ ہو۔ لہٰذا حضورؐ کے لیے مخصوص ہونے کی کوئی وجہ نہیں ـــــــ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ دشمنوں سے جو مال حاصل ہوتا ہے' اس کی دو قسمیں ہیں۔ غنیمت اور فے۔ اگر جنگ سے حاصل ہو تو غنیمت ہے اور اس کو امیر جیش یوں تقسیم کرتا ہے کہ ایک خمس مرکز میں بھیج دیتا ہے اور چار خمس خود شرکائے جنگ میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اور اگر بغیر جنگ کے حاصل ہو تو وہ سب کا سب مملکت کا ہوتا ہے اور امیر المومنین اسے اپنے صواب دید سے مصرف میں لاتا ہے۔ یہ مصرف کیا ہیں ان کا اگلی ہی آیت میں ذکر ہے۔

۴۔ اللہ کا حصہ ہونے کا مطلب صرف فی سبیل اللہ ہے اور رسولؐ سے مراد ذات رسولؐ نہیں بلکہ امیرالمومنین ہے۔ رسولؐ کے بعد جو بھی اس مشن کو چلانے کے لیے متعین ہو گا وہی اس مخصوص حصے کا حق دار ہو گا۔ ایک عہدے دار کی جو تنخواہ ہوتی ہے ـــــــ خواہ معین رقم ہو یا کسی گاؤں کی آمدنی ہو ـــــــ وہ اس کے بعد آنے والے عہدے دار کو ملتی ہے۔ بطور وراثت اس کے پس ماندوں کو نہیں ملتی۔ پھر اس مصرف کے علاوہ جو مصارف بتائے گئے ہیں' اس کے حق دار قرابت مند' یتامیٰ' مساکین' ابن السبیل' مہاجرین' انصار اور ان کے بعد آنے والے نادار لوگ ہیں ـــــــ اس تقسیم میں یہ شرط بالکل نہیں کہ جو جنگ میں شریک ہوا ہو وہی حصہ پائے اور جو شریک نہ ہوا ہو وہ نہ پائے بلکہ یہ امیر مملکت کی صواب دید پر منحصر ہے اور وہی

اسے لوگوں کی حاجتوں اور ضرورتوں کے مطابق تقسیم کرے گا۔

غزوہ ذات الرقاع

جمادی الاولیٰ میں حضورؐ کو اطلاع ملی کہ اطراف نجد میں بنو غطفان مدینے پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور بنو محارب اور بنو ثعلبہ بھی ان کا ساتھ دیں گے۔ یہ اطلاع پاتے ہی حضورؐ نے مدینے کا والی ابوذرؓ کو بنایا اور چار سو صحابہ کے ساتھ اس نخلستان میں پہنچے جہاں ان کے اکٹھا ہونے کی خبر ملی تھی۔ لیکن اہل اسلام کی آمد سن کر یہ سب وہاں سے فرار ہوگئے اور کوئی جنگ نہیں پیش آئی۔ یہ گویا صرف فوجی نقل و حرکت تھی لیکن اہم اس لیے ہے کہ اس جگہ پہلی بار صلوۃ الخوف پڑھی گئی کیوں کہ کسی کمین گاہ سے دفعتہ" دشمنوں کے ٹوٹ پڑنے کا خطرہ تھا۔ لیکن بیہقی اور احمد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صلوۃ الخوف غزوہ بنی لحیان کے موقعے پر بمقام غسفان پڑھی گئی۔

غزوہ بدر ثانیہ

غزوہ احد کے بعد ابوسفیان نے چلتے وقت دھمکی دی تھی کہ آئندہ سال مقام بدر پر پھر معرکہ ہوگا۔ حضورؐ کو اس کا خیال لگا رہتا تھا یہاں تک کہ خبر ملی کہ قافلہ ابوسفیان مکے سے چل پڑا ہے۔ ادھر سے مسلمانوں کی جماعت بھی نکل کھڑی ہوئی۔ حضورؐ نے عبداللہ بن عبداللہ بن ابی کو حاکم مدینہ مقرر کیا۔ یہ شعبان ۴ھ کا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے بدر میں مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے اور کفار ایک ہزار۔ اب کے اسی مقام پر مسلمان ڈیڑھ ہزار تھے۔ لشکر ابوسفیان پر کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ خرابی موسم کا عذر کرکے کوئی مقابلہ کیے بغیر ہی واپس چلا گیا۔ اس جگہ مسلمانوں نے چند دن انتظار کیا اور پھر واپس آگئے۔ اس نقل و حرکت کا نام بدر ثانیہ بھی ہے اور بدر موعدہ (دھمکی) بھی۔

واقعات متفرقہ

اسی سال شعبان میں جناب حسین بن علیؓ کی ولادت ہوئی۔ ام المومنین زینب بنت خزیمہ کا نکاح اور وفات دونوں اسی سال ہوئے۔ ام سلمہ کو ام المومنین ہونے کا شرف اسی سال حاصل ہوا جس کا ذکر سریہ ابو سلمہ میں آچکا ہے۔ غالباً" حرمت خمر کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا ہے۔

* * *

(۱۵)

۵ ہجری ——— غزوۂ دومتہ الجندل

دومتہ الجندل بحر احمر اور خلیج فارس کے درمیان حدود شام میں واقع ہے۔ یہ ڈاکوؤں کا مرکز تھا اور ان کی تعداد بھی بہت تھی۔ ربیع الاول ۵ھ میں حضورؐ کو اطلاع ملی کہ ان کی جمعیت بڑھتی جاتی ہے اور مدینے پر یہ لوگ حملہ کرنے والے ہیں۔ حضورؐ نے سباع بن عرفطہ کو والی مدینہ بنایا اور ایک ہزار صحابہ کو ساتھ لے کر نکلے مگر اطلاع ملتے ہی دشمن بھاگ کھڑے ہوئے۔ کوئی معرکہ نہیں پیش آیا۔ ان کا قلعہ اور مویشی ہاتھ آئے۔ ایک شخص بھی گرفتار ہوا جو مدینے آکر مسلمان ہو گیا۔

غزوہ مریسیع

مدینے سے نو منزل پر ایک چشمہ تھا جس کا نام مریسیع ہے۔ یہاں قبیلہ خزاعہ آباد تھا جو قریش کا حلیف تھا۔ اس قبیلے کی ایک شاخ بنو مصطلق کہلاتی تھی جس کا سردار حارث بن ابی ضرار تھا۔ اطلاع ملی کہ یہ مدینے پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ حضورؐ نے زید بن خصیب کو صورت حال دریافت کرنے کے لیے بھیجا۔ جب حارث کی جنگی تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو حضورؐ نے بھی صحابہ کو تیاری کا حکم دیا۔ ۲۰ شعبان ۵ھ کو جیش اسلامی روانہ ہوا۔ مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر حارث اپنی جمعیت لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر دوسرے باشندگان

مریسیع نے صف آرائی کر کے مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کیے۔ مسلمانوں نے یک بارگی حملہ کیا اور دشمن کے دس آدمی مارے گئے اور چھ سو قیدی ہاتھ آئے۔ دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں بھی قبضے میں آئیں۔

یہ واقعہ تو بظاہر معمولی سا ہے لیکن ایک خاص واقعے کی وجہ سے اسے بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ ہے سردار بنی مصطلق حارث بن ابی ضرار کی دختر حضرت جویریہؓ کا ام المومنین ہونا اور سارے قیدیوں کا آزاد ہو جانا۔

ام المومنین جویریہؓ بنت حارث کا نکاح

حضرت جویریہ کے نکاح کے بارے میں کئی مختلف روایتیں ہیں۔ ان سب کو ملا کر ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ بنو مصطلق کے قیدی مختلف مسلمانوں کے حصے میں آئے۔ ان میں سردار بنی مصطلق حارث بن ابی ضرار کی بیٹی جویریہؓ بھی تھیں۔ یہ ثابت بن قیس کے حصے میں آئیں۔ انھوں نے رہائی کی درخواست کی لیکن ثابت نے زر فدیہ طلب کیا۔ جویریہؓ کے پاس وہاں زر فدیہ کہاں تھا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی تو خود زر فدیہ ادا فرمانے کا وعدہ کر لیا۔ اسی دوران میں حارث زر فدیہ لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور اپنی بیٹی کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ خود جویریہ سے دریافت کر لو۔ جناب جویریہؓ، حضورؐ اور تمام صحابہؓ کے تقوے اور خلق و کرم سے اس درجہ متاثر ہو چکی تھیں کہ اپنے باپ کے سوال کے جواب میں کہا کہ: "مجھے حضورؐ کی خدمت میں رہنا زیادہ پسند ہے۔" چنانچہ حضورؐ نے ان کا زر فدیہ خود ادا فرمایا اور رہا ہو جانے کے بعد ان سے نکاح فرما لیا۔ ابن ہشام کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حارث اسی وقت ایمان لے آئے تھے اور ان کے بعد جویریہؓ بھی اسلام لے آئیں۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۴، ص ۳۴۰)

لمحہ فکریہ

حضرت جویریہؓ کا از خود حضورؐ کی زوجیت میں آنے پر راضی ہونا بہت قرین قیاس ہے۔ ایک طرف وہ اپنے باپ کو دیکھ چکی تھی کہ اپنی جمعیت سمیت بھاگ نکلا اور بیٹی کو گرفتاری کے لے چھوڑ گیا۔ دوسری طرف، وہ مسلمانوں کے اعلیٰ کردار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں کہ ان میں سے ہر فرد تقوے' اخلاق' خدا پرستی کا زندہ پیکر ہے اور یہ سب کچھ ایک ذات بابرکات کا فیض صحبت ہے۔ پھر انھوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ان سب کے مربی کا خلق یہ ہے کہ اپنے پاس سے زر فدیہ ادا کرنے پر آمادہ ہے اور انتقام و ہوس ناکی سے بالاتر ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اگر حضرت جویریہؓ کے دل میں روشنی پیدا ہو گئی ہو تو اس پر تعجب کیا ہے؟ آخر ام حبیبہؓ بھی تو ایک عورت ہی تھیں جن کا باپ (ابوسفیان) فتح مکہ تک ہر مخالفت رسولؐ کا ہیرو بنا رہا' لیکن وہ اللہ کی بندی نہ فقط ایمان ہی پر جمی رہی بلکہ حبشہ پہنچ کر مہاجرت کی زندگی بھی گزاری۔ حضرت جویریہؓ میں اگر یہی جذبہ ایمانی پیدا ہو گیا تو اس میں کوئی عقلی استبعاد نہیں۔ پھر ممکن ہے کہ آپ کے دل میں یہ خیال بھی آیا ہو کہ میرے حرم رسول بننے کے بعد میری برادری کے قیدیوں کے ساتھ زیادہ بہتر سلوک ہونے لگے۔

اس وقت حضورؐ کے سامنے بھی دو چیزیں تھیں۔ ایک یہ ہے کہ جویریہؓ کو آزاد کر کے ان کے باپ کے ساتھ بھیج دیں۔ لیکن اس سے فقط اتنا ہی بھر نتیجہ نکل سکتا تھا کہ ایک سردار زادی آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائے۔ لیکن دوسری طرف جو چیز نظر آ رہی تھی اور جو ظہور میں آ بھی گئی تھی کہ حضورؐ نے ان سے نکاح فرمالیا' اور اس کے نتیجے میں:

(۱) صحابہؓ نے کہا کہ جس خاندان سے حضورؐ نے شادی فرما کر اس سے اپنا صہری (سسرالی) تعلق پیدا کر لیا اس خاندان کے کسی فرد کو ہم قیدی یا غلام

بنا کر نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ یہ سارے قیدی بغیر زر فدیہ ادا کیے ایک لمحے میں آزاد ہو گئے۔

(۲) بنو مصطلق پہلے ڈاکو تھے۔ اب اس سسرالی قرابت کی وجہ سے اہل اسلام سے قریب تر ہو گئے۔ تعلقات خوش گوار ہو گئے اور دور دور رہنے کی وجہ سے انھیں اسلام اور اہل اسلام کی طرف سے جو غلط فہمیاں تھیں وہ سب دور ہوتی گئیں اور جلد ہی وہ دن بھی آگیا کہ یہ سب کے سب اسلام لا کر مہذب' تائب' متمدن اور معلم اخلاق بن گئے۔

(۳) خود سیدہ جویریہؓ شرف و مجد کے اس مقام پر پہنچ گئیں جہاں ان کا وہم و قیاس بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ ام المومنین ہوئیں اور ان ازواج مطہرات کی صف میں کھڑی ہوئیں جن کے ذکر سے کلام الٰہی رطب اللسان ہے۔ ان سے چند روایات بھی کتب احادیث میں ہیں۔

غرض ایک طرف صرف یہ تھا کہ جویریہؓ کو زر فدیہ لے کر باپ کے ساتھ بھیج دیا جائے اور دوسری طرف یہ مذکورہ بالا حقائق ہیں جو قیاس نہیں بلکہ مشہور حقیقتیں ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ انسانی اقدار کی محافظت کس چیز کا مطالبہ کر رہی تھی؟ یہی تو ہیں وہ قدریں جن کی اقامت کے لیے حضورؐ مبعوث ہوئے تھے۔

ایک ناخوش گوار واقعہ

اسی غزوہ بنی مصطلق کے موقعے پر ایک ناخوش گوار سا واقعہ یوں پیش آیا کہ ایک دن چشمہ مریسیع سے پانی لیتے ہوئے ایک انصار اور ایک مہاجر میں کچھ تکرار ہو گئی۔ تھا تو محض ذاتی معاملہ مگر ایک نے یا معشر الانصار کہہ کر پکارا' اور دوسرے نے یا معشر المہاجرین کہہ کر آواز دی۔ یوں کہیے کہ ذرا دیر کے لیے قدیم عرب جاہلیت نے اپنا سر نکالا۔ معاملہ کچھ قومی

سا بن گیا۔ دونوں طرف کے کچھ جوشیلے جذبات رکھنے والوں کی تلواریں نیام سے باہر نکل آئیں۔ فوراً چند سمجھ دار لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے قصے کو رفع دفع کر دیا۔ معمولی سا واقعہ تھا جو ختم ہو گیا' مگر راس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول نے اس خاکستر کی چنگاری کو ہوا دینی شروع کی۔ اس نے انصار سے کہا کہ: "تم ہی نے یہ مصیبت مول لی ہے اور مہاجرین تمھارے سر چڑھ گئے ہیں۔ اب بھی اگر تم ان کی اعانت سے دست کش ہو جاؤ تو اس بلا سے نجات مل سکتی ہے۔" زید بن ارقم نے یہ گفتگو سن لی اور حضورؐ کے سامنے جا کر اسے دوہرا دیا۔ سیدنا عمرؓ غصے سے کانپنے لگے اور عبداللہ بن ابی کا سر قلم کرنے کی اجازت طلب کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: "لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرتے ہیں۔" حضرت عمرؓ کا جذبہ ایمانی تو بجا تھا لیکن دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ خود اس منافق کے صاحب زادے (اپنے باپ کے ہم نام) حضرت عبداللہ کو علم ہوا کہ حضورؐ میرے باپ سے ناراض ہیں اور بعض صحابہ اس کے قتل کی رائے دیتے ہیں تو خود خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ:

"یا رسولؐ اللہ! اگر حضورؐ کی مرضی ہو تو میں خود اپنے باپ کا سر لے کر حاضر ہو جاتا ہوں۔" حضورؐ نے فرمایا: "میں اسے قتل کرانا نہیں چاہتا بلکہ عفو و درگزر اور رحم و کرم کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

لمحہ فکریہ

عبداللہ بن ابی بن سلول کے منافق ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اس سے پہلے بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب مسلمان میدان احد کی طرف جا رہے تھے تو یہی عبداللہ تھا جو تین سو آدمیوں کو بہکا کر واپس لے گیا۔ آج کے تمدنی دور میں اگر کوئی سیاسی آدمی ایسا کرے تو اسی وقت اس کا کورٹ مارشل ہو جائے۔ ایسا شخص یقیناً سزائے قتل کا مستحق ہوتا ہے۔ اب یہاں چشمہ مریسیع پر

اس نے مہاجرین و انصار کے درمیان جو خطرناک شگاف ڈالنے کی کوشش کی وہ بھی کھلا ہوا سبوتاژ تھا جس کی سزا قتل ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس قتل سے روکنے والی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ عمر فاروقؓ جیسے صحابہ ہی نہیں بلکہ خود اس منافق کے کامل الایمان فرزند بھی صرف اس کے منتظر ہیں کہ ذرا حضورؐ کا اشارہ ہو جائے تو منافق باپ کا سر قلم کرنے کی سعادت ان ہی کے حصے میں آئے۔ مگر حضورؐ پر اعلیٰ قدریں آخر تک غالب رہیں۔ ایک تھا رحمت عامہ کا تقاضا اور دوسرے رجائیت' یعنی یہ توقع کہ اگر آج نہیں تو کل شاید اسے ہدایت حاصل ہو جائے۔ یہی رجائی جذبہ سفر طائف میں غالب تھا اور یہی جذبہ میدان احد میں بھی کارفرما رہا' اور یہی اس منافق کے حق میں آخر تک قائم تھا۔ جب وہ مرگیا تو حضورؐ نے اسے کفنانے کے لیے اپنا کرتا مرحمت فرمایا۔ نماز جنازہ پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ سیدنا عمرؓ نے روکا اور یہ آیت پڑھی کہ:

ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللّٰہ لھم ط (التوبہ: ۸۰)

اگر ستر بار آپ ان منافقین کے لیے دعائے مغفرت کریں جب بھی خدا ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔

رحمت عالمؐ نے فرمایا کہ میں بہتر بار دعا کر لوں گا۔ آخر یہ آیت اتری کہ:

ولا تصل علی احد منھم مات ابداً ولا تقم علی قبرہ ط (التوبہ: ۸۴)

ان منافقوں میں سے کسی مرنے والے کی نماز جنازہ نہ پڑھو اور اس کی قبر پر دعائے مغفرت کے لیے کھڑے بھی نہ ہو۔

چھوٹے جرم یا شبہے پر بڑی سزائیں تو ہماری سمجھ میں آجاتی ہیں کیوں کہ ہم یہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں لیکن بڑے جرم پر چھوٹی سزا مشکل ہی سے سمجھ میں آتی ہے۔ اور بڑے بڑے جرموں کے عوض درگزر'

رحمت بلکہ انعام تو ہماری سمجھ سے اور بھی بالا تر ہے۔ ہمارے ذہنوں میں اس کا تصور بھی نہیں آسکتا' لیکن وسیع ظرف صرف اسی کا ہو سکتا ہے جس کی سیرت آپ کے پیش نظر ہے۔

ام المومنین عائشہؓ اور افک مبین

قرعہ اندازی اور استخارہ

غزوہ بنی مصطلق کا ایک اہم واقعہ وہ ہے جسے قرآنی اصطلاح میں افک مبین یا بھتان عظیم کہتے ہیں۔ حضورؐ کا معمول تھا کہ جب سفر میں جاتے اور اپنی اہل بیت یعنی بیویوں میں سے کسی کو ساتھ لے جانا ہوتا تو قرعہ اندازی فرماتے تاکہ ترجیح بلا مرجح لازم نہ آئے۔ اگر حضورؐ کسی کو اپنی پسند سے انتخاب فرماتے تو اس کا حضورؐ کو پورا پورا حق حاصل تھا' لیکن اس صورت میں یہ امکان تھا کہ دوسری اہل بیت کے آئینہ دل پر غبار سا آجاتا اور یہ شکایت اگر شدت اختیار کرتی تو ان کو مقام کفر تک بھی پہنچا سکتی تھی۔ حضورؐ یہ بالکل پسند نہ فرماتے تھے کہ ازواج مطہرات کی کوئی دل شکنی ہو اور دل شکنی انھیں ایمانی حیثیت سے کسی خطرناک مقام تک لے جائے۔ قرعہ اندازی کی یہی وجہ تھی۔ قرعہ اندازی صرف وہیں ہوتی ہے جہاں ایک نوع کے مختلف افراد میں تساوی ہو اور وجہ ترجیح نظر نہ آتی ہو۔ اگر عقلی یا نقلی وجہ ترجیح موجود ہو تو قرعہ اندازی کی ضرورت نہیں۔ قرعہ اندازی کے مواقع زندگی میں بہت کم پیش آتے ہیں۔ اگر وجہ ترجیح موجود ہوتے ہوئے خواہ مخواہ قرعہ اندازی ایک عام مشغلہ بن جائے تو اس کی سرحدیں قمار سے بھی مل جاتی ہیں۔ اس کی شکل نبیذ کی سی ہے جو اس وقت تک جائز ہے جب تک اس میں سکر نہ پیدا ہو۔ لیکن اگر اس کے سرور میں اضافہ کرتے چلے جائیں تو آخر اس کی سرحدیں نشے سے جا ملیں گی۔ اتباع سنت میں مقدار کے صحیح توازن و تناسب کو برقرار رکھنا بھی

ضروری ہے۔ کھانا سنت ہے لیکن مسلسل کھاتے چلے جانا کوئی سنت نہیں۔ یہی حال قرعہ اندازی اور استخارے کا ہے۔ بقدر مناسب ہی یہ روا ہے اور ہر قدم پر اس کا استعمال انسان کو وہمی بنا دے سکتا ہے۔

بہرکیف اس موقع پر قرعے میں سیدہ عائشہؓ کا نام نکلا اور غزوہ بنی مصطلق میں وہی حضورؐ کے ساتھ گئیں۔ واپسی میں ایک جگہ قافلہ رکا۔ جناب صدیقہؓ قضائے حاجت کے لیے ایک طرف تشریف لے گئیں۔ اپنی محمل کے پاس واپس آئیں تو دیکھا ہار غائب ہے۔ یہ ہار وہ اپنی بہن اسما سے مستعار لے کر آئی تھیں۔ عام عورتوں کی طرح حضرت عائشہؓ کو زیور سے دل چسپی ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن ان کو بڑی فکر یہ تھی کہ وہ ہار خود ان کا نہ تھا۔ حضرت اسماؓ کا تھا۔ وہ ادھر ہار ڈھونڈنے نکلیں اور ادھر قافلہ چل دیا۔ بات یہ ہوئی کہ حضرت عائشہؓ تھیں دبلی پتلی۔ محمل اٹھانے والے کو پتا بھی نہ چلا کہ اس میں عائشہؓ موجود ہیں یا نہیں۔ جب عائشہؓ واپس آئیں تو قافلہ نکل چکا تھا۔ وہ وہیں چادر اوڑھ کر اس خیال سے لیٹ گئیں کہ آخر لوگ مجھے ڈھونڈنے تو آئیں گے ہی۔ قافلے کے پیچھے پیچھے صفوان بن معطل آرہے تھے۔ عرب کا عام دستور تھا کہ قافلے یا فوجی دستے کے پیچھے ایک یا چند آدمی آتے ہیں جن کا کام یہ ہوتا ہے کہ گری پڑی چیزیں اٹھاتے ہوئے آئیں۔ ان کو سائق کہتے ہیں۔ جناب صفوان نے حضرت عائشہؓ کو دیکھا پہچانا اور صورت حال معلوم کر کے اپنے اونٹ پر بٹھا لیا اور خود مہار تھامے تیزی سے چل پڑے اور قافلے سے جا ملے۔ بس، اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ منافقوں نے جن میں عبداللہ بن ابی پیش پیش تھا ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور اتنا زیادہ پروپیگنڈا کیا کہ بعض مسلمانوں کو بھی دال میں کالا نظر آنے لگا اور جناب عائشہؓ کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگے، بلکہ جناب عائشہؓ پر تہمت لگانے میں وہ بھی شریک ہو گئے۔ انہی مسلمانوں میں مسطح بن اثاثہ، حسان بن ثابت، اور حمنہ بنت جحش ہیں۔

حضورؐ راستے بھر خاموش رہے۔ مدینے پہنچ کر مشورہ کیا۔ ایک جماعت صحابہ نے جن میں نمایاں شخصیات اسامہ بن زید کی ہے صاف کہہ دیا کہ: سبحنک ھذا بھتان عظیم (اے اللہ ہم تیری پاکیزگی کا اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بڑا بہتان ہے)۔ حضرت علیؓ نے کہا: ''یوں تو حضورؐ کے لیے عورتوں کی کمی نہیں' لیکن بریرہؓ سے دریافت فرما لیجئے۔'' بریرہ نے کہا: ''یا رسولؐ اللہ میں نے عائشہؓ میں کوئی عیب بجز اس کے نہیں دیکھا کہ وہ گندھا ہوا آٹا چھوڑ کر سو جاتی ہیں اور بکری آکر اسے کھا جاتی ہے۔

اس موقعے پر سب سے بڑے جگرے کا ثبوت عائشہؓ کے پدر بزرگوار نے دیا۔ کئی ہفتوں تک یہ معاملہ درپیش رہا۔ طرح طرح کی چہ می گوئیاں ہوتی رہیں۔ مخالف و موافق رائیں دی جاتی رہیں لیکن سیدنا ابوبکرؓ نے اشارۃً بھی کبھی کوئی ایسا لفظ زبان سے نہ نکالا جس سے اپنی بیٹی کی حمایت یا سفارش کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ سارا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا تھا اور یہ تسلیم و رضا کی ایسی منزل ہے جو پیغمبر صفت انسان ہی کو حاصل ہو سکتی ہے۔

کئی ہفتے تک تو حضرت عائشہؓ کو کوئی خبر نہ تھی کہ باہر کیا چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں کیوں کہ وہ خود بیمار پڑی تھیں' لیکن جب اس واقعے کا علم ہوا تو اور نڈھال ہو کر رہ گئیں۔ دل و دماغ منتشر ہو گئے' آنسوؤں کی لڑی جاری ہو گئی۔ اسی حال میں آپؓ نے فرمایا کہ: ''اگر میں اس بہتان کی تصدیق کروں تو میں عنداللہ جھوٹی ہوں گی اور اگر تردید کروں تو تم لوگ نہ مانو گے۔ اس لیے یعقوب کی طرح صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتی ہوں کہ فصبر جمیل واللہ المستعان علی ماتصفون۔

عائشہؓ کی یہ فریاد بڑی موثر دستک ثابت ہوئی اور بہت جلد وحی کا دروازہ اپنی بھرپور وسعتوں کے ساتھ کھل گیا۔ سورہ نور کے دو رکوع عائشہؓ کی برات و بے گناہی ثابت کرنے کے لیے نازل ہو گئے۔ ماں نے کہا: بیٹی اٹھ کر

رسولؐ اللہ کا شکریہ ادا کر۔ بیٹی بولی: "اس خدا کا شکر کیوں نہ ادا کروں جس نے میری بے گناہی کی آیات نازل فرمائیں۔" یہ ناز بھرا فقرہ اور یہ توحید میں ڈوبا ہوا جملہ عائشہؓ کے سوا اور کون کہہ سکتا تھا؟

اس کے بعد تہمت لگانے والوں کو حسب ہدایت قرآنی اسی اسی درے لگائے گئے۔

✳ ✳ ✳

(۱۶)

جنگ احزاب یا غزوۂ خندق

یہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ بنو نضیر مدینے سے جلاوطن ہونے کے بعد خیبر کی طرف چلے گئے اور ان کے سرداروں ——— ابو رافع، سلام بن ابی الحقیق، حی بن اخطب اور کنانہ بن ربیع ——— کی وہاں بڑی آؤ بھگت ہوئی اور ان تینوں نے وہاں سردارانہ پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف ان کا جوش انتقام روز افزوں تھا۔ لہٰذا انہوں نے ایک آخری اور فیصلہ کن مقابلے کے لیے عجیب سازش شروع کی۔ یہ تینوں سرداران بنی نضیر مکے جا کر قریش سے ملے اور انھیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ میں وہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ اس کے بعد یہ تینوں قبیلہ غطفان سے ملے اور انھیں بھی ملا لیا، اور ان سے یہ وعدہ کر لیا کہ خیبر کے محاصل کا آدھا حصہ وہ غطفانیوں کو دیا کریں گے۔ غطفان کے حلیف تھے بنی اسد، یہ بھی شریک کر لیے گئے۔ قریش کے قرابت مند تھے بنی سلیم، یہ بھی ساتھ ہو گئے۔ یہود کے حلیف تھے بنی سعد، یہ بھی خم ٹھونک کر آ گئے۔ غرض آس پاس کے تمام قبائل اپنی شاخوں سمیت اسلام اور اہل اسلام کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا کر یک جا ہو گئے۔ ان کی تعداد بائیس یا چوبیس ہزار تھی (بعض روایتوں میں دس ہزار بھی ہے)۔ احزاب جمع ہے حزب کی، جس کے معنی ہیں گروہ۔ اسے غزوہ احزاب اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں عرب کے

تقریباً سارے قبائل گروہ در گروہ مدینے پر حملہ کرنے کے لیے آئے تھے۔ اس کے افسر الکل ابو سفیان تھے۔ غطفانی لشکر کے افسر عیینہ بن حصن فزاری اور بنو اسد کے کمان دار طلحہ۔

حضورؐ کو ان کی آمد کی خبر ملی تو صحابہ سے مشورہ فرمایا۔ مقابلے کا ایک نیا طریقہ پہلی بار آزمایا گیا۔ اس کی رائے جناب سلمان فارسی نے دی تھی جو پسند کی گئی۔ انھوں نے بتایا کہ عجم میں مقابلے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ شہر کے چاروں طرف خندق کھود دی جاتی ہے اور اس طرف محفوظ ہو کر مقابلہ کیا جاتا ہے۔ حضورؐ نے اس رائے کے مطابق خندق کھودنے کا حکم صادر فرمایا۔ یہ خندق مدینے کے تین جانب کھودی گئی۔ وہ سمت جو شام کی طرف ہے چھوڑ دی گئی، کیونکہ اس رخ مکانات بھی تھے اور نخلستان بھی۔ لہٰذا اس طرف خود ہی شہر پناہ بنی ہوئی تھی۔ اسی خندق کی کھدائی کی مناسبت سے اسے غزوہ خندق بھی کہتے ہیں۔ خندق کی کھدائی محض ایک نیا واقعہ ہی نہ تھا بلکہ اس کھدائی میں جو ایمانی قدریں تھیں اور اخلاص کا جو روح پرور منظر تھا وہ دنیا میں اس سے پہلے نہیں دیکھا گیا۔

خندق کی کھدائی کا عجیب منظر

۸ ذوالقعدہ ۵ ھ کو خندق کی کھدائی کا کام شروع ہوا۔ یہ تین ہزار مزدور تھے جو صرف رضائے الٰہی کی خاطر اپنے دست و بازو کو حرکت دے رہے تھے۔ ان کو کوئی مزدوری رقم کی شکل میں نہ مل رہی تھی۔ بلکہ فاقوں پر فاقے ہو رہے تھے۔ آسمان کی آنکھوں نے اس سے بہتر مزدوروں کا گروہ نہیں دیکھا۔ یہ سب لوگ یہ رجز پڑھ رہے تھے:

نحن الذین بایعوا محمدا
علی الجہاد ما بقینا ابدا

ہم وہ ہیں جو اپنے آپ کو جہاد کے لیے
محمدؐ کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں۔

خدا کا رسولؐ ان مقدس رجز خوانوں کے جواب میں یوں کہتا:

اللّٰھم لا عیش الا عیش الاخرہ
فاغفر الانصار والمھاجرہ
الٰہی زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے'
پس انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما
(کہ انھیں عیش آخرت حاصل ہو)۔

اور کبھی یوں ارشاد ہوتا۔

واللّٰہ لو لا اللّٰہ ما اھتدینا
ولا تصدقنا ولا صلینا
بخدا اگر فضل الٰہی شامل حال نہ ہوتا تو
نہ ہم ہدایت پاسکتے تھے اور نہ زکوٰۃ و
صلواۃ ادا کرسکتے تھے۔

فانزلن سکینہ علینا
وثبت الاقدام ان لاقینا
لہٰذا ہم پر سکینت نازل فرما اور جب ہم
دشمن سے دوچار ہوں تو ہمیں ثابت
قدم رکھ۔

ان الذین قد بغوا علینا
اذا ارادوا فتنہ ابینا
ہم پر دشمن چڑھ آئے ہیں اور جب وہ
کوئی فتنہ کھڑا کرنا چاہیں تو ہم اسے

رد کر دیں گے۔

ہر شخص نے ایک گز لمبی اور پانچ ہاتھ گہری زمین کھودی۔ چوڑائی اتنی تھی کہ خندق میں اترے بغیر کوئی آدمی یا گھوڑا جست کر کے اس پار نہ آسکے۔ سرور کونینؐ بھی ان سب کے ساتھ زمین کھودنے اور مٹی پھینکنے میں برابر کے شریک تھے۔ ایک شخص کو زمین کھودتے کھودتے ایک چٹان ملی جس پر کوئی ضرب کام نہ کرتی تھی۔ حضورؐ موقعے پر تشریف لے گئے۔ اس وقت حضورؐ کو تین دن سے فاقہ تھا مگر نبوت کی قوت تیز تر ہو رہی تھی۔ حضورؐ نے تین ضربوں میں اس چٹان کے پرخچے اڑا دیئے۔

پیغمبری نگاہ

ذرا اس نازک موقعے پر نظر ڈالیے کہ کفر کی تمام عربی قوتیں متحد ہو کر اس ارادے سے آرہی ہیں کہ اسلام اور اہل اسلام کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے گا۔ ادھر مسلمان محصور ہونے کے علاوہ خشک سالی اور شدید سردی سے دوچار ہیں اور کئی کئی وقت کے فاقے ہو رہے ہیں۔ کلیجے منہ کو آگئے ہیں۔ وبلغت القلوب الحناجر ایسے جھٹکے پڑ رہے ہیں کہ دل ہلے جا رہے ہیں۔ وزلزلوا زلزالاً شدیداً۔ غرض اس سے پہلے کبھی ابتلا نے اس طرح اپنا چہرہ نہ دکھایا تھا۔ مگر عین اس مرحلے پر چٹان کو توڑتے ہوئے پیغمبری نور چمک کر سامنے آتا ہے اور حضورؐ اس نور میں مستقبل کو اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح کوئی اپنی ہتھیلی کو دیکھے۔ کہاں مسلمانوں کی یہ بے بسی کہ جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور کہاں رسولؐ کا یہ ارشاد کہ: "میری ضرب نے قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے منہ کھول دیے۔" کون یقین کر سکتا ہے کہ یہ باتیں کبھی حقیقت بن کر سامنے آسکیں گی؟ لیکن بیس سال نہیں گزرے کہ دنیا نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ لیا۔

قلعے بندی اور مقابلے کا انداز

یہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ بنو نضیر کے جلاوطن ہونے سے پہلے بنو قریظہ نے مسلمانوں سے تجدید معاہدہ کر لی تھی' اس لیے اب تک وہ ان دشمن اتحادیوں سے الگ تھے' مگر بنو نضیر کے سردار حی بن اخطب نے بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد کو رد و قدح کے بعد ہموار کر لیا اور یہ بھی معاہدے کا احترام کیے بغیر دشمنوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ حضورؐ کو یہ خطرہ پہلے ہی سے تھا اس لیے دو سو صحابہؓ کو اس محاذ پر متعین کر دیا کہ جدھر سے بنو قریظہ کے حملے کا خطرہ تھا۔ عورتوں اور بچوں کو محفوظ قلعوں میں بند کر دیا گیا اور کوہ سلع کو پشت کی طرف رکھ کر مسلمانوں نے اپنی صفیں آراستہ کیں۔ جماعت مسلمین میں کچھ منافقین بھی تھے جو متعدد بہانے کر کے کھسک گئے مگر اہل ایمان کے پائے ثبات میں کوئی لغزش آنے کی بجائے اور زیادہ استحکام پیدا ہو گیا۔

دشمنوں کی ٹڈی دل فوج بڑے زور شور سے آگے بڑھی مگر خندقوں کو دیکھ کر رک گئی۔ ایک ماہ تک دشمن محاصرہ کیے رہے۔ دست بدست مقابلہ نہیں ہوا۔ بس ادھر سے تیر اور پتھر برسائے گئے اور ادھر سے تیروں اور پتھروں سے جواب دیا گیا۔

حضرت زبیرؓ کی ہمت مردانہ

ایک دن حضورؐ نے فرمایا: "کوئی ہے جو دشمنوں کی خبر لائے؟" کسی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ یوں بھی چوبیس ہزار دشمنوں میں مخبری کے لیے تنہا جانا آسان نہ تھا۔ حضورؐ نے تین بار آواز دی لیکن ہر بار ایک ہی شخص نے اٹھ کر اپنے آپ کو پیش کیا اور یہ تھے سیدنا زبیر بن عوام ——— عشرہ مبشرہ کے ایک فرد ——— یہی وہ نازک مرحلہ تھا جہاں حضورؐ نے جناب زبیرؓ کو حواری رسول کا زندہ جاوید لقب عطا فرمایا۔

سیدنا علیؓ کی شجاعت

محاصرے کی طوالت کے بعد دشمنوں نے خندق پار کرنے کی وہ جگہ ڈھونڈ لی جہاں خندق کی چوڑائی ذرا کم رہ گئی تھی۔ اس راستے سے ضرار بن خطاب' عکرمہ بن ابوجہل' نوفل' ہبیرہ بن ابی وہب' اور عمرو بن عبدود نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور خندق پار کر لی۔ عمرو بن عبدود بدر میں بری طرح زخمی ہوا تھا اور اسی سبب سے وہ احد میں شرکت نہ کر سکا تھا۔ وہ آج نوے سال کا بڈھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عمر میں وہ کیا جنگ کر سکتا تھا لیکن جوانی میں وہ ہزار سواروں کے برابر تسلیم کیا جاتا تھا' اور اسی قدیم دبدبے کے بل بوتے پر وہ میدان میں آیا تاکہ جوانوں کو غیرت آئے اور بوڑھے بھی اس کے بہادرانہ اقدام سے سبق لیں۔ وہ بالکل کمزور اور بوڑھا ہو چکا تھا لیکن ہمت جوان تھی۔ اس نے خندق پار کر کے مسلمانوں کو للکارا۔ حضورؐ نے تین بار آواز دے کر دریافت فرمایا: "اس کے مقابلے کو کون جائے گا۔ ہر بار حضرت علیؓ ہی اٹھے۔ حضرت علیؓ کے ساتھ چند اور صحابہ بھی گئے۔ حضرت علیؓ نے عمرو بن عبدود کے سامنے اسلام پیش کیا' اس نے انکار کیا۔ سیدنا علیؓ نے اسے گھوڑے سے اتر کر مقابلہ کرنے کی فرمائش کی۔ وہ اترا اور آپؓ پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ خود کو کاٹ کر پیشانی کو زخمی کر دیا اور یہ نشان ساری عمر رہا۔ اس کے جواب میں آپؓ نے اس کے شانے پر ایسا وار کیا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ یہ رنگ دیکھ کر اس کے ساتھی بھاگے۔ مگر نوفل بن عبداللہ آگے بڑھا جسے زبیر بن عوامؓ یا علیؓ بن ابی طالب نے ایک ہی وار میں ختم کیا اور میدان نعرہ تکبیر سے گونج اٹھا۔

مشرکوں نے اپنے مقتول (ابن عبدود) کی لاش کے لیے دس یا بارہ ہزار درہم پیش کیے مگر حضورؐ نے کوئی رقم قبول نہ فرمائی اور لاش واپس کر دی۔ (رواہ ابن اسحق و احمد و البیہقی)۔ اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ حضورؐ

کا مقصد جنگ کیا تھا۔ محض حصول دولت یا قیام اقدار؟

تین یا چار نمازوں کی قضا

اگرچہ باقاعدہ دست بدست جنگ تو نہ ہوئی لیکن ایک دن تیروں اور پتھروں کی اتنی بارش کی گئی کہ مسلمانوں کے لیے نماز ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ اس دن نصف شب کے بعد ظہر' عصر' مغرب اور عشا ایک ساتھ ادا کی گئی۔ ایک اذان اور چار اقامتیں کہی گئیں۔

صفیہ کی شجاعت و حکمت

ایک دن بنو قریظہ کا ایک آدمی حملہ کے لیے راستہ ڈھونڈتا ہوا اس قلعے کے پاس آگیا جہاں عورتوں کو محفوظ کیا گیا تھا۔ مردوں میں سے یہاں کوئی نہ تھا۔ صرف حسان بن ثابت تھے' جو عارضہ قلب میں مبتلا تھے۔ مقابلہ کی جرات نہ کرسکے۔ مگر حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب (حضرت حمزہؓ کی بہن اور حضورؐ کی پھوپھی) نے خیمے کی ایک چوب اکھیڑ کر اس یہودی کے سر پر وہ ضرب لگائی کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے بعد خود اس کا سر کاٹا اور قلعے کی دیوار کے نیچے پھینک دیا۔ جناب صفیہؓ نے یہ بڑا عقل مندی کا کام کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنو قریظہ ڈر گئے اور انھیں حملے کی جرات نہ ہو سکی۔ وہ یہ سمجھے کہ ادھر بھی حفاظت کے لیے فوج متعین ہے۔

قدرت کی امداد

محاصرے کی طوالت سے دشمن بھی گھبرا گئے۔ چوبیس ہزار آدمیوں کی رسد کا انتظام بجائے خود ہی ایک مشکل مسئلہ تھا۔ اس پر سردی کی شدت نے مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا' اور سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ بڑی زور کی آندھی آگئی جس نے حملہ آوروں کے خیمے اکھاڑ دیے اور ان کی ہانڈیاں الٹ

گئیں۔ یہ ایک قدرتی امداد تھی جس نے حملہ آوروں کو پریشان کر دیا۔ ایک عجیب غیبی امداد اور بھی ہوئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قبیلہ غطفان کے ایک سردار نعیم بن مسعود ثقفی اسلام لے آئے تھے۔ لیکن کسی کو اطلاع نہ تھی۔ ان کا اثر قریش مکہ اور یہود مدینہ دونوں پر تھا۔ یہ ایک دن حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: "یا رسولؐ اللہ! میں مسلمان ہو چکا ہوں لیکن کسی کو بتایا نہیں ہے۔ کوئی خدمت میرے سپرد بھی فرمائی جائے۔" حضورؐ نے فرمایا کہ: "دشمنوں کو دفع کرنے میں ہماری کوئی امداد کر سکتے ہو تو کرو۔" حضرت نعیم پہلے تو بنو قریظہ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ: "دیکھو قریش آج تو حملہ کرنے یہاں آ گئے ہیں لیکن آخر وہ جنگ ختم ہونے کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ تمہارا اور مسلمانوں کا ہمیشہ کا ساتھ ہے۔ اس قصے میں پڑ کر ساری زندگی کے لیے اپنے پڑوسیوں (مسلمانوں) کی مخالفت مول لینا کون سی عقل مندی ہے۔ تم لوگ ایسا کرو کہ قریش سے چند نوجوانوں کو بطور یرغمال کے طلب کرو تاکہ قریش جنگ کا آخری فیصلہ کیے بغیر تمھیں مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ نہ جائیں' اور اگر وہ ایسا کریں تو تمھیں یہ حق ہو گا کہ قریشی نوجوانوں کو واپس نہ کرو۔ ورنہ قریش تمھیں احمق بنا کر خود چل دیں گے اور تمھیں ایک دائمی مصیبت میں ڈال جائیں گے۔" یہ باتیں جناب نعیم بن مسعود ثقفیؓ نے کچھ اس انداز سے کہیں کہ یہود بنی قریظہ کے دل میں اترتی چلی گئیں اور انھوں نے نعیم کی بات پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت نعیم ادھر سے فارغ ہو کر اپنے قبیلہ غطفان اور قریش کے پاس پہنچے اور کہا کہ: "بنو قریظہ چونکہ مسلمانوں کے ہمسائے ہیں اس لیے وہ اس حق ہمسائیگی کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ دل سے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ محض نمائشی طور پر تمہارا ساتھ دے رہے ہیں۔"

قریش جناب نعیم کی زبان سے یہ سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ آزمائش

کے طور پر انھوں نے بنی قریظہ سے کہلا بھیجا کہ: "کل تم لوگ مسلمانوں پر حملہ کرنے میں پہل کرو۔" بنو قریظہ کو حضرت نعیم تو سمجھا ہی چکے تھے۔ انھوں نے قریش کو جواب بھجوا دیا کہ: "اول تو کل یوم سبت (ہفتے کا دن) ہے جو عبادت کا دن ہے اور اس دن حملہ تو درکنار کوئی معمولی سا کام بھی نہیں کرسکتے۔ علاوہ ازیں اپنے چند نوجوانوں کو بطور یرغمال ہمارے پاس بھیج دو جو اس بات کی ضمانت ہو کہ تم ان کی خاطر جمے رہو گے اور بیچ میں جنگ کو معلق چھوڑ کر اور ہمیں دائمی مصیبت (مسلمانوں سے تلخ تعلقات) میں ڈال کر واپس نہ چلے جاؤ گے۔"

یہود بنی قریظہ کی طرف سے یہ جواب سن کر قریش کو یقین ہو گیا کہ نعیم بن مسعود نے سچ کہا تھا کہ بنو قریظہ دل و جان سے جنگ میں ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ یہ محسوس کر کے ابوسفیان نے کہا کہ: "یہود کھسکتے جاتے ہیں۔ موسم بھی سخت ہے اور سامان رسد بھی ختم ہو چکا ہے لہٰذا اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے اور کوچ کا سامان کیا جائے۔" غرض طبل کوچ بجا' یہود اپنے قلعوں میں واپس آگئے اور قریش و غطفان اپنی سمت روانہ ہو گئے۔

لمحہ فکریہ

ہمیشہ سے سیاست اور تقوے میں کچھ بیر سا رہا ہے۔ تقویٰ سچائی چاہتا ہے اور سیاست میں مطلب برآری اصل الاصول ہے خواہ یہ سچائی سے ہو یا سچائی کو پس پشت ڈال کر ہو۔ پھر اگر جنگ ہو رہی ہو تو بمصداق الحرب خدعتہ (جنگ دھوکا ہے) اس میں سر کا نشانہ دکھا کر پھرتی سے پاؤں میں مار دینا ایک ضروری جنگی چال ہے۔ اثنائے جنگ میں اخلاقی قدروں کا کب خیال رکھا جاتا ہے۔ ایسے نازک مواقع پر تو اقدار کو بے تکلف ذبح کر دیا جاتا ہے'

لیکن اسلام کا مبلغ اول کیا سکھاتا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ حضورؐ جناب نعیم سے کسی ایسی چیز کی فرمائش نہیں کرتے جو اخلاقی قدروں کو مجروح کرے۔ صرف اتنی بات فرماتے ہیں کہ: "دشمنوں کو دفع کرنے میں ہماری کوئی امداد کرسکتے ہو تو کرو۔" پھر حضرت نعیم کو دیکھیے جو حضورؐ کی صحبت میں نہیں رہے بلکہ آج سے پہلے انھوں نے اپنے اسلام کا اظہار بھی نہیں کیا تھا لیکن انھوں نے بنی قریظہ اور قریش سے جو باتیں کیں اس میں کوئی کذب صریح یا فریب صریح نہیں دکھایا جاسکتا۔ بات انھوں نے خدا لگتی ہی کہی جو دونوں کے دل میں اتر گئی اور مقصد حاصل ہو گیا۔

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اسلام انہی کے دلوں میں گھر کرتا ہے جو اونچے کردار اور بلند تصورات سے ہم آہنگی رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ جنگ جیسے نازک مواقع پر بھی اقدار انسانی کی نزاکت کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔ اسلام ان ہی کو پہلے کھینچتا ہے جن کو اسلام اپنے دل کی آواز معلوم ہوتا ہے اور جو فکر و کردار اور سلامت ذوق کے لحاظ سے ذہنی ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا ذہن ایسا تیار ہوتا ہے کہ وہ فوراً پیغام حق کو قبول کرلیتے ہیں۔ کچھ لوگ عرصہ دراز کے بعد سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ زندگی کی آخری سانس تک بھی نہیں سمجھ پاتے۔

نتیجہ جنگ

یہ جنگ کوئی باقاعدہ دست بدست تو ہوئی نہ تھی، اس لیے موتیں بھی زیادہ نہ ہوئیں۔ صرف تین مشرکین اور چھ مسلمان مارے گئے، جن میں قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ بھی تھے۔ ان کو ایک کاری زخم لگا تھا جس سے ایک ماہ بعد انھوں نے وفات پائی۔ زخمی ہونے کی حالت میں بھی اللہ نے ان سے ایک بڑا کام لیا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

بیس بائیس دن یہ محاصرہ رہا۔ اہل اسلام کے خلاف اتنی بڑی اجتماعی یورش نہ اس سے پہلے ہوئی تھی اور نہ بعد میں ہوئی۔

ایک شبہے کا ازالہ

غزوہ احزاب کے موقعے پر آپ نے سنا کہ ایک موقعے پر حضورؐ نے مجمع عام کو مخاطب کر کے تین بار پوچھا: ''کون دشمن کی خبر لانے کو تیار ہے؟'' جواب میں ہر بار حضرت زبیر بن عوام کھڑے ہوئے۔ اسی طرح دوسرے موقعے پر حضورؐ نے تین مرتبہ پوچھا: ''عمرو بن عبدود کے مقابلے پر کون جائے گا؟'' جواب میں ہر بار حضرت علیؓ بن ابی طالب کھڑے ہوئے۔ اس قسم کے واقعات سے بعض سادہ لوحوں کو یہ نتیجہ نکالتے دیکھا ہے کہ بعض مواقع پر ایک آدھ کے سوا سارے صحابہ بزدل ثابت ہوئے ہیں۔ العیاذ باللہ من ذلک۔ اگر آپ ایک مجمے میں کہیں کہ: بھئی پانی کون پلائے گا؟ تو اس مجمعے میں کوئی ایک ہی آدمی آپ کو پانی پلانے اٹھے گا۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ ایک کے سوا باقی سب کام چور ہیں یا آپ کو پیاسا مارنا چاہتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ایک کا کمربستہ ہونا سب کی طرف سے نمائندگی ہوتی ہے۔

جب کسی مقصد کے لیے حضورؐ اس طرح تخاطب فرماتے تو زیرک صحابہ خود منشائے نبویؐ کو تاڑ جاتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس عام تخاطب میں روئے سخن کس کی طرف ہے۔ جو اس سپرد کردہ خدمت کا اہل ہوتا' وہ منشائے نبوی کو تاڑ جاتا اور خود کھڑا ہو کر اس کام کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیتا۔ معرکہ بدر سے قبل مجلس شوریٰ میں اسی منشائے نبویؐ کو تاڑ کر سردار خزرج جناب سعد بن عبادہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ: ''شاید حضورؐ کا اشارہ ہم انصار کی طرف ہے۔ اگر حضورؐ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں گے۔'' اور اسی وقت حضرت مقداد نے منشائے نبوی کو بھانپ کر عرض کیا تھا کہ: ''یا رسولؐ

اللہ ہم قوم موسیٰؑ نہیں جو یہ کہہ دیں کہ موسیٰؑ تم اور تمہارا رب جا کر جنگ کریں، ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔" اسی منشائے نبوی کو محسوس کر کے حضرت ابودجانہ نے معرکہ احد میں رسولؐ اللہ کی تلوار لپک کر لے لی تھی۔ اسی منشائے نبویؐ کو حضرت زبیر نے محسوس کر کے غزوہ خندق کے موقعے پر مخبری کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں اور اسی منشائے نبوی کو معلوم کر کے عمرو بن عبدود کے مقابلے کے لیے حضرت علیؓ خم ٹھونک کر آگئے۔ نہ کوئی بزدل تھا نہ کام چور، اور نہ ایک کا کھڑے ہو جانا دوسروں کی بزدلی کی دلیل۔ وہ لوگ بزدلی کیا دکھائیں گے جو اپنے گھروں سے چلے ہی ہیں ہتھیلی پر سر لے کر، اور اپنے جان و مال کو خدا کے ہاتھ جنت کے عوض فروخت کر چکے ہیں؟ صحابہ جب کبھی کھڑے نہیں ہوئے یا خاموش رہے تو صرف اس وقت جب حضورؐ کا منشا معلوم کرنے میں انھیں تامل یا تردد ہوا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر ہم سپرد کردہ مقصد کے لیے بے سمجھے بوجھے کھڑے ہوگئے اور حضورؐ نے بٹھا دیا تو نااہلی کا داغ ہمیشہ کے لیے چپک کر رہ جائے گا۔ اس لیے وہ اس بات کے منتظر رہتے تھے کہ یا تو حضورؐ خود ہی کسی کو نامزد فرما دیں یا وہ شخص از خود کھڑا ہو جائے جو منشائے نبوی کو اور اصلی روئے سخن کو اچھی طرح بھانپ گیا ہو۔ انھیں یہ بھی علم تھا کہ حضورؐ جسے نامزد فرما دیں گے اس سے بہتر کوئی اہل ثابت نہ ہو سکے گا۔ ایک کم سن اسامہ بن زید کو حضورؐ نے نامزد کیا تو وہ ایسا اہل ثابت ہوا کہ رومیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو حدود شام سے آگے قدم نہ رکھنے دیا۔ حضرت علیؓ اپنے کو عہدہ قضا کے لیے اہل نہ سمجھتے ہوئے عذر و معذرت پیش کرتے رہے مگر حضورؐ نے انھیں قاضی یمن بنا کر بھیج دیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ویسا قاضی پھر نہیں پیدا ہوا۔

الغرض ایسے تمام مواقع پر صحابہ کی خاموشی یا تو اس لیے ہوتی تھی کہ حضورؐ ہی کسی کو نامزد فرما دیں یا اس لیے کہ روئے سخن کو بھانپ جانے والا اہل

خود کھڑا ہو جائے۔ ان کو یہ ضرور خیال رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص منشائے نبوی معلوم کیے بغیر خود کھڑا ہو جائے اور وہ غیر اہل (ان فٹ) سمجھ کر بٹھا دیا جائے یا کسی ایسے کام کا ذمہ لے لے جسے نبھا نہ سکے۔ بس اس سے زیادہ اور کوئی بات نہ تھی۔ نہ کوئی کام چور تھا نہ بزدل۔ یہ کون تسلیم کر سکتا ہے کہ جب مخبری کے لیے حضرت زبیرؓ کھڑے ہوئے تو سارے صحابہ حضرت علیؓ سمیت بزدل ہو گئے تھے یا جب ابن عبدود کے مقابلے میں حضرت علیؓ آگے بڑھے تو سارے صحابہ مع حضرت زبیر ڈرپوک بن گئے تھے؟

✳ ✳ ✳

(۱۷)

غزوۂ بنو قریظہ

اوپر آپ یہ پڑھ چکے ہیں کہ مدینے میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع' بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ یہ بھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ معاہدہ شکنی کی وجہ سے بنو قینقاع جلاوطن ہو کر شام کے علاقہ ازرعات میں آباد ہو گئے تھے اور جب بنو نضیر نے غداری کی تو جلاوطنی کے بعد یہ خیبر کے علاقہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ تیسرا قبیلہ بنو قریظہ کا تھا۔ یہ اب تک اپنے معاہدے پر قائم تھا اور انھیں امن و امان' دینی آزادی اور تمام طرح کے مساویانہ شہری حقوق حاصل تھے۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے' انھیں حی بن اخطب نے اکسایا اور بھکایا اور غزوہ خندق میں ان سبھوں نے علانیہ غداری اور عہد شکنی کر کے حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ ان بنو قریظہ نے جہاں مسلمانوں سے معاہدہ کیا تھا وہاں یہ انصار کے حلیف بھی تھے۔ اس کے باوجود یہ اہل اسلام کا محاصرہ کرنے میں کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھ رہے۔ بلکہ حملے کا راستہ معلوم کرنے کے لیے اپنا ایک شخص اس قلعے تک بھی بھیجا جہاں مسلمان عورتیں اور بچے محفوظ تھے اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن حی بن اخطب کو اپنے ہاں پناہ دی۔ ان تمام تجربوں کے بعد فوجی' سیاسی' قومی اور ملکی نقطہ نگاہ سے ان مارہائے آستین پر ایک منٹ کے لیے بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضورؐ اکرم اور تمام باتوں کو برداشت فرما سکتے تھے لیکن غداری اور

عہد شکنی حضورؐ کی نگاہوں میں اتنا بڑا اخلاقی جرم ـــــ انفرادی نہیں بلکہ قومی جرم ـــــ تھا کہ اس کی معافی نہیں دی جاسکتی تھی۔ وفائے عہد اخلاقی زندگی کی وہ بنیادی قدر ہے جس کے ختم ہو جانے کے بعد زندگی کے ہر شعبے سے امان و اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ سیاسی روابط، قومی تعلقات، تجارتی لین دین، ملکی آمدورفت، سفارتوں کا مبادلہ، غرض ہر شے خطرے میں پڑ جاتی ہے اور کسی کو دوسرے پر کسی معاملے میں بھی اعتماد نہیں رہتا اور امن و امان ایک دائمی بے چینی اور بے اطمینانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کاروبار حیات کس طرح جاری رہ سکتا ہے؟ اس لیے جو شخص یا قوم ایک بار اپنے عہد سے پھر جائے اس پر کبھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ حضورؐ تو مبعوث ہی ہوئے تھے اخلاقی اقدار قائم کرنے کے لیے، یہ کیسے ممکن تھا کہ اخلاقی گراوٹ کی اس انتہا کو ـــــ جس کا مظاہرہ بنو قریظہ کی طرف سے ہوا ـــــ حضورؐ گوارا فرما لیتے۔ ایسے غدار یقیناً ایسی عبرت ناک سزا کے مستحق ہیں جو دوسرے بدنیتوں کی آنکھیں کھول دے اور ہر شخص اس حقیقت کو سمجھ لے کہ اس اخلاقی گراوٹ ـــــ قومی عہد شکنی و غداری ـــــ کا یہ انجام ہوتا ہے۔

غزوہ احزاب سے مدینے واپس تشریف لاتے ہی حضورؐ نے حکم دیا کہ کوئی مسلمان اپنے ہتھیار نہ اتارے بلکہ سارے سرفروش بنو قریظہ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ مسلمان حکم کے بندے تھے۔ فوراً کوچ کر گئے اور بنو قریظہ کو محاصرے میں لے لیا۔

اس حالت میں اگر بنو قریظہ شرافت اور اظہار ندامت سے کام لیتے تو عجب نہیں کہ رحمتہ للعالمینؐ کا جذبہ عفو و کرم انھیں معافی دے دیتا۔ مگر انھوں نے بڑی کج خلقی برتی۔ اکڑ دکھائی اور حضورؐ کی شان میں بڑے گستاخانہ کلمات نکالے۔ مسلمان انہیں تقریباً ایک ماہ گھیرے میں لیے رہے، اور آخرکار بنو قریظہ عاجز آگئے اور مصالحت کی درخواست پیش کی اور حضورؐ کی

خدمت میں کہلوا بھیجا کہ ہمارے سابق حلیف ابو لبابہؓ کو گفتگوئے مصالحت کے لیے بھیج دیجیے۔

جناب ابو لبابہؓ کو جہاں مسلمانوں کے جوش کا اندازہ تھا وہاں وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ حضورؐ کی نگاہوں میں معاہدہ شکنی اور غداری کتنا سنگین جرم اور اس کی کیا عبرت ناک سزا ہو سکتی ہے۔ جب وہ بنو قریظہ کے پاس پہنچے تو بنو قریظہ نے ان سے نجی طور پر دریافت کیا کہ مسلمان ہمارے ساتھ کس قسم کے سلوک کا ارادہ رکھتے ہیں؟ ابو لبابہؓ نے اشارے سے بتایا کہ: "تم سب گردن زدنی ہو۔" ابو لبابہؓ نے بتانے کو تو بتا دیا' لیکن فوراً ہی انھیں شدید ندامت ہوئی کیونکہ انھیں اول تو یہ بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ فی الواقع ایسا ہو گا۔ دوسرے اگر بر سبیل تذکرہ یہ کہا بھی گیا ہو کہ یہ سب گردن زدنی ہیں تو گفت و شنید سے پہلے انھیں اس کے اظہار کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اس طرح کی بے محل باتوں کے اظہار کی عادت ہو تو ہر وقت یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ کبھی فوجی و سیاسی راز افشا ہو جائے اور پوری قوم کو ذرا سی غلطی کی وجہ سے سخت نقصان اٹھانا پڑے۔ بہر حال اس غلطی کا حضرت ابو لبابہؓ کو شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ وہ اسی وقت وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ندامت میں ڈوبے ہوئے سیدھے مسجد نبوی میں آئے اور ایک ستون سے اپنے آپ کو باندھ لیا اور یہ عہد کر لیا کہ: "جب تک اللہ تعالیٰ میری اس غلطی کو معاف نہ کر دے اور حضورؐ خود اپنے ہاتھوں سے مجھے نہ کھولیں میں اسی طرح بندھا رہوں گا۔" صرف نماز باجماعت (یا حاجت ضروریہ) کے وقت ابو لبابہؓ اپنے آپ کو کھول لیتے تھے' باقی اوقات میں بندھے رہتے۔ ایک یا دو ہفتے اسی طرح گزر گئے۔ آخر ادھر ندامت و توبہ اپنے اوج کمال پر پہنچی اور ادھر معافی و رحمت کا دروازہ بھی اپنی بھرپور وسعتوں کے ساتھ کھل گیا۔ حضورؐ نے اپنے دست مبارک سے ابو لبابہؓ کی رسی کھول دی۔ مسجد نبوی میں یہ ستون اب بھی موجود ہے۔ جس پر اسطوانہ ابی لبابہ

لکھا ہوا ہے۔ ابو لبابہؓ کے ایمان' ندامت' توبہ اور قبول توبہ کے صحیح مقام کا اندازہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون کرسکتا ہے؟ توبہ کا یہ طریقہ نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں' نہ کسی فقہ میں۔ یہ ابو لبابہؓ کے اظہار ندامت کا ایک انداز تھا۔

ابو لبابہؓ کے بعد سعد بن معاذؓ

بہرحال ابولبابہؓ تو درمیان سے ہٹ گئے اور خود یہود بنی قریظہ کی خواہش کے مطابق حضرت سعد بن معاذؓ کو فیصلے کے لیے ثالث بنایا گیا۔ یہ وہی سعد ہیں جو چند دنوں پہلے غزوہ خندق میں زخمی ہوگئے تھے لیکن ابھی تک زندہ تھے۔ یہ بھی بنو قریظہ کے حلیف تھے اور انھیں امید تھی کہ یہ بڑی رعایت سے کام لیں گے۔ لیکن انھوں نے ان یہود کے بارے میں جو فیصلہ کیا وہ ان ہی کی آسمانی کتاب کے مطابق تھا۔ حضورؐ نے بھی اس کی تصویب فرمائی اور کہا کہ تمہارا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہوا۔ کتاب استثنا کے بیسویں باب کی دسویں آیت ملاحظہ ہو۔ اس کا فیصلہ یہ ہے:

> "(اے موسیٰ) جب تو کسی شہر پر حملہ کرنے کے لیے جائے تو پہلے پیغام صلح دے۔ اگر وہ تسلیم کرلیں اور تیرے لیے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے ــــــ لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے۔ باقی بچے' عورتیں' جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لیے مال غنیمت ہوں گی۔"

یہود کتاب موسیٰ پر ایمان رکھنے کے دعوے دار تھے اور یہ فیصلہ اسی

کتاب کا ہے۔ اس کتاب کے مطابق ہی چار یا چھ سو یہود بنی قریظہ قتل کیے گئے اور تمام متروکات مسلمانوں کو بطور غنیمت ملے۔

لمحہ فکریہ

بہ ظاہر اس خوں ریزی کو سنگ دلی سے تعبیر کیا جائے گا لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ایک قوم کے لیے معاہدہ و میثاق پر قائم رہنا اتنی بڑی اہم اور بنیادی قدر ہے کہ اس کے بغیر امن عالم کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک میں اس کی بار بار تاکید آئی ہے اور حضورؐ کی سیرت پر ہر نازک سے نازک قدم پر اس کا عملی نمونہ ملتا ہے۔ جو قوم اپنے قومی میثاق پر قائم نہ رہے' اس پر زندگی کے کسی مرحلے میں بھی وثوق نہیں کیا جاسکتا اور اس کی سزا وثاق (مضبوط گرفت اور بندھن) کے سوا کچھ نہیں۔ ایسی قوم اپنے مفاد عاجل کی خاطر میثاق الٰہی کو بھی توڑ دیتی ہے۔ بائبل کے دو حصوں کا نام عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید ہے اور قرآن بھی جدید ترین اور آخری میثاق (عہد نامہ) ہے خدا اور اس کے بندوں کے درمیان۔ خدا اور بندوں کے درمیان معاہدے کا مقیاس اور کسوٹی صرف یہ ہے کہ اس کے بندوں کے درمیان جو میثاق و معاہدہ ہوتا ہے وہ قائم رہتا ہے یا نہیں؟ جو قوم اس پر قائم نہ رہے اس کے متعلق بے تامل سمجھ لینا چاہیے کہ وہ میثاق الٰہی پر بھی قائم نہیں' اس لیے کہ میثاق خداوندی ہی کا یہ حکم ہے کہ بندے اپنے باہمی معاہدوں پر قائم رہیں۔ جو لوگ مفاد پرستی اور موقع پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں اور عین وقت پر عہد شکنی کر کے دغا دیتے ہیں وہ دوسروں کے لیے اخلاقی گراوٹ کی ایک گندی مثال پیش کرتے ہیں اور گویا دوسروں کو بھی اسی اخلاق کشی پر ابھارتے ہیں۔ قومی' سیاسی اور فوجی نقطہ سے اس جرم کی جو سزا ہو سکتی ہے یا ہونی چاہیے وہ اپنی جگہ ہے ہی۔ اخلاقی زاویہ نظر سے بھی یہ اتنا سنگین جرم ہے جس کے لیے بڑی

سے بڑی سزا بھی کم ہے۔ اور یہ سزا محض اس لیے نہیں کہ اس جرم کے مرتکب کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے بلکہ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ بے کردار لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور ایسی غیر شریفانہ حرکت کی جرات نہ کریں ــــــ جو رسولؐ آیا ہی تھا اخلاقی اقدار کو قائم کرنے کی غرض سے' وہ ایسی انسانیت کش اور اخلاق سوز حرکت کو اپنی کمال رحمت و فراخ دلی سے برداشت بھی کر لیتا تو سعدؓ بن معاذ نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ بھی فیصلہ کیا بالکل صحیح کیا۔

جناب زینبؓ بنت جحش کا نکاح

اسی ۵ ھ میں ایک اہم واقعہ نکاح زینب کا ہے۔ زینبؓ بنت جحش حضورؐ کی پھوپھیری بہن تھیں۔ حضورؐ نے ان کا نکاح زیدؓ بن حارثہ سے کر دیا۔ حضرت زیدؓ پہلے حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے اور آپؓ ہی نے زیدؓ کو حضورؐ کے حوالے کر دیا۔ حضورؐ نے زید کو آزاد کر کے اپنا متبنی (منہ بولا فرزند) بنا لیا' جس کی وجہ سے یہ زیدؓ بن محمدؐ کہے جاتے تھے۔ حضورؐ کا بڑا مشن یہ تھا کہ آزاد و غلام کا فرق بتدریج مٹا دیا جائے۔ عرب کی ثقافت میں قیدی کے آزاد ہو جانے کے بعد بھی اسے برابری کا درجہ نہ دیا جاتا تھا۔ حضورؐ نے اس دھبے کو یوں مٹایا کہ اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح جناب زیدؓ سے کر دیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد دونوں میاں بیوی میں کش مکش شروع ہو گئی اور یہ کش مکش یہاں تک بڑھی کہ زید طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا (جسے قرآن نے نقل کیا ہے) کہ:

امسک علیک زوجک واتق اللّٰہ (الاحزاب: ۳۷)
طلاق نہ دو اور تقویٰ اللہ اختیار کرو۔

مگر نباہ نہ ہونے کی وجہ سے زید نے طلاق دے ہی دی۔ اس طلاق کے بعد

زوجین نے خواہ کسی قدر سکون محسوس کیا ہو لیکن ایک عورت کے لیے یہ نیک نامی کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں جناب زینبؓ کے لیے یقیناً ایک خلش اور دل شکنی کا پہلو موجود تھا۔ محض اس دل شکنی کو دور کرنے کے لیے (بعد عدت) حضورؐ نے زیدؓ کی معرفت جناب زینبؓ کو پیغام نکاح دیا جسے زینبؓ نے انتہائی فخر و مسرت کے ساتھ منظور کر لیا۔

اس نکاح نے سیرت نبوی کا ایک خاص کردار پیش کیا ہے اور بڑی اہم خصوصیتوں کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے چند نکات سن لیجیے:

۱۔ عرب جاہلیت میں متبنیٰ (لے پالک یا منہ بولے فرزند) کو حقیقی و صلبی فرزند کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کی بیوی کو حقیقی بہو کی طرح تصور کیا جاتا تھا اور حقیقی بہو کی طرح محرمات میں شمار کیا جاتا تھا یعنی جس طرح حقیقی بہو کے ساتھ (فرزند کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد) نکاح حرام ہے اسی طرح اس "مجازی بہو" سے نکاح بھی ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ حضورؐ کے اس اقدام سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ متبنیٰ صلبی و حقیقی فرزند نہیں ہو سکتا اور اس لیے اس پر رشتے اور وراثت وغیرہ کے وہ احکام جاری ہی نہیں ہو سکتے جو حقیقی فرزند کے ساتھ وابستہ ہیں۔

۲۔ اس میں ایک غلط عقیدے کی اصلاح بھی ہے۔ یعنی جب اولاد آدم اور ہم جنس ہونے کے باوجود منہ بولا فرزند کبھی حقیقی فرزند نہیں ہو سکتا تو کوئی فرزند آدم خدا کا فرزند کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ نہ آدمی جنس خدا سے ہے اور نہ خدا جنس آدم سے ہے۔ عیسائیوں کے ابنیت مسیح کے عقیدے پر حضورؐ کے اس اقدام سے خاصی زد پڑتی ہے۔ اس لیے عیسائی حضرات حضورؐ کے اس اقدام سے بہت ناراض ہیں اور اس واقعے کو وہ اس انداز سے بیان کرتے ہیں جو عقل و نقل، کسی لحاظ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ ان کا کہنا ہے کہ

حضورؐ نے جناب زینبؓ کو کہیں دیکھ لیا اور دل پر قابو نہ رہا۔ العیاذ باللہ۔ سوچنے کی بات ہے جناب زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ دیکھی بھالی تھیں۔ اگر حضورؐ کی خواہش ہوتی تو اسی وقت نکاح فرما لیتے جب کہ وہ کنواری تھیں اور حضورؐ کے پیغام نکاح کو جناب زینبؓ اور ان کا سارا خاندان سو جان سے منظور کر لیتا۔ حضورؐ کو اس کی کیا ضرورت تھی کہ پہلے اپنے لے پالک فرزند سے اس کا نکاح کر دیں' اس کے بعد خود نکاح فرما کر قوم سے یہ طعنہ سنیں کہ محمدؐ نے اپنی بہو سے نکاح کر لیا؟" آخر اس "بدنامی" میں حضورؐ کو کیا لطف آ سکتا تھا؟ اور اس "طعن و بدنامی" کے بغیر زید سے پہلے خود نکاح کر لینے سے حضورؐ کو کیا چیز مانع تھی؟

۳۔ حضورؐ یہ نہیں چاہتے تھے کہ زید' زینبؓ کو طلاق دیں اس لیے حضورؐ نے زید سے فرمایا کہ:

امسک علیک زوجک واتق اللّٰہ (الاحزاب: ۳۷)

اے زید اپنی بیوی کو روکے رکھ (یعنی طلاق نہ دے) اور اللہ کا تقویٰ اختیار کر۔

حضورؐ یہ سمجھ رہے تھے کہ زینبؓ نے میرے ہی کہنے سے زیدؓ سے نکاح کیا ہے۔ اس لیے طلاق کے بعد زینبؓ کی دل شکنی کی تلافی کی شکل صرف یہی ہو سکتی ہے کہ میں ان سے نکاح کر لوں۔ مگر حضورؐ کے دل میں ایک خطرہ یہ گردش کر رہا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ محمدؐ نے اپنی بہو سے نکاح کر لیا۔ عوام کے طعن کا خوف حضورؐ کو دامن گیر تھا۔ گویا ایک اندرونی کش مکش حضورؐ کے اندر یہ تھی کہ حضورؐ یہ تو سمجھتے تھے کہ لے پالک فرزند کی بیوی حقیقی بہو نہیں۔ اس سے نکاح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ اس وقت زینبؓ کی کبیدہ خاطری دور کرنے کے لیے اور متبنیٰ اور حقیقی فرزند کا فرق واضح کرنے کے لیے یہ نکاح ضروری ہے۔ لیکن رواج عرب اور عوام کی بے جا چہ می گوئی کا اندیشہ

حضورؐ کو اس اقدام سے روک رہا تھا۔ گویا دو قدروں میں ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ ایک طرف تھی عوام کی رعایت' دل داری اور بہ ظاہر بے ضرورت فتنہ و طعن سے بچنے کا جذبہ۔ اور دوسری جانب زینبؓ کی دل داری نیز حقیقی اور لے پالک فرزند کے فرق کا اظہار تھا۔ حضورؐ اس کش مکش کو چھپائے ہوئے تھے اور عوام کی رعایت کا رجحان رکھتے تھے' اور خدا یہ چاہتا تھا کہ ایک ضروری حقیقت کو واضح کرنے کے لیے عوام کے طعن کی کوئی پروا نہ کی جائے۔ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ عوام کی خشیت پر خشیت الٰہی بہرحال مقدم ہے' خصوصا" ایسے وقت میں جب کہ ابنیت مسیح کے ایک غلط تصور کی بھی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال کو قرآن پاک یوں بیان فرماتا ہے:

و تخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ و تخشی الناس ج واللہ احق ان تخشہ (الاحزاب: ۳۷)

اے رسول تم اپنے دل میں وہ چیز چھپا رہے ہو جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا اور تم عوام سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے ڈرو۔

گویا حضورؐ نے بحکم الٰہی یہ اخلاقی قدر قائم کی کہ عوام کی رعایت اگرچہ کچھ کم ضروری نہیں لیکن اگر ایک سچی حقیقت کو عملاً" یا قولا" ظاہر کرنا پڑے تو عوام کی رعایت ضروری نہیں رہتی۔ متبنیٰ کو حقیقی فرزند کا درجہ دینے سے رشتہ و وراثت وغیرہ کے قوانین پر غلط اثر پڑتا ہے' اس لیے ضروری تھا کہ صدیوں کے اس جمے ہوئے خیال کی پوری عملی تردید کر دی جائے۔ قرآن نے حضورؐ کے اس اقدام کی مصلحت یہی بتائی ہے کہ:

زوجنکھا لکی لا یکون علی المؤمنین حرج فی ازواج ادعیائھم (الاحزاب: ۳۷)

ہم نے تمھیں اس سے بیاہ دیا تاکہ منہ بولے فرزند کی بیویوں سے نکاح کرنے

میں مسلمانوں پر کوئی تنگی باقی نہ رہے۔

۴۔ نکاح زینب کے واقعے کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ صرف ان ہی کے لیے زوجنکھا کا لفظ آیا۔ یعنی اے رسولؐ ہم نے تمھیں اس سے بیاہ دیا یعنی زینب سے نکاح کو جائز قرار دیا تاکہ مسلمانوں پر یہ مسئلہ واضح ہو جائے کہ منہ بولے فرزند کی بیوی حقیقی بہو نہیں ہوتی کہ اس سے نکاح حرام ہو۔

۵۔ ایک اور خصوصیت اس واقعے میں یہ بھی ہے کہ تمام صحابہؓ میں تنہا زیدؓ ہی وہ شخص ہیں جن کا نام قرآن مجید میں آیا ہے:

فلما قضی زید منہا وطراً (الاحزاب: ۳۷)

جب زید کا دل زینب سے بھر چکا۔

۶۔ ایک بڑا ہی اہم مسئلہ اس واقعے میں یہ ہے کہ فرمان رسولؐ کی حدود کا اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ سورہ احزاب کے پانچویں رکوع میں نکاح زینبؓ کی تمام ضروری تفصیلات موجود ہیں۔ ان کے شروع کی دو آیات خاص طور پر قابل غور ہیں:

وما کان لمؤمن ولا مومنہ اذا قضی اللّٰہ و رسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم و من یعص اللّٰہ و رسولہ فقدضل ضللاً مبینا ○ واذتقول للذی انعم اللّٰہ علیہ وانعمت علیہ امسک علیک زوجک واتق اللّٰہ (الاحزاب: ۳۶، ۳۷)

کسی مومن مرد و زن کو جب کہ اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے کا فیصلہ کر دے کوئی اختیار ان کے اپنے معاملے میں باقی نہیں رہتا۔ اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے صریح گمراہی میں پڑ جائے گا۔ یاد کرو جب (اے رسول) تم زید سے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور خود تم نے بھی انعام کیا یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھ (طلاق نہ دے) اور اللہ سے

ڈر۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرمان نبوی کو رد کرنے کا اختیار کسی مسلمان کو نہیں اور اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔

فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (النساء: ٦٥)

اے رسول تمھارے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہوسکتے جب تک تمھیں اپنے اختلافی معاملات میں حکم نہ بنائیں اور پھر تمھارے فیصلے سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ پوری طرح سر تسلیم خم کردیں۔

اس سے بھی زیادہ واضح آیت یہ ہے کہ:

النبی اولی بالمومنین من انفسھم (الاحزاب: ٦)

نبی مسلمانوں کا حق دار خود ان کو اپنی ذات سے بھی زیادہ ہے۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ جناب زیدؓ سے فرما رہے ہیں کہ:

"اپنی بیوی کو طلاق نہ دے۔ اللہ سے ڈر۔" بایں ہمہ فرمان نبوی جناب زیدؓ اپنی بیوی (جناب زینبؓ) کو طلاق دے دیتے ہیں اور اس نافرمانی پر نہ خدا کوئی نوٹس لیتا ہے نہ اس کا رسول۔ بلکہ ان کے لیے انعم اللّٰہ علیہ و انعمت علیہ (الاحزاب: ٣٧) اس پر اللہ اور اس کے رسول دونوں نے انعام کیا) نازل ہوتا ہے۔ پہلی آیت میں ہے کہ فرمان رسولؐ کو ٹالنے کا کسی مسلمان کو اختیار ہی نہیں اور یہ نافرمانی سخت گمراہی ہے۔ مگر اس سے اگلی آیت میں ہے طلاق سے روکے جانے کے باوجود زید نے طلاق دے دی اور پھر زید منعم علیہ ہوئے۔ اس تناقض کو کس طرح دور کیا جائے؟ یہ ہے بڑا اہم سوال جس کے حل سے اطاعت رسولؐ کی حدود متیعن ہوسکتی ہیں۔

جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں وہ یہ ہے کہ حضورؐ کی کئی حیثیتیں ہیں اور ان کے احکام بھی جدا جدا ہیں۔ حضورؐ کی چار حیثیتیں بہت واضح ہیں۔

ایک ہے رسول کی حیثیت۔ اس حیثیت سے حضورؐ صرف احکام وحی (قرآن) پہنچاتے ہیں۔ اس کی اطاعت فرض ہے۔ نہ فقط مسلمانوں پر بلکہ خود رسول پر بھی۔ واتبع ما اوحی الیک۔

دوسری حیثیت ہے امیر کی۔ اس حیثیت سے حضورؐ جو بھی حکم دیں گے اس کی طاعت فرض ہے۔

تیسری حیثیت ہے قاضی یا جج کی۔ اس حیثیت سے بھی حضورؐ کا ہر فیصلہ تسلیم کرنا فرض ہے۔

چوتھی حیثیت ہے بشر کی۔ اس حیثیت سے حضورؐ جو کچھ فرمائیں وہ مشورہ ہوتا ہے خواہ امر ہی کے صیغے سے ہو۔ اول الذکر تینوں حیثیتوں میں حضورؐ کے فرامین کی اطاعت فرض ہے اور اس کا منکر مسلمان نہیں رہ سکتا۔ لیکن چوتھی حیثیت کی بات کو نہ ماننے والا مسلمان ہی رہے گا کافر نہیں ہوگا۔ اس کی بہت سی نظیریں ہمیں کتاب و سنت میں ملتی ہیں:

(الف) میدان بدر میں حضورؐ نے ایک جگہ کیمپ لگانے کا حکم دیا۔ حباب بن منذر نے عرض کیا کہ: یا رسولؐ اللہ کیا یہ جگہ وحی سے متعین کی گئی ہے؟ فرمایا نہیں۔ عرض کیا تو پھر یہ جگہ مناسب نہیں۔ اس کی بجائے فلاں جگہ زیادہ مناسب ہے۔ حضورؐ نے اپنی بات واپس لے لی اور حباب کی رائے پر عمل کیا گیا۔

(ب) حضورؐ نے لوگوں کو مدینے میں کھجوروں کے جوڑے ملاتے دیکھا تو اس سے روکا یا ناپسند فرمایا۔ اس سال پھل کم آئے۔ لوگوں نے شکایت کی تو حضورؐ نے اپنی بات واپس لے لی۔

(ج) حضرت مغیثؓ جناب بریرہؓ کے عشق میں مبتلا ہوئے۔ گلی گلی

روتے پھرتے تھے۔ حضورؐ نے بریرہؓ سے فرمایا کہ: تم مغیثؓ سے شادی کر لو۔ انھوں نے عرض کیا: اتا مرنی؟ کیا حضورؐ حکم دیتے ہیں۔ فرمایا: نہیں بلکہ سفارش کرتا ہوں۔ عرض کیا: مجھے وہ بالکل پسند نہیں۔

(د) اوس بن صامت نے اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ سے ظہار کیا۔ خولہ نے حضورؐ سے مسئلہ دریافت کیا تو فرمایا کہ طلاق ہوگئی۔ یہ فرمان رواج عرب کے مطابق تھا اور اس وقت تک اس بارے میں کوئی قرآنی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ خولہ نے کہا: یا رسولؐ اللہ میرے شوہر نے طلاق کا لفظ تو زبان سے نکالا نہیں تھا۔ اس نے اپنے ماں سے تشبیہ دی ہے۔ میں اس کی ماں کیسے بن سکتی ہوں۔ جو اس پر حرام ہو جاؤں۔ میں نے اسے جنا نہیں۔ اسے تو اس کی ماں نے جنا ہے۔ خولہ جھگڑتی رہیں۔ آخر وحی الٰہی نازل ہوئی کہ خولہ ٹھیک کہتی ہے۔ یہ اوس کی ماں کی طرح حرام نہیں۔ مگر اوس نے زبان سے بات بری نکالی ہے اس لیے اس کا فلاں طریقہ سے کفارہ ادا کرے ـــــ حضورؐ نے بہ حیثیت جج کے یہ فیصلہ نہیں دیا تھا۔

(ہ) صلح حدیبیہ کے موقعے پر چودہ سو مہاجرین و انصار نے صلح نامے کی دفعات سے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے زیادہ جوش میں مکالمہ کیا۔ حضرت علیؓ کو حضورؐ نے حکم دیا کہ: "محمد رسول اللہ" کو کاٹ کر محمد بن عبداللہ لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے تعمیل حکم نہیں کی۔ حضرت عمرؓ کو مکے جانے کا حکم دیا تو حضرت عمرؓ نے عذر پیش کیا۔ حضورؐ نے اپنی بات واپس لے لی اور حضرت عثمانؓ کو بھیج دیا۔

(و) اسی حدیبیہ کے موقعے پر صلح نامہ لکھے جانے کے بعد حضورؐ نے حکم دیا کہ: "سب لوگ اپنی اپنی قربانی کر لیں۔" لیکن ایک شخص بھی نہ اٹھا۔ آخر جب ام سلمہؓ کی رائے سے خود حضورؐ نے اپنی قربانی کر لی تو دوسرے لوگوں نے بھی قربانیاں کیں۔

(ح) حضورؐ نے وفات سے چند دن پہلے فرمایا کہ: دوات قلم لاؤ' میں کچھ باتیں لکھوا دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوگے۔ مگر کسی صحابی حتی کہ حضرت علیؓ نے بھی اس حکم کی تعمیل نہ کی اور حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔

غرض ایسے بہت سے مواقع آئے ہیں جہاں صحابہؓ نے حضورؐ کی بات نہیں مانی یا حضورؐ کے فرمان سے اختلاف کیا اور آج دنیا کا کوئی صاحب عقل ان پر کفر کا فتوے لگا کر ایمان سلامت نہیں رکھ سکتا۔

مسئلہ کچھ پیچیدہ نہیں سیدھی سی بات ہے۔ صحابہ بہ آسانی قرائن سے سمجھ لیتے تھے کہ حضورؐ کون سی بات بحیثیت رسول فرما رہے ہیں اور کون سی بحیثیت امیر۔ کون سی بحیثیت قاضی فرما رہے ہیں اور کون سی بات بحیثیت بشر کے بطور مشورہ ہے۔ اگر کہیں شبہ ہوتا تو حباب بن منذر یا بریرہؓ کی طرح دریافت کر لیتے تھے۔ ان میں ملکہ تمیز موجود تھا۔ وحی' امر' قضا' اور رائے میں فرق کر لینا ان کے لیے دشوار نہ تھا۔

اس معاملے کو خود حضورؐ نے یوں صاف فرما دیا کہ: ما امرتکم بشئی من امور دینکم فخذوہ وما امرتکم من رای فانما انا بشر (رواہ مسلم) دینی معاملات میں میں جو کچھ حکم دوں اسے اختیار کرو اور جو بات میں اپنی رائے سے کہوں تو میں بھی ایک بشر ہوں (اس میں غلطی ہو سکتی ہے اور اس کا نہ ماننے والا منکر دین نہیں)۔

یہاں "رائے" کا مقابلہ "دین" سے کیا گیا ہے۔ یعنی وحی رسول' امر امیر اور قضائے قاضی کا تعلق تو دین سے ہے اور اس کو نہ ماننے والا مسلمان ہی نہیں رہ سکتا۔ مگر رائے بشری دین سے متعلق نہیں اور اسے نہ ماننے سے اگر کوئی خارج از اسلام ہو سکتا تو سب سے پہلے خود حضورؐ ان لوگوں کو خارج از اسلام قرار دیتے جنھوں نے (اوپر کی مثالوں میں) حضورؐ کی رائے سے اختلاف

کیا یا وہ رائے نہ مانی۔

کہنا یہ تھا کہ حضرت زیدؓ کو حضورؐ نے جو امسک علیک زوجک واتق اللّٰہ (اپنی بیوی کو روکے رکھو اور خدا کا خوف کرو) فرمایا وہ نہ وحی رسالت تھی' نہ امر امیر اور نہ قضائے قاضی۔ وہ صرف ایک بشری مشورہ تھا۔ مشورہ دینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ماننے اور نہ ماننے دونوں کا اختیار حاصل ہے۔ جناب زید نے اگر حضورؐ کا مشورہ نہ مانا تو نہ خدا کی نافرمانی ہوئی نہ رسولؐ کی۔ وہ اسی طرح انعم اللّٰہ علیہ وانعمت علیہ باقی رہے جس طرح پہلے تھے۔

بہرحال سیدہ زینبؓ بنت جحش کا مطلقہ زید ہو کر بھی ام المومنین بننے کا شرف حاصل کرنا کوئی معمولی واقعہ نہیں جسے محض سرسری نگاہ سے دیکھا جائے' اور ایک بات تو سخت حیرت میں ڈالتی ہے کہ ان کا نکاح حضور سے ۵ھ میں ہوا اور ان کی رحلت ۲۰ھ میں ہوئی۔ گویا یہ چھ سال سے کچھ زیادہ حضورؐ کے ساتھ رہیں۔ اور حضورؐ کے بعد کم و بیش نو سال زندہ رہیں۔ لیکن حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ ان سے کوئی روایت مروی نہیں۔ حضرت خدیجہؓ تو روایت کے دور سے پہلے ہی مکے میں وفات پا چکی تھیں۔ ام المومنین زینبؓ بنت خزیمہ صرف تین ماہ زندہ رہیں۔ لہٰذا ان دونوں سے کسی روایت کا نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن زینبؓ بنت جحش سے کسی ایک روایت کا بھی نہ ہونا ہر صاحب عقل کو حیرت میں ڈالے گا' اور اس سے ہم صرف ایک ہی نتیجہ نکال سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جہاں ہزاروں جھوٹی روایتیں وضع ہوئیں وہاں بہت سی صحیح روایتیں درج ہونے سے رہ بھی گئیں۔

متفرقات

ظہار' حجاب' لعان اور تیمم کے احکام اسی سال نازل ہوئے اور اسی

سال صلوۃ الخسوف (چاند گرہن یا سورج گرہن کے وقت کی نماز) کا آغاز ہوا۔

✳ ✳ ✳

(۱۸)

۶ ہجری ——— غزوۂ بنو لحیان

اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ قبیلہ عضل و قارہ کی درخواست پر حضورؐ نے دس مبلغین بھیج دیے تھے۔ ان لوگوں نے سخت غداری کی اور مبلغین پر حملہ کر کے سب کو قتل کر دیا۔ دو شخص زید بن دثنہ اور خبیب بن عدی کو زندہ گرفتار کر کے بعد میں بڑی بے دردی سے قتل کیا۔ ہم اوپر کئی جگہ بتا چکے ہیں کہ غداری و فریب ایسی انسانیت کش حرکت ہے جس کے ہوتے ہوئے اخلاقی قدریں زندگی کے کسی گوشے میں باقی نہیں رہ سکتیں اور یہ جرم قطعاً" قابل درگزر نہیں' نہ اخلاقاً" نہ سیاستہ"۔ عضل و قارہ کی غداری کسی طرح قابل معافی نہ تھی۔ اس لیے حضورؐ نے دو سو سواروں کے ساتھ جمادی الاولی ۶ھ کو بنو لحیان کی طرف رخ کیا۔ لیکن کوئی جنگ نہیں ہوئی کیونکہ مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر یہ سب پہاڑوں میں اس طرح چھپ گئے کہ تلاش کے باوجود نہ مل سکے اور حضورؐ وہاں سے مدینے تشریف لے آئے۔

غزوہ غابہ یا غزوہ ذی قرد

کچھ دنوں کے بعد قبیلہ غطفان کے سرغنہ عیینہ بن حصین نے چند سواروں کو ساتھ لے کر مدینے کی چراگاہ پر چھاپہ مارا۔ وہاں ایک غفاری اونٹوں کو اپنی حفاظت میں چرا رہا تھا۔ ان لٹیروں نے اس غفاری کو قتل کر دیا اور اس

کی بیوی کو گرفتار کر لیا اور اونٹوں کو ساتھ بھگا لے گئے۔ سلمہ بن اکوع نے جب یہ دیکھا تو مسلمانوں کو آواز دی اور خود بھی تعاقب میں دوڑ پڑے۔ حضورؐ نے خبر ملتے ہی سعدؓ بن زید کو چند سواروں کے ساتھ دوڑایا۔ بنو غطفان نے جب مسلمانوں کو آتا دیکھا تو بھاگے۔ ان کا صرف ایک آدمی مارا گیا۔ چند اونٹ اور کچھ چادریں ہاتھ آئیں۔ کوئی باقاعدہ جنگ نہیں پیش آئی۔

صلح حدیبیہ

مہاجرین کو مکے سے آئے ہوئے کوئی چھ سال ہو گئے تھے۔ بعض مہاجرین کے اہل و عیال ہنوز مکے ہی میں تھے۔ اس کے علاوہ اکثر مسلمانوں کے دل میں زیارت بیت اللہ کا شوق بھی چٹکیاں لے رہا تھا۔ گو مہاجرین مکے سے مستقل ہجرت کر کے مدینے میں آ گئے تھے۔ لیکن وطن کی یاد اتنی جلدی دل سے محو نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنا گھربار، املاک، کھیتی، دکان اور اہل کفر قرابت داروں کو چھوڑا تھا اور وطنیت کے بت کو توڑا تھا، کعبے سے تو منہ نہیں موڑا تھا۔ بلکہ اس مرکز دین سے دور ہونے کا تو شدید صدمہ تھا اور وہ اس قبلہ عبادت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے تھے جس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کر رہے تھے اور جس کی زیارت اسلام کا چوتھا رکن ہے۔

اسی دوران میں حضورؐ نے خواب دیکھا کہ صحابہ کے ساتھ حضورؐ مناسک حج ادا فرما رہے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر آئندہ سال ظہور میں آنے والی تھی (جس کا ذکر آگے آئے گا)۔ تاہم زیارت بیت اللہ کا شوق حضورؐ پر اور تمام صحابہ پر اس درجے غالب ہوا کہ سب کے سب سفر مکہ کے لیے رخت سفر باندھ کر تیار ہو گئے اور روانگی عمل میں آ گئی۔

یہ چودہ سو مہاجرین و انصار تھے جو عمرہ ادا کرنے کے شوق میں کشاں کشاں چلے جا رہے تھے۔ یکم ذی القعدہ ۶ھ کو روانگی ہوئی۔ مدینے سے چھ میل

ذوالحلیفہ کے مقام پر حضورؐ نے اور تمام رفقا نے عمرے کا احرام باندھا۔ مدینے کی طرف سے آنے والے حجاج کا میقات یہی ذوالحلیفہ ہے۔ احرام کے معنی ہیں، حرام کر لینا۔ چونکہ احرام باندھتے ہی قتال، جدال، یا وہ گوئی وغیرہ حرام ہو جاتی ہے اس لیے اسے احرام کہتے ہیں۔ احرام ایک بے سلا کپڑا ہوتا ہے جسے جسم پر لپیٹ لیا جاتا ہے۔ یہ علامت ہے احرام کی تاکہ دور سے دیکھ کر سمجھ لیا جائے کہ یہ اپنے اوپر قتال و جدال وغیرہ کو حرام کر چکے ہیں۔ یہاں قربانی کے جانوروں کی گردن میں قلاوے بھی ڈال دیے گئے تاکہ مزید اطمینان ہو جائے کہ ان آنے والوں میں کوئی جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا۔ صرف زیارت کعبہ اور ادائے عمرہ کی نیت ہے۔ اس سفر میں دستور عرب کے مطابق مسلمانوں کے پاس تلواریں بھی تھیں لیکن وہ سب نیام میں تھیں۔ یہ بھی ایک اعلان تھا کہ مسلمانوں کی حیثیت صرف زائرین کی ہے۔ مسلمان جا بجا پڑاؤ کرتے ہوئے آرہے تھے۔ اس کی خبر اہل مکہ کو ہو گئی۔ انھیں یہ تو یقین تھا کہ اہل اسلام چڑھائی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے صرف عمرہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انھیں یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ مسلمان ادائے عمرہ کی نیت سے مکے میں داخل ہوں۔ اس لیے انھوں نے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ خالد بن ولید (جو ہنوز اسلام نہ لائے تھے) ایک دستہ فوج لے کر کراع الغمیم روانہ ہو گئے۔ حضورؐ ابھی مقام عسفان میں تھی کہ خالد کے آنے کی خبر ملی۔ خالد کے دستے کو پیس کر رکھ دینا ان چودہ سو مہاجرین و انصار کے لیے دشوار نہ تھا لیکن حضورؐ چونکہ صرف عمرے کا ارادہ رکھتے تھے اور ماہ حرام (ذی قعدہ) کی حرمت بھی قائم رکھنا چاہتے تھے اس لیے دستہ خالد کا سامنا کرنا بھی گوارا نہ فرمایا۔ چنانچہ حضورؐ نے داہنی طرف کترا کر ایک دوسرا کٹھن راستہ اختیار فرمایا۔ خالد نے دور سے مسلمانوں اور سواریوں کی اڑتی ہوئی گرد دیکھی اور اہل اسلام کی قوت و شوکت کا اندازہ کر لیا۔ فوراً واپس ہوئے اور اہل مکہ کو خبر دی کہ مسلمان غمیم کے قریب پہنچ

گئے ہیں۔ یہ مقام مکے سے نو میل پر ہے۔ حضورؐ کی اونٹنی (قصویٰ نامی) مقام حدیبیہ میں رکی۔ حضورؐ اور تمام صحابہ وہیں اتر پڑے۔ حدیبیہ دراصل ایک کنوئیں کا نام ہے جو مکے سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں کچھ آبادی بھی تھی اور یہ پورا علاقہ حدیبیہ ہی کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں چودہ سو صحابہ کے لیے ایک کنواں کیا کفایت کر سکتا تھا؟ پہلی ہی مرتبہ میں کنواں خالی ہو گیا اور پانی کی قلت محسوس ہوئی۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو دعا فرمائی جس کے بعد پھر پانی کی کوئی کمی نہیں ہوئی۔

حدیبیہ میں قافلہ زائرین کے پہنچنے کی خبر جب بنو خزاعہ کو ملی تو ان کے سردار بدیل بن ورقا چند آدمیوں کو لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ یہ لوگ اسلام نہیں لائے تھے لیکن مسلمانوں کے حلیف تھے' اس لیے ان کی ہمدردیاں اہل اسلام کے ساتھ تھیں اور مسلمانوں کے یہ راز دار بھی تھے۔ بدیل نے آکر حضورؐ کو خبر دی اہل مکہ نے بڑی تعداد میں جنگ جو نوجوانوں کو جمع کیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ وہ ہرگز مسلمانوں کو مکے میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ حضورؐ نے بدیل ہی کی معرفت قریش کو یہ پیغام بھیجا کہ: "ہم لوگ لڑنے نہیں آئے۔ صرف عمرہ ادا کر کے واپس چلے جائیں گے۔ متعدد جنگوں نے تمھیں یوں بھی کمزور کر دیا ہے (اس لیے ارادہ جنگ ترک کر دو اور) ایک مدت معینہ کے لیے معاہدہ صلح کر لو۔ (اگر لڑو گے تو) خدا کی قسم جب تک میرے شانوں پر سر موجود ہے میں بھی اس وقت تک لڑتا رہوں گا' جب تک اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ نہ فرما دے۔"

بدیل نے مکے پہنچ کر جب قریش کو حضورؐ کا یہ پیغام سنانا چاہا تو چند جوشیلے عاقبت نااندیش بول اٹھے کہ: "ہمیں محمدؐ کا کوئی پیغام سننے کی ضرورت ہی نہیں۔" مگر سنجیدہ طبقے نے سکون سے یہ پیغام سنا اور کہا کہ: یہ تو ہم جانتے ہیں کہ مسلمان عمرہ ادا کرنے آئے ہیں۔ لڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ لیکن اگر وہ

زائرین کی حیثیت سے بھی مکے میں داخل ہوئے تو سارا عرب ہمیں یہی طعنہ دے گا کہ مسلمان فاتحانہ و غالبانہ مکے میں داخل ہو گئے' ہم یہ طعنہ نہیں سن سکتے۔

بدیل یہ جواب لے کر واپس ہو گئے اور اہل مکہ نے حالات کا صحیح جائزہ لینے کے لیے جلیس بن علقمہ کو حدیبیہ بھیجا۔ جلیس نے واپس آ کر اسی قسم کی گفتگو کی جو بدیل نے کی تھی۔ مگر قریش کو پھر بھی اطمینان نہ ہوا۔ بنو ثقیف کے سردار عروہ بن مسعود ثقفی نے کہا کہ: "اگر تم کہو تو میں خود جا کر محمدؐ سے گفتگو کروں۔ انھوں نے جو باتیں پیش کی ہیں وہ معقول ہیں۔" قریش نے عروہ کو اپنا نمائندہ بنا کر حضورؐ کے پاس بھیجا۔ حضورؐ نے عروہ سے بھی وہی باتیں فرمائیں جو بدیل کی وساطت سے قریش کو کہلوائی تھیں۔ عروہ نے حضورؐ کی باتیں سن کر کہا کہ: اے محمدؐ! اگر تم قریش کو فنا کرو گے تو گویا اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی قوم کو فنا کرو گے۔ اور اگر کہیں جنگ نے پانسہ پلٹا تو تمھارے یہ رفقا گرد کی طرح اڑ جائیں گے۔" عروہ کا یہ جملہ سن کر حضرت ابوبکرؓ کو تاؤ آ گیا۔ فرمایا او بدبخت! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہم لوگ رسولؐ اللہ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟ عروہ نے کہا اے ابوبکرؓ! میری گردن پر تمھارا ایک احسان ہے جس کا بدلہ میں نے ابھی تک نہیں اتارا ہے' اس لیے میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ ورنہ تمھاری سخت کلامی کا مزہ چکھا دیتا۔"

عروہ حضورؐ سے گفتگو کرتے ہوئے اپنا ہاتھ بار بار حضورؐ کی ریش مبارک تک لے جاتا۔ حضورؐ کے پاس مغیرہ بن شعبہ کھڑے تھے۔ عروہ کی یہ حرکت انھیں سخت ناگوار گزری۔ کڑک کر بولے: "عروہ! اگر اب تیرا ہاتھ حضورؐ کی ریش مبارک تک آیا تو تیرا ہاتھ پھر واپس نہ جائے گا۔" عروہ نے کہا: "احسان فراموش میرے احسان کو بھول گئے؟ (ایک موقعے پر چند مقتولین کا خون بہا مغیرہ کی طرف سے عروہ نے ادا کیا تھا) یہ عربی فطرت دور جاہلیت میں

بھی تھی کہ نہ دوسرے کے احسان کو فراموش کرتے تھے نہ اپنے احسان کو بھلاتے تھے۔ عروہ نے ایک ہی موقعے پر دونوں جذبے کا اظہار کر دیا۔

عروہ کی گفتگو ناتمام سی رہی۔ وہ مکے میں آگئے اور قریش سے کہا: "اے ابنائے قریش! میں نے نجاشی کا دربار بھی دیکھا ہے اور قیصر و کسریٰ کے دربار بھی دیکھے ہیں۔ لیکن عقیدت و احترام اور پروانگی و ادب کا جو منظر اس وقت دیکھ کر آرہا ہوں وہ کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ محمدؐ جب گفتگو کرتے ہیں تو سارے مجمعے پر سکوت طاری ہو جاتا ہے اور سب ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں۔ کوئی شخص محمدؐ کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھنے کی جرات نہیں کرتا۔ وہ وضو کرتے ہیں تو ایک قطرہ بھی زمین پر گرنے نہیں دیا جاتا۔ سارا مجمع اسے اپنے چہرے اور سینے پر ملنے کے لیے ٹوٹ پڑتا ہے۔ محمدؐ کا تو لعاب دہن بھی زمین پر گرنے سے پہلے عقیدت مند اپنے چہروں پر مل لیتے ہیں۔ محمدؐ کے اصحاب میدان چھوڑ کر بھاگنے والے نہیں۔ اب تم جو مناسب سمجھو وہ کرو۔"

عروہ کی گفتگو سے قریش پر سناٹا چھا گیا اور ان کی قوت فیصلہ درہم برہم ہو گئی۔ کوئی فیصلہ کر چکنے سے پہلے ہی حضورؐ نے ایک دوسرے خزاعی خراش بن امیہ کو اپنی سواری کا اونٹ دے کر مکے روانہ فرمایا۔ خراش ابھی اپنی بات بھی پوری نہ کر پائے تھے کہ ظالموں نے ان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ سردار احابیش جلیس بن علقمہ نے انھیں پناہ دے دی اور خراش کی جان بچی۔ مگر ان ظالموں نے ان کے اونٹ کو ہلاک کر دیا۔

اس واقعے کے بعد قریش کے اسی جوشیلے نوجوانوں کا ایک دستہ مسلمانوں سے جنگ چھیڑنے کے لیے کوہ تیغم سے اتر کر حدیبیہ کی وادی میں پہنچ گیا۔ لیکن حملے کے آغاز ہی میں مسلمانوں کے محافظ دستے نے ان سب کو گرفتار کر لیا۔ ان کا یہ اقدام فوجی نقطہ نگاہ سے قابل معافی نہ تھا لیکن کچھ تو قرب حرم کا احترام تھا اور کچھ ماہ حرام کا پاس، اور سب سے بڑھ کر رحمت کے تقاضے تھے

اور صلح پسندی کا سچا جذبہ۔ اس لیے رحمت للعلمین نے ان سب کو معافی دے کر رہا کر دیا۔ قرآن نے ماہ حرام میں حملہ آوروں کے جواب میں قتال کی اجازت دی ہے ولا تقتلوھم عندالمسجد الحرام حتی یقتلوکم فیہ (البقرہ: ١٩١) لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قتال کے موقعے نہیں تلاش فرماتے تھے بلکہ قتال کو روکنے اور صلح کو قائم کرنے کے ذرائع ڈھونڈتے تھے۔ صحابہ میں قریشی نوجوانوں کی اس جسارت سے یقیناً جوش انتقام پیدا ہوا ہوگا' لیکن جو رسول آیا ہی ہو انسانی اقدار کے قیام کے لیے' وہ کیونکر گوارا کر سکتا تھا کہ جذبہ انتقام ـــــــ اگرچہ جائز اور جوابی ہو ـــــــ بلد حرام اور شہر حرام کی حرمت کو مجروح کرے! اگر ان حملہ آوروں کو قتل کر دیا جاتا تو یہ اس کے مستحق تھے' لیکن اہل مکہ کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ ان مسلمانوں نے زائرین کا روپ تو دھار لیا ہے لیکن دراصل یہ قتال ہی کی نیت سے آئے ہیں اور بہ ظاہر ہمیں معاہدہ صلح کا پیغام بھجوا رہے ہیں۔ بہرحال اس موقعے پر حضورؐ نے ان مجرموں کو معافی دے کر دینی و اخلاقی قدروں کی محافظت کا انتہائی بلند مظاہرہ فرمایا۔

سیدنا عمرؓ کا عذر مقبول

حضورؐ نے اتمام حجت اور مصالحت کی کوشش مزید کے لیے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ: "قریش کے پاس اب تم جا کر بات کرو۔" حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ: "یا رسولؐ اللہ مجھ سے قریش کو انتہائی بغض و عناد ہے کیونکہ میں نے دینی معاملات میں ان کے ساتھ کبھی مداہنت و نرمی نہیں برتی ہے۔ علاوہ ازیں میری قوم (بنی عدی) کا کوئی ایسا آدمی بھی مکے میں موجود نہیں جو مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ میری رائے ہے کہ حضورؐ اس نامہ و پیام کا کام عثمانؓ سے لیں' کیونکہ وہ بنو امیہ کے ایک معزز رکن ہیں اور بنو امیہ پر ان کا بڑا اثر ہے۔"

حضورؐ نے حضرت عمرؓ کی رائے کو پسند فرمایا اور سیدنا عثمانؓ کو مکے بھیج دیا۔

یہاں یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اگر محض جان کی قربانی پیش کرنا مقصود ہوتا تو نہ حضرت عمرؓ کو انکار ہوتا اور نہ کسی دوسرے صحابی کو۔ یہاں محض جان کی قربانی پیش کرنا یا اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا مقصود ہی نہ تھا۔ مقصد تو تھا ایک کام کو بہتر طریق پر انجام دینا اور نتیجہ خیز طریقہ اختیار کرنا۔ یہاں عشق و محبت یا بہادری و بزدلی کا کوئی امتحان پیش نظر تھا ہی نہیں۔ یہاں صرف عقل و حکمت اور حسن تدبیر سے ایک کام انجام دینا تھا۔ حضرت عمرؓ کی معذرت نہ بربنائے بزدلی تھی نہ بربنائے نافرمانی۔ غزوہ احزاب کے بیان میں ہم اس موضوع کی وضاحت کر چکے ہیں۔

رسولؐ اللہ اور بیت اللہ سیدنا عثمانؓ کی نظر میں

حضورؐ کے ارشاد کے مطابق سیدنا عثمانؓ بن عفان مکے تشریف لے گئے اور اپنے ایک قرابت دار ابان بن سعید کے گھر ٹھہرے۔ جب اہل مکہ کو حضورؐ کا پیغام مصالحت پہنچایا تو انھوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ: "ہم محمدؐ اور اصحاب محمدؐ کو ہرگز مکے میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ ہاں اگر تم خود عمرہ ادا کرنا چاہو تو کر لو۔" سیدنا عثمانؓ نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ اوراق تاریخ پر ہمیشہ ابھرتے ہوئے حروف میں ہیرے کی طرح چمکتا رہے گا۔ آپ نے فرمایا: "یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں یہاں تنہا عمرہ و طواف کر لوں اور میرا کعبہ حقیقت (صلی اللہ علیہ وسلم) بیت سے دور حدیبیہ میں بیٹھا رہے۔" اللہ اللہ ممکن ہے کوئی ظاہر بین یہ کہے کہ جناب عثمانؓ طواف کعبہ کے ایک بڑے ثواب سے محروم رہے، مگر حقیقت بین نگاہ میں اس ترک طواف کا ثواب، ثواب طواف سے کہیں زیادہ ہے۔

رسولؐ اللہ اور عثمانؓ کے روحانی جذبہ کار فرما تھا۔ یہاں حدیبیہ میں

بعض لوگ بولے کہ: "عثمانؓ بڑے خوش قسمت ہیں۔ وہ کم سے کم عمرہ تو ادا کر ہی لیں گے۔" عثمانؓ کے نبض شناس پیغمبرؐ نے فرمایا: "مجھے یقین نہیں کہ عثمانؓ میرے بغیر عمرہ و طواف کر لیں۔" صدق النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ عثمانؓ کو حقیقت کعبہ کا کیا علم تھا۔ قوم نے تو اس بیت اللہ کو بیت الاصنام بنا دیا تھا۔ یہ کعبہ حقیقتؐ ہی تھا جس نے حقیقت کعبہ سے دنیا کو روشناس کرایا۔

از جمال تو کعبہ شد قبلہ
پیش ازیں ورنہ بود بت خانہ

قتل عثمانؓ کی افواہ اور بیعت رضوان

سیدنا عثمانؓ نے اہل مکہ کو پیغام مصالحت دینے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا تو روک لیے گئے۔ واپسی میں دیر ہو گئی تو افواہ پھیل گئی کہ عثمانؓ شہید کر دیے گئے۔ حضورؐ نے یہ خبر سنتے ہی فرمایا: "اگر ایسا ہے تو خون عثمانؓ کا قصاص لینا فرض ہے۔" یہ فرما کر ایک ببول کے درخت کے سائے میں تشریف لے گئے۔ اور آواز دی کہ بایعوا علی الموت (سر دھڑ کی بازی لگانے پر بیعت کرو)۔ آواز رسولؐ کا سننا تھا کہ تمام صحابہ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ اتنا اہم ہے کہ قرآن پاک نے ان تمام بیعت کرنے والوں کو رضائے الٰہی کی دائمی سند یوں عطا فرمائی کہ:

> لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینہ علیھم فاثابھم فتحا قریبا (الفتح: ١٨)
>
> اللہ ان تمام مسلمانوں سے راضی ہے جنھوں نے اس درخت کے نیچے (اے رسولؐ) تمھاری بیعت کی۔ پھر اس نے ان کے دلوں کی بات (نیت و اخلاص) جان لی اور ان پر

سکینت نازل فرمائی اور انھیں جلد آنے والی فتح سے
سرفراز کیا۔

صرف اسی قدر نہیں بلکہ اس بیعت کو اتنی اہمیت دی کہ:

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللّٰہ ط ید اللّٰہ فوق ایدیھم ج
(الفتح: ١٠)

جو لوگ (اے رسولؐ) تم سے سودا کر رہے تھے ان کے ہاتھوں میں
(تمھارا کیا) خدا کا ہاتھ تھا۔

خون عثمانؓ کی قدر و قیمت ' اللہ اور رسولؐ کی نگاہ میں

ذرا غور کیجیے ' دنیا میں کسی کے خون کا قصاص لینے کے لیے بارگاہ نبوت سے کبھی یہ اہتمام ہوا ہے؟ کس کی جان اتنی پیاری تصور کی گئی ہے جس کے قصاص کے لیے بیعت کرنے والوں کے حق میں خدا نے اپنی رضا مندی کا غیر فانی پروانہ نازل کیا ہو؟ کس کی شخصیت اتنی اہم ہے جس کی حرمت کی خاطر جان کی بازی لگانے والوں ہی کا نہیں بلکہ اس درخت کا ذکر بھی قرآن نے کیا ہو جس کے سائے میں جاں بازی کا معاہدہ ہوا تھا؟ کس ہستی کا خون اتنا قیمتی سمجھا گیا ہے کہ اس کا قصاص لینے والوں کی بیعت کو محض بیعت رسولؐ ہی نہیں بلکہ عین بیعت خدا سے تعبیر کیا گیا ہو؟ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا کہ حضورؐ کو اس کا پورا اندازہ تھا کہ عثمانؓ مکے میں قتل نہیں کیے گئے ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ خون عثمانؓ کا قصاص لینے کے لیے یہ اہتمام کیوں فرمایا گیا؟ اس کی دو وجہیں ہماری سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کے جوش و خروش کی اطلاع اہل مکہ کو مل جائے تاکہ اگر وہ جناب عثمانؓ کے ساتھ کسی قسم کی برائی کا ارادہ رکھتے ہوں تو اس سے باز آ جائیں۔ نیز وہ مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ بھی کر لیں اور معاہدہ صلح میں تامل نہ کریں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ جناب

عثمانؓ پر جو مصیبت آنے والی تھی' اس کے بارے میں حضورؐ یہ بتانا چاہتے تھے کہ اس نازک وقت میں مسلمان خون عثمانؓ کو ایسا ہی قیمتی سمجھ کر محافظت کریں اور ہر فرد امت ان کا قصاص لینے کے لیے اسی طرح اٹھ کھڑا ہو جس طرح آج حضورؐ ہر ایک کو کھڑا کر رہے ہیں۔ مگر آہ خون عثمانؓ بڑی ہی بے دردی سے بہایا گیا۔ امت نے غفلت سے کام لیا' جس کے خمیازے میں امت کو پھر کبھی امن و اتفاق دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ آج کون عثمانؓ کے بے دردانہ قتل پر آنسو بہانا ثواب سمجھتا ہے؟ آج کس جگہ ان کی بے گناہی و مظلومی کا ماتم کیا جاتا ہے؟ آج کہاں ان کے قاتلوں اور سازشیوں کو بدترین خلائق سمجھا جاتا ہے؟ سننے والے اپنے اپنے ایمان کا جائزہ لیں۔

مگر خوب ہوا جو حضرت عثمانؓ کے غم کو کوئی مذہبی حیثیت نہ حاصل ہوئی' ورنہ ایک اور الگ فرقہ پیدا ہو جاتا جس کا مذہب صرف ماتم عثمانؓ رہ جاتا اور محض چند ایجاد کردہ رسموں پر نجات کا انحصار قرار پا جاتا۔

سیدنا عثمانؓ زندہ تھے

بیعت رضوان کی ایک عجیب امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ جب تمام صحابہ کی بیعت ہو چکی تو حضورؐ نے اپنے ایک ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے فرمایا کہ: "یہ میرا ہاتھ ہے اور یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے اور اب میں عثمانؓ کی بھی بیعت لیتا ہوں۔" گویا حضورؐ نے اشاروں میں بتا دیا کہ عثمان زندہ ہیں' کیونکہ بیعت زندوں ہی کی لی گئی تھی اور لی جاتی ہے۔

یہاں یہ نکتہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ خدا نے رسول کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا۔ ید اللہ فوق ایدیھم (الفتح: ۱۰) اور آج بیعت رضوان کے وقت رسولؐ اپنے ہاتھ کو عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے رہا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ رومی نے شاید ٹھیک ایسے موقعے کے لیے کہا ہے:

چوں قبول حق شود آں مرد راست
دست او درکار ہا دست خداست

اس شرف کے واحد مستحق تھے بھی سیدنا عثمانؓ ہی۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ: "جس دن میں نے اسلام قبول کرتے ہوئے اپنا سیدھا ہاتھ رسولؐ اللہ کے ہاتھ میں دیا اس دن سے کبھی میرا وہ ہاتھ میری شرم گاہ سے مس نہیں ہوا۔" غالباً" یہی سبب ہے کہ اشاعت قرآن کا کام اسی مبارک ہاتھ سے لیا گیا۔ یہ "مصحف آسمانی" خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں مکمل ہو چکا تھا اور اسی کی نقول کی اشاعت کا کام حضرت عثمانؓ نے کیا۔ جناب عثمان " صرف ناشر قرآن" ہیں۔ "جامع قرآن" قطعاً" نہیں۔ بہرحال دست قدرت نے اشاعت قرآن کا کام دست عثمانؓ ہی سے لیا کیوں کہ عثمانؓ کا ہاتھ رسولؐ کا ہاتھ اور رسولؐ کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ دست او درکار ہا دست خداست۔ حتی کنت یدہ التی یبطش بھا (حدیث قدسی)

صلح نامے کی کتابت

ابھی یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ حضورؐ یہ خوب جانتے تھے کہ عثمانؓ قتل نہیں ہوئے ہیں' اس کے باوجود افواہ قتل پر بیعت سرفروشی لینے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اہل مکہ کو مسلمانوں کے جوش و خروش کا اندازہ ہو جائے' اور وہ معاہدہ صلح کرنے میں زیادہ تامل نہ کریں۔ فی الواقع اس کا یہی نتیجہ ہوا کہ جب قریش کو مسلمانوں کے اس جوش و خروش کا علم ہوا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے اور انھوں نے فوراً ایک زیرک اور معاملہ فہم شخص کو سفیر بنا کر حضورؐ کی خدمت میں بھیجا۔ یہ تھے سہیل بن عمرو۔ اپنی طلاقت لسانی اور معاملہ فہمی کی وجہ سے وہ خطیب قریش کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ یہ حضورؐ کے پاس آئے اور دیر تک باہم گفتگو کے بعد صلح نامہ لکھا جانے لگا۔ اس تاریخی صلح نامے کے کاتب

سیدنا علی بن ابی طالب تھے۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سہیل بن عمرو بولے کہ: عرب کے دستور کے مطابق باسمک اللّٰھم لکھوایئے۔ حضورؐ نے فرمایا: جو سہیل کہتے ہیں وہی لکھو۔ حضرت علیؓ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی بجائے باسمک اللّٰھم لکھا۔ پھر حضورؐ نے فرمایا: لکھو ھذا ما قضی علیہ محمد رسول اللہ (یعنی اس صلح نامے پر اللہ کے رسول محمدؐ صاد کرتے ہیں)۔ سہیل بولے: اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول سمجھتے تو جھگڑا ہی کس بات کا تھا۔ اسے کاٹ کر محمد بن عبداللہ لکھوایئے۔" حضورؐ نے فرمایا: "اسے کاٹ کر وہی لکھو جو سہیل کہتے ہیں۔"

سیدنا علیؓ چند سیکنڈ کے لیے عجیب ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گئے۔ ایک طرف الامر فوق الادب اپنی طرف کھینچ رہا تھا' اور دوسری جانب الادب فوق الامر اپنی کشش دکھا رہا تھا۔

خال او فتویٰ دہ از کعبہ در بتخانہ شو
زلف او دعویٰ کند گر عاقلی دیوانہ شو

آخر جذبہ اطاعت پر جذبہ محبت و ادب غالب آگیا۔ دوات قلم چھوڑ کر یہ کہتے ہوئے الگ ہو گئے کہ: "رسولؐ اللہ" کا لفظ کاٹنے کا کام مجھ سے نہ ہو گا۔" کون جانتا ہے کہ اس "نافرمانی" پر کتنی فرماں برداریاں قربان ہیں۔

خوں شہیداں راز آب اولی ترست
ایں خطا از صد صواب اولی تراست

یہ بھی مقام غور ہے کہ جناب مرتضیٰؓ نے اسم الٰہی الرحمٰن الرحیم کاٹنے میں ذرا تامل نہ کیا' مگر محمدؐ کے لقب و منصب رسول اللہ کو قلم زد کرتے وقت ظاہری نافرمانی کی بھی پروا نہ کی۔ سچ ہے:

با خدا دیوانہ و با مصطفیٰ ہشیار باش

یہاں دوات بھی ہے' قلم بھی ہے' قرطاس (کاغذ) بھی ہے اور رسولؐ

کا حکم بھی ہے، مگر جذبہ عشق و ادب کی وجہ سے ظاہری "نافرمانی" قابل ملامت نہیں بلکہ قابل ستائش ہے۔ اسی طرح حضور کے آخری عین حیات میں جب کہ نہ دوات موجود تھی، نہ قلم اور نہ قرطاس، اگر دوسرا جاں نثار ظاہری نافرمانی کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے ہدف طعن کیوں بنایا جائے، خصوصاً" جب کہ وہ ایک خدا لگتی بات بھی کہہ دیتا ہے کہ حسبنا کتاب اللّٰہ (اللہ کی کتاب ہم سب کے لیے کافی ہے) اور اس جواب پر رسولؐ مطمئن ہو کر خاموش ہو جاتے ہیں اور زندگی کے بقیہ ایام میں پھر دوات، قلم، کاغذ لانے کی کوئی فرمائش کسی سے بھی نہیں کرتے۔

ادھر سیدنا علیؓ نے "رسولؐ اللہ" کا لفظ کاٹنے سے انکار کر دیا، اور ادھر رسولؐ اللہ کی نگاہوں سے حجابات اٹھ گئے۔ حضورؐ نے فرمایا: اے علی! ایک دن تمھارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آنے والا ہے۔" چنانچہ جب سیدنا علیؓ اور جناب امیر معاویہؓ کے درمیان صلح نامہ مرتب ہونے لگا تو اس پر یہ لکھا تھا کہ: ھذا ماقضی علیه امیر المومنین علی ابن ابی طالب جناب معاویہؓ نے کہا: "اگر ہم آپ کو امیر المومنین تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا ہی کس بات کا تھا؟ سیدنا علیؓ کی زبان سے بے اختیار نکلا: صدق النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم حضورؐ نے سچ فرمایا تھا۔ دونوں معاملے یکساں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اہل کفر اور اہل اسلام کے درمیان معاہدہ ہو رہا تھا۔ اور یہاں دونوں جانب کلمہ گو مسلمان تھے۔ فرق صرف مرتبوں کا تھا۔

شرائط صلح

الغرض حضرت علیؓ کے انکار کے بعد حضورؐ نے خود لفظ "رسولؐ اللہ" مٹا کر "بن عبد اللہ" لکھ دیا، یا لکھوا دیا۔ اس کے بعد معاہدے کی مندرجہ ذیل دفعات لکھی گئیں۔

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔
۲۔ آئندہ سال آئیں اور صرف تین دن ٹھہر کر واپس ہو جائیں۔ اپنے ساتھ صرف تلواریں لائیں جو نیام میں ہوں اور نیام تھیلے میں ہوں۔ اس اثنا میں قریش باہر چلے جائیں گے۔
۳۔ جو مسلمان اس وقت مکے میں ہیں انھیں مسلمان اپنے ساتھ واپس نہ لے جائیں بلکہ جو مسلمان اس وقت مدینے سے آئے ہیں ان میں سے بھی جو مکے میں رہنا چاہے اسے رہنے دیا جائے گا۔
۴۔ مکے سے جو مسلمان یا غیر مسلم مدینے چلا جائے اسے واپس کر دیا جائے گا' لیکن مدینے سے جو مسلمان مکے آئے گا اسے واپس نہ کیا جائے گا۔
۵۔ مسلمان اور قریش جس قبیلے کو چاہیں اپنا حلیف یا معاہد بنا سکتے ہیں۔
۶۔ فریقین امن و امان کے ساتھ رہیں گے اور دس سال تک یہ معاہدہ قائم رہے گا۔

اقدار معاہدہ کی عجیب محافظت

اس معاہدے میں اور تو جو کچھ تھا وہ تھا' دفعات ۲ اور ۴ اس درجے حوصلہ شکن تھیں کہ مسلمان تڑپ اٹھے۔ ہر شخص اسے اسلامی اور قومی وقار کے سخت خلاف سمجھ رہا تھا۔ اس زخم پر نمک یوں پڑا کہ عین اسی معاہدے کے وقت مکے سے ایک مسلمان بھاگتا' ہانپتا' کانپتا اور فریاد کرتا ہوا حضورؐ کے پاس پہنچا۔ اس نے اپنے جسم پر زخموں کے داغ دکھائے۔ زنجیروں میں جکڑے جانے اور ماریں کھانے کی دردناک داستان سنائی۔ مسلمان اس کی فریاد سن کر لرز اٹھے۔ اس وقت مسلمانوں کا جوش اور ولولہ ایسا تھا کہ ایک اشارے میں مکہ خاک سیاہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اقدار انسانیت' امن پسندی' صلح جوئی' تحمل و

بردباری اور ایثار و قربانی کا جو مظاہرہ آج حضورؐ کی طرف سے ہوا ہے اس کی نظیر تاریخ میں تلاش کرنا سب سے زیادہ ناکام کوشش ہوگی۔

یہ بھاگ کر آنے والا مظلوم کون ہے؟ یہ ہیں حضرت ابو جندلؓ۔ خدا کی شان دیکھیے۔ سہیل بن عمرو ان کے باپ ہیں جو کفار قریش کے نمائندے بن کر آئے ہوئے ہیں۔ اور ابو جندلؓ ان کے فرزند ہیں جو پکے مومن ہیں۔ کوئی خوف اور کوئی لالچ ان کے ضمیر کو نہ خرید سکا۔ قید و بند میں رہے۔ زنجیروں میں جکڑے گئے۔ صبح و شام ماریں کھاتے رہے، لیکن کوئی شے انھیں ایمان سے نہ ہٹا سکی۔ آج یہ مسلمانوں سے فریاد کرتے ہوئے بھاگ کر آئے ہیں اور امداد کے طالب ہیں۔ حضورؐ نے سہیل سے فرمایا کہ: ابو جندل کو ہمارے ساتھ جانے دو۔" سہیل بولے کہ: "پابندی عہد کے مظاہرے کا یہی پہلا موقع ہے۔" حضورؐ نے فرمایا: "ابھی نہ معاہدہ مکمل ہوا ہے نہ دستخط ہوئے ہیں۔ سہیل نے کہا: اگر ابو جندل واپس نہ کیا گیا تو ہمیں یہ معاہدہ ہی منظور نہیں۔

ابو جندل کو روکنے کے لیے اور بھی کئی دلیل پیش کی جاسکتی تھی مگر معاہدے کا احترام تمام جذبات پر مقدم تھا۔ ابو جندل سے بصد حسرت فرمایا کہ:
"تم واپس چلے جاؤ۔ خدا تمھارے لیے کوئی بہتر سبیل نکال دے گا۔"

واہ رے ابو جندل کا جذبہ اطاعت و ایثار نفس۔ وہ صریحاً" دیکھ رہے تھے کہ بھاگ کر آنے کے بعد پھر واپس چلے جانا پہلے سے کہیں زیادہ کٹھن اور موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے مگر اطاعت رسولؐ کے جذبے نے ساری متوقع تکالیف جھیلنے پر آمادہ کر دیا، اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ حضورؐ کے اس فرمان پر بھی ابو جندل کا ایمان پختہ تھا کہ "اللہ تعالیٰ کوئی بہتر سبیل پیدا فرما دے گا۔" اور فی الواقعہ ایسا ہی ہوا۔

حضرت ابو جندلؓ کا حیرت انگیز کارنامہ

حضرت ابو جندلؓ جانے کو تو واپس چلے گئے مگر مسلمانوں کو بے تاب کر گئے اور خود مکے میں قید کر دیے گئے۔ اور ایک شخص ان پر نگران مقرر کر دیا گیا تاکہ وہ کہیں بھاگنے نہ پائیں۔ جناب ابو جندل کو موقع غنیمت ملا۔ انھوں نے اپنے نگران کے سامنے اسلام پیش کیا اور کچھ ایسے ڈھنگ سے تبلیغ کی کہ وہ بصد خوشی اسلام لے آیا۔ قریش کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس نگران کو بھی قید میں ڈال دیا اور ان دونوں پر ایک اور آدمی کو نگران مقرر کر دیا۔ اب ان دونوں نے مل کر تبلیغ شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی اسلام لے آیا۔ الغرض ایک سال کے اندر حضرت ابو جندل اور ان کے ساتھیوں نے تین سو کافروں کو مسلمان کر لیا۔

سیدنا عمرؓ کا جوش دینی اور تیز گفتگو

سیدنا ابو جندل کے واپس جانے سے سارے مسلمان تڑپ اٹھے۔ جناب عمرؓ سے نہ رہا گیا۔ بے تاب ہو کر حضورؐ کے پاس آئے اور یوں مکالمہ ہوا۔

"یا رسولؐ اللہ! کیا حضورؐ پیغمبر برحق نہیں؟"

"ہاں۔ ہوں۔"

"یا رسولؐ اللہ! کیا ہم مسلمان حق پر نہیں؟"

"بے شک حق پر ہیں۔"

"تو پھر ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟"

"اللہ ہمارا مددگار ہے۔ وہ ہمیں ہرگز رسوا نہ کرے گا۔"

حضرت عمرؓ کے پاس اس کے بعد خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن جوش اتنا تھا کہ وہ وہاں سے سیدھے سیدنا ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور وہاں بھی

اسی قسم کی گفتگو کی۔ راز دار نبوت صدیق اکبرؓ نے اس کا مختصر جواب یوں دیا کہ: "محمدؐ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کی مرضی سے کر رہے ہیں۔" اس جواب نے حضرت عمرؓ کا سارا جلال ٹھنڈا کر دیا۔ آپؓ کو اس وقتی دینی جوش اور اپنی تیز گفتگو پر اتنی ندامت رہی کہ ساری عمر مختلف کار خیر سے اس کی تلافی فرماتے رہے' نفل نماز اور روزے' صدقات' قیدیوں کی رہائی اور دوسرے کار خیر سے اس لغزش کا کفارہ ادا کرتے رہے۔

ام المومنین ام سلمہؓ کی اصابت رائے

معاہدہ مکمل ہونے کے بعد حضورؐ نے ان تمام لوگوں کو جو قربانی کے جانور ساتھ لائے تھے قربانی ادا کرنے کا حکم دیا۔ کئی بار حضورؐ نے آوازیں دیں لیکن ایک مسلمان بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بہ ظاہر یہ بھی "نافرمانی" ہی معلوم ہوتی ہے لیکن جیسا کہ ہم نکاح زینبؓ کی تفصیلات میں بتا چکے ہیں ہر حکم کی عدم تعمیل نافرمانی کی حدود میں داخل نہیں ہوتی اور نہ اسے نعوذ باللہ کفر قرار دیا جاسکتا ہے۔ صحابہ کرام سے زیادہ حضورؐ کی فرماں برداری کا کون دعویٰ کر سکتا ہے؟ حضورؐ کے بار بار فرمانے پر بھی کسی کا قربانی کے لیے نہ اٹھنا نعوذ باللہ کسی نافرمانی کے جذبے سے نہ تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ سب رسولؐ کے نافرمان ہوں' اور خدا ان سب سے راضی ہونے کی آسمانی سند نازل فرمائے؟ سیرت نگار حضرات اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مسلمان اس حوصلہ شکن معاہدے سے اتنے دل گرفتہ ہو گئے تھے کہ قربانی کے لیے اٹھنا ان کے لیے دوبھر ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ بھی وجہ ہو۔ لیکن ایک اور سبب بھی اس کا ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ صحابہؓ کو ہنوز یہ امید تھی کہ شاید اب بھی حالات میں کوئی ایسا تغیر پیدا ہو جائے اور کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ یہ قربانیاں اپنے اصلی موقع و محل پر ادا ہوں۔ دستور کے مطابق عمرہ ادا کرنے کے بعد ہی قربانیاں ہونی چاہئیں' بغیر عمرہ

ادا کیے قربانی کا ہونا صحابہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ تین سو میل سے ادائے عمرہ کی بے تاب تمنائیں لے کر آئے تھے اس لیے ان کی توقع فطری تھی۔ وہ اسے حضورؐ کی رائے سمجھ رہے تھے، جس میں "لاو نعم" کی گنجائش ہوتی ہے۔ اگر وہ اسے وحی الٰہی یا امر امیریا قضائے قاضی سمجھتے تو عدم تعمیل کی مجال نہ ہوتی۔

بہرکیف جب حضورؐ نے پوری قوم کی یہ دل گرفتگی دیکھی تو ام المومنین ام سلمہؓ کے پاس تشریف لائے جو اس سفر میں حضورؐ کے ساتھ تھیں۔ واقعات سن کر ام المومنینؓ نے عرض کیا کہ: "یا رسولؐ اللہ! حضورؐ خود باہر نکل کر اپنی رسم قربانی ادا فرمالیں اور سر کے بال اتروا کر احرام اتار ڈالیں۔" ام المومنینؓ کا یہ مشورہ صحیح اور صائب نکلا اور تیر نشانے پر جا کر لگا۔" جب حضورؐ نے قربانی ادا کر کے بال اتروائے اور احرام اتار لیا تو تمام صحابہ کو یقین آگیا کہ اب معاہدے میں کوئی تغیر نہیں ہو گا اور معاہدے کے مطابق عمرہ ادا کیے بغیر ہی یہاں سے واپس جانا پڑے گا۔ چنانچہ حضورؐ کا عمل دیکھ کر ان سب نے اپنی اپنی قربانیاں ادا کر کے بال اتروائے اور احرام اتار دیے۔

⁂ ⁂ ⁂

(۱۹)

صلح حدیبیہ اور فتح مبین

معاہدے کے بعد تین دن حدیبیہ میں قیام رہا' پھر مدینے کو روانگی ہوئی۔ راستے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

انا فتحنالک فتحا مبینا ○ ....

اے رسول! ہم نے تمھارے لیے واضح فتح کے دروازے کھول دیے.....

وحی الٰہی کی گہرائیوں تک پوری طرح کون پہنچ سکتا ہے؟ مسلمان اس معاہدے کو اپنی قومی شکست اور دینی رسوائی سمجھ رہے تھے اور وحی آسمانی اسے فتح مبین بتا رہی ہے۔ سیدنا عمرؓ یہ آیات سن کر حیرت میں آگئے۔ ان سے رہا نہ گیا۔ حضورؐ سے دریافت کیا کہ: "یا رسولؐ اللہ! کیا یہ فتح مبین ہے؟" ارشاد ہوا: "ہاں"۔ حضرت عمرؓ کی سمجھ میں بات نہ آسکی اور شاید کوئی بھی نہ سمجھ سکا ہوگا۔ ہاں صرف ایک ہی رفیق نظر آتا ہے جو اس پوری داستان تگ و دو میں خاموش' مطمئن اور شروع سے آخر تک رسولؐ کا ہم نوا' ہم آہنگ اور ہم خیال ہے۔ وہ محض اپنے کمال ایمان و عشق کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی مومنانہ فراست و حکمت کی وجہ سے ان تمام نزاکتوں' مصلحتوں اور گہرائیوں کو سمجھ رہا ہے جو رسولؐ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ یہ ہے راز دار نبوت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ عنا۔

اس معاہدے کے فتح مبین ہونے کی تصدیق بعد کے واقعات نے کر دی۔ اس کے مصالح و فوائد مختصراً" یوں ہیں:

۱۔ مکے اور مدینے کا راستہ ہر راہی مسافر کے لیے بے خطر کھل گیا اور کاروباری لین دین کی سہولتیں حاصل ہوگئیں۔

۲۔ مکے اور مدینے کے علاوہ بھی آس پاس اور دور دراز کے قبائل کی آمدورفت نے مسلمانوں سے روابط پیدا کر دیے۔ دور دور اور کھنچے کھنچے رہنے کی وجہ سے جو غلط فہمیاں تھیں' وہ دور ہوگئیں۔ انھوں نے براہ راست اہل اسلام کی ستھری زندگی دیکھی' ایمان و عبادات کو پرکھا' اخلاق و معاملات کو جانچا اور ان کی معاشری زندگی کا معائنہ کیا۔ اخوت' مساوات' ہمدردی' اخلاص' عدل' صداقت اور تمام اخلاقی اقدار کا تجربہ کیا۔ اس طرح ہر ملنے والے کے دل میں اسلام گھر کرتا گیا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سال کے اندر اندر اتنی کثرت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا کہ اس سے پہلے برسوں میں بھی اتنے لوگ اسلام نہ لائے تھے۔ فاتح شام و عراق خالد بن ولیدؓ' فاتح مصر عمرو بن العاصؓ اور عدی بن حاتم طائی وغیرہ سب ان ہی ایام میں ایمان لائے۔

۳۔ اب تک اہل اسلام کو عربوں کے اندرونی فتنوں سے ہی فرصت نہ ملی تھی مگر اب عام طور پر عرب میں امن و امان قائم ہوگیا اور حضورؐ کو باہر کے فرماں رواؤں کو بھی دعوت اسلام دینے کا موقع ملا۔ (اس کا ذکر آگے آئے گا)

۴۔ ایک بڑا فائدہ جو اس معاہدے سے ہوا وہ یہ کہ مسلمانوں کو اصل خطرہ ہر وقت اہل مکہ سے تھا کیونکہ مکہ عرب کا مرکز تھا اور اہل مکہ کا اثر و اقتدار سارے عرب پر تھا۔ اب ان سے ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ (Non - Aggression Pact) صلح حدیبیہ کی شکل میں ہوچکا تھا اور اہل مکہ مسلمانوں کی طاقت سے مرعوب بھی ہوچکے تھے۔ گویا ان کے حملوں کی

طرف سے اطمینان ہو گیا تھا۔ اب یہود خیبر تنہا رہ گئے تھے اور ان کی سرکوبی کے لیے راستہ صاف ہو گیا تھا۔ یہ خطرہ نہ تھا کہ اہل مکہ ان یہود کی حمایت میں مسلمانوں سے جنگ کریں گے۔ چنانچہ جلد ہی (جیسا کہ آگے ذکر آئے گا) یہود خیبر جیسی فتنہ پرور قوم کا زور توڑ دیا گیا اور فتح خیبر فتح مبین کی تفسیر مبین بن کر سامنے آگئی۔ حضورؐ یا صدیق اکبرؓ کے سوا کون اس سیاسی گہرائی کو سمجھ سکتا تھا کہ دو بڑے دشمنوں میں سے ایک سے مصالحت کر کے دوسرے کا خاتمہ کر دیا جائے؟

اس معاہدے سے ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ اس معاہدے کی بعض شرطیں خود قریش کے لیے وبال جان بن گئیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اہل مکہ کے کے مسلمانوں پر طرح طرح کی سختیاں کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس سے گھبرا کر ایک مسلمان حضرت عتبہ بن اسید (ان کی کنیت ابو بصیر ہے) مکے سے نکل بھاگے اور سیدھے مدینے پہنچے۔ اہل مکہ نے دو آدمیوں کو مدینے بھیجا اور مطالبہ کیا کہ اس بھاگے ہوئے آدمی کو شرائط معاہدہ کے مطابق واپس کر دیا جائے۔ حضورؐ نے جس طرح حضرت ابو جندل کو حدیبیہ سے واپس فرما دیا تھا' اسی طرح جناب عتبہ کو بھی واپس ہونے کا حکم دیا۔ عتبہ بہت گڑگڑائے اور مظلومیت کی داستان بیان کر کے واپس جانے سے معذوری ظاہر کی۔ مگر حضورؐ کو اقدار معاہدہ کا اتنا پاس و لحاظ تھا کہ صاف فرما دیا: ''معاہدے کی پابندی ضروری ہے اور میں تمھیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ تم واپس جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کوئی بہتر سبیل پیدا فرما دے گا۔'' کتنے بڑے جگرے کا کام تھا ان سخت آزمائشوں میں پھر واپس جانا' مگر عہد کی پابندی اور اطاعت رسولؐ کا جذبہ انھیں واپس لے گیا۔ عتبہ ان دونوں کافروں کی حراست میں مدینے سے روانہ ہو گئے۔ ذوالحلیفہ پہنچ کر عتبہ نے ایک کو قتل کر دیا۔ دوسرا بھاگا ہوا مدینے پہنچا۔ پیچھے سے عتبہ بھی پہنچ گئے اور عرض کیا کہ: ''یا رسولؐ اللہ! حضورؐ نے معاہدے

کے مطابق اپنی طرف سے مجھے واپس فرمایا۔ اس لیے حضورؐ تو بری الذمہ ہو گئے۔" عتبہ کو یہ معلوم تھا کہ حضورؐ انھیں مدینے میں نہیں رہنے دیں گے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ مکے واپس جانا موت کے دہانے میں جانا ہے۔ لہٰذا انہوں نے مدینہ تو چھوڑ دیا لیکن مکے بھی واپس نہ گئے' بلکہ سمندر کے کنارے ذومرہ کے کے پاس عیص نامی ایک جگہ پر مقیم ہو گئے۔ مکے کے مظلوم مسلمانوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ عتبہ نے اپنا ایک ٹھکانا بنا لیا ہے تو وہ بھی بھاگ بھاگ کر ان کے پاس آنا شروع ہو گئے' اور تھوڑے دنوں میں ایک اچھی خاصی جماعت ہو گئی۔ قریش کے تجارتی قافلے عموماً ادھر ہی سے گزر کر مکے سے شام کی طرف آتے جاتے تھے۔ یہ لوگ ان قافلوں کو روک لیتے اور اسی مال غنیمت سے اپنی گزر اوقات کرتے۔ اس سے اہل مکہ کی تجارت و معاش پر اتنا برا اثر پڑا کہ قریش نے حضورؐ کے پاس پیغام بھیجا کہ: "ہم اس شرط سے باز آئے۔ آپ سارے مسلمانوں کو مدینے میں بلوا لیجیے۔ ہماری طرف سے سب مسلمانوں کو مدینے جانے کی اجازت ہے۔"

آپ نے دیکھا؟ ——— وہی شرط معاہدہ جسے قریش اپنی سب سے بڑی فتح سمجھ رہے تھے ان کے لیے سب سے زیادہ وبال جان بن گئی:

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جناب عتبہؓ اور ان کے رفقا نے اخلاقی قدروں کا کچھ اچھا مظاہرہ نہ کیا۔ لیکن اس سے پہلے یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ مسلمانوں کو صرف اسلام لانے کے جرم میں مکے میں قید رکھنا کون سا مظاہرہ اخلاق تھا۔ ان سے معاملات' اخلاق اور سوشل زندگی کی کوئی ادنیٰ شکایت بھی نہ تھی۔ پھر انھیں کس جرم میں سخت سے سخت سزائیں دی جا رہی تھیں؟ حضورؐ نے شرائط معاہدہ کی پوری پوری پابندی فرمائی اور کسی مسلمان کو جو مکے سے

بھاگ کر آئے اپنے پاس نہیں رکھا۔ اب یہ ان مکی مسلمانوں کا کام تھا کہ انھوں نے مظالم سے عاجز آکر اپنے بچاؤ کے لیے ایک نیا راستہ نکال لیا۔

۶۔ حدیبیہ کے معاہدۂ صلح میں جو سب سے بڑا انسانی فائدہ ہے وہ اخلاقی فتح ہے۔ ذرا دیکھیے کتنی اعلیٰ اخلاقی اقدار کی محافظت کی گئی ہے۔ یہ چودہ سو مہاجرین و انصار ایسے جاں باز تھے کہ ان کے تین سو تیرہ نے بدر کے معرکے میں ایک ہزار نبرد آزما یکوں کے منہ پھیر دیے۔ ایک اشارے میں یہ چودہ سو جاں باز سارے مکے کو تہس نہس کرسکتے تھے۔ ان کی ایک یورش سارے ظالموں کو خاک میں ملا سکتی تھی' اور اس کے لیے کافی وجوہ بھی موجود تھیں۔ صرف ابو جندل ہی کے معاملے پر اڑ جانا معاہدے کو نامکمل چھوڑ کر حملے کا بہانہ بن سکتا تھا۔ لیکن والصلح خیر کی اعلیٰ قدریں حضورؐ کے پیش نظر تھیں۔ چودہ سو صحابہ اس معاہدے سے دل شکستہ ہوگئے تھے۔ حضورؐ کا اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا کہ ہماری قوم اس معاہدے پر راضی نہیں' مگر صلح کی جا رہی ہے۔ دب کر صلح کی جا رہی ہے۔ رفقا کی خفگیوں کی پروا نہیں کی جاتی' خون کا ایک قطرہ نہیں بہایا جاتا۔ کیا اقدار صلح و امن کی محافظت کا اس سے بہتر نمونہ بھی دنیا کے لیے ہو سکتا ہے؟

اس پورے سفر حدیبیہ میں جہاں سیدنا عثمان ذوالنورینؓ کی عظمت و شخصیت نمایاں ہوتی ہے وہاں صدیقؓ کی عاقلانہ تسلیم و رضا' فاروقؓ کے والہانہ جوش حق اور مرتضیٰؓ کے کمال عشق و ادب اور ام المومنین ام سلمہؓ کی فراست و دانائی کا بھی واضح اندازہ ہوتا ہے۔

✻ ✻ ✻

(۴۰)

فرماں رواؤں کو دعوت اسلام

اگر ایک تالاب کے وسط میں ایک ڈھیلا پھینکا جائے تو پانی اچھل کر ایک چھوٹا سا دائرہ بنا دے گا اور وہ دائرہ دھیرے دھیرے بڑھتا جائے گا اور کناروں تک پہنچ جائے گا۔ یہی صورت اصلاح قوم کی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے حضورؐ کو اپنی ذات کو سنوارنے کا حکم ہوا: قم فانذر ○ وربک فکبر ○ و ثیابک فطھر ○ والرجز فاھجر ○ (المدثر: ۲-۵) اس کے بعد یہ دائرہ گھر اور قریب رہنے والوں تک وسیع کرنے کا حکم ہوا۔ و انذر عشیرتک الاقربین (الشعراء: ۲۱۴) اس کے بعد اہل مکہ کی باری آئی۔ لتنذر ام القریٰ (الانعام: ۹۲) پھر مکے کے آس پاس تک یہ دائرہ پہنچا: ومن حولھا (الانعام: ۹۲) اور اس طرح یہ دائرہ عرب میں پھیلتا گیا۔ اس کے بعد سارے عالم کی ذمہ داری ڈالی گئی۔ کافۃ للناس بشیراً و نذیراً (سبا: ۲۸)

ابھی پورے عرب میں اسلام نہیں پھیلا تھا۔ اس لیے بقیہ حصہ عرب اور بیرون عرب کی طرف ایک ساتھ توجہ دی گئی۔

ہر دین پہلے عوام سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد بااقتدار لوگوں تک پہنچتا ہے۔ فطرت کا کچھ تقاضا بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ نیچے طبقے کے عوام دین حق کو اس لیے پہلے قبول کرتے ہیں کہ یہ ان کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ اسی میں ان کی روح کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اسی میں ان کے ٹوٹے دلوں کا

سہارا ہوتا ہے۔ اسی میں اخوت و مساوات ہوتی ہے۔ اسی میں ان کی ذلت و سرنگونی کا مداوا ہوتا ہے اور اسی میں ان کی خودی بیدار ہوتی ہے۔ اونچے' دولت مند اور بااقتدار لوگوں میں بہت کم سعید روحیں ہوتی ہیں جو پیغام حق کو جلد قبول کرلیں۔ یہ لوگ عموماً اپنے عیش و تنعم اور دولت و اقتدار کے نشے میں مست رہتے ہیں۔ اگر حق سمجھ میں آبھی جائے تو قبول کرنے میں اس لیے تامل ہوتا ہے کہ حق ان سے اقتدار' دولت اور عیش سب کا ایثار چاہتا ہے اور اس کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہیں پاتے۔ یہ لوگ پیغام حق اگر قبول بھی کرتے ہیں تو اس وقت جب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو اور وہ اپنی مسند اقتدار کو سہارا دینے کا اسی کو ذریعہ سمجھیں۔ ان کی مسند اقتدار عوام ہی کے بل بوتے پر قائم رہتی ہے۔ عوام ہی کی محنت و خدمت کے سہارے یہ داد عیش دیتے ہیں' اس لیے یہ فقط یہی نہیں کرتے کہ خود قبول حق میں تامل یا انکار سے کام لیں بلکہ عوام کو بھی قبول حق سے روکتے ہیں' کیونکہ ان عوام کے بغیر ان کا پورا نقشہ زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر پیغام حق پہلے عوام میں پہنچایا جاتا ہے اور پہلے وہیں مقبول ہوتا ہے۔ اس کے بعد مسند اقتدار رکھنے والوں کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اب تک اسلام کو قبول کرنے والے عوام ہی تھے جن کو حضورؐ نے اپنی تربیت سے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔ اب جب کہ قریش کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو اس فرصت سے حضورؐ نے بلا تاخیر یہ فائدہ اٹھایا کہ فرماں رواؤں کو دعوت نامے ارسال فرمائے۔ اس موقعے پر حضورؐ نے مہردار انگوٹھی بنوائی جس پر محمد رسول اللہ کے الفاظ اس طرح کندہ تھے کہ نیچے "محمدؐ" اس کے اوپر رسول' اور اس کے اوپر اللہ' کا لفظ تھا۔ اس ترتیب میں یہ اشارہ ہے کہ محمدؐ بندہ ہے۔ اس کا منصب رسول ہے اور مقصود اللہ ہے۔ حضورؐ نے اپنی عبدیت و فروتنی کے اظہار سے اپنی مہر کو بھی خالی نہ رکھا۔

ان رسالت ناموں کی خصوصیت یہ ہے کہ سب کا انداز تحریر الگ الگ اور دعوت ایک ہی ہے۔ جسے دعوت دی گئی اس کے ماحول' اس کی ذہنیت اور اس کے نفسیاتی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر بلیغ' موثر اور دل نشین انداز میں دعوت اسلام دی گئی اور ہر خط پر مہر بھی ثبت کی گئی۔ ان تمام رسالت ناموں کی نقل' ترجمہ اور ضروری تشریح کے لیے ایک الگ تصنیف درکار ہے۔ بعض مولفات میری نظر سے گزرے ہیں جن میں رسالت ناموں کو یک جا کیا گیا ہے اور بعض کے عکسی فوٹو بھی دیے گئے ہیں۔ کئی رسالت نامے آج بھی دنیا میں محفوظ ہیں۔ مثلاً اصحمہ بن ابجر اور مقوقس مصر کو جو دعوت نامے بھیجے گئے تھے وہ اب تک محفوظ ہیں۔ اس وقت اس کی تفصیلات میں گئے بغیر ہم صرف ایک مختصر سی فہرست پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

ا۔ ایک دعوت نامہ فرماں روائے حبشہ اصحمہ بن ابجر (ملقب بہ نجاشی) کے نام تھا جسے عمرو بن امیہ ضمری لے کر گئے تھے۔ یہ عیسائی تھے۔ شروع سے ہی اسلام کی طرف مائل تھے۔ خط پاتے ہی اسلام لے آئے۔ انھوں نے مسلمان مہاجرین حبشہ کے ساتھ جو شریفانہ برتاؤ کیا' اس کا بیان آپ ہجرت حبشہ کے ذکر میں پڑھ چکے ہیں۔ حضرت ام حبیبہؓ بنت ابو سفیان کے پہلے شوہر عبید اللہ بن جحش کے ارتداد کے بعد آنحضرتؐ نے نجاشی ہی کی معرفت پیغام نکاح بھیجا تھا۔ نکاح خالد بن سعید نے پڑھایا۔ مہر چار سو دینار طلائی تھا جو حضرت نجاشیؓ ہی نے اپنے پاس سے اسی وقت ادا کر دیا۔ نجاشی کے قبول اسلام کے بعد پادریوں نے اور دوسرے بکثرت عوام نے اسلام قبول کر لیا۔ نجاشی پہلے ہرقل روم کے باج گزار تھے' لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد اسے ایک درہم بھی خراج نہ دیا۔ حضورؐ کو خیبر میں نجاشی کی وفات کی خبر ملی تو جماعت صحابہ کے ساتھ ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نجاشی کے بعد والے نجاشی کو بھی دعوت نامہ دیا گیا تھا مگر اس نے اسلام

قبول نہیں کیا۔ بہرحال دونوں میں سے ایک نے تو ضرور اسلام قبول کر لیا تھا اور اسی کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی تھی۔

۲۔ ایک رسالت نامہ فرماں روائے بحرین منذر بن ساوی کے پاس علاء بن حضرمی لے کر گئے۔ یہ بھی اسلام لے آئے۔

۳۔ ایک نامہ رسالت فرماں روائے عمان اور اس کے بھائی جیفر اور عبد (فرزندان جلندی) کے پاس عمرو بن العاص لے کر گئے۔ دونوں کئی دن گفتگو کرنے کے بعد مطمئن ہوئے اور اسلام لے آئے۔

۴۔ ایک دعوتی رقعہ شام کے گورنر منذر بن حارث بن ابی شمر کے پاس شجاع بن وہب اسدی لے کر گئے۔ یہ ایمان نہ لایا۔ پہلے تو یہ بہت ناراض ہوا' پھر اعزاز کے ساتھ شجاع کو رخصت کیا۔

۵۔ ایک دعوت نامہ حاکم یمامہ ہودہ بن علی کے پاس سلیط بن عمرو لے کر گئے۔ اس نے خط پڑھ کر کہا: "باتیں تو معقول ہیں لیکن اسلامی حکومت میں آدھا حصہ میرا رکھا جائے تو اسلام لانے کو تیار ہوں۔" اس جواب کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہودہ ہلاک ہو گیا۔

۶۔ ایک نامہ مبارک فرماں روائے مصر جریج بن متی (ملقب بہ مقوقس) کے پاس حاطب بن ابی بلتعہ لے کر گئے۔ اس نے اسلام کا نہ اقرار کیا نہ انکار۔ ایک گول مول سا جواب دے کر حاطب کو رخصت کر دیا۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں ایک خچر (دلدل نامی) کچھ کپڑے اور دو کنیزیں بھیجیں۔ یہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔ ایک کا نام سیرین اور دوسری کا نام ماریہ تھا۔ حاطب نے ان دونوں کو اسلام کی تبلیغ کی اور ان دونوں نے مدینے پہنچنے سے پہلے ہی اسلام قبول کر لیا۔ سیرین حضرت حسان بن ثابت کی بیوی بنیں اور ماریہؓ آنحضرتؐ کی۔ معلوم نہیں لوگ ماریہؓ قبطیہ کو امہات المومنین کی فہرست میں کیوں داخل نہیں کرتے؟

۷۔ ایک نامہ تبلیغ کسرائے ایران خسرو پرویز کے نام عبداللہ بن حذافہ لے کر گئے۔ گستاخ اور بد قسمت خسرو پرویز نے نامہ مبارک پڑھ کر چاک کر دیا اور بولا: "میرا غلام مجھے یوں خط لکھتا ہے جس میں میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھا ہے۔" العیاذ باللہ! اس کے بعد خسرو نے اپنے گورنر یمن باذان کو لکھا کہ: "محمدؐ کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔" العیاذ باللہ۔ باذان نے دو آدمیوں (بابویہ اور خرخرہ) کو تعمیل حکم کے لیے مدینے بھیجا۔ آنحضرتؐ نے ان کی آمد کا سبب معلوم کرنے کے بعد فرمایا: "تمہارا فرماں روا (خسروِ پرویز) ہلاک ہو چکا۔ جا کر تحقیق کرو۔" وہ دونوں یمن واپس گئے تو انھیں معلوم ہوا کہ خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر کے تخت حکومت پر قبضہ کر لیا ہے۔ جب عبداللہ بن حذافہ مدینے واپس آئے تو انھوں نے آنحضرتؐ کو بتایا کہ خسرو پرویز نے نامہ مبارک کو چاک کر ڈالا۔" آنحضرتؐ نے فرمایا: مزق ملکه (اس نے اپنی سلطنت کے پرزے اڑا دیے)۔ ان دو کلموں کی تفسیر عہد فاروقیؓ میں دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

۸۔ ایک رسالت نامہ فرماں روائے بصریٰ کے پاس حارث بن عمیر ازدی لے کر گئے۔ شرجیل بن عمرو نے انھیں قتل کر دیا جو روم کی طرف سے حاکم بلقا تھا۔ یہی قتل آگے چل کر غزوہ موتہ کا سبب بنا۔

۹۔ ایک تبلیغ نامہ فرماں روائے قسطنطنیہ یعنی ہرقل کے پاس وحیہ کلبی لے کر گئے۔ ہرقل اس وقت بیت المقدس میں تھا۔ اس نے دربار عام کیا جس میں جناب ابو سفیانؓ کو بھی بلایا۔ یہ ابھی تک مسلمان نہ ہوئے تھے' بلکہ آنحضرتؐ کی ہر مخالفت و جنگ میں پیش پیش تھے۔ یہ بہ سلسلہ تجارت یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان سے ہرقل کے جو جو سوال و جواب ہوئے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ انھیں یہاں درج کیا جائے۔ ("ہ" ہرقل کے نام کو اور "الف" ابو سفیان کو ظاہر کرتا ہے۔)

ہ۔ ”تم میں اس (مدعی نبوت) کا حسب کیسا ہے؟“
الف۔ ”وہ ہم میں حسب (یعنی خاندانی شرافت) رکھتا ہے۔“
ہ۔ ”انبیا اسی طرح اپنی قوم کے شریف خاندان میں بھیجے جاتے ہیں۔“
ہ۔ اس کے مورثوں میں کوئی بادشاہ بھی تھا؟“
الف۔ ”نہیں“۔
ہ۔ ”اگر اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ ہوتا تو میں یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ اس بادشاہت کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔“
ہ۔ ”اس دعوائے نبوت سے پہلے اس پر دروغ گوئی کا الزام لگایا گیا ہے؟“
الف۔ ”نہیں“۔
ہ۔ ”جو بندوں سے جھوٹ بولنا ترک کر دے وہ خدا پر جھوٹ بہتان کیسے باندھ سکتا ہے۔“
ہ۔ ”اس کے پیرو بڑے لوگ ہوتے ہیں یا کم زور قسم کے لوگ؟“
الف۔ ”کم زور لوگ۔“
ہ۔ ”رسولوں کے پیروان اول ایسے ہی ہوتے ہیں۔“
ہ۔ ”پیروؤں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے یا کم ہوتی رہتی ہے؟“
الف۔ ”بڑھتی جاتی ہے۔“
ہ۔ ”ایمان کی الفت جب دلوں میں اتر جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“
ہ۔ ”کیا کوئی پیرو ایسا بھی ہے جو لوگوں کی ناراضی کے سبب اپنے دین سے پھر جائے؟“
الف۔ ”نہیں۔“
ہ۔ ”ایمان کی قوت ایسی ہی ہوتی ہے تاآنکہ وہ مشن مکمل ہو

جائے۔"

ہ۔ " تمھاری اس سے جنگ بھی ہوئی ہے؟ "

الف۔ "ہاں"

ہ۔ "انبیا کی آزمائش اسی طرح ہوتی ہے اور نتیجہ ان ہی کے حق میں ہوتا ہے۔"

ہ۔ "جنگ کے نتائج کیا رہے؟"

الف۔ "جنگ ہمارے اور اس کے درمیان اس ڈول کی طرح رہی ہے جس کو کبھی وہ ہم سے اور کبھی ہم اس سے چھین لیتے ہیں (یعنی کبھی ایک فریق غالب ہوتا ہے اور کبھی دوسرا)۔"

ہ۔ "ہاں نتیجہ انبیا ہی کے حق میں نکلتا ہے۔"

ہ۔ "وہ معاہدہ شکنی بھی کرتا ہے؟"

الف۔ "اب تک تو نہیں کی ہے لیکن اس دوران میں جب کہ ہم لوگ یہاں ہیں ہمیں علم نہیں کہ اس کا طرز عمل کیا رہا ہے؟ " (ابو سفیان کا بیان ہے کہ سوال و جواب کے دوران میں مجھے حضورؐ کے خلاف کہنے کا اور کوئی موقع اس کے سوا نہ مل سکا)۔

ہ۔ "انبیا کا کیرکٹر ایسا ہی ہوتا ہے۔"

ہ۔ "کیا اس سے پہلے بھی وہاں کسی نے یہ دعویٰ کیا ہے؟ "

الف۔ "نہیں"۔

ہ۔ "اگر ایسا ہوتا تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ کسی مدعی کی نقالی کر رہا ہے۔"

اس کے بعد ہرقل نے پھر ایک سوال کیا کہ: "وہ تمھیں کن باتوں کا حکم دیتا ہے؟ ہم نے کہا کہ: "وہ صلوٰۃ' زکوٰۃ' صلہ رحمی اور پاک دامنی وغیرہ کا حکم دیتا ہے۔ ہرقل بولا کہ: جو کچھ تم بیان کرتے ہو' اگر یہ صحیح ہے تو وہ یقیناً نبی

ہے' مجھے یہ تو علم تھا کہ وہ ظہور کرنے والا ہے لیکن یہ گمان نہ تھا کہ وہ تمھاری قوم میں پیدا ہو گا۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ میں اس تک پہنچ سکوں گا تو میں خود اس کی زیارت کرتا' اور اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتا۔ اس کا اقتدار اس سرزمین تک جو آج میرے قدموں کے نیچے ہے پہنچ کر رہے گا۔ اس کے بعد ہرقل نے رسالت نامہ منگوا کر یوں پڑھنا شروع کیا: (ترجمہ) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: یہ خط ہے محمدؐ رسول اللہ کی جانب سے ہرقل عظیم روم کے نام۔ سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اما بعد۔ میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کر لو تو سلامتی نصیب ہو گی۔ تم اسلام قبول کر لو تو اللہ تمھیں دوہرا اجر عطا فرما دے گا۔ اور اگر یہ دعوت رد کر دی تو تم پر خود تمھارا گناہ بھی ہو گا اور ماتحتوں کا بھی' جو تمھاری وجہ سے اسلام سے محروم رہیں گے۔ اے اہل کتاب! ایک ایسے کلمے کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے' اور وہ یہ ہے کہ ہم بجز اللہ تعالیٰ کے اور کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ کریں اور اس کے سوا ہم میں کسی کو کوئی رب نہ بنائے۔ اگر وہ اس پیغام کو رد کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہنا ہم تو مسلم ہیں —— ہرقل جب یہ رسالت نامہ پڑھ چکا تو مختلف آوازیں بلند ہونے لگیں اور شور سا مچ گیا۔ ہم لوگوں کو اس نے واپس جانے کی اجازت دی اور ہم لوگ باہر چلے آئے۔ پھر باہر نکل کر ہم نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ: ابو کبشہ کے فرزند (یعنی حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم) کا اثر تو بڑھتا جا رہا ہے۔ اس سے تو رومیوں کا فرماں روا بھی خوف کھا رہا ہے۔" اس کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ حضورؐ کا اثر و اقتدار غالب ہو کر رہے گا۔ آخر ایک دن اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں بھی اسلام کو داخل کر ہی دیا —— زہری اس کے بعد کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ: "ہرقل نے تمام حکام روم کو بلا کر اپنے ایک گھر میں جمع کیا اور کہا کہ: "اے قوم روم: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمھاری فلاح اور

رشد ہمیشہ قائم رہے اور تمہارا ملک بھی تمہارے ہی پاس رہے؟ یہ سن کر سب کے سب دروازے کی طرف اس طرح بھاگنے لگے جیسے جنگلی گدھے بھاگتے ہیں' لیکن دروازوں کو بند پایا۔ ہرقل نے کہا کہ: ان سب کو ادھر بلاؤ۔ وہ آگئے تو ہرقل نے (پینترا بدلتے ہوئے) کہا کہ: میں نے تمہاری دینی پختگی کا امتحان لیا تھا' سو میں نے وہی بات دیکھ لی جو میں چاہتا تھا۔ یہ سن کر سب اس کے آگے سجدے میں گر گئے اور اس سے خوش ہو گئے۔

ان فرماں رواؤں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے جن کو دعوت نامہ اسلام بھیجا گیا' مثلاً

۹۔ فرماں روائے غسان جبلہ بن ایہم۔ اس نے اسلام قبول کر لیا مگر دماغ سے پندار فرماں روائی نہیں نکلا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد عہد فاروقی میں طواف کعبہ کرتے ہوئے اس کی چادر کا ایک کونہ کسی کے پاؤں سے دب گیا۔ اس نے اس غریب کو ایک طمانچہ رسید کیا۔ مقدمہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں پیش ہوا۔ آپؓ نے جبلہ کے خلاف طمانچے کے بدلے طمانچے کا فیصلہ دیا۔ جبلہ نے کہا کہ میں سردار قوم ہوں اور ایک معمولی آدمی سے مجھے برابر کا بدلہ دلوایا جاتا ہے۔ آپؓ نے فرمایا کہ اسلام کے قانون کے سامنے کوئی بڑا چھوٹا نہیں' سب برابر ہیں۔ جبلہ نے کچھ دیر کی مہلت لی اور چپکے سے بھاگ نکلا اور پھر مرتد ہو کر مرا۔

۱۰۔ فردہ بن عمرو خزاعی شام کے گورنر تھے۔ دعوت نامہ دیکھنے کے بعد اسلام لے آئے۔ قیصر روم نے انھیں قید کر لیا اور پھر سزائیں دے کر قتل کر دیا۔ مگر کوئی شے انھیں اسلام سے برگشتہ نہ کر سکی۔

۱۱۔ اکیدر حکمران دومتہ الجندل تھے۔ یہ دیر بعد ۹ھ میں اسلام لے آئے۔

۱۲۔ ذوالکلاع حمیری یمن و طائف کے اکثر علاقوں پر حکومت کرتے

تھے اور لطف یہ ہے کہ الوہیت کے مدعی تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ایک دن میں اٹھارہ ہزار غلام آزاد کیے۔ عہد فاروقی میں اپنی حکومت سے دست بردار ہو کر مدینے میں بس گئے اور زہد و ریاضت میں ساری زندگی گزار دی۔

ثمامہ بن اثال کا اسلام

۱۳۔ کہا جاتا ہے کہ سردار نجد ثمامہؓ بن اثال کو بھی دعوت نامہ اسلام بھیجا گیا تھا لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن یہ ایک دوسری طرح اسلام لے آئے۔ یہ مسلمانوں کو خصوصیت سے لوٹتے اور قتل کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اعلان فرمایا کہ جو ثمامہ کو گرفتار کر کے لائے گا میں اسے اپنے پاس سے انعام دوں گا۔ صحابہ اس فکر میں لگے رہتے تھے مگر ثمامہ ہاتھ نہ آتے تھے۔ آخر ایک موقعے پر گرفتار ہوئے اور آنحضرتؐ کی خدمت میں اس طرح لائے گئے کہ پیچھے سے ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''ان کے ہاتھ کھول دو۔ ایک سردار قوم کو اس طرح باندھنا کوئی شریفانہ طریقہ نہیں۔'' صحابہ نے عرض کیا کہ: ''یا رسول اللہ! یہ بڑی مشکل سے گرفتار ہوا ہے۔ ہاتھ کھولے جائیں گے تو یہ فرار ہو جائے گا؟'' آنحضرت نے فرمایا: ''مجھے ثمامہ سے ایسی توقع نہیں۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے پوچھا: ''ثمامہ! ہمارے اور اسلام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ ثمامہ ایک مرد دلیر تھے بولے: ''اے محمدؐ! اس روئے زمین پر تمہارے چہرے سے زیادہ قابل نفرت چہرہ تمہارے دین سے زیادہ قابل نفرت دین اور تمہارے شہر سے زیادہ قابل نفرت شہر میرے نزدیک کوئی نہیں۔'' آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اسے لے جا کر (مسجد نبوی کے سامنے) حراست میں رکھو اور کل پھر میرے سامنے پیش کرو۔'' دوسرے دن پیش کیا گیا اور بالکل اسی طرح کے سوال و جواب ہوئے اور تیسرے دن بھی بعینہ یہی ہوا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اسے چھوڑ دو۔'' صحابہ

حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بڑی مصیبتوں سے تو اسے گرفتار کیا گیا ہے اور وہ اتنی سخت کلامی سے پیش آیا ہے اور اسے پھر مسلمانوں کو لوٹنے کے لیے رہا کیا جا رہا ہے۔ مگر حکیم امت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تمام نقوش پڑھ لیے تھے جو ان تین دنوں کے اندر تاثرات قلبی نے ثمامہ کے چہرے پر تحریر کر دیے تھے۔

ثمامہ ان تین دنوں میں کیا دیکھتے رہے؟ ایک مجرم قیدی کے ساتھ انتہائی شریفانہ برتاؤ۔ جماعت نماز میں پوری قوم کی فروتنی' عاجزی اور سنجیدگی' اخوت' مساوات' ہمدردی' ایثار' اعلیٰ انسانی اقدار' بلند اخلاق' اونچے کردار' ہر فرد کی پیشانی پر ایمان و صداقت کے انوار۔ اسلامی تعلیمات ایک پورے معاشرے کے اندر مجسم شکل میں نمودار۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک کھلے ہوئے مجرم کو سخت کلامی کے باوجود کوئی سزا دیے بغیر صاف رہائی کا فرمان ـــــ ثمامہ کا دل ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ مگر وہ کھرا تھا' دلیر تھا۔ وہ یہ نہیں پسند کرتا تھا کہ قید و بند اور دباؤ کی وجہ سے اسلام قبول کرنے کا طعنہ سنے۔

وہ رہا ہو کر سیدھے اپنی قوم میں پہنچے۔ پہلے اعلان کیا کہ کسی کا کوئی قرض یا اور کوئی حق ہو تو وہ طلب کر لے۔ اللہ اللہ ثمامہ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ قرض سے بچنے کے لیے مسلمان ہونے کا طعنہ دیا جا سکے۔ وہ اپنے گھر سے سیدھے مدینے کی طرف چل پڑے۔ آبادی سے باہر اپنے کپڑے دھوئے۔ غسل کیا اور شہر میں داخل ہو گئے۔ صحابہ نے دیکھا تو سمجھے کہ معلوم نہیں یہ کیا نیا فتنہ لایا ہے۔ فوراً چوکس ہو کر آنحضرتؐ کی اور اپنی حفاظت کے لیے تیار ہو گئے۔ ثمامہ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں درخواست کی کہ کل جس جگہ اور جس طرح حضور بیٹھے تھے۔ اسی جگہ اور اسی طرح بیٹھ جائیے۔ آنحضرتؐ نے اس کی درخواست منظور کر لی اور وہیں بیٹھ گئے۔ صحابہ ہر چہار طرف تحفظ کے لیے موجود تھے کہ کہیں یہ اچانک حملہ نہ کر دے۔ ثمامہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے

اور آنحضرتؐ کے گھٹنوں کو پکڑ کر کہا: "یا رسولؐ اللہ! آج اس روئے زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ محبوب چہرہ میری نظروں میں کوئی نہیں۔ آپ کے دین سے زیادہ پیارا میرے لیے کوئی دین نہیں اور آپ کے شہر سے زیادہ پسندیدہ شہر میرے لیے کوئی نہیں۔"

اسلام لانے کے واقعات تو آپ نے بہت پڑھے ہوں گے۔ مگر اس انوکھی شان سے یا تو عمرؓ بن خطاب ایمان لائے تھے یا ثمامہؓ بن اثال۔

یہ بھی سن لیجیے کہ مکے میں غلہ نجد ہی سے جایا کرتا تھا۔ ثمامہؓ نے واپس آکر حضورؐ سے اذن لیے بغیر سارا غلہ رکوا دیا اور اہل مکہ تڑپ اٹھے۔ بھوکے مرنے لگے۔ آخر انھوں نے اپنا ایک نمائندہ (غالباً" ابو سفیان کو) بھیجا۔ اس نمائندے نے آکر کہا کہ: "اے محمدؐ! کیا تم چاہتے ہو کہ تمھارے قریشی قرابت دار بھوکے مر جائیں؟ ثمامہؓ نے غلہ روک کر ہم سب کو بھوکا مار دیا ہے۔" رحمتہ للعالمینؐ یہ کہاں گوارا فرما سکتے تھے؟ قیدی ثمامہ کو بھوکا نہ مارا تو مکی دشمنوں کا بھوکا مرنا کب برداشت فرما سکتے تھے۔ انسانیت کو بلند کرنے والا اور انسانی اقدار کو قائم کرنے والا، یہ انسانیت سوز انتقامی کارروائی کہاں دیکھ سکتا تھا کہ انسان بھوکے مریں؟ جو خود بھوکا رہ کر دوسروں کا پیٹ بھرتا ہو وہ کسی پوری قوم کی بھوک کو کیوں کر انگیز کر سکتا تھا؟ آنحضرتؐ نے فوراً ثمامہؓ کو پیغام بھجوا دیا کہ اہل مکہ کے لیے غلہ کھول دو۔"

✳ ✳ ✳

(۲۱)

محرم ۷ ہجری ——— غزوۂ خیبر

خیبر مدینے سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر ایک جگہ کا نام ہے۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر مدینے سے جلا وطن ہوئے تو وہ دونوں قبیلے خیبر ہی میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ مدینے میں انھیں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی، مگر یہ غداری سے باز نہ آئے۔ خیبر میں رہ کر بھی ان کی ریشہ دوانیاں ہمیشہ جاری رہیں۔ اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ غزوہ احزاب ان ہی کی سازش و انگیخت سے ظہور میں آیا تھا اور غزوہ بنو قریظہ بھی ان ہی کی شرانگیزیوں کا نتیجہ تھا۔ ان یہودیوں نے اپنے کھوئے ہوئے عزت و اقتدار کو واپس لانے کے لیے پھر پرپرزے نکالنے شروع کیے۔ غزوہ بنو قریظہ میں حی بن اخطب کے مارے جانے کے بعد ابو رافع سلام بن ابی الحقیق اس کا جانشین ہوا۔ یہ قتل کیا گیا۔ (اس کی داستان قتل پر ہم آگے تبصرہ کریں گے) تو اسیر بن زرام مسند آرائے ریاست ہوا۔ یہ پہلے اپنے قریب کے حلیف قبیلے بنی غطفان کے پاس گیا اور پورے قبیلے کو مسلمانوں کے خلاف خوب بھڑکایا۔ اس کے بعد دوسرے کئی قبائل کو ساتھ ملایا گیا۔ یہاں تک کہ بیس پچیس ہزار کی فوج مدینے پر حملہ کرنے کی غرض سے جمع کر لی۔ آنحضرتؐ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو حضرت عبداللہ بن رواحہ کو تحقیق حال کے لیے بھیجا۔ انھوں نے چھپ کر اپنے کانوں سے یہود کی سازشوں کی گفتگو سنی اور واپس آکر آنحضرتؐ کو اطلاع دی۔ آنحضرتؐ نے پھر تیس آدمیوں کو عبداللہ بن رواحہ کے ساتھ خیبر بھیجا۔ عبداللہ بن رواحہ نے

اسیر سے ملاقات کی اور کہا کہ: " تمھاری حکومت تمہیں کو مبارک رہے، تم رسولؐ اللہ سے مل تو لو۔ تمھاری حکومت تمھارے ہی پاس رہے گی۔" عبداللہ بن رواحہ نے یہ گفتگو اسی توقع پر کی تھی کہ اسیر آنحضرتؐ سے مل کر یا تو اچھا اثر لے گا اور ایمان لائے گا یا اتنا متاثر ضرور ہو گا کہ انسانیت کے ساتھ مصالحت کر لے۔ اسیر تیار ہو گیا اور اس نے بھی تیس آدمی اپنے ساتھ لے لیے۔ راستہ یوں طے ہوا کہ ہر مسلمان کے ساتھ ایک یہودی تھا۔ گویا دو آدمی ایک ساتھ چل رہے تھے اور ان کے پیچھے پھر دو آدمی۔ اسی طرح تیس تیس آدمیوں کی دو قطاریں تھیں۔ قرقرہ میں پہنچ کر اسیر کی نیت بدل گئی۔ غالباً اس نے یہ سوچا ہو گا کہ اگر یہاں کچھ چھیڑ ہو گئی تو خیبر سے فوراً امدادی کمک آجائے گی اور ان تیس مسلمانوں کو ختم کر کے مسلمانوں پر ہیبت قائم کر دی جائے گی۔ اسیر نے چھیڑ خانی کے لیے اپنے ساتھ کے مسلمان عبداللہ بن انیس کی تلوار چھین لینی چاہی۔ عبداللہ بن انیس پہلے ہی سے ہوشیار تھے۔ انھوں نے اسیر سے کہا: تو ابھی سے غداری کرنے لگا؟" یہ کہہ کر انھوں نے اسیر کی ران پر ایک تلوار ماری۔ وہ گھوڑے سے گرا اور گرتے گرتے تلوار کا ایک ہاتھ مار کر عبداللہ بن انیس کو بھی زخمی کر گیا۔ پھر کیا تھا، فوراً میدان کارزار گرم ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک کے سوا سارے یہودی کھیت ہو گئے۔

صحابہ نے اس قسم کی حرکت کبھی نہیں کی تھی اور یہود پہلے ہی بارہا غداری کا عملی ثبوت دے چکے تھے۔ قرینہ یہی ہے کہ یہ اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ یہود نے پہلے ہی سے راستے میں چھیڑ کر مسلمانوں کو ختم کرنے کا پروگرام بنایا ہو گا۔

مقصد جنگ کا اعلان

اس واقعے کے بعد آنحضرتؐ نے مشورہ فرمایا۔ یہ یقینی بات تھی کہ

اسیر بن زرام نے جو فوجیں جمع کی تھیں وہ مدینے پر حملہ کرنے ہی کے لیے تھیں۔ اگر یہ چھوٹا سا معرکہ نہ بھی پیش آتا تو وہ اپنی سکیم پوری کرتا' اور اب تو دشمنوں کا حملہ اور بھی یقینی ہو گیا تھا۔ اس لیے رائے یہ قرار پائی کہ اس سیلاب کو امنڈنے سے پہلے ہی روک دیا جائے۔ اس موقعے پر اسلامی جیش کو تیار ہونے کا حکم دیا گیا اور ساتھ ہی آنحضرتؐ نے اعلان فرمایا کہ: "اس جنگ میں صرف وہی لوگ شریک ہوں جن کا مقصد صرف اعلائے کلمتہ اللہ ہے۔" یعنی حصول غنیمت یا جذبہ انتقام کی تسکین یا اور کوئی مقصد پیش نظر نہ ہو۔ اس اعلان کے مطابق اس غزوہ میں سولہ سو (۱۶۰۰) وہی مہاجرین و انصار شریک تھے جو صلح حدیبیہ کے موقعے پر بیعت رضوان میں شریک تھے۔ (ان میں سے چند رحلت کر چکے تھے) بعد میں دو سو (۲۰۰) وہ مہاجرین حبشہ بھی آکر مل گئے جو حبشہ سے واپس آتے ہوئے خیبر پہنچ گئے تھے۔

یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعلائے کلمتہ اللہ کی شرط تو تمام ہی مواقع قتال پر ضروری تھی۔ پھر آج خاص طور پر اس اعلان کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ یہ بڑا اہم سوال ہے مگر سیرت نگاروں نے اس سوال کو حل کرنے کی طرف توجہ نہیں فرمائی ہے۔ ہماری سمجھ میں جو کچھ آسکا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن پاک نے صحابہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک قبل فتح کے مسلمان اور دوسرے بعد فتح کے مسلمان۔ ارشاد ہے:

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح و قتل ؕ
اولٓئک اعظم درجہ من الذین انفقوا من بعد و قتلوا ط
و کلا وعداللہ الحسنی ط و اللہ بما تعملون خبیر ○
(الحدید ۱۰)

تم میں سے وہ جس نے قبل فتح خرچ کیا اور جنگ کی'
یکساں نہیں۔ یہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں'

جنھوں نے بعد فتح خرچ کیا اور جنگ کی' ہاں حسنیٰ کا وعدہ
اللہ نے دونوں ہی سے کیا ہے اور اللہ تمھارے اعمال سے
باخبر ہے۔

تمام مفسرین یہاں الفتح سے مراد فتح مکہ لیتے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے بالکل صحیح ہے کہ الفتح کا ظہور فتح مکہ ہی ہے۔ لیکن اگر قرآن پاک سے اس کی تفسیر تلاش کی جائے تو اس فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہوگی کیوں کہ اس صلح حدیبیہ کے بعد ہی راستے میں انا فتحنالک فتحا مبینًا نازل ہوئی۔ گویا صلح حدیبیہ ہی فتح مبین تھی' یعنی یہ آغاز تھا۔ اس کے بعد کی ساری فتوحات ——— فتح خیبر' فتح وادی القریٰ' فتح مکہ' فتح حنین' فتح اوطاس' فتح طائف ——— اسی آغاز کا انجام اور اسی مبتدا کی خبر تھیں۔ ان ساری فتوحات کا مجموعہ ہے فتح مبین۔ صرف فتح مکہ ہی فتح مبین نہیں۔ بلاشبہ فتح مکہ سب سے بڑی فتح مبین ہے اور آنحضرتؐ داخلہ مکہ کے وقت انا فتحنالک فتحًا مبینا تلاوت فرما رہے تھے۔ لیکن بعد کی تمام فتوحات بھی فتح مبین ہی میں داخل ہیں اور ان سب کا پہلا زینہ صلح حدیبیہ ہے۔ لہٰذا "قبل فتح اور بعد فتح" کی تقسیم صلح حدیبیہ ہی سے شروع ہونا قرین قیاس ہے۔

اب دیکھیے صلح حدیبیہ میں جو لوگ شامل تھے' ان ہی نے بیعت رضوان کی اور ان ہی کے لیے رضائے الٰہی کی آسمانی سند نازل ہوئی' کیوں کہ اب تک یہ مردان خدا جس جنگ میں بھی شریک ہوئے صرف اعلائے کلمتہ اللہ ہی کے لیے شریک ہوئے اور کوئی دوسری غرض ان کے پیش نظر نہ تھی۔ نہ مال غنیمت ان کے پیش نظر تھا نہ ہوس ملک گیری اور نہ کوئی اور شے۔ ان لوگوں کو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ تم صرف اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے کوچ کرو۔ یہی صورت حال ان مہاجرین حبشہ کی بھی تھی جو دو سو کی تعداد میں یہاں آکر مل گئے تھے۔ ان کا مقصد بھی بجز اعلائے کلمتہ اللہ کے اور کچھ نہ تھا۔

ان کی ہجرت حبشہ بھی اسی لیے تھی اور ہجرت مدینہ بھی۔ بخلاف اس کے جو لوگ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے تھے ان میں ابھی وہ پختگی نہ پیدا ہوئی تھی' خواہ بعد میں کتنے ہی پکے مومن ہوگئے ہوں۔ ان کے اندر حصول غنیمت یا ملک گیری یا انتقامی کارروائی کا جذبہ پیدا ہوسکتا تھا۔ اس لیے آنحضرتؐ کو یہ اعلان فرمانا پڑا کہ: "غزوہ خیبر میں صرف وہی لوگ شریک ہوں جن کا مقصد اعلائے کلمتہ اللہ کے سوا کچھ نہ ہو۔

ذرا یہاں پر غور کیجیے۔ چوبیس پچیس ہزار کی فوج کی خبر سننے کے بعد کوشش یہ ہونی چاہیے تھی کہ جتنے زیادہ سے زیادہ جنگ جو مقابلے کے لیے تیار ہوں اتنا ہی بہتر ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ صرف سولہ سو ایسے افراد اس معرکے میں شریک ہوئے جن سے زیادہ مخلص و صادق انسان چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھے۔ بتانا یہ تھا کہ اہل ایمان کا مقصد نہ جنگ ہے نہ فتوحات' نہ غنیمت نہ انتقام' نہ ملک گیری نہ کوئی اور شے۔ ان کے پیش نظر صرف اعلائے کلمتہ اللہ ہے' جسے آپ دوسرے لفظوں میں انسانی اقدار کا قیام کہہ لیجیے۔ جو رسول اتنے بڑے اعلیٰ مقصد کو لے کر اٹھا ہو وہ یہ کب گوارا کرسکتا تھا کہ اس میں وہ لوگ بھی شریک ہوں جنہیں اعلیٰ اقدار کو زندگی میں جذب کرنے کا ابھی پورا موقع میسر نہیں آیا ہے۔ اگر محض فوج کشی مقصود ہوتی تو نہ فقط ان حدیث الاسلام مسلمانوں کو بلکہ آنحضرتؐ بہت سے غیر مسلم حلیف قبیلوں کو بھی ساتھ لے سکتے تھے۔ لیکن آنحضرت کو آج واضح طور پر یہ بتانا تھا کہ مقصد جنگ صرف انسانیت کا قیام ہے۔

خیبر کے موقع پر اس اعلان کی ایک اور بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یہود بڑے دولت مند تھے۔ ان کی زمینیں بھی بہت تھیں۔ ان کے قلعے بھی بڑے بڑے تھے۔ زن' زر' زمین وغیرہ کی یہ کشش بہت سے حدیث الاسلام لوگوں کے اخلاص میں فرق ڈال کر اعلیٰ اقدار کو مجروح کرسکتی تھی۔ لہٰذا یہی صحیح موقع

تھا کہ قبل صلح حدیبیہ اور بعد از صلح حدیبیہ ——— یا یوں کہیے کہ قبل فتح، اور بعد فتح ——— میں ایک خط امتیاز کھینچ دیا جائے اور واضح طور پر عملاً مقصد قتال کی بلند قدروں کو قائم کر دیا جائے۔

خیبر کی چند اور خصوصیات

اس غزوے کی چند اور خصوصیتیں یہ بھی ہیں۔ ام المومنین ام سلمہؓ حدیبیہ میں موجود تھیں، اس لیے وہ اس غزوے میں بھی ساتھ رہیں۔ ان کے علاوہ بیس دوسری عورتیں بھی ساتھ تھیں۔ ان کی شرکت کا کیا مقصد تھا، اسے اس روایت سے سمجھنا چاہیے:

عن نجدة بن عامر حروری انه كتب الى ابن عباس هل كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يغزو بالنساء وهل كان يضرب لهن بسهم؟ .... فقال ابن عباس ...... فقد كان يغزوبهن فيد اوين الجرحى و يحذين المغنمه واما سهم فلم يضرب لهن (مسلم، ابو داؤد، ترمذی)

نجدہ بن عامر حروری نے ابن عباس کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ کیا آں حضورؐ عورتوں کی معیت میں جہاد فرماتے تھے؟ اور ان کا کوئی حصہ مقرر تھا؟...... ابن عباس نے جواب دیا کہ...... ہاں حضورؐ عورتوں کی معیت میں جہاد فرماتے تھے۔ وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور ان کو مناسب حصہ غنیمت بھی ملا کرتا تھا لیکن (مردوں کی طرح) ان کا کوئی حصہ مقرر نہ تھا۔

ایک دوسری روایت میں انسؓ سے مروی ہے کہ:

ولقد رايت عائشه وام سليم وانهما لمشمرتان ارى خدم سوقهما تنقلان القرب على متونهما ثم تفرغانه فى افواه القوم ثم ترجعان فتملان فتفرغانه فى افواههم (بخاری، مسلم)

میں نے عائشہؓ اور ام سلیمؓ کو (غزوہ احد) میں دیکھا کہ دونوں بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہی ہیں۔ ان کی پنڈلیاں اس وقت میری نگاہوں کے سامنے تھیں۔ دونوں اپنی اپنی پشت پر مشکیزے اٹھائے ادھر سے ادھر جاتیں اور لوگوں کے منہ میں پانی ڈالتیں اور پھر واپس آکر مشکیزے بھرتیں اور لوگوں کے منہ میں پانی ڈالتیں۔

گویا عورتوں کی معیت کا مقصد تھا زخمیوں کی مرہم پٹی اور پیاسوں کو پانی پلانا (اور موقع ہو تو تلوار بھی چلانا)۔

دوسری خصوصیت اس غزوے کی یہ ہے کہ اس سے پہلے غزوات میں چھوٹی جھنڈیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن اب کے تین علم (بڑے جھنڈے) تیار کیے گئے۔ ایک علم جو ام المومنین عائشہؓ کے دوپٹے سے تیار کیا گیا تھا حضرت علیؓ کو دیا گیا۔ دوسرے حباب بن منذر کو اور تیسرا اسعد بن عبادہ کو مرحمت ہوا۔

نقشہ میدان جنگ

میدان بدر کی طرح یہاں بھی حباب بن منذر ہی کی رائے سے مقام رجیع پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ یہ اس لیے کہ یہ مقام یہود خیبر اور غطفان کے درمیان میں واقع تھا۔ یہود نے غطفانیوں کو یہ لالچ دیا تھا کہ مدینہ فتح ہو جانے کے بعد خیبر کی پیداوار کا آدھا حصہ تم لوگوں کو دیا جایا کرے گا۔ غطفانی چار ہزار سپاہی لے کر خیبر کی طرف چلے لیکن انھوں نے اپنے اور یہود کے درمیان مسلمانوں کے لشکر کو حائل پایا تو انھیں خود اپنی فکر پڑ گئی اور وہ چپکے سے واپس ہو گئے اور یہود کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔

آنحضرتؐ نے ضروری سامان اور عورتوں بچوں کو ایک محافظ دستے کی نگرانی میں چھوڑ دیا اور تمام جاں نثاروں کو ساتھ لے کر خیبر کی طرف روانہ ہو گئے۔ محافظ دستے کے کیمپ کے سردار سیدنا عثمانؓ تھے۔ پیش قدمی کرنے والی

فوج کے افسر میمنہ سیدنا عمرؓ تھے۔ اور افسر میسرہ ایک دوسرے صحابی۔ مقدمتہ الجیش کی افسری جناب عکاشہ بن محسن کے سپرد تھی۔ حملہ آور دستے کی کمان جناب محمود بن مسلمہ کے ہاتھ میں تھی۔ اور کمال یہ ہے کہ افسر دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود ایک سپاہی کی حیثیت سے اسی حملہ آور دستے میں تھے۔ جس کے کمان دار سیدنا محمود بن مسلمہ تھے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے امام دوجہاں ہونے کے باوجود آنحضرتؐ نے سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی اقتدامیں بھی نماز ادا فرمائی ہے۔ یہ انداز تربیت دنیا کے ہر مصلح کے لیے اسوہ حسنہ ہے۔

الغرض یہ جیش اسلامی بڑی تیزی سے بڑھا۔ مقام صہبا میں نماز عصر ادا کی اور رات ہونے تک خیبر پہنچ گیا۔ شب کو جنگ کرنا آنحضرتؐ کے معمول کے خلاف تھا اس لیے سب لوگوں نے رات یہیں گزاری۔

ادھر یہود نے خبر ہوتے ہی جنگی تیاریاں شروع کر دیں لیکن میدان میں آکر مقابلہ کرنے کی جرات نہ ہوئی اس لیے قلعے بند ہو گئے۔ ایک قلعے میں عورتوں بچوں کو محفوظ کیا اور دوسرے میں سامان رسد مہیا کیا۔ باقی تمام یہود نے مختلف قلعوں میں داخل ہو کر اندر سے دروازے بند کر لیے۔ ان کے نو دس قلعے تھے جو تین حصوں میں یوں منقسم تھے کہ پہلا حصہ حصن نطاۃ تھا جس میں ناعم' صعب اور زبیر نامی تین قلعے تھے۔ دوسرا حصن شق تھا' اس میں براوز ابی نامی دو قلعے تھے۔ تیسرا حصن کتیبہ تھا اور اس میں وطیح' قموص اور سلالم نامی تین قلعے تھے۔

آغاز جنگ

سب سے پہلے قلعہ ناعم پر محمود بن مسلمہ نے حملہ کیا۔ چار پانچ دن جنگ ہوتی رہی۔ اس دوران میں حضرت محمود ذرا دم لینے کے لیے سایہ دیوار

میں بیٹھ گئے۔ اوپر سے کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق نے ایک چکی کا پاٹ ان کے اوپر گرا دیا اور محمود اس کے صدمے سے جاں بر نہ ہو سکے۔ ان کے بھائی محمد بن مسلمہ نے فوراً کمان سنبھال لی اور یہ قلعہ فتح ہو گیا۔

اسی رات سیدنا عمرؓ پاسبانی کر رہے تھے کہ ایک یہودی پر نظر پڑ گئی اور اسے گرفتار کر لیا۔ اسے امان دے دی گئی اور اسی نے یہ اطلاع دی کہ یہودی آج اپنی عورتوں بچوں کو قلعہ شق میں بھیج رہے ہیں اور نقد و جنس وغیرہ کو قلعہ نطاۃ میں چھپا رہے ہیں۔ نطاۃ فتح ہونے کے بعد اسی یہودی نے مسلمانوں کو وہ تہہ خانے بھی بتا دیے جہاں یہ چیزیں چھپائی گئی تھیں۔

قلعہ ناعم فتح ہونے کے بعد سیدنا حباب بن منذر نے قلعہ صعب کو محاصرے میں لے لیا اور تیسرے دن اسے فتح کر لیا۔ اس قلعے کا نام ہی بتا رہا ہے کہ اس کا فتح کرنا بے حد دشوار (صعب) تھا۔ یہاں سے روغن زیتون، چربی، کپڑے اور قلعہ شکن آلے (منجنیق) ہاتھ آئے۔ اس سے مسلمانوں کی قلت رسد کی دشواری بھی کم ہو گئی اور منجنیق قلعہ بر کو فتح کرنے میں کام آئے۔ اگلے روز حصن نطاۃ بھی فتح ہو گیا لیکن اس حصن میں قلعہ زبیر کو فتح کرنا دشوار نظر آیا کیوں کہ یہ ایک اونچے ٹیلے پر واقع تھا۔ دو روز کے بعد ایک یہودی ہی نے مسلمانوں کو بتایا کہ تم اس قلعے کو مہینہ بھر میں بھی فتح نہیں کر سکتے۔ فتح کرنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ زیر زمین نالی پر قبضہ کر لو جس کے ذریعے قلعے کے کنوؤں میں پانی کا ذخیرہ جمع ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے جب اس نالی پر قبضہ کر لیا تو یہود کھلے میدان میں باہر آکر لڑنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر جلد ہی یہ قلعہ زبیر بھی فتح ہو گیا۔

اب حباب بن منذر ——— جو ابھی قلعہ صعب کو فتح کر چکے تھے ——— قلعہ ابی کی طرف بڑھے۔ عزوان نامی ایک یہودی بہادر مقابلے کے لیے نکلا۔ جناب حباب نے پہلے ہی وار میں اس کا دایاں بازو الگ کر دیا۔ وہ

بھاگا' مگر حباب نے تعاقب کر کے اسے تلوار پر رکھ لیا۔ دوسرا بہادر مقابلے کے لیے باہر آیا۔ ایک مسلمان سپاہی کو گرا کر ختم کر دیا۔ مگر فوراً حضرت ابو دجانہ لپکے اور اس کے پاؤں کاٹ کر اسے قتل کر دیا۔ اب کسی یہودی کو آگے بڑھنے کی جرات نہ ہو سکی۔ مسلمانوں نے یہودیوں کے اس احساس مرعوبیت کو بھانپ لیا اور جناب ابو دجانہ مسلمانوں کو لے کر تکبیر کے دل ہلا دینے والے نعروں کے ساتھ جھپٹ پڑے اور ہر طرف سے دیواروں پر چڑھنے لگے۔ یہ دیکھ کر اہل قلعہ بھاگ کھڑے ہوئے اور قلعہ فتح ہو گیا۔ یہاں سے کافی مقدار میں بکریاں' کپڑے اور کچھ دوسرے سامان ہاتھ آئے۔

اس کے بعد مسلمانوں نے حصن البریر حملہ کیا۔ یہاں کے قلعہ نشینوں نے بے حد تیر اور پتھر برسائے۔ اس کے مقابلے کے لیے مسلمان وہ منجنیق لائے جو قلعہ صعب سے ہاتھ آئے تھے۔ قلعہ شکن منجنیقوں سے قلعہ بر کی دیواریں گرا دی گئیں اور مسلمانوں کی ایک یورش میں قلعہ فتح ہو گیا۔

اب قلعہ قموص (یا قمروص) کی باری آئی۔ اس کا بیس دن محاصرہ رہا۔ سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا عمرؓ نے بھی کوشش کی لیکن اندر پہنچنے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی۔ جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ باہر کوئی مقابلے کے لیے نکلا ہی نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا: "کل میں یہ علم اس کے ہاتھ میں دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کا محب بھی ہے' اور محبوب بھی۔ اللہ اس کے ہاتھ سے یہ قلعہ فتح کرا کے رہے گا۔" دوسرے دن آنحضرت نے وہ علم حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دیا۔ ان کی دکھتی ہوئی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگایا جس سے آشوب چشم کی تکلیف جاتی رہی۔

یہاں ایک بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ اس نازک موقعے پر آنحضرتؐ نے رخصت کرتے وقت سیدنا علیؓ سے فرمایا: "پہلے ان کے سامنے اسلام پیش کرنا۔ قتال کی نوبت اس کے بعد آتی ہے۔ یاد رکھو اگر ان میں سے

ایک شخص بھی اسلام قبول کر لے تو یہ نعمت سو سرخ بالوں والے اونٹوں سے بہتر ہے۔" یقین ہے کہ سیدنا علیؓ نے اس ارشاد نبوی کی حرف بہ حرف تعمیل کی ہوگی' اگرچہ سیرت نگار اس کا ذکر نہیں کرتے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ آنحضرتؐ نے دوسرے نبرد آزماؤں کو بھی ایسی ہی ہدایت فرمائی ہوگی' اور انھوں نے بھی تعمیل حکم کی ہوگی کیوں کہ یہ اعلان آنحضرتؐ نے شروع ہی میں فرما دیا تھا کہ "اس معرکے میں وہی شریک ہو جس کا مقصد صرف اعلائے کلمتہ اللہ ہو۔"

اس موقعے پر سب سے پہلے مرحب رجز پڑھتا ہوا میدان میں آیا' اور اس کے جواب میں سیدنا عامر بن اکوع رجز پڑھتے ہوئے بڑھے۔ مرحب نے ان پر وار کیا جسے انھوں نے اپنی سپر پر صاف روک لیا اور ساتھ ہی مرحب کے پاؤں پر ایک وار کیا۔ ان کی تلوار چھوٹی تھی' گھوم کر تلوار خود ان کے اپنے پاؤں پر لگی اور اس زخم سے یہ جاں بر نہ ہوسکے۔ اس کے بعد سیدنا علیؓ رجز پڑھتے ہوئے لپکے اور تلوار کا ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ تلوار اس کے خود اور سر کو چیرتی ہوئی گردن تک پہنچ گئی۔ یہ دیکھ کر مرحب کا بھائی یاسر تیزی سے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے حضرت علیؓ کی طرف لپکا' مگر ابھی راستے ہی میں تھا کہ حضرت زبیر بن عوام کا ایک بھرپور ہاتھ یاسر کے سر پر پڑا' اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اس کے بعد عام یورش ہوئی۔ سیدنا علی نے ایک ہی دھکے میں قلعے کا دروازہ توڑ کر گرا دیا اور مسلمان قلعے کے اندر گھس گئے۔ اس طرح یہ مستحکم قلعہ بھی فتح ہو گیا۔

پھر قلعہ وطیح اور قلعہ سلالم کی نوبت آئی۔ سلالم کو حصن ابن ابی الحقیق بھی کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے ان دونوں قلعوں کا محاصرہ کر لیا اور چودہ دن تک یہ محاصرہ جاری رہا۔ آخر یہاں بھی منجنیقوں کو کام میں لانے کا

ارادہ کیا گیا۔ یہود یہ دیکھ کر ڈر گئے اور صلح کی درخواست کی۔ مصالحت کے بعد یہ دونوں قلعے بھی فتح ہو گئے۔

اب صرف قلعہ شن رہ گیا۔ اس کو فتح کرنے میں کوئی مقابلہ نہ پیش آیا' کیوں کہ یہاں صرف عورتیں بچے تھے۔ بغیر کسی معرکے کے یہ قلعہ بھی آسانی سے فتح ہو گیا۔

یہ تمام فتوحات کس چیز کا نتیجہ تھیں؟ صرف صلح حدیبیہ کا۔ صلح حدیبیہ کے بعد اہل مکہ کی کوئی امداد اہل خیبر کو نہ مل سکتی تھی' کیوں کہ ایک تو یہ معاہدہ عدم جارحیت (Non - Aggression Pact) تھا اور دوسرے بیعت رضوان کے جوش و خروش نے اہل مکہ کو مرعوب کر دیا تھا اور تیسرے خود اہل مکہ میں اسلام کے اثرات تیزی سے نفوذ کر رہے تھے۔ ان تمام باتوں کے اجتماع نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین بنا دیا اور خیبر کے قلعوں کی فتح پہلی فتح مبین تھی۔ یہ فتح مبین کا آغاز تھا اور بعد کی فتوحات اسی فتح مبین کے سلسلہ دراز کی کڑیاں تھیں۔

یہود کی درخواست

خیبر کے اس پورے معرکے میں ۹۳ یہود اور ۱۵ مسلمان کام آئے۔ فتح کے بعد یہود خیبر نے آں حضرتؐ کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ خیبر کی زمینیں ان ہی کے قبضے میں رہنے دی جائیں اور وہ پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو ادا کر دیا کریں گے۔ آں حضرتؐ نے یہود کی یہ درخواست منظور فرما لی۔ اسی لفظ خیبر سے لفظ مخابرت نکلا ہے جسے مزارعت اور مساقات بھی کہتے ہیں' جس کے معنی ہیں زمین کو بٹائی پر دینا۔ فقہا میں بڑا اختلاف ہے کہ زمین کو بٹائی پر دینا جائز ہے یا نہیں' اور جائز ہے تو کن شرائط کے ساتھ جائز ہے؟ ہمارے نزدیک یہ اولی الامر کی صواب دید پر موقوف ہے۔

یہاں قدرت کا ایک کرشمہ دیکھیے۔ یہود نے غطفانیوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر خیبر کی نصف پیداوار کی شرط پر ابھارا تھا۔ مگر آج وہ یہود اسی شرط پر مسلمانوں سے صلح کی درخواست کر رہے ہیں۔

عدل کا مثالی نمونہ

خیبر میں جب بٹائی کا وقت آتا تو آں حضرتؐ عبداللہ بن رواحہ کو وہاں بھیجتے۔ عبداللہ بن رواحہ پیداوار کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے یہود سے کہتے کہ: "ان دونوں میں سے جو حصہ تم پسند کرو وہ لے لو۔" یہود یہ انصاف و تنصیف دیکھ کر کہتے کہ: "بلاشبہ زمین و آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں۔" تقسیم کا یہ انداز ایسا ہے کہ خود غرضی کی جگہ فراخ دلانہ عدل کارفرما ہوتا ہے اور کوئی باہمی جھگڑے کا موقع نہیں آسکتا۔

تقسیم غنائم اور اسوہ رسولؐ

آں حضرتؐ نے غنیمتوں کو اٹھارہ سو حصوں میں تقسیم فرمایا۔ ایک ایک حصہ تو سولہ سو پیدل فوج کو ملا۔ ان میں دو سو سوار بھی تھے جن کو ایک ایک حصہ مزید دیا گیا۔ اس طرح کل اٹھارہ سو حصے ہوئے۔ اس قسم میں جو اعلیٰ ترین انسانی قدر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ سرور دوعالمؐ نے اپنا حصہ بھی ایک معمولی سپاہی کے برابر ہی رکھا۔ آں حضرتؐ اپنے لیے جتنا چاہتے رکھ سکتے تھے اور ایک مسلمان فرد کو بھی اس میں کوئی عذر نہ ہوتا لیکن آں حضرتؐ نہ فقط عدل و مساوات کا عملی نمونہ پیش فرمانا چاہتے تھے بلکہ رہتی دنیا تک ہر مصلح قوم کے لیے ایک اسوہ عمل بھی چھوڑنا چاہتے تھے۔ یہی تو ہیں وہ اعلیٰ انسانی اقدار جن کے لیے رسالت کی ساری تگ و دو ہو رہی تھی۔

آں حضرتؐ نے جو غنیمت تقسیم فرمائی وہ کل غنیمت کا نصف حصہ تھی۔ بقیہ نصف کو وفود کی میزبانی' ناگہانی ضروریات اور دیگر مصالح امت کے

لیے محفوظ فرما دیا۔ ہر سٹیٹ کے لیے ایسے فنڈ ضروری ہوتے ہیں جو سٹیٹ کی اجتماعی ضروریات کے کام آئیں اور عین وقت پر دشواریوں کا سامنا نہ ہو۔

سیدنا عمرؓ نے اپنا حصہ کار خیر کے لیے وقف کر دیا اور یہ اسلام میں پہلا وقف تھا۔

غطفانیوں پر نظر کرم

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ یہود خیبر نے غطفانیوں کو نصف پیداوار خیبر کی شرط پر مسلمانوں کے خلاف ابھارا تھا اور یہ چار ہزار فوج لے کر خیبر کی طرف چل بھی پڑے تھے' اور اگر یہ رجیع میں مسلمانوں کو حائل نہ پاتے تو یہود خیبر کی مدد کو پہنچ بھی جاتے۔ ظاہر ہے کہ یہ غطفانی مجبوراً" واپس گئے اور براہ راست مسلمانوں سے لڑنے کی جرات نہ کر سکے۔ انھوں نے مسلمانوں سے جنگ نہ کر کے مسلمانوں پر کوئی احسان نہ کیا تھا بلکہ خود اپنے اوپر احسان کیا تھا' اور کم سے کم اتنی بات تو یقینی تھی کہ یہود کی حمایت میں مسلمانوں پر مدینے پہنچ کر حملہ کرنے کے لیے آمادہ ہو جانا اور مسلمانوں کی آمد سن کر چار ہزار آدمیوں کو لے کر یہود کی امداد کے لیے چل پڑنا بجائے خود ایک قابل سزا اقدام تھا' ورنہ کم از کم یہ کسی انعام کے مستحق تو ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ لیکن آں حضرتؐ جن اقدار کو قائم کرنے کے لیے آئے تھے' ان میں صرف عدل ہی نہ تھا بلکہ تقاضائے رحمت ہر چیز پر غالب تھا' اور تقاضائے رحمت میں انتقامی کاروائیوں کی گنجائش کہاں رہتی ہے؟

یہ غطفانی آں حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ: "ہم لوگوں نے اس جنگ میں یہود کا ساتھ نہیں دیا اس لیے غنیمت میں کچھ حصہ ہمارا بھی ہونا چاہیے۔" —— ظاہر ہے کہ صرف دشمن کا ساتھ نہ دینا کسی انعام کا حق دار نہیں بناتا۔ قانون عدل کے مطابق غنیمت کے مستحق وہ ہوتے

ہیں جو جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں یا کم سے کم وہ پہلے مسلمانوں سے مل کر انعام کے وعدے پر دشمن کا ساتھ نہ دینے کا عہد کریں۔ یہاں ایسی کوئی بات نہ تھی اور قانونی لحاظ سے یہ کسی انعام کے مستحق نہ ہوسکتے تھے' جب کہ دشمن کا ساتھ دینے کے لیے گھروں سے چل بھی پڑے تھے۔ لیکن رحمتہ للعالمین ؐ کے در سے سوالی خالی ہاتھ لے کر کیسے واپس جاسکتا تھا۔ آں حضرتؐ نے ان کی درخواست منظور فرمالی اور ذوالرقیبہ کا پہاڑی علاقہ انھیں دے دیا۔ دراصل تالیف قلب بھی ایسی اخلاقی قدر ہے جسے کوئی ریاست نظر انداز نہیں کرسکتی۔ خود قرآن نے بھی مال صدقات میں مولفہ القلوب کا حصہ رکھا ہے۔ اس کے خوش گوار نتائج دور رس ہوتے ہیں' فوری نہیں ہوتے۔

جعفر بن ابی طالبؓ کی آمد

آں حضرتؐ ابھی خیبر ہی میں تھے کہ حبشہ سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ آکر مل گئے۔ انھوں نے حبشہ میں جو اسلامی خدمات انجام دیں ان کا حال آپ ہجرت حبشہ کے بیان میں پڑھ چکے ہیں۔ ان کی آمد کی آں حضرتؐ کو بے حد خوشی ہوئی۔ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ: ''میں نہیں بتا سکتا کہ مجھے فتح خیبر کی خوشی زیادہ ہوئی یا آمد جعفر کی۔''

نکاح ام المومنین صفیہؓ

سیدہ صفیہؓ سیدنا ہارونؑ کی نسل سے تھیں اور اس حی بن اخطب کی دختر تھیں جو اسلام اور اہل اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ جناب صفیہؓ قلعہ قموص کے قیدیوں میں آئی تھیں اور بحیثیت قیدی کنیز کے حضرت وحیہ کلبی کے حصے میں آئی تھیں۔ بعض صحابہ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ: ''یہ بنو نضیر کے سردار کی بیٹی ہیں' ان کے ساتھ عام قیدیوں کا سلوک نہیں ہونا چاہیے۔'' وحیہؓ نے انھیں آں حضرتؐ کے سپرد کیا۔ آں حضرتؐ نے انھیں آزاد کردیا۔ اس کے

بعد ان کی مرضی سے نکاح فرمالیا۔ وہ قید ہو کر نہ آتیں جب بھی، اور وحیہ کلبی کے پاس رہتیں جب بھی، آج انھیں کون جانتا؟ مگر آں حضرتؐ نے نہ فقط عورتوں ہی کا درجہ بلند فرمایا بلکہ ایک دشمن دین کی بیٹی کو یہ درجہ مرحمت فرمایا کہ وہ ام المومنینؓ اور زندہ جاوید شخصیت بن گئی۔ آں حضرتؐ کی خدمت میں انھیں جو دولت ایمان نصیب ہوئی، اس لافانی مسرت کو صفیہؓ ہی بتا سکتی ہیں۔ باپ (حی بن اخطب) زندہ ہوتا تو صفیہؓ اللہ جانے کتنی بار اسے اپنے مقدس شوہر کے قدموں پر قربان کر دیتیں۔

اس مبارک نکاح کے بعد یہود سے آں حضرتؐ کی مصاہرت قائم ہوگئی اور ان تک آواز اسلام کے پہنچنے کے ذرائع آسان و وسیع ہوگئے۔ مغلوبیت نے سیاسی طور پر اور اس نکاح نے معاشرتی و اخلاقی طور پر یہ نتیجہ پیدا کیا کہ اس کے بعد پھر کبھی یہود کا کوئی فتنہ سر نہ اٹھا سکا۔

ارادہ قتل کے بعد درگزر

اجتماعی طور پر تو یہود پھر نہ اٹھے لیکن انفرادی طور پر یہ شرارتیں کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ ایک دن ایک یہودیہ زینب بنت حارث نے آں حضرتؐ کی خدمت میں بھنا ہوا گوشت زہر ہلاہل ملا کر بھیجا۔ اس وقت آں حضرتؐ خیبر ہی میں تشریف فرما تھے۔ آں حضرتؐ نے گوشت کا پہلا ہی لقمہ چکھ کر تھوک دیا اور فرمایا کہ: ”یہ گوشت بتاتا ہے کہ زہر ملا ہوا ہے۔“ اس وقت حضرت بشیر بن برا بن معرور بھی آں حضرتؐ کے ساتھ کھانے میں شریک تھے۔ جب آں حضرتؐ نے اپنا پہلا لقمہ اگل دیا تو عرض کیا: ”یا رسولؐ اللہ! لقمہ مجھے بھی بدمزہ معلوم ہوا تھا لیکن چبائے ہوئے لقمے کو حضورؐ کے سامنے تھوکنا خلاف ادب تھا۔ اس لیے میں اسے نگل گیا۔“ زینب سے باز پرس ہوئی تو اس نے اقرار جرم کرتے ہوئے اپنا بیان دیا کہ: ”میں نے یہ حرکت اس لیے کی تھی کہ اگر آپ

نبی ہیں تو آپ کو اس کا حال معلوم ہو جائے گا اور اگر آپ نبی نہیں ہیں تو آپ کا ختم ہو جانا ہی مناسب ہے۔" آں حضرتؐ نے زینب سے کوئی انتقام نہ لیا حالاں کہ عرصہ دراز تک زہر کی تکلیف محسوس فرماتے رہے۔ لیکن جب حضرت بشیرؓ نے اسی زہر سے انتقال فرمایا تو ان کے قصاص میں زینب کو قتل کر دیا گیا۔ اور کنانہ ابن ربیع کو بھی جس نے چکی کا پاٹ گرا کر حضرت محمود بن مسلمہ کو شہید کیا تھا' قصاص میں محمد بن مسلمہ نے قتل کیا۔

غزوہ وادی القریٰ

خیبر سے فارغ ہو کر آں حضرتؐ وادی القریٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ جگہ تیما اور خیبر کے درمیان واقع ہے۔ یہاں جب اہل اسلام پہنچے تو یہاں کے یہودیوں نے کوئی گفت و شنید کیے بغیر ہی تیر اندازی شروع کر دی۔ آں حضرتؐ کے ایک خادم مدعمؓ اونٹ سے محمل اتارتے ہوئے ایک تیر کھا کر جاں بحق ہوئے۔ جب اہل اسلام نے حملے سے اس کا جواب دیا تو تھوڑے مقابلے کے بعد یہ لوگ گفتگوئے مصالحت پر مجبور ہوگئے اور نصف پیداوار ادا کرنے پر اسی طرح صلح کر لی جس طرح اہل خیبر نے کی تھی۔

فتح فدک

وادی القریٰ سے متصل ہی یہود کا ایک اور مسکن تھا جس کا نام ہے فدک۔ انھوں نے جب فتح خیبر کا حال سنا تو مقابلے کا ارادہ ہی ترک کر دیا' اور آنحضرتؐ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ: "ہماری جانوں کو محفوظ رہنے دیا جائے اور اس کے عوض میں ہمارا تمام مال و اسباب لے لیا جائے۔" آں حضرتؐ نے اسے منظور فرما لیا۔

جو کچھ دشمن سے جنگ کیے بغیر حاصل ہو' اسے قرآنی اصطلاح میں فے کہتے ہیں۔ قرآن پاک نے ایسی جائدادوں کا مصرف بھی بتا دیا ہے:

ما آفاء اللّٰہ علٰی رسولہ من اھل القرٰی فللّٰہ
اللہ نے اپنے رسول کو جو کچھ ان اہل آبادی سے دلوایا وہ اللہ یعنی بیت المال کا ہے۔

(الف) وللرسول رسول کے لیے ہے (اور بعد از رسولؐ سربراہ ریاست کے لیے)۔

(ب) ولذی القربی (سربراہ ریاست کے قرابت داروں کے لیے۔

(ج) والیتمی یتیموں کے لیے۔

(د) والمسکین مسکینوں کے لیے۔

(ہ) وابن السبیل.... (الحشر:۷) مسافر کے لیے۔

(و) للفقراء المھجرین.... (الحشر:۸) حاجت مند مہاجرین کے لیے۔

(ز) والذین تبوؤ الدار والایمان من قبلھم (الحشر:۹)
جو ان مہاجرین کی ہجرت سے پہلے ہی ایمان لا کر مدینے میں مقیم ہو گئے۔ یعنی انصار کے لیے۔

(ح) والذین جاء ومن بعدھم.... (الحشر:۱۰) جو لوگ ان کے بعد آئیں ان کے لیے۔

جو کچھ جنگ کے بعد دشمن سے حاصل ہو' اسے غنیمت کہتے ہیں اور اس کا مصرف یہ بتایا گیا ہے:

واعلموا انما غنمتم من شئی فان للّٰہ خمسہ
جو کچھ تمھیں غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے یعنی حکومت اسلامیہ کے بیت المال کے لیے ہے (باقی مجاہدین کے لیے)۔

(الف) وللرسول اور (اس پانچویں میں سے ایک حصہ) رسول

کے لیے' (اور بعد از رسول سربراہ حکومت کے لیے)

(ب) ولذی القربی اور قرابت داروں کے لیے۔

(ج) والیتمی اور یتیموں کے لیے۔

(د) والمسکین اور مسکینوں کے لیے۔

(ہ) وابن السبیل (الانفال:۴۱) اور مسافر کے لیے۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک بعد از رسولؐ' رسولؐ کا حصہ' اور قرابت دار رسولؐ کا حصہ یتامٰی' مساکین اور ابن السبیل پر صرف کیا جائے گا۔ لیکن ہماری ناچیز رائے میں رسولؐ کے بعد جو بھی رسولؐ کے مشن کو چلانے کی ذمے داری لے گا وہی حصہ رسول پانے کا حق دار ہوگا اور اس کے قرابت داروں کے لیے وہی حصہ ہوگا جو قرابت داران رسول کے لیے تھا' کیوں کہ سربراہ مملکت کی صرف اپنی ذاتی ہی ضرورتیں نہیں ہوتیں' اس کے بال بچے وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ ہاں اگر مملکت کوئی دوسرا متبادل انتظام کر دے تو پھر امام اعظم کے مسلک پر عمل ہوگا' یعنی سب کچھ سٹیٹ کی ملکیت ہوگا اور سٹیٹ ہر فرد مملکت کی ضروریات کی ذمہ دار ہوگی۔ سربراہ مملکت بھی تمام افراد مملکت کی طرح ایک غیر ممتاز فرد ہوگا اور وہ بھی عام لوگوں کی طرح —— جن میں یتامٰی' مساکین' مسافر وغیرہ سب داخل ہیں —— ایک فرد مملکت ہوگا۔

خمس غنیمت اور فے کے متعلق جو للّٰہ وللرسول کہا گیا ہے' اس سے مراد رسولؐ کی ملکیت نہیں۔ آں حضرتؐ نے نہ اپنی کوئی جائداد بنائی اور نہ اس لیے آں حضرتؐ دنیا میں تشریف لائے تھے۔ آں حضرتؐ چوں کہ خدا کا کام کر رہے تھے' اس لیے خدا نے آپؐ کے اور آپؐ کے اہل و عیال کے لیے خمس غنیمت اور فے کو "خالصہ" قرار دیا۔ آں حضرتؐ کے بعد یہ خالصہ بطور وراثت تقسیم نہیں ہوگا بلکہ یہ اس کے مصرف میں آئے گا جو آں حضرتؐ کے بعد اسلامی نظام کو چلانے کی ذمہ داری لے اور اپنے تمام وقت کو اور ساری

قوتوں کو اسی مقصد کے لیے وقف کر دے اور اس کے پاس کوئی وقت اپنے یا اہل و عیال کے معاشی سہارے کے لیے نہ رہے۔ اگر کسی گورنر سے یہ کہہ دیا جائے کہ فلاں گاؤں کی آمدنی سے اپنا گزارہ کرو تو وہ گاؤں اس گورنر کی ملکیت نہیں بن جائے گا' اور وہ اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں میں تقسیم نہیں ہو گا بلکہ جب تک وہ گورنر ہے اس گاؤں کی آمدنی کو مصرف میں لائے گا اور جب اپنے عہدے سے سبک دوش ہو گا تو اس گاؤں کی آمدنی سے وہ فائدہ اٹھائے گا جو اس کی جگہ گورنر بن کر آئے' اور اگر اس گاؤں کی آمدنی کی بجائے کوئی اور روزینہ یا تنخواہ یا الاؤنس ریاست کی طرف سے مقرر ہو جائے تو گاؤں کی آمدنی ریاست کے دوسرے مصارف میں صرف ہو گی۔

ہمارے عقیدے میں تو سارا جہان ہی محمدؐ رسول اللہ کا ہے اور امت کے پاس جو کچھ ہے وہ سب آنحضرتؐ ہی کا ہے' لیکن اسے فراموش نہ کرنا چاہیے کہ حضورؐ کے پاس جو کچھ ہے وہ ساری امت کا ہے' چند مخصوص افراد کا نہیں۔ ذاتی ملکیت کے گھٹیا تصور اور خاندان کے لیے جائداد بنانے کے پست رجحان سے سید عالمؐ کی ذات اقدس بلند' بہت بلند' ارفع اور بے حد ارفع ہے۔ آں حضرتؐ کسی کے معاشی سہارے کے لیے اگر کوئی جائداد چھوڑ جاتے تو سب سے پہلے اپنی ازواج مطہرات کے لیے چھوڑتے' اس لیے کہ عقد ثانی ازروئے قرآن ان کے لیے حرام تھا اور ان کی گزر اوقات کا اور کوئی سہارا موجود نہ تھا۔ آں حضرتؐ اپنی بیوی بچوں کے لیے جائداد بنانے کا کوئی ادنیٰ تصور بھی نہ رکھ سکتے تھے۔ ہاں ایک ایسی مثالی مملکت اور ایسے پاکیزہ معاشرے کی بنیاد رکھ گئے جو ہر فرد کی ضروریات زندگی کی ذمے دار تھی۔ خواہ بیوی ہو یا اولاد' رشتے دار ہوں یا غیر رشتے دار' بڑے ہوں یا چھوٹے' عورتیں ہوں یا مرد' مسلم ہوں یا غیر مسلم' خود سربراہ ہو یا رعایا' اس مملکت میں جو بھی تھا اس کی ساری ذمے داریاں مملکت کے کاندھے پر تھیں۔ ذرا سوچیے کہ ایک ایسی مثالی مملکت میں

بال بچوں کے لیے جائداد بنانے کا کام خواہ کسی اور کے لیے زیب دے مگر محمد رسولؐ اللہ کے لیے تو تصور میں بھی نہیں آتا۔ اگر سربراہ بننے سے پہلے کسی نے کچھ پیدا کیا ہو تو وہ اس کی ملکیت ہو سکتا ہے، لیکن سربراہ بننے کے بعد اسے اپنے لیے کچھ پیدا کرنے کی نہ مہلت مل سکتی ہے اور نہ اسے اس کا حق رہتا ہے۔ اس کا سارا وقت اور تمام صلاحیتیں مملکت کے لیے مختص ہو جاتی ہیں اور مملکت اس کی ضروریات کی ذمے دار ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جو سربراہ ہوگا اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا۔ سرورِ دو عالمؐ نے یہی مثال قائم فرمائی اور خلفائے راشدینؓ نے اسی سنت کی پیروی کی۔

ادائے عمرہ

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ صلح حدیبیہ ۶ھ کے مطابق چودہ سو مسلمان حدیبیہ سے واپس آگئے تھے اور آئندہ سال انھیں ادائے عمرہ کی اجازت دی گئی تھی۔ اب فتح خیبر سے واپس ہونے کے بعد آں حضرتؐ نے اعلان فرما دیا کہ: "تمام وہ لوگ جو صلح حدیبیہ میں موجود تھے خصوصاً" اور دوسرے مسلمان عموماً ادائے عمرہ کے لیے سفر کی تیاری کریں۔" چنانچہ ذوقعدہ ۷ھ میں دو ہزار مسلمان آں حضرتؐ کی معیت میں مکے کی سمت روانہ ہوگئے۔ مکے سے آٹھ میل کے فاصلے پر ایک جگہ بطن یا جج میں تمام اسلحہ رکھ دیے گئے، اور دو سو سواروں کا دستہ حفاظت اسلحہ کے لیے یہاں متعین کر دیا گیا۔ عربوں کا یہ عام دستور ہی تھا کہ ہتھیاروں کے بغیر کہیں سفر نہیں کرتے تھے۔ اس عادت کے علاوہ بھی مسلمانوں کو ہر وقت چوکس اور ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔ بطن یا جج میں آٹھ میل کے فاصلے پر ہتھیاروں کو سوار دستے کی حفاظت میں اس لیے بھی رکھ دیا گیا ہوگا کہ خدانخواستہ اگر اہل مکہ اپنے معاہدے کے خلاف چھیڑ چھاڑ کریں، اور دفاع کی نوبت مجبوراً" آ جائے تو نہتے ہونے کی وجہ سے مسلمان مار نہ

کھائیں بلکہ ایک آواز میں بطن یا جج سے اسلحہ پہنچ جائیں۔

اس کے بعد اہل اسلام اپنی دبی ہوئی آرزوئیں لیے مکے میں داخل ہوئے۔ آں حضرتؐ کی اونٹنی کی مہار عبداللہ بن رواحہ تھامے ہوئے تھے اور خوشی سے رجز پڑھتے جاتے تھے۔ معاہدہ حدیبیہ کے مطابق کسی مسلمان کے پاس تلوار کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ تھا۔ تلواریں بھی نیام میں اور نیام تھیلوں میں۔ اہل مکہ نے اپنے عہد کے مطابق مکہ خالی کر دیا تھا اور جبل بو قبیس پر چڑھ کر اہل اسلام کے عمرے کا نظارہ کرتے رہے۔ مسلمان خیبر سے فارغ ہو کر آئے تھے۔ پھر یہ طویل سفر طے کیا تھا۔ علاوہ ازیں یہ آسودہ حال بھی نہ تھا۔ پیہم ریاضتوں' اور جہادوں میں مصروف رہتے' اس لیے ان کے چہروں پر وہ شگفتگی نہ تھی جو خانہ نشین آرام طلب اور عیش پسند لوگوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔ ان کے معصوم چہروں پر طہارت و تقوے کے جو آثار' ایمان و عمل کے جو انوار برس رہے تھے' وہ ان بے بصیرت اہل مکہ کو کہاں سے نظر آ سکتے تھے؟ انھیں اہل اسلام کے تن و توش نظر نہ آئے تو سمجھے مسلمانوں کو مدینے کی آب و ہوا نے کم زور کر دیا ہے۔ آنحضرتؐ نے ان کے اس وہم کو محسوس فرما لیا اور حکم دیا کہ: "تمام مسلمان پہلے تین طوافوں میں دبدبے اور شان کے ساتھ مونڈھوں کو جنبش دیتے ہوئے دوڑیں۔" اس طریق کو رمل کہتے ہیں اور یہ سنت آج تک جاری ہے۔

تین دن پورے ہوتے ہی قریش نے حضرت علیؓ کی معرفت کہلا بھیجا کہ معاہدے کی رو سے اب مسلمانوں کو واپس جانا چاہیے۔ آں حضرتؐ نے فوراً کوچ کا حکم دیا اور مسلمان واپس ہو گئے۔ اہل مکہ نے جب واپس آ کر اپنے گھروں کو دیکھا تو حیرت سے ان کے منہ کھلے رہ گئے کیوں کہ کسی کا ایک تنکا ادھر سے ادھر نہیں ہوا تھا اور کسی کا کوئی ادنیٰ نقصان بھی نہیں ہوا تھا۔ یہی تو ہیں وہ اخلاقی اقدار جن کے بقا و تحفظ کے لیے آنحضرتؐ مبعوث ہوئے تھے۔

اگر صحابہ میں اتنی بات بھی پیدا نہ ہوئی ہوتی تو محض عمرہ و حج سے کیا ہو سکتا تھا؟

دختر کشی اور دختر پروری

بعض عرب لڑکی کی پیدائش کو اپنے لیے ننگ تصور کرتے تھے اور اس ننھی سی معصوم جان کی ولادت سے اس درجے کبیدہ خاطر ہوتے تھے کہ زمین میں گڑھا کھود کر اسے زندہ دبا دیتے تھے اور اسے ظلم نہیں بلکہ نشان عزت و فخر سمجھتے تھے۔ آج کے مہذب دور میں ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور یقین نہیں آسکتا کہ کیا باپ اپنی لخت جگر کے ساتھ ایسی انسانیت سوز اور اخلاق کش حرکت بھی کر سکتا ہے۔ لیکن احادیث میں اس کے واقعات موجود ہیں اور خود قرآن پاک نے اس کا ذکر یوں کیا ہے:

> واذا بشر احد هم بالانثى ظل وجهه مسودا و هو کظیم ○ یتواری من القوم من سوء مابشربه ط ایمسکه علی هون ام یدسه فی التراب ط الا ساء ما یحکمون ○ (النحل: ۵۸'۵۹)
>
> ان میں سے کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر سیاہی دوڑنے لگتی ہے اور اندر اندر گھٹنے لگتا ہے' اس خوش خبری سے اسے جو کبیدگی ہوتی ہے' اسے یہ لوگوں سے مخفی رکھنا چاہتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس ذلت کو اٹھائے پھرے یا اسے پیوند خاک کر دے۔ سن لو ان کے منصوبے بہت برے ہیں۔

ایسی عجیب قوم میں صحیح انسانی اقدار کو قائم کرنے کے لیے رحمت للعالمین ؐ مبعوث ہوتے ہیں۔ دیکھیے وہ انسانیت کش ذہنیت میں کیا انقلاب پیدا کرتے ہیں۔

آں حضرتؐ مکے سے چلنے لگتے ہیں تو سیدنا امیر حمزہؓ (سید الشہدا) کی کم سن صاحب زادی جناب امامہؓ جو ہنوز مکے میں تھیں "چچا چچا" کہتی ہوئی آں حضرتؐ کے پاس دوڑ کر آئیں۔ سیدنا علیؓ نے گود میں اٹھا لیا۔ سیدنا زید بن حارثہ اور سیدنا جعفر بن ابی طالب بھی موجود تھے۔ جھگڑا یہ ہوا کہ اس یتیم بچی کی پرورش کا ذمہ کون لے؟ ان تینوں نے اپنا اپنا حق جتانا شروع کیا۔ علیؓ نے کہا: "یہ سب سے پہلے میرے پاس آئی ہے اور یہ میری چچا زاد بہن بھی ہے۔" زید نے اپنا دعویٰ یوں پیش کیا کہ: "حمزہؓ میرے دینی بھائی تھے' اس لیے میں بھی امامہ کا چچا ہوں۔" جعفر نے اپنا حق یوں جتایا کہ: "حمزہؓ تو میرے بھی دینی بھائی تھے اور اس یتیمہ کی خالہ میرے گھر ہے۔" آں حضرتؐ نے تینوں کے دعووں کو برابر کا درجہ دیا اور فرمایا: "خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔" اس کے بعد امامہ کو جناب اسماءؓ کے حوالے کر دیا۔

ہم جانتے ہیں کہ جعفرؓ' علیؓ اور زیدؓ کا کوئی تعلق دختر کش طبقے سے نہ تھا' لیکن قبل از اسلام لڑکیوں پر ایسا مہربان بھی کون تھا؟ دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ جس قوم میں دختر کشی کی عادت باعث افتخار ہو' اسی قوم کے افراد میں تعلیم رسولؐ کی بدولت یہ اخلاقی قدریں پیدا ہو گئیں کہ اپنی نہیں بلکہ دوسروں کی لڑکی کے لیے جھگڑے ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنا اپنا حق پرورش جتاتا ہے۔ اس چھوٹے سے واقعے سے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ نبوی تربیت نے اس امت کی نگاہوں میں انسانی خون کی کیا قدر وقیمت پیدا کر دی ہوگی۔ ساری انسانی قدروں کا نقطہ آغاز یہی ہے کہ انسان پہلے انسان کی قدر پہچانے۔ انسان' دوسرے انسان کے ساتھ بے رحمانہ اور غیر انسانی برتاؤ اسی وقت کرتا ہے جب وہ اسے محض حیوانی سطح پر رکھ کر دیکھتا ہے۔

❋ ❋ ❋

(۲۲)

۸ ہجری ——— غزوۂ موتہ

یہ ایک معرکہ ہے جو عرب سے باہر بمقام موتہ عیسائیوں کے خلاف پیش آیا تھا۔ چوں کہ اس میں بظاہر مسلمانوں کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی اس لیے سیرت نگار بھی اسے سرسری واقعے کی طرح لکھ دیتے ہیں' حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح صلح حدیبیہ عرب کی تمام فتوحات کا پیش خیمہ تھی اسی طرح غزوہ موتہ بھی رومیوں کے مقابلے میں آئندہ کی تمام کامیابیوں کا ضامن ہوا۔ قیصری قوت کتنی ہے؟ اس کا طریقہ جنگ کیا ہے؟ ان سے کس طرح کامیاب مقابلہ کیا جاسکتا ہے؟ ان تمام باتوں کا اندازہ غزوہ موتہ ہی سے ہو گیا اور یہی تجربہ رومیوں کے مقابلے میں آئندہ کام آیا۔ ایک بڑا فائدہ اس سے یہ بھی ہوا کہ خود رومیوں کو بھی اہل اسلام کے سرفروشانہ جذبے کا اندازہ ہو گیا اور وہ مسلمانوں پر جو کبھی جارحانہ حملہ کرنے کا ارادہ کرسکتے تھے' اس میں کم زوری پیدا ہو گئی۔ اس سے ایک اور اندرونی فائدہ بھی ہوا کہ مسلمانوں کے یہ بڑھتے ہوئے حوصلے دیکھ کر اندرون عرب بھی ایک ہیبت طاری ہو گئی اور جو باغیانہ و غدارانہ فتنے سر اٹھا سکتے تھے ان کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ غرض جنگ موتہ محض ایک سرسری سی جنگ نہ تھی بلکہ اس سے بے شمار سیاسی فائدے ہوئے اور یہی آئندہ کام آئے۔

اہل اسلام کا یہ اقدام بلاوجہ نہیں ہوا تھا' بلکہ جیسا کہ آپ اوپر پڑھ

چکے ہیں جہاں مختلف فرماں رواؤں کو دعوت اسلام دی گئی تھی' وہاں بصریٰ کے حاکم کو بھی ایک دعوت نامہ بھیجا گیا تھا جو حضرت حارث بن عمیر ازدی لے کر گئے تھے۔ حارثؓ کو شرجیل بن عمرو نے قتل کر دیا۔ شرجیل عربی النسل عیسائی تھا اور رومی حکومت کی طرف سے علاقہ بلقا کا حکمران تھا۔ آں حضرتؐ کو حارث کے قتل کیے جانے کا بڑا صدمہ ہوا۔ یہ صدمہ محض اس لیے نہ تھا کہ اپنا ایک آدمی مارا گیا بلکہ کسی سفیر کے ساتھ برے برتاؤ کو آں حضرتؐ انتہائی اخلاق سوز حرکت تصور فرماتے تھے۔ سفیر تو مملکت کا ایک نمائندہ ہوتا ہے' اس کے ساتھ غیر انسانی سلوک پوری مملکت کے لیے چیلنج کا حکم رکھتا ہے۔ احترام آدم تو اپنی جگہ ہے ہی' سفیر کا احترام اس سے بھی زیادہ ضروری ہے اور اگر سفیروں کے ساتھ غیر شریفانہ برتاؤ ہوا کرے تو حکومتوں کی باہمی خوش اعتمادی ختم ہو جائے اور دنیا کا نظام امن درہم برہم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آں حضرتؐ نے آخری حین حیات میں جو چند وصیتیں فرمائیں ان میں ایک وصیت یہ بھی تھی کہ: ''وفود اور سفرا کے ساتھ اسی طرح حسن سلوک ہوتا رہے جس طرح میں کرتا ہوں۔'' آں حضرتؐ کسی وفد یا سفیر کے ساتھ بے احترامی کو انتہائی غداری اور انسانیت سوز حرکت تصور فرماتے تھے۔ سفیر نہ فقط ایک واجب الاحترام انسان ہے بلکہ وہ ایک مہمان بھی ہوتا ہے اور اس کی حیثیت ایک پیغام رساں کی ہوتی ہے۔ وہ تن تنہا لڑنے کے لیے نہیں آتا۔ اس کی بے حرمتی ہی نہیں بلکہ اسے قتل بھی کرنا نہ تو سیاست کی نگاہ میں قابل معافی جرم ہے نہ اخلاق کی نظر میں۔ یہ آپ اوپر بھی کئی مواقع پر پڑھ چکے ہیں کہ آں حضرتؐ اس قسم کی امن شکن اور اخلاق سوز کارروائی کو ختم کر کے انسانی اقدار کو قائم فرمانا چاہتے تھے۔

صلح حدیبیہ نے قریش مکہ کی طرف سے مطمئن کر دیا تھا اور فتح خیبر کے بعد یہود کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ آں حضرتؐ نے حارث بن عمیر ازدی کے قصاص

کے لیے تین ہزار مسلمانوں کی ایک فوج تیار کی۔ اس میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ موجود تھے۔ آں حضرتؐ کے عم زاد بھائی سیدنا جعفر بن ابی طالب موجود تھے جو حبشہ کے مہاجرین اولین میں تھے اور حبشہ میں تبلیغ اسلام کی بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ سیدنا عبداللہ بن رواحہ بھی موجود تھے۔ جن کی شخصیت اور اسلامی اور فوجی خدمات کا ذکر آپ گزشتہ صفحات میں کئی موقعوں پر پڑھ چکے ہیں۔ لیکن اس اسلامی جیش کی سرداری کس کے سپرد کی گئی؟ اس کے لیے آں حضرتؐ نے اپنے مولیٰ یعنی آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کو منتخب فرمایا۔ آں حضرتؐ نے جو سب سے بڑی عادلانہ قدر قائم فرمائی وہ اخوت و مساوات انسانی ہے۔ محض وعظ نہیں فرمایا بلکہ عملاً" غلاموں کو آقائی بخشی۔ گرتوں کو سہارا دیا۔ انسانی بلندی کا معیار صرف کردار تقوے اور صلاحیت کو قرار دیا۔ دولت' خاندان' وطن' رنگ' زبان اور پیشے نے انسانوں میں جو پست و بلند کی تفریق پیدا کر رکھی تھی اسے مٹا دیا۔ ان غلط بنیادوں پر جو پست تھے انھیں بلند کیا اور جو بلند تھے انھیں پست کیا اور اس طرح بنی آدم کو قانون کی نگاہ میں ایک سطح پر کھڑا کر دیا:

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندہ بے ساز و برگ

آں حضرتؐ کے اس انتخاب پر بعض لوگوں نے چہ می گوئیاں بھی کیں' لیکن آں حضرتؐ نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور زید ہی کو سردار لشکر رکھا۔ آں حضرتؐ نے اس جیش کو رخصت کرتے وقت چند ہدایات دیں۔

"ان کے سامنے پہلے اسلام پیش کرو۔ اگر وہ جزیے پر مصالحت کر لیں تو ان سے جنگ نہ کرو' جو لڑنا نہ چاہیں ان سے بھی جنگ نہ کرو۔ فوج پہلے وہاں جائے جہاں حارث بن عمیر کو قتل کیا گیا ہے۔ اگر سردار لشکر زید بن حارثہ جنگ میں کام آجائیں تو جعفر بن ابی طالب کے ہاتھ میں کمان دی جائے۔ اگر وہ بھی

کام آجائیں تو عبداللہ بن رواحہ کو قائد لشکر بنایا جائے۔ اگر وہ بھی رخصت ہو جائیں تو جسے مناسب سمجھو اپنا امیر جیش بنا لو۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے پیش آنے والا پورا نقشہ جنگ آں حضرتؐ کی دوربین نگاہوں کے سامنے موجود تھا۔ گویا ان تینوں کمان داروں کی شہادت کی خبر دے رہے تھے اور چوتھے امیر جیش کے متعلق خاموشی کا مطلب یہ نہ تھا کہ یہ جنگ میں کام نہ آئے گا۔ ایک پیغمبر کے سامنے سے حجابات کا کسی وقت اٹھ جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ بسا اوقات مستقبل آئینے کی طرح حال بن کر اس کے سامنے آجاتا ہے۔

جمادی الاولیٰ ۸ھ میں یہ اسلامی جیش مدینے سے روانہ ہوا۔ آں حضرتؐ نے ثنیتہ الوداع تک اس کی مشایعت فرمائی۔ جاں نثاروں کی یہ جماعت جب معادن پہنچی تو اطلاع ملی کہ سرحد بلقا ماب یا موآب میں ایک لاکھ رومی فوج مقابلے کے لیے تیار ہو کر آ پہنچی ہے۔ دراصل اس جیش اسلامی کی روانگی کے وقت ہی رومی جاسوسوں نے قیصر روم کو خبر پہنچا دی تھی۔ رومی لشکر میں عربی النسل عیسائی بکثرت موجود تھے۔

رومیوں کی تیاری کی خبر سن کر حضرت زید ذرا سوچ میں پڑ گئے۔ یہ تامل اس لیے نہ تھا کہ وہ سرفروشی سے گریزاں تھے بلکہ اس لیے کہ ایک لاکھ کے مقابلے میں صرف تین ہزار کا تناسب عالم اسباب کے مطابق نہ تھا' اس لیے زید نے یہ سوچا کہ مدینے سے کچھ اور امدادی کمک منگوانے کا انتظار کیا جائے۔ کئی دن اسی بحث میں گزر گئے اور اہل لشکر کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ آخر عبداللہ بن رواحہ نے اٹھ کر ایک پرجوش تقریر کرتے ہوئے کہا کہ: "ہمیں دشمنوں کی قلت و کثرت سے کوئی بحث نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں تو جہاد فی سبیل اللہ کرنا ہے ہمیں دو میں سے ایک سعادت تو ضرور نصیب ہوگی۔ یا فتح ہوگی یا شہادت کا رتبہ نصیب ہوگا۔ عبداللہ بن رواحہ کی اس تقریر نے پوری

فوج میں جوش و خروش کی ایک نئی لہر دوڑا دی اور لشکر موتہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں رومی فوج پہلے سے مقابلے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ جنگ چھڑ گئی۔ زیدؓ علم لیے آگے آگے پوری داد شجاعت دے رہے تھے۔ ایک غسانی گروہ نے انھیں ہر چہار طرف سے گھیر لیا اور برچھیاں مار مار کر زیدؓ کو گرا لیا۔ ہدایت نبوی کے مطابق فوراً جعفر بن ابی طالبؓ لپکے، اور علم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے بعد اس بے جگری سے لڑے کہ دشمنوں میں تہلکہ ڈال دیا۔ آخر یہ بھی ابدی نیند سو گئے۔ عبداللہ بن عمر بھی اس جنگ میں موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ: "میں نے جعفرؓ کے زخم شمار کیے تو نوے تھے۔ اور ایک زخم بھی پشت پر نہ تھا۔ سارے زخم سامنے تھے۔ ان کے دونوں بازو بھی کٹ گئے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد ارشاد نبوی کے مطابق عبداللہ بن رواحہ نے علم لشکر سنبھال لیا اور یہ بھی پوری داد شجاعت دیتے ہوئے موت شہادت سے ہم آغوش ہو گئے۔ اب ثابت بن اقرم نے جھپٹ کر علم کو سنبھال لیا اور پکارا کہ: "مسلمانو! فکر نہ کرو، علم میرے پاس ہے جسے چاہو امیر لشکر بنا کر علم اس کے سپرد کر دو۔" لوگوں نے کہا کہ: "ہم آپ کی امارت پر راضی ہیں۔" ثابت نے کہا میں اس کا اہل نہیں۔ میری رائے میں خالد بن ولید مناسب ہیں۔ سب نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا اور فوج کی کمان خالد کے ہاتھ میں دے دی گئی۔

یہ وہی خالد ہیں جنھوں نے جنگ احد میں مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچایا تھا، اور یہی خالد ہیں جو مسلمانوں کو ادائے عمرہ سے روکنے کے لیے فوجی دستہ لے کر کراع الغمیم کی طرف گئے تھے۔ یہ خالد صرف بہادر ہی نہ تھے بلکہ جنگی تدابیر کے ماہر بھی تھے۔ دوربین، مصلحت آشنا اور موقع شناس بھی تھے۔ ان کی یہ تمام قوتیں پہلے کفر کے کام آ رہی تھیں اور اسلام لانے کے بعد یہ تمام صلاحیتیں راہ حق میں اور اعلیٰ انسانی اقدار کو بلند کرنے میں لگ گئیں۔

اس غزوے میں خالد نے شجاعت کے بڑے بڑے جوہر دکھائے۔ اس

کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اس دن ان کے ہاتھ سے آٹھ تلواریں ٹوٹیں۔ لیکن ایک لاکھ کا مقابلہ تین ہزار کہاں تک کرسکتے تھے؟ حضرت خالد نے بڑی عقل مندی سے کام لیا اور سارے مسلمانوں کو موت کے منہ میں جھونکنے کی بجائے ان کی صلاحیتوں کو دوسرے قیمتی موقعوں کے لیے محفوظ کر لیا۔ بڑی خوب صورتی سے پورے لشکر کو بچا کر لے آئے۔ جب یہ مدینے پہنچے تو بعض لوگوں نے یہ طعنہ دیا کہ تم لوگ زندہ کیوں واپس آئے اور راہ حق میں مرنے سے فرار کیوں اختیار کیا؟" آں حضرتؐ کو یہ طعنہ ناگوار ہوا۔ فرمایا: "یہ اللہ کا گروہ ہے۔ میدان قتال سے واپس آیا ہے اور پھر میدان جنگ میں جائے گا۔"

یہاں سلسلہ قتال میں ایک بڑی اعلیٰ قدر ملی' اور وہ یہ ہے کہ جس طرح ایک موقعے پر راہ خدا میں جان دینا نیکی ہے اسی طرح دوسرے موقعے پر خدا ہی کے لیے جانوں کو بچا لینا بھی نیکی ہی ہے۔ شہادت صرف مرنا ہی نہیں۔ راہ خدا میں زندہ رہنا بھی شہادت ہی ہے۔ زندگی ہو یا موت جو کچھ خدا کے لیے ہے اور جس چیز سے بوقت ضرورت گواہی (شہادت) پیش کی جائے اسی کو شہادت کہتے ہیں۔ مقصد محض مرنا نہیں بلکہ کام کو نتیجہ خیز بنانا ہے خواہ مرکر ہو یا زندہ رہ کر محیای و مماتی للہ رب العالمین

غزوہ موتہ میں اسلامی فوج کے تین سپہ سالار اور نو سپاہی شہید ہوئے۔ آں حضرتؐ کو ان سب کا صدمہ تھا لیکن جعفر کا بہت غم ہوا۔ عورتوں نے بھی جاہلیت کے انداز کا ماتم شروع کر دیا۔ آں حضرتؐ نے آدمی بھیج کر عورتوں کو اس ماتم سے رکوایا' مگر کسی نے نہ سنا۔ آں حضرتؐ نے پھر آدمی بھیجا اور فرمایا کہ: "ان ماتمیوں کے منہ میں خاک جھونک دو۔"

آں حضرتؐ نے سیدنا حمزہؓ کے ماتم کو کچھ ہی دنوں برداشت کیا تھا' اس کے بعد حکماً" رکوا دیا تھا۔ موت پر غم ہونا ایک فطری جذبہ ہے لیکن جاہلیت کے انداز پر اس کا اظہار اور پھر اس میں رسمی تصنع اسلامی روح سے

کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ زندہ قومیں وقف ماتم نہیں ہوتیں' سرگرمی عمل کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ گزری ہوئی موت پر غم کے لیے وقف ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ماضی کی یاد میں فنا ہو کر حال کے تقاضوں اور مستقبل کی تعمیر سے غافل ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں کب سے اور کیوں اور کس طرح ماتم ہمارا دین بن گیا ہے؟

* * *

(۲۴)

۸ ہجری ــــــ فتح مکہ

یہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے رو سے فریقین (مسلمان اور قریش) کو کسی قبیلے سے معاہدہ کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ چنانچہ بنو خزاعہ سے مسلمانوں نے اور ان کے دشمن قبیلے یعنی بنو بکر سے قریش نے عہد و پیمان کر لیا۔ بنو خزاعہ اور بنو بکر میں مدت سے سخت عداوت و جنگ کا سلسلہ جاری تھا' لیکن اسلام و اہل اسلام کی عداوت میں یہ دونوں ہم نوا تھے' اس لیے ان کی باہمی آتش عناد دب گئی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد جو امن و سکون پیدا ہوا تو ان دونوں قبیلوں کی خاکستر سے عناد باہمی کی چنگاریوں نے پھر سر نکالا۔ بنو خزاعہ چوں کہ مسلمانوں کے حلیف ہوگئے تھے اور بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے تھے' اس لیے قریش کے دل میں بنو خزاعہ کی طرف سے عناد پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ بنو بکر نے اس موقعے کو غنیمت جانا کہ قریش ایک تو ان کے دوست ہیں اور دوسرے ان کے دشمنوں (بنو خزاعہ) کے مخالف بھی ہیں۔ لہٰذا گزشتہ عداوتوں کی کسر نکالنے اور جذبہ انتقام کی آگ سرد کرنے کے لیے بنو بکر نے بنو خزاعہ پر ایک دھاوا بول دیا۔ قریش نے بنو بکر کی محض زبانی ہی ہمدردی سے کام نہیں لیا بلکہ عملی طور پر ان کا یوں ساتھ دیا کہ عکرمہ بن ابی جہل' صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو وغیرہ نے شب کو بھیس بدل کر بنو خزاعہ پر تلواریں چلائیں۔ بنو خزاعہ نے بھاگ کر حرم میں پناہ لی۔ انھیں یقین تھا کہ حرم کا روایتی

احترام تو ضرور ملحوظ رکھا جائے گا۔ مگر بنو بکر کے سرگروہ نوفل نے کہا کہ: "حرم میں پناہ لینے کی کوئی پروا نہ کرو۔ کیوں کہ پھر ایسا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔" چنانچہ حرم کے اندر بھی بنو خزاعہ کا بے دریغ خون بہایا جانے لگا۔ خزاعی مظلوموں نے حملہ آوروں کو خدا کا وسطہ دے دے کر فریاد کی' مگر ان ظالموں کی طرف سے یہ جواب ملا کہ: لا الہ الیوم: آج خدا کوئی شے نہیں۔"

کچھ دنوں کے بعد چالیس بچے کھچے خزاعیوں کا ایک گروہ فریادی اشعار پڑھتا ہوا مدینے میں داخل ہوا۔ آں حضرتؐ اس وقت مسجد نبوی میں تشریف رکھتے تھے۔ خزاعیوں کے سرگروہ سالم بن عمرو نے جب پر درد اشعار بنو بکر کی داستان ظلم سنائی تو رحمتہ للعالمین بے تاب ہوگئے۔ آں حضرتؐ نے جلد ہی ایک قاصد قریش کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا:

۱۔ یا تو خزاعی مقتولوں کا خوں بہا قریش اور بنو بکر مل کر ادا کریں۔

۲۔ یا قریش بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

۳۔ یا صلح نامہ حدیبیہ کے فسخ ہونے کا اعلان کر دیں۔

باتیں نہایت معقول تھیں اور پہلی بات کو مان لینا رواج عرب' عقل اور انصاف کے عین مطابق تھا۔ اگر قریش اور بنو بکر یہ مان لیتے تو معاملہ صاف ہو جاتا اور امن و امان قائم رہتا۔ مگر غالباً وہ ادائے خوں بہا کو اپنی اہانت تصور کرتے تھے۔ پیغام نبوی سن کر قرظہ بن عمرو نے قریش کی طرف سے کہہ دیا کہ: "ہمیں صرف تیسری بات منظور ہے۔" یعنی صلح نامہ حدیبیہ فسخ سمجھا جائے۔ قاصد یہ جواب لے کر واپس چلا گیا تو قریش کو اپنے اس جواب پر تاسف ہوا' اور انھوں نے فوراً ہی ابو سفیانؓ کو معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کے لیے مدینے روانہ کر دیا۔ تجدید معاہدہ کا مطلب یہ تھا کہ یہ معاہدہ علیٰ حالہا برقرار رہے گا۔

ابو سفیان سب سے پہلے اپنی بیٹی ام المومنین ام حبیبہؓ کے پاس گئے۔ بیٹی نے اپنے باپ کو آتا دیکھا تو بستر لپیٹ کر کنارے کر دیا۔ ابو سفیانؓ نے

اسے محسوس کر لیا اور پوچھا: "بیٹی میں نہیں سمجھ سکا کہ تم مجھ سے بستر ے کو دور رکھنا چاہتی ہو یا مجھ کو بستر ے سے؟ (یعنی اس بستر ے کے لائق میں نہیں ہوں یا بستر ہ میرے لائق نہیں؟) ام المومنین ——— مومنہ صادقہ ام المومنینؓ ——— نے جواب دیا: "یہ رسولؐ پاک کا بستر ہے۔ جو تمھاری طرح کفر کی ناپاکیوں میں پڑا ہو وہ اس پاک بستر ے پر بیٹھنے کا حق نہیں رکھتا۔ ابو سفیان اپنی بیٹی کی اس تعظیم رسولؐ پر حیرت زدہ ہو کر رہ گئے اور رنجیدہ ہو کر کہنے لگے: "تیری فطرت مجھ سے جدا ہو کر بالکل بدل گئی ہے۔ نہ بڑوں کا پاس رہا نہ خاندان کا لحاظ۔" ام المومنین نے فرمایا: "میری تبدیل فطرت تو کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں۔ البتہ ان لوگوں پر ضرور حیرت ہونی چاہیے جو عقل و دانائی کے مدعی ہونے کے باوجود بے جان مورتیوں کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہیں۔ ابو سفیان یہ دو ٹوک جواب سن کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے آں حضرتؐ کی خدمت میں پہنچے۔ معاہدے کی بحالی کے متعلق گفتگو کرنی چاہی، مگر آں حضرتؐ نے کوئی توجہ نہ دی۔ اس کے بعد یہ سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا عمرؓ کے پاس یکے بعد دیگرے گئے اور بیچ میں پڑ کر معاہدے کی بحالی کی درخواست کی۔ مگر ان دونوں نے یہ دیکھ کر کہ آں حضرتؐ نے کوئی توجہ نہ دی خود کوئی دخل دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ابو سفیان جناب فاطمہ زہراؓ کے پاس گئے۔ انھوں نے بھی شیخین کی طرح درمیان میں پڑنے سے انکار کر دیا۔ پھر وہاں سے مایوس ہو کر سیدنا علیؓ کے پاس آئے۔ آپ نے ابو سفیانؓ کو یہ تدبیر بتائی کہ: "مسجد میں جا کر اعلان کر دو کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کو بحال کیا۔" اس کے بعد فوراً مکے واپس چلے جاؤ۔" ابو سفیان نے یہی کیا اور مکے واپس ہو گئے۔ قریش کو ابو سفیان نے جب داستان سفر سنائی تو وہ اور زیادہ ششں و پنج میں پڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ: "یہ کارروائی نہ تو صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھیں اور نہ اعلان جنگ ہی ہے کہ ہم مقابلے کی تیاری کریں۔"

ادھر قریش اس حیص بیص میں پڑ گئے اور ادھر ابو سفیان کے واپس جاتے ہی آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو مکے کی طرف کوچ کرنے کا حکم صادر فرما دیا اور حلیف قبائل کو بھی پیغام بھجوا دیا کہ وہ تیار رہیں اور جب مسلمان گزرنے لگیں تو راستے میں ساتھ ہوتے جائیں۔ یہ تمام کارروائی خاموشی کے ساتھ رازدارانہ طریقے پر کی گئی تاکہ اہل مکہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

ایک شبہے کا ازالہ

یہاں پڑھنے والوں کو ایک شبہ ضرور پیدا ہو گا کہ جب ایک شخص قرطہ بن عمرو نے قاصد رسولؐ سے یہ کہا کہ: "ہمیں تیسری بات یعنی فسخ معاہدہ منظور ہے۔" تو آں حضرتؐ نے معاہدہ حدیبیہ کو فسخ تصور فرما لیا۔ لیکن جب اس سے زیادہ ذمے دار شخص ابو سفیان نے مسجد نبوی میں آکر اعلان کر دیا کہ: "ہم نے معاہدہ حدیبیہ کو بحال کیا" تو اسے معاہدے کی بحالی نہ سمجھا گیا' اور اسلامی جیش کو کوچ کا حکم دے دیا گیا۔ آخر یہ کیوں؟ سیرت نگاروں نے اس سوال کا کوئی حل نہیں پیش فرمایا ہے۔ بہرکیف ہمارے خیال میں معاملہ صاف ہے۔ بات یہ ہے کہ محض معاہدے کی بحالی کا اعلان کوئی شے نہیں۔ اگر معاہدے کو بحال رکھنا تھا تو پہلی اور دوسری شرط میں سے کسی ایک بات کا صاف اور غیر مبہم الفاظ میں فیصلہ بھی کر کے بتا دینا چاہیے تھا' یعنی خزاعی مقتولوں کا خوں بہا ادا کرنا ہے یا بنو بکر کی حمایت سے دست کش ہو جانا ہے؟ عمداً" ہو یا سہواً" اصل معاملے کو بہرحال ابو سفیان نے صاف نہیں کیا اور اس بات کو بالکل مبہم رکھا کہ اگر تیسری شرط منظور نہیں ہے تو پھر کون سی شرط منظور ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قریش اصل مطالبے سے گریز کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے حلیف خزاعیوں کا جو نقصان ہوا ہے' اس کی وہ کوئی تلافی کرنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا ایسی صورت میں ایک آدمی کا محض

یہ کہنا کہ: "میں نے معاہدہ حدیبیہ کو بحال کیا۔" اس کے بعد واپس چلے جانا ہرگز کافی نہیں ہو سکتا۔

سیدنا حاطب سے درگزر

ادھر مسلمان کوچ کی تیاری کر رہے تھے ادھر ایک عظیم المرتبت صحابی سیدنا حاطب بن ابی بلتعہ نے ایک خفیہ خط قریش کو لکھا جس میں مسلمانوں کی تیاری کی اطلاع تھی۔ نامہ بر ایک عورت تھی۔ آں حضرتؐ کو اس کا علم ہو گیا اور حضرت علیؓ کو دوڑایا۔ آپ نے اسے راستے ہی میں جا لیا۔ خط مانگا تو اس نے کہا: "میرے پاس کوئی خط نہیں۔" حضرت علی نے کہا: "رسولؐ اللہ غلط خبر نہیں دے سکتے۔" اس کے بعد ذرا دھمکا کر اس کی تلاشی لی تو اس کے جوڑے میں سے وہ خط نکلا۔ حاطب بن ابی بلتعہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں' مہاجر مدینہ ہیں' بدری ہیں۔ اب تک معرکوں میں آں حضرتؐ کے ساتھ رہے اور مقوقس مصر کے پاس دعوت نامہ اسلام لے کر یہی گئے تھے۔ ایک ایسے صحابی کی طرف سے جرم مخبری کا سرزد ہونا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ تمام صحابہ کو حیرت تھی' سیدنا عمر بن خطاب نے عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ اجازت دیجیے کہ حاطب کی گردن اڑا دوں۔" آں حضرتؐ نے فرمایا: "تمھیں کیا معلوم؟ شاید اللہ کا یہ فیصلہ ہو کہ اہل بدر سے کوئی مواخذہ نہیں۔"

جناب حاطب کے بال بچے ہنوز مکے میں ہی تھے اور اہل و عیال کے تحفظ کی فکر میں ایسی فطرت ہے جو بدلی نہیں جا سکتی۔ حاطب کو بجا طور پر یہ خطرہ تھا کہ قریش ان کے اہل و عیال کو ستاتے ہوں گے اور آئندہ بھی ستائیں گے۔ اس لیے انھوں نے سوچا کہ مسلمانوں کی آمد کی اطلاع قریش کو دے کر ان پر ایک احسان کر دیا جائے تاکہ وہ اس احسان کے عوض کم از کم اتنا کریں کہ ان کے بال بچوں کو نہ ستائیں۔ خدمت نبوی میں حاطب نے اسی مصلحت کو بطور

عذر پیش کیا۔ اور آں حضرتؐ نے اس عذر کو قبول کر کے حاطب سے درگزر فرمائی۔

دراصل آں حضرتؐ نے یہاں کئی نئی قدریں عطا فرمائی ہیں:

۱۔ تعزیر و سزا محض ظاہری نوعیت جرم کو دیکھ کر متعین نہیں ہوتی۔ کچھ خارجی احوال و ظروف ایسے بھی ہوتے ہیں جو جرم کی سنگینی کو ہلکا کر دیتے ہیں یا معمولی جرم کو سنگین بنا دیتے ہیں۔ ہر چوری کے عوض ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔ بھوکا قحط میں چوری کرے' سپاہی حالت جنگ میں چوری کرے' فرزند باپ کی یا بیوی شوہر کی یا غلام آقا کی چوری کرے تو اگرچہ ظاہر میں یہ ساری چوریاں عین چوریاں ہیں لیکن قطع ید کسی میں بھی نہیں۔ اسی طرح ہر قتل کا قصاص یکساں نہیں۔ اگرچہ اپنی ظاہری شکل میں قتل ہی ہے لیکن قتل عمد اور قتل خطا کی سزا میں فرق ہے۔ ہر زنا اپنی ظاہری شکل میں زنا ہے لیکن زنا بالجبر میں عورت پر حد جاری نہیں ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح ہر جاسوسی یا مخبری سبوتاژ نہیں جس کی سزا قتل ہو۔ جاسوس وہ ہے جو دشمن سے ساز باز رکھتا ہو۔ یہی کام کیا کرتا ہو۔ اسی لیے بھیجا گیا ہو۔ دشمن سے باقاعدہ معاوضہ حاصل کیا کرتا ہو۔ جناب حاطب کے متعلق ایسا گمان ہی نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ آں حضرتؐ نے اس موقعے پر ایک قدر یہ بھی بخشی کہ کسی کی پچھلی خدمات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ ایک دو غلطیوں سے کسی کی ساری عمر کی نیکیاں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ اگر کسی خادم کا اصل رجحان وفاداری ہو تو ایک دو نقصان رساں کام سے اس کو اس وقت تک بے وفا نہیں کہا جا سکتا جب تک اس کے جرم کی نوعیت اتنی سنگین نہ ثابت ہو جائے۔ سیدنا حاطبؓ کی وفاداریاں اور قربانیاں مسلم ہیں' اس لیے ان کی حیثیت فرمان قرآن کے مطابق اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ:

خلطوا عملًا صالحًا و اخر سیئًا عسی اللّٰہ ان یتوب علیھم

(التوبہ: ۱۰۲)

اپنے عمل صالح میں کوئی برائی بھی شامل کرلی۔ امید ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول فرمالے گا۔

۳۔ آں حضرتؐ نے اس موقعے پر اہل بدر کی عظمت و قدر بھی بتا دی۔ معرکہ بدر میں شرکت کرنے والے وہ اجلہ صحابہ ہیں جو اولون سابقون میں ہیں' اور جن کی قربانیوں کو نظرانداز کرنے کے بعد اخلاص و ایثار کا کوئی تصور ہی نہیں باقی رہتا۔ ان کے متعلق قرآن پاک نے واضح الفاظ میں فیصلہ یوں سنا دیا ہے کہ:

والسبقون الاولون من المهجرين و الانصار و الذين اتبعوهم باحسان رضى الله عنهم و رضوا عنه و اعد لهم جنت تجرى تحتها الانهر خلدين فيها ابداً ط (التوبہ: ۱۰۰)

مہاجرین و انصار کے سابقون اولون بلکہ وہ بھی جنھوں نے ان کی عمدگی سے پیروی کی ان سب سے خدا راضی ہے اور وہ خدا سے راضی ہیں' اور خدا نے ان کے لیے ایسی جنت مہیا کر رکھی ہے جس کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

رضائے الٰہی اور خلود بہشت کی اس آسمانی سند کے بعد ان پر زبان طعن دراز کرنے والوں کو اپنے ایمان کی خبر لینی چاہیے۔ ان بدریوں کے ایمان و ایثار کا کون مقابلہ کرسکتا ہے؟ ان ہی کے متعلق تو ارشاد نبوی ہے کہ: "آج اگر کوئی شخص جبل احد کے برابر سونا راہ خدا میں صرف کرے تو ان کے ایک مد غلے کی بھی برابری نہیں ہوسکتی۔"

سیدنا حاطبؓ کے درگزر میں ایک اور اخلاقی درس یہ ہے کہ قاضی کو

محض قانون تعزیر ہی پر نظر نہیں رکھنی چاہیے۔ تعزیرات کے علاوہ کچھ اخلاقی تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ خدا نے صرف قانون مکافات ہی نہیں دیا ہے' صحیح محل پر عفو و درگزر بھی خدا ہی کی تعلیمات میں شامل ہے۔ جرم کی خفت و سنگینی کا پورا لحاظ رکھنے کے علاوہ قاضی کا رجحان تعزیر سے بچانے کی طرف ہونا چاہیے۔ اسی لیے آں حضرتؐ کا ارشاد ہے کہ:

انک ان تخطئی فی العفو خیر من ان تخطئی فی العقوبہ۔

ناقابل معافی کو معاف کر دینا اس سے بہتر ہے کہ ناقابل سزا کو سزا دی جائے۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ:

ادرؤا الحدود عن الشبھات۔

اشتباہ پیدا ہو تو حد کو ٹال جاؤ۔

غرض سیدنا حاطب کی غلطی اور معافی محض ایک سرسری واقعہ نہیں بلکہ اس کے اندر بڑی اعلیٰ اقدار کی محافظت کا درس ہے۔

قدسیوں کی پرشکوہ روانگی

لشکر اسلام پورے شکوہ و جلال کے ساتھ آٹھویں یا دسویں رمضان ۸ھ کو مدینے سے روانہ ہوا۔ یہ سفر بڑی تیزی کے ساتھ طے ہوا۔ راستے میں حلیف قبائل بھی ساتھ ہوتے گئے جن کی تعداد کم و بیش دو ہزار تھی۔ یہ کل رفقائے سفر دس ہزار کی تعداد میں تھے۔ علم قدیم نے اپنی انگلیوں سے تاریخ کے ورق الٹنے شروع کیے اور چشم کائنات ہزاروں سال کے انتظار کے بعد غزل الغزلات سیدنا سلیمانؑ کے اس صفحے پر جم کر رہ گئی جس میں لکھا تھا:

"میرا محبوب....... دس ہزار آدمیوں میں جھنڈے کی مانند کھڑا ہوتا ہے۔"

ذوالحلیفہ یا جحفے میں آں حضرتؐ کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب ملے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ مکے سے روانہ ہو کر مدینے جا رہے تھے۔ یہ اب تک معاہدہ حدیبیہ کے مطابق مکے ہی میں مقیم تھے اور "سقایت" یعنی حجاج کے لیے آب رسانی کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ آں حضرتؐ کو جناب عباسؓ کی آمد سے بڑی مسرت ہوئی۔ عباسؓ نے اپنے اہل و عیال کو تو مدینے روانہ کر دیا اور خود جیش اسلامی کے ساتھ ہو گئے۔ آں حضرتؐ نے اس موقعے پر سیدنا عباسؓ سے فرمایا کہ: "جس طرح نبوت آخری ہے اسی طرح تمھاری ہجرت بھی آخری ہے۔"

اسی موقعے کے لیے آں حضرتؐ نے فرمایا ہے کہ لا ھجرۃ بعد الفتح (یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت ختم ہے)۔ یہاں الفتح سے مراد خاص فتح مکہ ہے۔ فتوحات تو فتح مکہ سے پہلے اور بعد میں بھی ہوتی رہی ہیں اور وہ سب فتوحات جو صلح حدیبیہ کے بعد ہوئیں فتح مبین میں شامل ہیں' لیکن جس فتح کے بعد ہجرت کی فضیلت ختم ہوئی وہ فتح مکہ ہی ہے۔ دوسری فتوحات نہیں۔ فتح مکہ کے بعد بھی بہت سے لوگ مدینے میں آکر آباد ہوئے لیکن قرآنی اصطلاح کے مہاجرین میں ان کا شمار نہیں کیوں کہ فتح مکہ سے پہلے جو ہجرت تھی وہ ایک وطن' گھربار اور اقربا و احباب کی قربانی تھی اور فتح مکہ کے بعد کی ہجرت صرف ایک سفر ہے خواہ وہ کیسے ہی اعلیٰ مقصد کے لیے ہو۔

یہ جیش اسلامی ایک ہفتے میں مرالظہران پہنچ گیا جو مکے سے کم و بیش دس میل کے فاصلے پر ہے اور مسافران مکہ کے لیے آخری پڑاؤ ہے۔ یہاں آں حضرتؐ کے حکم سے ایک ایک ہزار کی جماعت نے تمام صحرا کے کونوں میں پھیل کر اپنے اپنے کیمپ لگا لیے۔ شب کو رواج عرب کے مطابق سب نے اپنے اپنے الاؤ روشن کیے اور سارا میدان بقعہ نور اور نور ہدایت سے وادی طور بن گیا۔

سفرائے قریش

جناب عباسؓ کو یہ انبوہ کثیر دیکھ کر خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں اہل مکہ کل ہی پیس کر نہ رکھ دیے جائیں۔ اس خوں ریزی کے خوف سے وہ رات ہی کو مکے کی طرف روانہ ہوگئے تاکہ اہل مکہ کو اعتراف قصور اور درخواست معافی کی طرف متوجہ کریں۔ ادھر قریش کو بھی مسلمانوں کی آمد کی خبر مل گئی تھی اس لیے انھوں نے اپنے تین سفیر دریافت حال کے لیے بھیج دیے۔ یہ تین سفیر سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق حکیم بن حزام (سیدہ خدیجہؓ کے برادر زادے) ابو سفیان اور بدیل بن ورقا تھے۔

ابو سفیان کی آمد اور عمرؓ کا جوش

بہرحال یہ تینوں سفیر مرالظہران کے قریب آئے اور روشنی دیکھ کر ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ یہ لوگ دفعتہً ایک لشکر کے پہنچ جانے پر حیران تھے۔ ابو سفیان بولے: "صرف بنو خزاعہ تو اتنی کثیر تعداد میں ہو نہیں سکتے۔ یہ کوئی اور لشکر ہے جو چڑھ آیا ہے۔ اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ حضرت عباسؓ ادھر سے گزرے۔ انھوں نے ابو سفیان کی آواز پہچان لی اور ان سے مل کر تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ پھر امن دلانے کے خیال سے انھیں ساتھ لے کر آں حضرتؐ کی خدمت میں تشریف لائے۔ ابو سفیان کو آتا ہوا دیکھ کر جناب عمرؓ بے تاب ہوگئے اور عرض کیا کہ: "یا رسولؐ اللہ! اجازت ہو تو میں دشمن اسلام کا سر اتار لوں۔ عباسؓ بولے کہ: "یہ جوش اس لیے ہے کہ ابو سفیان عبد مناف کی اولاد ہے۔ اگر تمھارے قبیلے (بنی عدی) کا کوئی فرد ہوتا تو شاید اتنا جوش نہ دکھاتے۔" جناب عمرؓ نے جواب دیا: "بخدا یہ بات نہیں، مجھے اپنے باپ (خطاب) کے ایمان لانے کی بھی اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی جتنی خوشی تمھارے ایمان لانے کی ہوئی تھی۔"

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

اس رات ابو سفیان یہیں رہے۔ تمام صحابہ نے یہ رات بڑی بے چینی سے کاٹی۔ ان سب کو یہ انتظار تھا کہ دیکھیں کل صبح ابو سفیان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے؟ صبح ابو سفیان خدمت نبویؐ میں پیش کیے گئے۔ آں حضرتؐ نے ان سے پوچھا: ''کیوں ابو سفیان: کیا اب بھی تمھیں یقین نہیں آیا کہ اللہ کے سوا کوئی اور الہ نہیں؟'' ابو سفیان نے جواب دیا: ''اگر واقعتہ'' کوئی اور الہ ہوتا تو آج ہمارے کام نہ آتا؟'' آں حضرتؐ نے پھر دریافت فرمایا: ''کیا اب بھی تمھیں میرے رسولؐ اللہ ہونے میں شک ہے؟'' ابو سفیان نے کہا: ''اس میں تو ابھی کچھ شک باقی ہے۔''

گویا اس وقت ابو سفیان لا الہ الا اللہ کے تو قائل ہو گئے مگر محمد رسول اللہ کے ابھی پوری طرح قائل نہ ہوئے تھے ——— مگر آں حضرتؐ نے انھیں اس یقین پر چھوڑ دیا کہ آج جو توحید کا قائل ہو گیا ہے وہ کل رسالت کا بھی قائل ہو ہی جائے گا۔ بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ آں حضرتؐ کا یہ یقین بالکل سچا تھا۔ فتح مکہ کے بعد ہی غزوہ حنین میں یہ بڑی جواں مردی سے مسلمانوں کی طرف سے لڑے اور ان کی ایک آنکھ جاتی رہی' اور بہ عہد فاروقی غزوہ یرموک میں داد شجاعت دیتے ہوئے اپنی دوسری آنکھ بھی کھو بیٹھے۔

دو حقیقتیں

آج ابو سفیان دس ہزار کی فوج میں تنہا گھرے ہوئے ہیں۔ ابو جہل کے مارے جانے کے بعد اہل مکہ اور اطراف مکہ کی سیادت و قیادت ان ہی کے حصے میں آئی تھی' وہ آج تک جس جس انداز سے اور جو جو مخالفتیں اہل اسلام کی کرتے رہے ہیں' وہ اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ شدید اذیت رساں اور ذلت آمیز طریقے سے انھیں قتل کر کے دنیا کے لیے عبرت کا نمونہ بنایا جائے۔

لیکن رسولؐ اللہ انتقام کی تسکین کے لیے نہیں آئے تھے۔ آپؐ کی آمد کا مقصد اسفل جذبات کو دبانا اور اعلیٰ قدروں کو پھیلانا تھا۔ آں حضرتؐ نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ: "ابو سفیان! ہم مسلمانوں پر تم نے جو جو زیادتیاں کی ہیں وہ تمھیں یاد ہیں؟ بتاؤ آج تمھیں کیا سزا دی جائے؟" نہیں نہیں اتنا کچھ بھی تو آں حضرتؐ نے نہیں پوچھا۔ بات کی تو صرف وہ جو کام کی تھی، جو مشن سے تعلق رکھتی تھی، جو مقصد بعثت تھی۔

جناب ابو سفیان نے بھی بات وہی کی جو سمجھ میں آئی۔ آج سے زیادہ خطرناک بے بسی کی کوئی ساعت ابو سفیان پر نہیں آئی تھی۔ ایک چوہیا شہتیر کے نیچے تلے دبی تھی۔ ناخن کے ایک اشارے میں ملک الموت حاضر ہونے کے منتظر تھے۔ دس ہزار چمکتی ہوئی تلواروں کے درمیان ایک گردن تھی۔ اگر ڈر، خوف سے تقیہ کر کے اسلام قبول کرنا ہوتا تو آج سے زیادہ ابو سفیان کے لیے اور کوئی نازک موقع زندگی میں نہ آیا تھا۔ آج ابو سفیان کو ہر بات کا اقرار کر لینا چاہیے تھا، لیکن قریش کا یہ نڈر فرزند منافق نہ تھا۔ اس بے بسی میں بھی بات وہی کہی جو سمجھ میں آئی۔ صرف توحید کا اقرار کیا اور رسالت کے بارے میں جو شک تھا اسے اپنی جان کی پروا کیے بغیر دس ہزار کے مجمعے میں برملا ظاہر کر دیا۔ جب دشمن تھا تو پکا دشمن تھا اور جب دوست ہوا تو پکا دوست ہوا۔ یہ فرض کر لینا کہ فتح مکہ کے بعد جو بھی اسلام لایا وہ جان کے ڈر سے لایا کچھ معقولیت پسندی کا ثبوت نہیں۔

فتح مکہ کے بعد کبھی اللہ یا اس کے رسولؐ نے یہ حکم نہیں دیا کہ جو اسلام نہ لائے اسے قتل کر دو۔ فتح مکہ کے پندرہ مہینے کے بعد ذی الحجہ ۹ھ میں بہ موقع حج اکبر یہ آیت سنا دی گئی کہ:

فسیحوا فی الارض اربعہ اشھر (التوبہ: ۲)
مشرکو! چار ماہ حرم میں اور چل پھر لو۔

گویا فتح مکہ کے بعد انھیں ۱۹ مہینے کی مہلت مل گئی کہ اس درمیان میں اپنا فیصلہ کر لیں۔ فیصلہ بھی یہ نہیں کرنا تھا کہ قتل ہوں یا اسلام لائیں بلکہ یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مسلمان ہو کر عام مسلمانوں کے بھائی بن کر رہیں یا اپنے شرک کے ساتھ خدا کی وسیع زمین میں کہیں چلے جائیں۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ یہ فراخ دلانہ الٹی میٹم صرف ان لوگوں کو دیا گیا تھا جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہ تھا یا وہ مشرک جو خود عہد شکنی کر کے معاہدے کو ختم کر چکے تھے۔ باقی رہے وہ لوگ جن کا معاہدہ ہنوز باقی تھا ان کے لیے یہ الٹی میٹم تھا ہی نہیں۔ ان کے لیے آخر وقت تک معاہدے پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ آگے انشا اللہ یہ تفاصیل آئیں گی۔

ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ ان پر اسلام قبول کرنے کے لیے کوئی دباؤ ڈالا گیا تھا یا قتل کی دھمکی دی گئی تھی اور وہ قتل کے ڈر سے اسلام لے آئے تھے؟ ان کے قبول اسلام کی وجہ صرف وہ تھی جس کی طرف جناب ابو سفیان نے اشارہ کیا ہے کہ: ”اگر اللہ کے سوا کوئی اور الہ ہوتا تو آج ہماری مدد ضرور کرتا۔“ ان اہل مکہ کے دماغ پر صدیوں سے نسلاً“ بعد نسل شرک کا قبضہ چلا آرہا تھا۔ مخصوص اہل بصیرت کے سوا عام طور پر ان کی سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ کعبۃ اللہ میں رکھے ہوئے بت جھوٹے اور بے اثر ہو سکتے ہیں۔ انھیں آخر وقت تک یقین تھا کہ سرزمین مکہ میں اسلام اور مسلمانوں کا کوئی تسلط نہیں ہو سکتا۔ اگر ادھر مسلمانوں نے رخ کیا تو ہمارے دیوی دیوتا انھیں دھتکار دیں گے۔ ان کے اس غلط اعتقاد کا قلعہ اس وقت بھسم ہوا جب انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اہل اسلام خدا کا نام لیتے ہوئے داخل مکہ ہو گئے۔ ان کا تسلط ہو گیا اور ہمارے بت دھرے کے دھرے رہ گئے۔ بلکہ کعبۃ اللہ کے ایک ایک دیوی دیوتا کو ذلت و خواری کے ساتھ باہر کر دیا گیا۔ یہ مناظر دیکھنے کے بعد اہل مکہ کے اعتقاد میں تزلزل پیدا ہو گیا اور ان کے باطل

تصورات میں انقلاب آگیا۔ اس حقیقت کی طرف ہند بنت عتبہ (جناب ابو سفیان کی بیوی) نے بڑا واضح اشارہ کیا ہے۔ یہ اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے گھر گئیں اور اس بڑے بت کو (جو انھوں نے اپنے ہاں حاجت روائی کے لیے رکھ چھوڑا تھا) اپنے ہاتھ سے یہ کہتے ہوئے پارہ پارہ کیا کہ: "کم بخت تو نے ہی اب تک ہمیں دھوکے میں رکھ چھوڑا تھا۔"

غرض اہل مکہ کے اسلام قبول کرنے کا سبب بتوں کی وہ بے بسی تھی جو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی اور وہ تسلط تھا جو خدا پرستوں کو حاصل ہوا۔ نہ یہاں تلوار کا دباؤ تھا نہ قتل کی دھمکی تھی کہ اسلام قبول کرو ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ انھیں تو کم سے کم انیس مہینے کی یا اختتام میعاد تک کی مہلت دی گئی اور وہ بھی اس لیے نہ تھی کہ اس کے بعد قتل کر دیے جاؤ گے بلکہ یہ اس لیے تھی کہ اگر اسلام پسند نہیں تو اہل توحید کے نظام معاشرہ کو ان کے اپنے تصورات کے مطابق چلنے دو اور خود جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔

ذرا سوچیے' وہ اسلام ہی کیا ہوا جو دباؤ سے قبول کیا جائے؟ دباؤ یا قتل کی دھمکی کے بعد پھر خدا کا صریح حکم لا اکراہ فی الدین کدھر جائے گا؟ اسلام تو نام ہی ہے اس منظوری کا جس میں خوش دلانہ رضا کاری' یا رضاکارانہ خوش دلی ہو۔ آں حضرتؐ نے کب کسی ایسے شخص کا اسلام قبول کیا ہے جسے دباؤ سے منوایا گیا ہو؟ حضرت خالد تک سے تو باز پرس فرمائی کہ ھلا شققت قلبه؟ کیا تم نے اس شخص کا (جسے تم نے قتل کر دیا) دل چیر کر دیکھا تھا کہ وہ تلوار کے ڈر سے اسلام لے آیا ہے؟ یعنی جناب خالد بھی یہ سمجھتے تھے کہ تلوار کے ڈر سے جو اسلام لایا جائے وہ اسلام نہیں ہوتا۔ لیکن ان سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ ایسے شخص کو واجب القتل سمجھ بیٹھے۔ مطلب یہ ہے کہ قبول اسلام کے بعد کسی کے متعلق اور خصوصاً" اہل مکہ کے متعلق یہ فرض کر لینا کہ وہ تلوار کے ڈر سے اسلام لے آئے تھے سرے سے درست نہیں۔

ہاں ان کی یہ بڑی غلطی تھی کہ انھوں نے عقل و بصیرت اور دلائل و براہین کی راہ سے اسلام کو نہیں سمجھا بلکہ اسلام کے حق ہونے اور شرک کے باطل ہونے کا معیار اس بات کو قرار دیا کہ اہل توحید ہمارے دیوی دیوتاؤں پر غالب آگئے' اور یہ ایسا ہی ہے جیسے بعض لوگ حقیقت پسندی کی وجہ سے نہیں بلکہ معجزہ دیکھ کر ایمان لاتے ہیں۔ مسلمان وہ بھی ہوتے ہیں لیکن ان کا وہ درجہ نہیں ہوتا جو بے معجزہ دیکھے ایمان لے آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ صلح حدیبیہ کی فتح مبین کے بعد ایمان لانے والوں کا وہ درجہ نہیں جو اس سے پہلے کے اہل اسلام کا ہے۔ مگر مسلمان سب ہیں اور حسنیٰ کا وعدہ دونوں ہی طبقوں سے ہے۔ وکلا وعد اللہ الحسنیٰ تلوار کے دباؤ سے اسلام لانے والے نہ تو کبھی سچے مسلمان ہوسکتے ہیں اور نہ ان سے خدا حسنیٰ کا وعدہ کرسکتا ہے۔ (اوپر ہم اس کے متعلق الفتح کی تفسیر میں وضاحت کر چکے ہیں)۔ کچھ بھی ہو ان کا ایمان ہم جیسے لوگوں سے ہزار درجے بہتر تھا جو فتح مبین کے صدیوں بعد کے مسلمان ہیں۔

شاہی یا فقیری

جب لشکر اسلام مرالظہران سے مکے کی طرف روانہ ہوا تو آں حضرتؐ نے جناب عباسؓ سے فرمایا کہ: "ابو سفیان کو گزر گاہ کی کسی پہاڑی پر کھڑا کر دو تاکہ وہ جیش اسلامی اور حزب اللہ کا جاہ و جلال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ آں حضرتؐ کو یہ علم تھا کہ ابھی تک بعض لوگوں کے نزدیک حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی بصیرت و دلائل کی بجائے غلبہ و استیلا ہے۔ بہرحال ابو سفیان اور عباس ایک ٹیلے پر کھڑے تھے اور عسکر الٰہی کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جلال و جمال کے پھریرے اڑاتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس وقت ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی ہے' اس سے جاہلیت اور اسلام کے تصورات کا فرق بڑی خوبی

سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ابو سفیان نے عباس سے کہا: لقد اصبح ملک بن اخیک عظیما (عباس! تمھارے برادر زادے کی بادشاہت تو بڑی زبردست ہوگئی ہے۔) عباس نے مسکرا کر جواب دیا: لیس بملک انما ھذہ النبوۃ (ارے نادان ابو سفیان! تو ابھی تک نہیں سمجھا۔ یہ بادشاہت نہیں، یہ نبوت ہے)۔ اللہ اللہ! جناب عباس کے اس ایک جملے میں پوری کتاب سمٹی ہوئی ہے۔ اسلامی تصورات کا حقیقت نما نچوڑ اس جملے میں اس طرح بند ہے کہ جس طرح ایک تخم کے اندر پورا درخت چھپا ہوا ہوتا ہے۔ کجا بادشاہت اور کجا نبوت؟ بادشاہت خود غرضانہ شخصی پوجا ہے اور نبوت صرف خدا کی اطاعت کا پیغام اور انسانی پوجا کے لیے پیغام موت۔ بادشاہت ظاہری جاہ و جلال کی نمائش ہے اور نبوت ایک ایسی فقیری ہے جس کے سامنے شاہانہ جاہ و جلال سرنگوں ہے۔ بادشاہت کا اعضا و جوارح پر جابرانہ و ظالمانہ قبضہ ہے اور نبوت روح کی گہرائیوں پر خوش دلانہ تسلط۔ بادشاہت مفاد پرستی کے لیے قانون ساز ہے اور نبوت انسانی اقدار کے قیام کی ذمے دار ——— بادشاہت ملک گیری ہے اور نبوت حقیقت پسندی۔

جناب عباسؓ کے ایک جملے نے ابو سفیان کی آنکھیں کھول دیں۔ وہ توحید کو از خود ایک دوسری راہ سے سمجھے تھے اور رسالت کی حقیقت نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے تذبذب میں پڑے ہوئے تھے۔ مگر عباسؓ کے جملے نے ابو سفیان کے دل و دماغ کی وہ کھڑکی کھول دی جو اب تک بند پڑی تھی۔ آگے کے واقعات نے بادشاہت اور نبوت کا فرق اور بھی اچھی طرح واضح کر دیا۔

پرامن اور پرجلال کوچ

سب سے پہلے غفاری قبیلے کا جھنڈا لہراتا ہوا گزرا۔ پھر جہنیہ، ندیم، سلیم وغیرہ کے قبائل اپنے اپنے علم اڑاتے اور نعرہائے تکبیر سے فضا میں

ارتعاش پیدا کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے نکلتے چلے گئے۔ آخر میں انصار رسولؐ کی باری آئی۔ یہ لوہے میں غرق تھے اور سعد بن عبادہ ان کا پھریرا فضائے آسمانی میں لہراتے جا رہے تھے۔ سیدنا سعد کی نظر جناب ابو سفیان پر پڑی تو دھمکانے کے لیے بولے: الیوم یوم الملحمہ' الیوم تستحل الکعبہ (آج گھسان کا رن پڑنے کا دن ہے اور آج سرزمین حرم بھی خوں ریزی سے نہیں بچ سکے گی)۔ ابو سفیان یہ سن کر گھبرا گئے اور سوچ میں پڑ گئے۔ یوں تو ہر گزرنے والا جیش پہلے سے زیادہ گہرا نقش ابو سفیان کے دل پر بٹھا کر کفر کی باقی ماندہ تاریکیاں دور کر رہا تھا۔ لیکن سعد بن عبادہ کی خلاف حقیقت للکار نے ان کی کیفیت دگرگوں کر دی۔ ابھی ابھی جناب عباسؓ کی بات سے بادشاہت و نبوت کے فرق کا جو نقش ابھرا تھا تھوڑی دیر کے لیے دھندلا پڑ گیا۔ اتنے میں ابو سفیان نے دیکھا کہ رحمتہ للعالمینؐ تشریف لا رہے ہیں اور سیدنا زبیر بن عوام ایک ہمیشہ اونچا رہنے والا عرش رفعت علم رحمت لہراتے ہوئے ساتھ ساتھ ہیں۔ ابو سفیانؓ کی نظر رحمت مجسمؐ پر پڑی تو پکار کر کہا: "ابھی سعد بن عبادہ آج کے دن کو گھسان کی جنگ اور خوں ریزی کا دن بتا گئے ہیں۔" آں حضرتؐ کو سعد کا یہ قول ناگوار گزرا' کیوں کہ بات خلاف واقعہ تھی۔ فرمایا: "سعد نے غلط کہا۔ آج تو باران رحمت کا دن ہے۔" (الیوم یوم الملحمہ نہیں بلکہ یوم الرحمتہ) اس کے بعد آں حضرتؐ کے حکم سے علم سعدؓ سے لے کر ان کے فرزند قیس بن سعد کو دے دیا گیا۔ بادشاہت اور نبوت کے فرق کا دھندلا نقش پھر ابو سفیان کی لوح دل پر پوری طرح ابھر آیا۔ لیکن اس کی مکمل عملی تصدیق آگے چل کر اسی دن ہو گئی۔

داخلہ مکہ سے پہلے ہدایات

ذرا دیر کے بعد مکے کے اندر داخلہ ہوا۔ علم نبوی مقام حجون میں

نصب کیا گیا۔ حضورؐ کے حکم کے مطابق پانچ قبیلے ـــــــ اسلم، سلیم، غفار، مزینہ اور جہینہ ـــــــ حضرت خالدؓ کی سرکردگی میں مکے کے حصہ زیریں سے داخل ہوئے۔ دوسرے لشکر بالائی حصے سے داخل ہوئے اور خود آں حضرتؐ نے اپنے داخلے کے لیے مقام ذی طویٰ کے راستے کو پسند فرمایا۔ خالد اور زبیر کو یہ حکم ملا کہ:

"حرم میں ہرگز کوئی خوں ریزی نہ ہو۔ مقابلہ اسی کا کیا جائے جو سامنے آکر حملہ آور ہو۔" مزید اعلان یہ فرمایا کہ: "جو شخص کعبے کے اندر داخل ہو جائے اسے پناہ۔ جو ابو سفیان کے گھر کے اندر داخل ہو اسے پناہ، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اسے پناہ۔ بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔ جو ہتھیار پھینک دے اس سے تعرض نہ کیا جائے۔ زخمی اور اسیر قتل نہ کیے جائیں۔

لمحہ فکریہ

ذرا ان احکام پر غور کیجئے۔ خوں ریزی کو روکنے کی کون سی تدبیر ہے جو باقی رہ گئی ہو؟ ذرا دیکھیے:

۱۔ سب سے پہلے ابو سفیان کو ایک ٹیلے پر کھڑا کر کے ان کے دل کو مرعوب کر دیا گیا تاکہ اس سردار قریش کے ساتھ قریش کے حوصلے بھی پست ہو جائیں۔ اور وہ جنگ کی جرات نہ کر سکیں جس کے نتیجے میں قریش کی شکست کے علاوہ سینکڑوں انسانوں کا خون بہہ سکتا تھا۔

۲۔ پھر تین طرف سے جیوش قاہرہ داخل کیے گئے تاکہ اہل مکہ ارادہ خوں ریزی سے دست کش ہو جائیں۔

۳۔ پھر سرزمین حرم کی حرمت کو باقی رکھنے کی سختی سے تاکید کی گئی۔

۴۔ پھر ہر اس شخص کو پناہ حاصل ہونے کا اعلان کیا گیا جو کعبے میں

داخل ہو جائے اور ابو سفیان کے گھر کے اندر چلا جائے اور حد یہ ہے کہ اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے۔

۵۔ پھر مقابلے سے الگ رہنے والے کے لیے بھی پناہ کا اعلان کر دیا گیا۔

۶۔ پھر ہتھیار پھینک دینے والے کے لیے بھی امن کا پیغام سنا دیا گیا۔

۷۔ پھر زخمی یا اسیر ہونے والے پر بھی تلوار اٹھانے کی ممانعت کر دی گئی۔

۸۔ بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ: "جو حکیم بن حزام کے گھر کے اندر داخل ہو جائے اسے بھی پناہ۔"

یہ ہے وہ موقع جہاں انسانی اقتدار کا امتحان ہوتا ہے۔ یہ فتح مبین تھی اور ایسی غالبانہ فتح تھی کہ ایک اشارے میں پورا مکہ خاک سیاہ بن سکتا تھا۔ فاتحین فتح کے نشے میں سرشار ہوتے ہیں اور دبا ہوا جذبہ انتقام ابھر آتا ہے۔ چن چن کر لوگوں سے بدلہ لیا جاتا ہے لیکن یہاں تو فتح کی ایسی نئی قدریں پیش کرنی تھیں جو بلند ترین انسانیت کا مظہر ہوں اور رہتی دنیا تک ہر فاتح کے لیے اسوہ حسنہ ہو۔ اپنی طرف سے حضورؐ نے ہر وہ ممکن تدبیر کی کہ کسی انسان کا خون نہ بہے۔

لیکن ایک جگہ قضائے الٰہی غالب آگئی۔ خالدؓ جس راستے سے گزر رہے تھے وہاں قریش کے ایک گروہ نے مزاحمت کرتے ہوئے تیر برسائے جس سے کرز بن جابر فہری اور حبیش بن عامر شہید ہو گئے۔ مجبوراً خالد کو جواب دینا پڑا اور تیرہ قریشی مارے گئے۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو خالدؓ سے باز پرس فرمائی۔ خالدؓ نے یہ عذر پیش کیا کہ ابتدا قریش کی طرف سے ہوئی تھی۔ آں حضرتؐ نے فرمایا: "یہ قضائے الٰہی تھی۔"

چند سرکش

جہاں پناہ عام کا یہ اعلان تھا وہاں آں حضرتؐ نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ:

"عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، عبدالعزیٰ بن خطل، عکرمہ بن ابی جہل، مقیس بن صبابہ اور ام سارہ جہاں بھی ملیں انھیں قتل کردیا جائے خواہ وہ کعبہ کے پردے کو پکڑے ہوئے ہوں۔" عبداللہ بن خطل کو تو سعید بن حریث نے قتل کیا۔ یہ اس وقت کعبے کے پردے کو پکڑے ہوئے تھا۔ مقیس کو لوگوں نے بازار میں دیکھا اور قتل کر دیا۔

عکرمہ بن ابی جہل ایک کشتی میں سوار ہو کر بھاگے مگر راستے میں شدید طوفان سے دوچار ہوئے۔ کشتی سوار آپس میں باتیں کرنے لگے کہ: "اس وقت خالص اللہ کو پکارو کیوں کہ دوسرے معبود اس وقت تمہارے کسی کام نہ آئیں گے۔ عکرمہ نے کہا: "بخدا اگر سمندر میں بجز اللہ کے اور کوئی چیز نہیں بچا سکتی تو خشکی پر بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا۔ اے اللہ! اگر تو مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دے تو میں عہد کرتا ہوں کہ محمدؐ کے پاس جا کر آپؐ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں گا اور میں انھیں عفو و کریم ہی پاؤں گا۔ اس کے بعد عکرمہ آئے، اور ایمان لے آئے۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح حضرت عثمانؓ بن عفان کے پاس روپوش ہوگئے اور جب لوگ بیعت کے لیے حضورؐ کے پاس آنے لگے تو حضرت عثمانؓ انھیں لے کر آئے اور عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! ان کی بیعت لے لیجیے۔" آں حضرتؐ نے انھیں تین بار دیکھا اور ہر بار گویا بیعت سے انکار فرمایا۔ اس کے بعد پھر بیعت لے لی۔ اس کے بعد صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ: "جب تم مجھے دیکھ رہے تھے کہ میں اس کی بیعت لینے سے پس و پیش کر رہا ہوں تو کیا تم میں کوئی ایسا سمجھ دار نہ تھا کہ جو اسے اٹھ کر قتل کر دیتا؟" صحابہ نے عرض کیا کہ: "یا رسولؐ اللہ! حضورؐ کے دل کی بات کا ہمیں

کیا علم تھا۔ حضورؐ نے ذرا آنکھ سے اشارہ فرما دیا ہوتا۔" فرمایا: "کسی نبی کو خیانت چشم زیب نہیں دیتی۔"

لمحہ فکریہ

عبداللہ بن ابی سرح سیدنا عثمانؓ کا رضاعی بھائی تھا۔ اسے واجب القتل اس لیے قرار دیا گیا تھا کہ یہ کتابت وحی کرتا تھا تو اس میں ردوبدل کر دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا کوئی جرم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس ارتداد کی سزا قتل کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لیے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سزاوار قتل قرار دیا' لیکن سیدنا عثمانؓ کی سفارش سے اس کا دوبارہ اسلام قبول فرما کر بیعت کر لی۔ یہ رحمت کی انتہا ہے۔ پھر اس موقعے پر جو سب سے بڑی نبوی قدر ظاہر ہوئی وہ یہ ہے کہ نبی یہ کبھی نہیں کر سکتا کہ بہ ظاہر تو چپ رہ کر خون معاف کر دے اور دوسری طرف آنکھوں سے اشارہ کرے کہ اسے قتل کر دو۔ اس کا حکم قتل بھی علانیہ ہو گا اور معافی بھی علانیہ ہو گی۔ نبی کوئی سیاسی دوغلا پن سکھانے نہیں آتا۔ وہ ایمان دارانہ انداز زیست کی تعلیم دیتا ہے۔ جس میں منافقت کا کوئی شائبہ نہ ہو۔

اس روایت سے ایک اور حقیقت کا بھی پتہ چلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آں حضرتؐ ایک ایسی امت رشیدہ پیدا فرمانا چاہتے تھے جس میں منشائے نبوی کو تاڑ جانے کی کمال صلاحیت ہو۔ ہر ایک بات صاف لفظوں میں نہیں کہی جاتی۔ کہیں الفاظ کنایہ ہوتے ہیں' کہیں خاموشی ہوتی ہے اور کسی جگہ محض تیور ہوتے ہیں اور ان سب کے خاص خاص منشا ہوتے ہیں۔ اگر کسی شخص میں باریکیوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو تو اس کا فقیہہ ہونا مشکل ہے۔ تفقہ فی الدین کے لیے محض مخلص و فداکار ہونا کافی نہیں۔ اس کے لیے کلام الٰہی اور حدیث نبوی ——— جس میں قول' فعل اور سکوت سب داخل ہیں ——— کے تیور

پہچاننا بھی ضروری ہے تاکہ صحیح منشا معلوم ہو سکے۔ محض الفاظ کی پیروی سے وہی غلط فہمی ہو سکتی ہے جو بعض مخلص' سادہ لوح صحابہ کو قرآن کے الفاظ خیط ابیض اور خیط اسود سے ہوئی تھی جس کے معنی تو ہیں افق کی سفید و سیاہ دھاریاں' لیکن وہ اس کا مطلب سمجھتے تھے سفید و سیاہ دھاگے۔

شان رسالت اور تطہیر کعبہ

۲۰ رمضان ۸ھ کو فاتح القلوب رسول رحمتؐ فاتحانہ مکے میں داخل ہوئے۔ اونٹنی پر سوار تھے اور آزاد کردہ غلام زید شہید کا یتیم فرزند اسامہ ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ انا فتحنالک فتحا مبینا کی سورت تلاوت فرمائی جا رہی تھی۔ فاتحانہ داخلہ تھا' لیکن جھکا ہوا سر اقدس عبدیت کاملہ کا اظہار کر رہا تھا۔ حضرت اکرمؐ کا قیام مقام خیف میں ہوا تھا جیسا کہ اکثر روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بعد پہلے حضورؐ نے کعبتہ اللہ کو بتوں سے پاک صاف کیا۔ بیت اللہ اس وقت تین سو ساٹھ بتوں کا مسکن تھا۔ ایک چھڑی کی نوک سے حضورؐ ایک ایک بت کو اس طرح ٹھوکر لگاتے تھے کہ بت سربہ سجود ہو کر الٹ جاتے تھے یا چت ہو جاتے تھے۔ زبان مبارک پر اس وقت یہ آیت تھی: جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا ○ (بنی اسرائیل: ۸۱) یعنی حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ باطل تو مٹنے والی چیز تھی۔ کبھی یہ آیت تلاوت فرماتے: جاء الحق و مایبدی الباطل و ما یعید (سبا: ۴۹) یعنی حق آگیا اور باطل نہ کرنے کا رہا نہ دھرنے کا۔ کعبے کے اندر جا کر حضرت عمرؓ تمام تصاویر پہلے ہی مٹا چکے تھے۔ جب بیت اللہ حقیقی معنی میں پاک ہو چکا تو حضورؐ نے عثمان بن ابی طلحہ کو' جو کلید بردار کعبہ تھے' بلوایا اور ان سے بیت اللہ کی چابی طلب فرمائی۔ روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ پہلے طواف کعبہ کیا پھر چابی مانگی۔

ایک پیشین گوئی کا ظہور

ابتدائے نبوت کے ایام میں ایک دن حضرت اکرمؐ نے عثمان بن ابی طلحہ سے خانہ کعبہ کھولنے کو فرمایا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "عثمان دیکھ لینا ایک دن خانہ کعبہ کی چابی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جسے چاہوں گا دوں گا۔" آج اس پیشین گوئی کا پورا ظہور ہوا۔ آں حضرتؐ نے عثمان سے چابی لی اور قفل کھول کر اندر تشریف لے گئے۔ آج کعبہ اپنی قسمت پر ناز کر رہا ہے کہ اس کے اندر اس کا وارث حقیقی اپنے مبارک قدم رکھ رہا ہے۔ وہ وارث جس کا ہر نقش قدم قبلہ گاہ عالم ہے۔

گری پڑتی ہے اک دنیا جبین شوق گھسنے کو
جہاں ان کا قدم پڑتا ہے کعبہ ہو ہی جاتا ہے

کعبہ دو جہاں کعبتہ اللہ میں

حضورؐ اکرمؐ بلالؓ اور طلحہؓ کو ساتھ لے کر اندر گئے اور بارگاہ الٰہی میں اپنا سرنیاز خاک پر رکھ کر عبدیت و تشکر کا نذرانہ پیش فرمایا۔ باہر تشریف لائے تو عباس نے کلید کعبہ بنو ہاشم کو دیے جانے کی درخواست کی۔ رحمت عالمؐ نے فرمایا: الیوم یوم البرو الوفاء "آج ہی کا دن تو ہے جب کہ بروں کے ساتھ نیکی اور بے وفاؤں کے ساتھ وفا کی جائے گی۔" یہ فرما کر کنجی عثمان ہی کے حوالے کر دی اور فرمایا کہ جو تم سے یہ کلید چھینے گا ظالم ہوگا۔ ممکن ہے یہ حکم صرف عثمانؓ بن ابی طلحہ کے ساتھ مخصوص ہو' لیکن امت نے اس فرمان کا اتنا احترام کیا ہے کہ ان تیرہ صدیوں میں آج تک یزید کے سوا کسی نے اس خاندان سے یہ حق سلب نہ کیا۔

عجیب خطبہ

اس کے بعد حضورؐ نے مجمع پر نگاہ ڈالی تو ان خوں خواران قریش کو دیکھا جو اگرچہ اس وقت بے کس تھے اور مسلمانوں کے قبضے میں تھے' لیکن ان

کے پیچھے مظالم کا ہر واقعہ تلواروں کو گردن زنی کی دعوت دے رہا تھا۔ پہلے حضورؐ نے ایک بلیغ خطبہ دیا جس کے آخری الفاظ یہ ہیں: حمد و ثنا کے بعد

یا معشر قریش ان اللّٰہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیہ و تعظمھا بالا بآء الناس من آدم و آدم من تراب۔

اے قریشیو! آج اللہ تعالیٰ نے تمھارے جاہلانہ گھمنڈ اور نسب کے تفاخر کو خاک میں ملا دیا۔ سارے انسان ایک آدم سے پیدا ہوئے اور آدم مٹی سے بنے۔

پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

یآیھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی و جعلنکم شعوبًا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقکم (الحجرات: ۱۳)

اے انسانو! ہم نے تمھیں ایک ایک مرد و زن سے پیدا کیا ہے اور تمھیں قبیلوں اور خاندانوں میں اس لیے بانٹ دیا کہ تم ایک دوسرے کو (باسانی) شناخت کرسکو۔ ورنہ اللہ کے نزدیک تو سب سے زیادہ قابل عزت وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

اعدا سے درگزر کی عجیب مثال

اس خطبے کے بعد ظالم خون خواران قریش کی طرف حضورؐ نے متوجہ ہو کر پوچھا کہ: "اے قریشیو! تمھیں معلوم ہے کہ آج میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟" قریش اگرچہ ظالم تھے مگر حضورؐ اکرمؐ کے مزاج شناس تھے۔ فوراً بول اٹھے: اخ کریم و ابن اخ کریم یعنی شریف النفس بھائی اور شریف الطبع بھائی کے فرزند ہیں۔" یعنی حضورؐ سے خیر ہی کی توقع ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

فانی اقول کما قال یوسف لاخوتہ لا تثریب علیکم الیوم

اذھبوا فانتم الطلقاء۔
آج میں تم بھائیوں سے وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ آج تم پر کوئی دار گیر نہیں۔ جاؤ آج تم سب چھوڑ دیے گئے۔
ادھر جسم آزاد ہوئے ادھر قلوب مسخر ہونے لگے۔ روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ حضورؐ اکرم نے مہاجرین سے ان تمام مملوکات سے دست بردار ہو جانے کو فرمایا جن پر اہل مکہ نے قبضہ کر لیا تھا۔

کعبہ میں پہلی اذان اور جماعت

ظہر کا وقت آیا تو موذن رسولؐ سیدنا بلالؓ نے کعبتہ اللہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی اور اس لشکر جرار کے ساتھ حضورؐ نے نماز ادا فرمائی۔ یاد کرو اس وقت کو جب کہ اسی حرم میں یاد الٰہی اور نماز کی حالت میں سردار دوجہاں کی گردن پر اوجھ ڈالا گیا تھا اور گردن میں کپڑا ڈال کر اسے بل دیا گیا تھا۔ آج کہاں ہیں وہ جباران قریش اور آج وہ مستہزئین کدھر گئے۔ جاء الحق وزھق الباطل۔

ہر گھر میں اسلام

نماز کے بعد رسولؐ خدا کوہ صفا پر چڑھ گئے۔ قریباً سارا مکہ اسی روز اسلام لا کر اہل صفا میں داخل ہو گیا۔ پہلے مردوں کی جماعت نے آکر بیعت اسلام کی' پھر عورتوں نے آنا شروع کیا۔ عورتوں سے بیعت اس طرح لی جاتی کہ ان سے ارکان اسلام اور اصلاح اعمال و اخلاق وغیرہ کا عہد لیا جاتا۔ پھر ایک پانی سے بھرے برتن میں حضورؐ اکرم اپنا دست مبارک ڈال کر نکال لیتے اور پھر عورتیں اس میں ہاتھ ڈالتیں۔ یہ پختگی عہد کا طریقہ تھا۔ عورتوں سے علاوہ دیگر ضروری باتوں کے یہ بھی اقرار لیا جاتا تھا کہ کسی کے سوگ میں قبر پر نہ بیٹھنا' سیاہ کپڑے نہ پہننا' گریبان چاک نہ کرنا' سر کے بال نہ نوچنا' چہرہ اور

سینہ نہ پیٹنا۔

ہند بنت عتبہ کا اسلام

ان ہی ایمان لانے والی عورتوں میں ہند بنت عتبہ بھی تھیں، جو ابو سفیان کی بیوی اور امیر معاویہؓ کی والدہ ہیں۔ یہ نقاب اوڑھ کر حاضر ہوئیں۔ انھیں غالباً یہ خیال ہوگا کہ جگر حمزہؓ چبانے کی پاداش میں شاید کوئی پہچان کر قتل نہ کر دے۔ بہر حال حضورؐ نے ان سے عہد بیعت لیتے ہوئے فرمایا: "اقرار کرو کہ شرک نہ کرو گی۔" ہند نے کہا: "منظور۔" حضورؐ نے فرمایا: "اور چوری بھی نہ کرنا۔" ہند نے جواب دیا: "میں اپنے شوہر کے مال میں سے کبھی تھوڑا بہت لے لیا کرتی ہوں، معلوم نہیں یہ چوری میں داخل ہے یا نہیں۔" حضورؐ نے فرمایا: "اور زنا بھی نہ کرنا۔" ہند بولیں "شریف عورتیں ایسا نہیں کیا کرتیں۔" پھر حضورؐ نے ارشاد فرمایا "اور اولاد کو قتل نہ کرنا۔" ہند نے کہا "ہم نے تو چھوٹے بچوں کو پرورش کر کے بڑا کیا اور جب وہ بڑے ہوئے تو آپؐ نے جنگ میں انھیں قتل کیا۔" (بدر میں ہند کے لڑکے مارے گئے تھے)۔ حضورؐ سرور کائناتؐ سراپا رحمت تھے، اس بے باکانہ برجستگی پر ہنس پڑے۔ اور فرمایا: "تم ہند معلوم ہوتی ہو۔" انھوں نے کہا: "ہاں یا رسولؐ اللہ اپنے کیے پر نادم ہوں۔" اسلام لانے کے بعد ہندؓ اپنے گھر گئیں اور بڑے بت کو اپنے ہاتھ سے یہ کہہ کر توڑا کہ "تو نے ہی مجھے آج تک دھوکے میں رکھا۔" غزوہ یرموک میں یہ شریک تھیں اور بڑے جوش کے ساتھ یہ مردوں کو ہمت دلا رہی تھیں۔ یاد کرو وہ وقت جب کہ کل یہ کافران قریش کو جوش دلانے کے لیے میدان احد میں سب سے آگے آگے تھیں اور آج یرموک میں کیا انقلاب ہوگیا ہے۔ مکے میں جو مرد و زن باقی رہ گئے تھے وہ تھوڑے ہی دنوں بعد ایمان لے آئے۔

نبی اکرمؐ نے پندرہ روز مکہ معظمہ میں قیام فرمایا، اس کے بعد حنین

کی جانب ہوازن و ثقیف کی تادیب کے لیے روانہ ہو گئے۔

اپنی نوعیت کی پہلی فتح

آپ نے فتح مکہ کے حالات سنے اور اس کے علاوہ بھی آپ نے اور بہت فتوح کے واقعات سنے اور پڑھے ہوں گے۔ کیا ایسی شان دار فتح دنیا میں اور بھی کہیں دیکھی یا سنی ہے؟ ایسی فتح جس میں خون کا ایک قطرہ بھی بہانے کا از خود اقدام نہ کیا گیا ہو؟ ایسی فتح جس میں عام دشمنوں کے لیے عام درگزر کا پیغام سنایا گیا ہو؟ ایسی فتح جس نے ملک کے ساتھ ساتھ اسی دن ہزاروں قلوب کو بھی فتح کر لیا ہو؟ ایسی فتح جس نے فاتح کے خلاف آج تیرہ صدیوں میں پھر کبھی بغاوت نہ پیدا ہونے دی ہو؟ ایسی فتح جس نے اپنے مشن کی تکمیل کا آخری نمونہ دکھا دیا ہو؟ ایسی فتح جس نے فاتح کو پہلے سے زیادہ منکسر' متواضع اور رحیم بنا دیا ہو؟ ایسی فتح جس نے ایک طرف روسائے قریش کا سر نیچا کیا ہو تو دوسری طرف ایک غلام زادے (اسامہ) کو فاتح کے ساتھ اونٹ پر بٹھا کر غلاموں کا درجہ شاہنشاہوں سے زیادہ بلند کر دیا ہو؟ ایسی فتح جو فتح مبین ہو اور ایسی فتح جس نے خائنوں کو امین' ڈاکوؤں کو نگہبان' چوروں کو محافظ' دختر کشوں کو دختر پرور' ظالموں کو عادل' سنگ دلوں کو رحیم' وحشیوں کو متمدن' جاہلوں کو معلم' غلاموں کو فرماں روا' ذرے کو آفتاب' دشمنوں کو جاں نثار اور جہنمیوں کو "مطلوب جنت" بنا دیا ہو؟ کس قوم کی تاریخ کا کوئی ورق اور کس فاتح کی سیرت ان سوالوں کا جواب اثبات میں دے سکتی ہے' لطف کی بات دیکھو۔

عجیب عنایت و کرم

دوستوں پر سبھی عنایات کرتے ہیں۔ اگر ابوبکرؓ و عمرؓ پر عنایات ہوئیں تو ہونی چاہیے تھیں مگر یہاں فاتحانہ رحم و کرم کس پر ہوتا ہے؟ ابو سفیان پر جو

قریش کے ہر معاندانہ اقدام کا ہیرو ہے۔ کس پر؟ ہندؓ پر' جو ابوسفیان کی بیوی اور حمزہؓ کا جگر چبانے والی ہے۔ کس پر؟ وحشیؓ پر' جو حمزہؓ کا قاتل ہے۔ کس پر؟ راہ میں کانٹے بچھانے والوں پر' گلے میں کپڑے کا پھندا کسنے والوں پر' پیٹھ پر اوجھ کا بوجھ ڈالنے والوں پر' گالیوں اور تالیوں سے ہر جگہ استقبال کرنے والوں پر' پتھروں سے مار مار کر خون بہانے والوں پر' ان ظالموں پر جنھوں نے صرف خدا پرستی کے جرم میں تین سو میل کے فاصلے پر بھی امن کا سانس نہ لینے دیا۔ اللہ اللہ درگزر' عفو و کرم' مہر و رحم کا یہ نمونہ رحمت للعالمینؐ کے سوا کون پیش کر سکتا تھا؟ کون ایسے خوں خواروں کو انتم الطلقاء کا پیغام سنا سکتا ہے؟ رحم ہی نہیں بلکہ حد تو یہ ہے کہ جس ابو سفیانؓ نے گھر سے بے گھر کیا' حرم سے بے پناہ کیا' آج اسی ابو سفیانؓ کے گھر کو پناہ گاہ بنایا جا رہا ہے اور حرم کی طرح اسے بھی امن گاہ بنایا جا رہا ہے۔ جس عثمان بن ابی طلحہ نے کبھی کلید کعبہ دینے سے انکار کیا تھا' آج اسی عثمان کو ہمیشہ کے لیے کلید برداری کعبہ کا منصب سونپا جا رہا ہے۔

* * *

(۲۴)

غزوۂ حنین

سرحد مکہ کے پاس مشرقی سمت عرفات سے تین میل پر حنین ایک مقام ہے جہاں قبائل ہوازن و ثقیف آباد تھے۔ یہ قبیلے فن حرب کے ماہر اور سرکشی میں ممتاز تھے۔ فتح مکہ کی خبر سننے کے بعد ان کے اندر خوف و رجا کی دو حالتیں پیدا ہوئیں۔ خوف تو اس سے ہوا کہ کہیں اہل مکہ کی طرح مسلمان ہمیں بھی مغلوب نہ کر لیں' اور رجاء و امید اس بات کی پیدا ہوئی کہ ہم نے مسلمانوں کو مغلوب کر لیا تو علاوہ انتقام بت شکنی کے اہل مکہ کے جو باغ اور املاک طائف میں ہیں ان پر ہم قابض ہو جائیں گے۔ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر ہم مغلوب ہوگئے تو جس طرح آج بھی مسلمانوں کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنی ہے اسی طرح کل بھی بسر کرلیں گے۔

دراصل ہوازن و ثقیف کی تیاریاں صلح حدیبیہ کے بعد ہی سے شروع ہو گئی تھیں اور کم و بیش ایک سال ان کی یہ جدوجہد جاری رہی۔ تمام قبائل عرب کو انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ابھار کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ایک متحدہ حملہ کر کے شوکت اسلام کو ختم کر دیا جائے۔ یہ موقع ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ فتح مکہ کی خبر دفعتہ" ملی اور یہ اپنے لیے اور زیادہ خطرہ محسوس کرنے لگے۔ انھیں مسلمانوں کے مدینے سے روانگی کے وقت ہی خبر ہو گئی تھی' لیکن یہ سمجھے کہ حملے کا رخ ہماری طرف ہے' اس لیے انھوں نے زور شور سے تیاریاں شروع کر دیں۔ اب فتح مکہ کی خبر ملنے کے بعد انھیں کوئی اور تیاری کرنے کی

ضرورت نہ تھی' صرف پیش قدمی کی حاجت تھی۔ سامان و مواد سب تیار تھے' اس لیے یہ خود مسلمانوں کی طرف بڑھے۔ چار ہزار آزمودہ کار جنگ جو سپاہیوں کا دستہ تھا اور ہر قبیلے نے اپنے اہل و عیال کو بھی اس لیے ساتھ رکھ لیا تھا کہ ان کی حفاظت کا خیال پیٹھ پھیرنے نہ دے گا۔ یہ لشکر وادی حنین میں خیمہ زن ہوا۔ فوجی قیادت کے لیے دو شخصوں کا انتخاب ہوا۔ ایک مالک بن عوف کا جو سردار ہوازن تھا۔ دوسرے درید بن صمہ کا جو قبیلہ خثم کا سردار اور آتش زبان شاعر تھا۔ درید سو برس کا بڈھا اور ہڈیوں کا پنجر تھا لیکن اس کی دانائی و تدبر کے باعث پلنگ پر اٹھا کر اسے میدان جنگ میں لایا گیا تھا۔

حضرت اکرمؐ کو جوں ہی خبر ملی فوراً عبداللہ بن جدرد کو تحقیق حال کے لیے بھیجا۔ عبداللہ نے واپس آکر تصدیق کی تو حضورؐ اکرم نے فوراً کوچ کی تیاریاں شروع فرما دیں۔ سامان و نقد کی کچھ کمی تھی' اس لیے عبداللہ بن ربیعہ سے تیس ہزار درہم اور صفوان بن امیہ سے سو (یا اس سے زیادہ) زرہیں قرض لیں۔ اس کے بعد یہ لشکر جرار جس میں دس ہزار مسلمان مجاہدین اور ان کے علاوہ قریباً" دو ہزار نومسلم تھے' حنین کی طرف روانہ ہوا۔ بعض روایات سے ان دو ہزار نومسلموں میں معاہد و حلیف غیر مسلموں کا شریک ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ حضورؐ کو اس کی ضرورت تو نہ تھی لیکن ممکن ہے کہ خود انھوں نے یقین فتح کے بعد حصول غنیمت کی غرض سے شرکت کی درخواست کی ہو اور حضورؐ نے اسے منظور فرما لیا ہو۔

تنبیہہ مقربین اور قلت و کثرت کا فریب

ادھر چار ہزار تھے اور ادھر بارہ ہزار۔ بہ ظاہر کیا قیاس ہو سکتا تھا؟ بعض مسلمان بول اٹھے کہ "آج ہم پر کون فتح پا سکتا ہے۔" اللہ تعالیٰ کو یہ اطمینان اور اکڑ پسند نہ آئی اس لیے فوراً ہی ایک ٹھوکر بھی دے دی گئی۔ یعنی

پہلے ہی حملے میں یہ بارہ ہزار مجاہدین میدان چھوڑ کر بھاگے جس کی تفصیل ابھی آتی ہے۔ پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ جو بندے جتنے زیادہ مقرب ہوتے ہیں اسی قدر جلد ان کی لغزش پر تنبیہہ اور غلطی کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ ورنہ ان کے پیچھے چلنے والے فوراً ہی بے راہ ہو جائیں۔ لیکن گمراہوں میں جو جتنا زیادہ گم راہ ہو اسی قدر ڈھیل دی جاتی ہے۔ جب سارا مواد اکٹھا ہو جاتا ہے تو ایک بار ''ان کیدی متین'' کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ نیک بندوں کی ذرا ذرا سی باتوں پر گرفت ہوتی ہے اور جلد سے جلد ہوتی ہے اور بدکاروں کو بڑی بڑی بدکاریوں پر بھی مہلت دی جاتی ہے۔

جوشیلے مسلمانوں کا اترانا اور پھولنا کیوں کر پسند آسکتا تھا جب کہ نفسیاتی لحاظ سے بھی یہ مضر ہے کیوں کہ اس طرح کا اطمینان قوت مدافعت میں کمی اور پائے ثبات میں لغزش پیدا کر دیتا ہے۔ جب ہی تو قرآن کریم نے قلت و کثرت کے تصور ہی سے بے نیاز رکھا ہے۔ جس طرح قلت کا ڈر ایک شرک خفی ہے' اسی طرح کثرت پر بھروسہ بھی خدائی مدد سے بے نیازی کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ایک سبق دینا مقصود تھا کہ مسلمان اگر ڈرتا ہے تو صرف خدا سے ڈرے' قلت تعداد کوئی ڈرنے کی چیز ہی نہیں۔ اسی طرح اگر بھروسہ کرنا ہے تو صرف اللہ پر کرے' کثرت تعداد کوئی توکل و اعتماد کی شے ہی نہیں۔ یہی قرآنی نظریہ ہے جسے بعض اترانے والے نومسلم نوجوانوں نے سمجھنے کے باوجود وسعت ظرف سے کام لینے میں لغزش کی ہوگی۔ لیکن پروردگار عالم کو اتنا بھی گوارا نہ ہوا کیوں کہ انھیں تاقیامت آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ بننا تھا۔ لتکونوا شهداء على الناس۔

کیفیت جنگ اور اعلان صداقت

بہر کیف ادھر بے خطا تیر اندازی کرنے والوں کا ہجوم تھا جنھوں نے

مناسب مقامات اور کمین گاہوں پر پہلے سے قبضہ کر رکھا تھا۔ غاروں اور گھاٹیوں میں تیر انداز بہادر پیشتر سے بٹھا دیے تھے۔ ادھر خالدؓ کی کمان میں نو خیزوں کا دستہ مقدمتہ الجیش بنا ہوا تھا جن میں وہ نا آزمودہ کار نو مسلم تھے جن کے پاس اسلحہ جنگ بھی نہ تھے۔ نشیب میں جگہ ملی تھی اور ہتھیاروں کی جگہ جوش شباب اور زعم شجاعت تھا۔ صبح کی تاریکی میں جنگ کا آغاز ہوا۔ ہوازن و ثقیف اور دیگر قبائل کے ہزاروں تیر اندازوں نے یک بارگی حملہ کر کے تیروں کی بارش شروع کر دی۔ مقدمتہ الجیش کا دستہ پیچھے ہٹا۔ اس کے ریلے میں پیچھے کے لوگ بھی ہٹے اور اسلامی فوج میں ایسی ابتری پھیلی کہ بجز چند صحابہؓ کے سارا مجمع منتشر ہو گیا۔ حضورؐ اکرم موقع احد کی مانند یہاں بھی میخ آہنی کی طرح جمے رہے۔ ایک کوہ مردانگی تھا جو دشمن کی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔ شہسوار اپنی سواریوں پر بھاگ رہے ہیں لیکن صرف ایک شہسوارؐ ہے جو اپنے سفید خچر سے اتر کر سرو قد کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ:

انا النبی لا کذب انا بن عبدالمطلب

میں نبی ہوں یہ غلط نہیں میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں

اس مردانہ رجز میں بھی وہی تبلیغ کارفرما ہے جس کے لیے بعثت ہوئی ہے' یعنی چاہے سارے مجاہدین پیٹھ پھیر لیں مگر میں' میری رسالت' میرا پیغام سب سچے ہیں' خواہ کوئی ثابت قدم رہے یا نہ رہے۔ پھر حضورؐ نے انصار کو للکارا کہ یا معشر الانصار جدھر رخ کر کے پکارا ادھر ہی سے جواب ملا لبیک یا رسول اللہ پھر عباس سے کہا کہ تم انصار و مہاجرین کو آواز دو۔ عباسؓ نے یا معشر الانصار اور یا اصحاب الشجرۃ بہ آواز بلند کہا۔ ان آوازوں کا کانوں میں پڑنا تھا کہ دفعتہً ہوا کا رخ بدل گیا۔ تمام مجاہدین پلٹ پڑے۔ اب کے انصار و مہاجرین آگے آگے تھے۔ یہ نہ رکنے والا سیلاب دشمنوں کی طرف بڑھا تو جنگ کا نقشہ پلٹ گیا۔ دشمنوں کے ستر آدمی

مارے گئے۔ ان کا علم بردار عثمان بن عبداللہ بھی قتل ہوا' اور اس کے قتل ہوتے ہی عسکر اسلامی کا چہرہ تھا اور فوج اعدا کی پشت۔ مالک بن عوف تو تمام جنگ جو بہادروں کو لے کر قلعہ طائف میں گھس گیا اور درید بن صمہ عورتوں بچوں کو لے کر اوطاس میں پناہ گزین ہوا۔

غزوۂ اوطاس

حنین سے فارغ ہو کر حضرت اکرمؐ نے ایک دستہ ابو عامرؓ اشعری کی سرکردگی میں اوطاس کی طرف بھیجا۔ ابو عامرؓ درید کے بیٹے سلمہ کے ہاتھ سے شہید ہوئے اور علم اسلامی قاتل نے لے لیا۔ ابو موسیٰ اشعری فوراً بڑھے اور اسے مار کر علم پر قبضہ کر لیا۔ تھوڑے مزید مقابلے کے بعد عسکر اسلامی کی فتح ہوئی۔ چھ ہزار عورتیں اور بچے' چوبیس ہزار اونٹ' چالیس ہزار بکریاں' چار ہزار اوقیہ چاندی بطور غنیمت ہاتھ آئی۔ یہ کل غنیمت حضورؐ اکرم کے حکم سے مقام جعرانہ میں محفوظ کر دی گئی۔

محاصرہ طائف

حنین کے بقیۃ السیف نے طائف میں آکر پناہ لی تھی۔ جو ایک نہایت محفوظ مقام تھا۔ چاروں طرف شہر پناہ کھڑی تھی جس کے اوپر جا بہ جا منجنیقیں نصب تھیں اور تیر انداز دستے بٹھا دیے گئے تھے۔ اندر کوئی سال بھر کی رسد بھی جمع تھی۔ یہاں کے ثقفی قبائل بھی جنگ و پیکار میں مشہور تھے۔ جیش اسلامی نے طائف کا محاصرہ کر لیا۔ بیس دن محاصرہ رہا' لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ مجاہدین میں سے بہت سے لوگ زخمی ہوئے کیوں کہ وہ اوپر سے پتھر' تیر اور لوہے کی گرم سلاخیں مسلسل برسا رہے تھے۔ حضرت اکرمؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ نوفل بن معاویہ نے کہا کہ ''اگر مسلسل محاصرہ قائم رکھا جائے تو ایک دن یہ قابو میں تو آجائیں گے۔ لیکن اگر انھیں اسی حال میں چھوڑ دیا

جائے جب بھی کوئی خاص نقصان نہیں۔" یہ رائے حضورؐ نے پسند فرمائی اور محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ لوگوں نے ثقیف کے لیے بددعا کی درخواست کی۔ حضورؐ نے فرمایا: "الٰہی ثقیف کو ہدایت دے اور میرے پاس حاضر کر دے۔" آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ کس طرح اس کا ظہور ہوا۔

تقسیم غنائم اور ایک پیچیدگی کا حل

اس کے بعد حضورؐ اکرم تقسیم غنیمت کے لیے جعرانہ تشریف لائے۔ اسیروں کی تقسیم کا معاملہ ملتوی رکھا گیا۔ اس خیال سے کہ شاید ان کے قبیلے کا کوئی آدمی آکر فدیہ وغیرہ کی گفت و شنید کرے۔ باقی مال کی تقسیم پنج گانہ کی گئی جس میں سے ایک حصہ بیت المال کے مصارف کے لیے رکھا گیا اور باقی مجاہدین میں تقسیم کیا گیا۔

سب سیرت نگاروں نے تسلیم کیا ہے کہ خیبر کی غنیمت میں پیدل کا ایک حصہ اور سواروں کے دو حصے لگائے گئے تھے اور یہی دستور ہمیشہ رہا کیا ہے۔ لیکن غنیمت حنین کے متعلق سب لکھتے ہیں کہ ہر پیدل کے حصے میں چار اونٹ اور چالیس بکریاں اور سوار کے حصے میں بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں آئیں۔ یعنی پیدل کا ایک حصہ اور سوار کے تین حصے لگائے گئے۔ مولانا شبلی بھی خیبر کے بیان میں لکھتے ہیں۔ "سواروں کو گھوڑوں کے مصارف کے لیے پیدل سے دوگنا ملتا تھا۔" اور خود ہی حنین کے بیان میں لکھتے ہیں کہ..... "چوں کہ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا۔" بہ ظاہر تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دو میں سے ایک ہی بات صحیح ہوسکتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ تاہم یہ افسوس ہے کہ کسی سیرت نگار نے ان دونوں کے صحیح ہونے کا کوئی حل نہیں پیش کیا۔

ہم جہاں تک سمجھ سکے ہیں یہ ہے کہ اس کا حل خود حنین کی روایت

تقسیم میں موجود ہے' اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ دستور یہی رکھا گیا تھا کہ سوار کو پیدل سے دوگنا (نہ کہ تگنا) دیا جائے لیکن غنیمت حنین کی تقسیم اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس تقسیم میں شروع سے آخر تک وہ اصول نہیں قائم رکھا گیا تھا جو عام سے رائج تھا۔ امیروقت کو خصوصاً" جب کہ امیروقت محمد رسولؐ اللہ جیسا انسان ہو' کیوں یہ اختیار نہیں کہ حالات کا لحاظ کر کے ضروری تغیرو تبدل کر دے۔ اس سے پیشتر مولف القلوب کا کوئی اہم معاملہ سامنے نہ آیا تھا۔ اب اس وقت آگیا' اس لیے اس غزوے کے حالات بالکل جداگانہ تھے اور اسی لحاظ سے تقسیم غنیمت نے بھی جداگانہ شکل اختیار کر لی۔ اسی وجہ سے آپ دیکھیں کہ ابتدا ہی سے وہ اصول نہیں برتا گیا جو معمول بہ تھا۔ چنانچہ جن جن حضرات کو جو کچھ دیا گیا ہے' ان کی فہرست یہ ہے:

ابو سفیان کو تین سو اونٹ اور ایک سو بیس اوقیہ چاندی۔ حکیم بن حزام کو دو سو اونٹ' نضیر بن حارث' صفوان بن امیہ' قیس بن عدی' سہیل بن عمرو' حویطب بن عبدالعزیٰ' اقرع بن حابس' عیینہ بن حصین اور مالک بن عوف میں سے ہر ایک کو سو سو اونٹ دیے گئے اور بہتوں کو پچاس پچاس اونٹ دیے گئے۔ باقی لوگوں میں پیدل کو چار اونٹ اور بیس بکریاں اور سوار کو اس کا تگنا دیا گیا۔ عبداللہ بن مرداس کو صرف چالیس اونٹ ملے تھے۔ اس نے غصے میں ہجویہ قصیدہ کہا۔ حضورؐ نے فرمایا: "میری طرف سے اس کی زبان کاٹ لو۔ صحابہ نے اسے کچھ اور دے کر اسے راضی کر لیا اور قطع لسان کا مطلب واضح ہو گیا۔ (اصح السیر ص ۲۹۶)

اب آپ اس پوری تقسیم کو دیکھ جائیں جو مصلحت کہ تقسیم کی ابتدا میں ہو سکتی ہے وہی پیدل اور سوار کو دیتے وقت بھی ہو سکتی ہے' جب اس پر اعتراض نہیں تو اس پر شبہ کیوں ہو؟ یہ حالات کا اقتضا تھا اور آئندہ ہونے والے امرائے امت کے لیے مشعل ہدایت۔

ایک تاریخی پیچیدگی

ہاں سو اونٹ والی فہرست میں بعض نام محل نظر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً مالک بن عوف اگر وہی ہیں جو ابھی قلعہ طائف میں ایک جنگ جو دستے کے ساتھ ہیں اور جن کو ابھی حضورؐ محاصرے سے چھوڑ کر آئے ہیں تو ان کا' درآں حالیکہ یہ ہنوز حریف ہیں' تقسیم غنیمت میں شریک ہونا سمجھ میں نہیں آتا' واللہ اعلم۔ باقی لوگوں میں یا تو ایسے ہیں جن کے قلوب میں نور ایمان آچکا ہے یا کم از کم وہ ہیں جو شریک جنگ (حنین) تھے یا کم سے کم برسرپیکار نہ تھے۔ مگر مالک تو ابھی گویا برسرپیکار ہی ہیں۔ ان ہی سے حاصل کیے ہوئے مال غنیمت میں سے ان ہی کو حصہ ملنا ذرا بعید معلوم ہوتا ہے' لیکن دراصل (یہ مالک بن عوف مسلمان ہوگئے تھے)۔

حضورؐ نے مالک سے کہلوایا تھا کہ اگر وہ اسلام لے آئے تو اس کے مال و اہل کے علاوہ سو اونٹ بھی دیے جائیں گے۔ مالک شب کو جعرانہ یا مکے میں آکر مسلمان ہوگئے اور قصیدہ کہا جس کا ایک شعر یہ ہے:

ما ان رایت ولا سمعت بمثلہ　　　　فی الناس کلھم بمثل محمد

(اصح السیر' ص ۲۹۴)

تقسیم پر اعتراض اور عجیب تسکین

حضورؐ اکرم کی اس تقسیم پر بعض انصار کو اعتراض ہوا۔ کسی نے کہا کہ "رسولؐ اللہ نے قریش کو نوازا اور ہمیں بھول گئے۔" کوئی بولا: "تلوار چلانے کو ہم ہیں اور غنیمت لینے کو قریش۔" حضورؐ کو خبر معلوم ہوئی تو پہلے خبر کی تحقیق فرمائی۔ معلوم ہوا کہ بعض نوخیز انصار نے ایسے فقرے کہے ہیں۔ حضورؐ نے تمام انصار کو بلایا اور ایک عجیب بلیغ و موثر خطبہ دیا۔ فرمایا کہ: "اے انصار کیا یہ سچ نہیں کہ تم پہلے گم راہ تھے۔ پھر اللہ نے میرے ذریعے سے

تمھاری ہدایت فرمائی۔ تم میں پھوٹ تھی اور میرے وسیلے سے تم کو متحد کیا۔ تم مفلس تھے اور میرے ذریعے سے تم کو غنی کر دیا۔" انصار ہر سوال کے جواب میں عرض کرتے جاتے تھے کہ ہاں ہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔" اب تصویر کا رخ پلٹا اور حضورؐ نے فرمایا کہ: "اے انصار تم بھی یہ جواب دے سکتے ہو کہ اے محمدؐ جب آپؐ کی لوگوں نے تکذیب کی تو ہم نے تصدیق کی۔ جب لوگوں نے نکالا تو ہم نے پناہ دی۔ آپؐ مفلس تھے اور ہم نے مدد کی۔ اے انصار تم بھی یہ کہتے جاؤ تو میں جواب دیتا جاؤں گا۔ کہ ہاں یہ سچ ہے۔" "دراصل انصار! کیا تم اسے پسند نہیں کرتے کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر اپنے گھروں کو جائیں اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لے جاؤ؟" انصار اس تقریر کو سن کر بے اختیار چیخ اٹھے کہ: "ہمیں فقط محمدؐ درکار ہے۔" اکثر انصار روتے روتے ہلکان ہو رہے تھے۔ پھر حضورؐ نے انصار کو سمجھایا کہ ان جدید الاسلام لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ ان کے استحقاق کی بنا پر نہیں دیا گیا بلکہ تالیف قلب مقصد ہے۔

اس کے بعد قیدیوں کی تقسیم کا وقت آیا تو چھ سرداران ہوازن آئے اور قیدیوں کے لیے درخواست رحم پیش کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "میں اپنے اور اس سے آگے ابنائے عبدالمطلب کے حصوں کو چھوڑ سکتا ہوں۔ عام لوگوں کے حق کے متعلق مجمع عام میں یہ سوال پیش کرو۔ دوسرے دن صبح یا ظہر کی نماز کے بعد مجمع عام میں ان سرداروں نے اپنا سوال پیش کیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں اپنے اور بنو عبدالمطلب کے حق سے دست بردار ہوتا ہوں اور عام لوگوں سے بھی تمھارے لیے میری یہی سفارش ہے۔ مہاجرین نے کہا: "یا رسولؐ اللہ ہم بھی اپنے حصے کے قیدیوں کو آزاد کرتے ہیں۔" انصار وہی انصار جن کے بعض نوخیزوں نے کل مال کم ملنے پر اعتراض کیا تھا۔ اٹھے اور عرض کیا کہ: "یا رسولؐ اللہ ہم سب بھی حضورؐ ہی کی پیروی کرتے ہوئے اپنے حصے کے قیدیوں

کو آزاد کرتے ہیں۔ بنی فزارہ اور بنی سلیم جو ابھی اسلام نہ لائے تھے حیران تھے کہ دشمن پر قابو پانے کے بعد یہ لطف کیوں کیا جا رہا ہے۔ بہرحال انھوں نے اپنے حق کو آزاد کرنے میں تامل کیا تو حضورؐ اکرم نے ہر قیدی کے عوض چھ چھ اونٹ (یا اس کی قیمت) اپنے پاس سے دے کر ان کے حصے کے قیدیوں کو رہائی دلائی۔ اس طرح تھوڑے عرصے میں چھ ہزار قیدی آزادی کا سانس لیتے ہوئے اپنے اپنے گھر روانہ ہوگئے۔ ان میں سے اکثر کو حضورؐ نے اپنے پاس سے جوڑے بھی مرحمت فرمائے۔

ان ہی قیدیوں میں شیما بنت الحارث بھی تھیں۔ یہ حلیمہ سعدیہؓ کی بیٹی یعنی حضورؐ اکرم کی رضاعی بہن تھیں۔ حضرت کریمؐ نے انھیں پہچانا، اپنی چادر بچھا کر بٹھایا۔ پچھلے ایام رضاعت یاد آئے تو حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ پوچھا تم میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو یا اپنے گھر جانا چاہتی ہو؟ شیما نے گھر جانے کی خواہش ظاہر کی تو حضورؐ نے اونٹ اور بکریاں دے کر اعزاز کے ساتھ گھر پہنچوا دیا۔

متفرقات

حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے اسی سال حضورؐ کو خدا نے ایک فرزند بخشا جس کا نام آں حضرت اکرمؐ نے ابراہیم رکھا۔ قریباً" ڈیڑھ سال کے بعد ابراہیمؓ نے وفات پائی۔ اسی دن سورج گرہن ہوا۔ بعض لوگوں نے قدیم عربی توہم کے ماتحت کہا "یہ گہن ابراہیم کی وفات کی وجہ سے ہوا ہے۔" یہ محض وہم تھا۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے ایک خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا کہ:
"چاند یا سورج کا گہن اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں، کسی کے مرنے جینے سے اسے کچھ تعلق نہیں۔" اس کے بعد صلوٰۃ الکسوف ادا فرمائی۔ سیدہ زینبؓ بنت رسولؐ (سیدنا ابو العاص کی حرم) کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔

(۲۵)

۹ ہجری ——— جیش عسرت یا غزوۂ تبوک

آپ یہ معلوم کر چکے ہیں کہ جمادی الاولیٰ ۸ھ میں حضورؐ اکرم نے تین ہزار کا ایک لشکر زیدؓ بن حارثہ کی افسری میں شرجیل بن عمرو غسانی کے ایک لاکھ فوجیوں کے مقابلے کے لیے بہ مقام موتہ بھیجا تھا۔ یہ مہم قوت قیصری کا اندازہ کرنے میں بڑی مدد و معاون ہوئی تھی اور ایک بڑا فائدہ اس سے یہ بھی ہوا تھا کہ رومیوں کا سیلاب روک لیا گیا۔ ورنہ اگر وہ مسلمانوں پر چڑھ آتے تو اس بیرونی فتنے اور پھر اندرون ملک کے فتنے دونوں کا یک جا مقابلہ مسلمانوں کے لیے دشوار ہو جاتا۔ موتہ کی مہم نے رومی طاقت اور طریق جنگ کا اندازہ بھی کر لیا' اور ان کا فتنہ اس طرف آنے سے رکا رہا' یہاں تک کہ اندرون ملک کے فتنے بہت حد تک سر ہو گئے اور تبلیغ دین اس قدر ہوئی کہ جب تو تین ہزار مجاہدین کو لے کر زیدؓ گئے تھے اور اب صرف ایک سال کے بعد تیس ہزار کی جمعیت لے کر زیدؓ کا آقاؐ جاتا ہے۔ جو لوگ موتہ سے عسکر اسلامی کے واپس آ جانے کو "ناکامی" سے تعبیر کرتے ہیں وہ صحیح نہیں۔ اس سے بڑے بڑے فوائد حاصل ہوئے ہیں' اگرچہ ادھر سیرت نگاروں کی نظر نہیں گئی ہے۔

وسط ۹ھ کا ذکر ہے کہ شامی تاجروں کے ایک قافلے نے مدینہ میں آکر یہ خبر دی کہ رومیوں نے ایک بھاری فوج مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے تیار کی ہے' اور ۵ قبائل لخم' جذام' عاملہ و غسان (یہ عربی قبائل پہلے بھی موتہ میں

رومی لشکر میں تھے) بھی شامل ہیں۔ یہ خبر ایک وجہ سے بہت شہرت پکڑ گئی۔ وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو غسانیوں کے حملے کا ہر وقت کھٹکا لگا ہوا تھا اور یہی کھٹکا ان کی قوت مدافعت کو باقی رکھے ہوئے تھا۔ قافلہ تجارت نے یہاں تک بیان کیا کہ اس رومی لشکر کا مقدمتہ الجیش بلقا تک آگیا ہے' خبر چوں کہ بہت بڑی تھی' اس لیے حضرت اکرمؐ نے عسکری تیاری کا حکم دے دیا۔ اگرچہ موسم شدید گرمی کا تھا اور پھلوں کے پکنے کا زمانہ بھی تھا۔ قحط بھی تھا اس لیے پھلوں کے پکنے کا انتظار معمول سے زیادہ تھا۔ اس پر یہ کہ سامان رسد کی بڑی قلت تھی۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے عموماً" لوگوں پر یہ سفر گراں تھا۔ منافقین بھی ان ہی مذکورہ وجوہ کو پیش کر کر کے لوگوں کو بہکا رہے تھے۔ یہ تمام رکاوٹیں پہاڑ بن کر سامنے آتی رہیں لیکن رسولؐ خدا کے آہنی عزم کے سامنے یہ پہاڑ خس و خاشاک سے زیادہ نہ تھے۔ روانگی کی تیاریاں اسی طرح جاری رہیں۔

چندے کا عدیم المثل نمونہ

پہلے تیاری کا حکم دیا گیا پھر چندے کی عام فہرست کھولی گئی۔ اس سے پہلے اس اہتمام کے ساتھ کوئی چندہ نہ ہوا تھا۔ وجوہ صرف یہ تھی کہ اس وقت تنگی و عسرت زیادہ تھی' اسی لیے اس مہم کا نام جیش العسرۃ بھی ہے۔ چندہ دینے والوں نے بھی ایثار و قربانی کے عجیب عجیب نمونے دکھائے۔ عثمان غنیؓ نے ایک ہزار دینار طلائی' نو سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے دیے۔ اونٹ اور گھوڑے کے لیے تمام سامان اس طرح مکمل فرمائے کہ ان کے باندھنے کے لیے رسی تک مہیا کر دی۔ عثمان غنیؓ کو اس کے صلے میں دو انعام فوراً ہی ملے جو دنیا و آخرت دونوں کے لیے بیش بہا سرمایہ ہیں۔ ایک تو مجہز جیش العسرہ کا خطاب ملا' دوسرے یہ ارشاد نبوی کہ آج کے بعد سے عثمانؓ کچھ بھی کریں ان کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ یہ دراصل ایک پیشین گوئی ہے کہ عثمانؓ آئندہ کوئی کام ایسا

کر ہی نہ سکیں گے جو اللہ کی نگاہ میں قابل گرفت ہو۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے چالیس ہزار درہم نقرئی حاضر کیے۔ حضرت عمرؓ گئے اور اپنے تمام نقد و جنس و مواشی کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ گھر میں رہنے دیا اور دوسرا خدمت اقدس میں حاضر کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے تن پوشی کے سوا وہ تمام چیزیں جن پر چیز کا اطلاق ہو سکے حضورؐ کے قدموں میں لا کر رکھ دیں۔ حضرت عمرؓ نے (جیسا کہ خود فرماتے ہیں) اکثر مواقع پر حضرت ابوبکرؓ سے نیکی میں بڑھ جانے کی کوشش کی تھی۔ آج ان کے پاس نقد و جنس زیادہ تھے' اس لیے خیال ہوا کہ آج تو ضرور میں اس نیکی میں سبقت لے گیا ہوں گا۔ خدا کا رسولؐ ان تمام خطرات قلب کو محسوس فرما رہا تھا' اس لیے ابوبکرؓ کے سامنے عمرؓ سے پوچھا کہ تم نے اپنے اہل و عیال کے لیے کیا رکھا ہے؟" عمرؓ نے عرض کیا "نصف"۔ پھر ابوبکرؓ سے پوچھا "تم نے گھر والوں کے لیے کیا رکھ چھوڑا ہے؟" کہا' اللہ و رسولہ" (اللہ اور اس کے رسول کو رکھ چھوڑا ہے) یہ ہی وہ صدیقیت تھی جس کو معلوم کرنے کے بعد عمرؓ نے مقابلہ و مسابقت کا خیال ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

یہ بڑے بڑے دولت مند اور صاحب ایثار مجلس مبارک میں دست بستہ حاضر ہیں اور خوش نودی رسولؐ کی لازوال دولت لوٹ رہے ہیں' پیش کردہ مال و اسباب کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اتنے میں ایک مسکین مزدور (ابو عقیل انصاریؓ) حاضر ہوتا ہے جس کے ہاتھوں میں رات بھر رہٹ چلاتے چلاتے [illegible]لے پڑے ہوئے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں دو سیر کھجوروں کی ٹوکری ہے۔ [illegible] کمی سے آنکھوں میں شرمندگی جھلک رہی ہے' مگر ساغر دل سے بادہ [illegible] چھلکا پڑتا ہے۔ اس نے رات بھر مزدوری کر کے چار سیر کھجوریں حاصل [illegible]۔ دو سیر گھر دے آیا ہے اور دو سیر اس مجلس میں چندے کے لیے لایا ہے [illegible] عثمانؓ و عبدالرحمٰنؓ جیسے دولت مندوں اور ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے ارباب ایثار کی

پیش کش کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ابو عقیل انصاری کی اس جرات پر بعض لوگ تبسم زیر لب ہوئے۔ رسولؐ کی باریک بین نگاہوں نے تاڑ لیا اور حکم دیا کہ "تمام مال و اسباب کے اوپر ابو عقیل کی کھجوریں بکھیر دو۔" اللہ اللہ! اخلاص کی قدر افزائی، مسکینوں کی دلداری اور بے کسوں کی درمندی و حوصلہ افزائی کی یہ نظیر اور کس کی سیرت میں مل سکتی ہے؟

ایثار و قربانی کے یہ نمونے دیکھنے کے باوجود قریباً ۸۲ نفر ایسے تھے جو جھوٹے سچے عذر پیش کر کے مجاہدین کے ساتھ جانے سے رہ گئے۔ حضورؐ نے سباع بن عرفط کو حاکم مقرر کیا۔ حضرت علیؓ کو ازواج و عیال کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا۔ اس سفر میں امہات مومنینؓ میں سے کوئی ساتھ نہ تھیں۔ حضرت علیؓ اس سفر میں ساتھ نہ گئے تھے، جیسے حضرت عثمانؓ شریک بدر نہ ہوئے تھے۔

روانگی اور فضیلت مرتضویؓ

یہ سب انتظامات مکمل کر کے حضورؐ تیس ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ تبوک کی طرف روانہ ہوئے۔ تبوک مدینہ اور دمشق کے درمیان مدینے سے قریباً ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ایک مقام کا نام ہے۔ یہ روانگی رجب ۹ھ میں واقع ہوئی، دس ہزار گھوڑے ساتھ تھے، اور ہر ۱۸ آدمی کے درمیان ایک اونٹ تھا۔ کھانے پینے اور گرمی کی سخت سخت آزمائشیں ہوئیں، لیکن مردان خدا تبوک پہنچ ہی گئے۔ راستے میں حضرت علیؓ تیزی سے روانہ ہو کر لشکر سے مل گئے۔ بعض لوگوں نے آپ کو طعنے دیے تھے، اس لیے غیرت نے مدینے میں بیٹھنے نہ دیا۔ جب حضورؐ اکرم نے دیکھا تو پھر مدینے واپس کیا اور یہ فرمایا کہ: "اما ترضی بان تکون منی بمنزلہ ھارون من موسی" کیا تم یہ پسند نہیں کرتے تم میرے لیے ویسے ہی بنو جس طرح حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے لیے تھے)۔ حضرت موسیٰؑ جب کوہ طور پر چالیس دن کے لیے گئے تو قوم کو

حضرت ہارون کے سپرد کر گئے تھے' وقال موسیٰ لاخیہ ھرون اخلفنی فی قومی (الاعراف: ۱۴۲)۔ اس تشبیہ نے حضرت علیؓ کا درجہ و فضل پہلے سے زیادہ بلند کر دیا۔ اثنائے سفر میں ان عمارات کے آثار ملے جو قوم ثمود نے پہاڑ کاٹ کاٹ کر بنائے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس معذب خطے سے جلدی گزر جاؤ اور یہاں کا پانی استعمال نہ کرو۔ یہ امت قوم طالوت نہ تھی جو یہاں کا تھوڑا پانی بھی استعمال کر لیتی۔ تبوک پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ رومی تیاریوں کی خبر صحیح نہ تھی۔ غالباً" مسلمانوں کی سرفروشانہ آمد دیکھ کر رومیوں نے حملے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ اندریں حالات کوئی جنگ پیش نہ آئی' لیکن رسولؐ کا آنا بے نفع نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سفر کے سلسلے میں چند باتیں قابل ذکر ہیں جنہیں ہم نمبروار لکھتے ہیں:

ا۔ متعدد قبائل کی مصالحت

رئیس غسان تمام اطراف و جوانب میں مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال بچھا رہا تھا' حتیٰ کہ مدینے تک میں اس کا آدمی پہنچ چکا تھا۔ عسکر اسلامی کی پیش قدمی اور غسانیوں اور رومیوں کی مرعوبیت سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ متعدد قبائل مصالحت پر مجبور ہو گئے۔ ایلہ کا رئیس یوحنا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جزیے پر مصالحت کر لی۔ یوحنا نے ایک سپید خچر بھی پیش کیا جس کے عوض حضورؐ نے ایک چادر تحفے میں دی۔ نیز جربا اور اذرع کے نصاریٰ حاضر ہوئے اور جزیہ دینا منظور کر لیا۔ پھر حضورؐ نے خالدؓ بن ولید کی افسری میں چار سو سواروں کا دستہ دومتہ الجندل کی طرف بھیجا۔ خالد نے یہاں کے سردار اکیدر کو گرفتار کر لیا اور اس شرط پر کہ وہ خود بارگاہ رسالت میں آکر شرائط صلح پیش کرے گا اسے رہائی دی۔ اکیدر اپنے بھائی کے ساتھ آئے اور امان لے کر واپس ہوئے' پھر کچھ دنوں کے بعد اسلام لے آئے۔

۲۔ شہید ناز عبداللہ ذوالبجادین

اس سلسلے کا اہم واقعہ عبداللہ ذوالبجادین کی وفات بھی ہے۔ ان کا قدیم نام عبدالعزیٰ تھا۔ مدینے سے منزل دو منزل کے فاصلے پر کسی گاؤں میں رہتے تھے۔ بچپن میں باپ نے انتقال کیا تھا۔ ابھی نوجوان ہی تھے کہ اسلام کی آواز کانوں میں پڑی۔ ولی چچا تھا جو تمام مال و اسباب اور جائداد پر قابض تھا۔ دیدار رسولؐ کا شوق عبداللہ کو بے چین کر رہا تھا' مگر ظالم چچا کے خوف سے خاموش تھے۔ آخر شوق دیدار ہر خوف پر غالب آیا۔ چچا سے خدمت نبوی میں حاضری کی اجازت چاہی۔ چچا نے خوب مارا' پھر جسم کے کپڑے تک اتار کر گھر سے نکال دیا۔ لیکن:

گر تن ہمہ ریزہ ریزہ گردد
مہر تو زجاں رود محال است

عبداللہ اسی حالت عریانی میں اپنی ماں کے پاس آئے۔ ماں نے ایک کمبل دیا جس کے دو ٹکڑے کر کے ایک سے ستر پوشی کی اور ایک بدن کے اوپر ڈال لیا اور اسی حالت میں مدینے پہنچے۔ بیعت اسلام کی اور شوق شہادت ظاہر کیا۔ اسی دن ان کا نام عبداللہ اور لقب ذوالبجادین (کملی کے دو ٹکڑوں والا) رکھا گیا۔ یہ اصحاب صفہ میں داخل ہو گئے۔ دن رات تعلم دین میں بسر کرتے۔ نوجوان تھے قرآن زور دار آواز میں پڑھتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ایک دن شکایت کی کہ "یا رسول اللہ ان کی آواز سے نمازیوں کی نماز میں خلل پہنچتا ہے۔" رحمت للعالمینؐ نے فرمایا کہ اسے کچھ نہ کہو۔ یہ اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر کے آیا ہے۔" ان ہی ایام میں سفر تبوک پیش آیا۔ عبداللہ بھی مجاہدین میں شامل ہوئے اور حضورؐ اکرم سے شہادت حاصل ہونے کے لیے دعا کی درخواست کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: "اگر تمھیں راستے میں موت آجائے تب بھی تم شہیدوں میں داخل ہو جاؤ گے۔" الغرض لشکر روانہ ہوا اور راستے

ہی میں عبداللہ کو تیز بخار آیا جس سے انھوں نے وفات پائی۔ بوقت وفات عبداللہ کے سرہانے مقصود کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ جمال اقدس پر نظر جمی ہوئی تھی کہ پیام اجل آگیا۔

به چه ناز رفته باشد زجهاں نیاز مندے
که بوقت جاں سپردن به سرش رسیده باشی

بعض روایتوں میں ہے کہ عبداللہ کی تکفین کے لیے حضورؐ نے اپنی چادر مبارک عنایت فرمائی' اس لیے کہ خدا و رسولؐ کی راہ میں عبداللہ نے برہنہ ہو کر گھر سے نکلنا گوارا کیا تھا۔ ان کی تدفین بھی عجیب شان سے ہوئی۔ اجلہ صحابہ نے قبر کھودی۔ قبر تیار ہونے کے بعد حضورؐ اکرم قبر میں خود اترے اور تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گئے۔ پھر اٹھ کر کہا کہ لاؤ اپنے بھائی کو۔" حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے اس مبارک اور سراپا ناز لاشے کو سہارا دے کر اتارا۔ حضورؐ نے فرمایا "ادبا الی اخیکما" یعنی عبداللہ عام مرنے والوں جیسا نہیں' اسے دھیرے دھیرے ادب سے اتارو:

آہستہ برگ گل بفشاں بر مزار او
بس نازک ست شیشہ دل در کنار او

بلالؓ ہاتھ میں مشعل لیے ہوئے تھے' اس لیے کہ شب کے وقت تدفین عمل میں آئی تھی۔ حضرت اکرمؐ نے اس "ہمہ تن فدا" کی لاش کو اپنی گود میں لے کر اتارا۔ زمین پر لٹا کر ماتھے پر بوسہ دیا اور فرمایا: "آج شام تک میں اس مرنے والے سے راضی رہا ہوں تو بھی اس سے راضی رہنا۔" حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ جیسے صحابہ اس مرنے والے کی موت پر غبطہ (رشک) کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ: "اے کاش! اس قبر میں ہم دفن کیے جاتے۔" ایک عمرؓ پر اور ابن مسعودؓ پر کیا موقوف ہے؟ دیکھنے والے تو الگ رہے۔ سننے والوں میں کون اہل ایمان ہے جو ایسی موت پر ہزار زندگیوں کو

قربان کرنے کی تمنا نہ رکھتا ہو:

منم و ہمیں تمنا کہ بوقت جاں سپردن
برخ تو دیدہ باشم تو درون دیدہ باشی

۳۔ تین معترفین خطا کا سخت امتحان اور وحی معافی

تبوک میں حضرت اکرمؐ کا قیام بیس دن رہا۔ آنے اور جانے اور وہاں کے قیام میں تقریباً" پچاس دن صرف ہوئے۔ منافقوں کو یقین تھا کہ اب کوئی مسلمان واپس نہ آسکے گا اس لیے کہ مقابلہ اس قوم سے تھا جو نصف دنیا پر حکمرانی کر رہی تھی اور جو ابھی ایرانیوں کی گردن غرور کو نیچا دکھا چکی تھی۔ منافقین کے اس پروپیگنڈے سے اہل مدینہ بھی پریشان تھے۔ جب مسلمان سالماً" غانماً" واپس آئے تو جتنی حسرت و ندامت منافقوں کی تھی اتنی ہی خوشی و مسرت اہل ایمان کو ہوئی۔ چنانچہ حضورؐ کی تشریف آوری کے وقت ایسی ہی خوشی منائی گئی جیسی ہجرت کے بعد پہلی بار داخلہ مدینہ کے وقت منائی گئی تھی۔

جو منافقین شرکت تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے' انھوں نے اپنے جھوٹے سچے عذر پیش کیے اور حضورؐ نے قبول فرما لیے۔ لیکن ان ہی پیچھے رہ جانے والوں میں تین اہل ایمان ایسے بھی تھے جنھوں نے صاف لفظوں میں اعتراف کر لیا کہ ہم محض اپنی سستی و کاہلی کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے۔ یہ کعب بن مالکؓ' ہلال بن امیہؓ' مرارہ بن ربیع تھے۔ حضورؐ نے ان تینوں کے فیصلے کو وحی الٰہی پر چھوڑ دیا اور حکم دیا کہ ان تینوں کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔ تقریباً" پچاس دن ان کا اس طرح بائی کاٹ رہا کہ ایک مسلمان حتی کہ گھر کے بیوی بچے بھی ان سے سلام و کلام نہ کرتے تھے۔ یہ ایام سخت ترین امتحان میں گزرے۔ اسی درمیان میں ایک اور بھی سخت اِمتحان ہوا۔ ایک دن ایک عیسائی نے شاہ غسان کا خط لا کر چپکے سے کعب بن مالک کے ہاتھ میں دیا جس میں

لکھا کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا آقا (محمدؐ) تم سے ناراض ہے' اگر تم اسے چھوڑ کر میرے پاس چلے آؤ تو بہترین سلوک تمھارے ساتھ کروں گا۔" کعبؓ نے یہ خط وہیں جلا ڈالا' اور جواب دیا کہ: "میرے آقا کی ناراضی بھی تیری عنایات سے لاکھ درجے بہتر ہے۔" پچاس دن اس مصیبت میں گزر گئے۔ اس کے بعد وحی نازل ہوئی وعلی الثلثه الذین خلفوا ... یعنی ان تین پیچھے رہ جانے والوں کی توبہ بھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔" حضورؐ اکرم نے اور تمام صحابہ نے مبارک بادیں دیں۔ کعبؓ نے اس خوشی میں ثلث مال راہ خدا میں خیرات کر دیا۔ یہ اپنا کل مال خیرات کے لیے پیش کر رہے تھے۔ حضورؐ نے کہا' نہیں۔ پھر کہا نصف۔ ارشاد ہوا نہیں۔ پھر کہا ثلث ارشاد ہوا۔ ہاں اتنا بہت ہے (وصیت بھی ثلث مال سے زیادہ میں نہیں ہوتی جیسا کہ سعد سے حضورؐ نے فرمایا تھا)۔

۴۔ مسجد ضرار کا نیا فتنہ اور اس کا ہدم

منافقین اپنی منافقانہ کارروائیوں سے کبھی باز نہیں آتے تھے۔ ان لوگوں نے اب اسلام کو مٹانے کی ایک نئی ترکیب نکالی۔ یعنی مسجد قبا کے مقابلے میں ایک نئی مسجد تیار کی اور بہانہ یہ کیا کہ کم زور لوگ یہیں نماز ادا کر لیا کریں گے۔ اس تعمیر مسجد کی چار بڑی اغراض تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یوں ظاہر فرمایا کہ:

والذین اتخذ وا مسجداً ضرارا وکفرا و تفریقا بین المؤمنین وارصادا لمن حارب اللہ و رسوله من قبل ط (التوبہ: ۱۰۷)

جن لوگوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے' کفر کی تائید کرنے' مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور قدیم دشمنان خدا و رسولؐ کے لیے اڈا بنانے کی غرض سے یہ مسجد تیار کرائی ہے۔

ان چار اغراض کے لیے یہ مسجد تیار کرائی گئی تھی۔ ابو عامر راہب انصاری عیسائی ہو کر شام کی طرف نکل گیا تھا اور منافقوں سے کہہ گیا تھا کہ ”میں رومیوں کا لشکر جرار ساتھ لا کر اسلام کو اس ملک سے ختم کرا دوں گا‘ تم اسلحہ اور قوت جمع کرتے رہو۔“ اسی سازش کے مطابق یہ مسجد بھی بنی تھی اور خفیہ کارروائیاں بھی شروع ہو گئی تھیں‘ لیکن عام مسلمانوں کی نظر میں اسے شبہے سے پاک رکھنے کے لیے یہ منافقین حضرت اکرمؐ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ ”اگر حضورؐ ایک دفعہ مسجد میں نماز پڑھ لیں تو یہ مسجد مقبول ہو جائے گی۔“ حضورؐ نے فرمایا کہ ”میں تبوک کی مہم پر جا رہا ہوں واپس آ کر دیکھا جائے گا۔ پھر وحی نازل ہوئی لا تقم فیہ ابداً الخ (التوبہ: ۱۰۸) اس میں ہرگز کبھی نماز ادا نہ کرنا۔ نماز کے لیے اسی مسجد قبا میں حسب معمول جاؤ۔“ چنانچہ تبوک سے واپسی پر حضورؐ اکرم نے مالکؓ اور معنؓ بن عدی کو بھیج کر اس جگہ یعنی ”مسجد ضرار“ میں آگ لگوا کر منہدم کروا دی۔

حج اکبر

مکہ رمضان ۸ھ میں فتح ہوا تھا۔ اس سال کا ذوالحجہ حج سے خالی تو نہیں گیا تھا۔ لیکن یہ حج اسلامی ارکان و فرائض کی حیثیت سے نہ تھا بلکہ اقتدائے سنت ابراہیمی یا نفلی عبادت کے طور پر تھا۔ ۹ھ میں باقاعدہ فرض ہوا اور اسلام میں پہلا حج اسی سال ادا کیا گیا۔ تین سو مسلمانوں کی جمعیت آں حضرت اکرمؐ کے حکم سے مکہ معظمہ روانہ ہوئی۔ امیر الحاج سیدنا صدیق اکبرؓ کو بنایا یعنی آپ ہی کی امامت میں یہ حج ادا ہوا۔ قافلہ حجاج روانہ ہونے کے بعد سورہ برات نازل ہوئی جسے لے کر سیدنا حضرت علی مرتضیٰؓ بعد میں تیزی سے روانہ ہوئے اور راستے میں قافلے سے جا ملے۔ چوں کہ یہ اسلام کا پہلا حج تھا جس میں مشرکوں کی روک ٹوک وغیرہ کا مطلقاً کوئی دخل نہ تھا اس لیے اس حج کو سورۂ

برات میں "حج اکبر" کہا گیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے ہر موقعے پر امامت کے فرائض انجام دیے۔ مناسک حج کی تعلیم دی اور یوم النحر میں نہایت بلیغ خطبہ دیا، جس میں حج کے مسائل و حقائق بیان فرمائے۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے سورہ برات کی چالیس آیتیں سنا کر اعلان فرما دیا کہ "اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہ ہوسکے گا، نہ اب کوئی برہنہ ہو کر حج کرنے پائے گا۔" اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ "مشرکین کے معاہدے خود ان کے نقض عہد کے سبب سے ٹوٹ گئے۔ لیکن انھیں چار ماہ کی اور بھی مہلت ہے۔ اس مدت کے بعد کوئی معاہدہ باقی نہ رہے گا۔" اس اعلان کے بعد عام طور سے لوگ مسلمان ہونے شروع ہوگئے اور یہی زمانہ ہے جب کہ تمام اطراف و اکناف سے بکثرت وفود آ آ کر مشرف بہ اسلام ہوئے اور وفات نبوی تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ نجاشی حبشہ یعنی اصحمہؓ بن ابجر نے اسی سال رحلت کی تھی اور حضورؐ نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی جس میں دیگر صحابہ بھی شریک تھے۔

✳ ✳ ✳

(۲۶)

۱۰ ہجری ——— حجتہ الوداع یا حجتہ البلاغ

لوگوں نے حج اکبر تو کر لیا لیکن کون سا دل ہو گا جسے ایک بار امام المرسلینؐ کی امامت و اقتدا میں یہ فریضہ ادا کرنے کی تمنا بے چین نہ کر رہی ہوگی؟ کسے ایک بار کعبہ حقیقت کے ساتھ طواف کرنے کی حسرت نہ ہوگی اور کس کو یہ آرزو مضطرب نہ کر رہی ہوگی کہ ایک بار رسول اکبرؐ کو اپنی آنکھوں سے یہ فریضہ ادا کر کے اسوۂ عمل چھوڑتے دیکھ لے' مگر حج عمر میں ایک ہی بار فرض ہے' اس لیے اس آسمان کے لیے ایسا موقع صرف ایک ہی بار آیا جب کہ رسول آخریںؐ نے اپنی تیار کردہ بے شمار امت کے ساتھ یہ فرض بھی ادا کیا۔ امام انبیاؑ ہے اور امام امم کا ساتھ۔ وہ امت جس کا ہر فرد شان نبوت کا آئینہ دار ہے ساتھ ہے اور وہ رسولؐ جو تمام رسولوں کی صفات کاملہ کا حامل ہے' مقتدا اور امام ہے۔ یہ وقت اور یہ موقع اور منظر پھر کبھی نہ آئے گا اور کبھی نہ آیا۔ ازل سے اس کا ایک ہی بار ظاہر ہونا مقدر تھا جو ۱۰ ھ میں پورا ہو رہا ہے۔

روانگی اور ادائے حج

اس سال خیر الرسلؐ نے حج کا ارادہ فرمایا اور یہ خبر بجلی کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ خیر امت کے سعادت مند افراد ٹوٹ پڑے اور روانگی سے پہلے ایک لاکھ کا مجمع ہو گیا۔ راستے میں اور سرزمین مکہ میں پہنچ کر کم و بیش سوا لاکھ حجاج کا اجتماع ہو گیا۔ حضرت اکرمؐ ہفتے کے دن ۲۶ ذی قعدہ کو ظہر پڑھ کر

مدینے سے قافلہ حجاج کے ساتھ روانہ ہوئے۔ تمام ازواج مطہراتؓ بھی ساتھ تھیں۔ قربانی کے اونٹ بھی لے لیے گئے اور کچھ حضرت علیؓ یمن سے ساتھ لائے تھے۔ حضورؐ کی خاص سواری کی اونٹنی کا نام قصوا تھا۔ مدینے سے چھ میل کے فاصلے پر میقات مدینہ یعنی ذوالحلیفہ میں پہنچ کر ایک رات قیام فرمایا۔ صبح غسل کر کے دو رکعت نماز ادا فرمائی' پھر لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے قصوا پر چڑھ کر احرام باندھا اور بہ آواز بلند یہ ترانہ تقدیس پڑھا: لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد و النعمہ لک والملک لا شریک لک۔ دوسرے ہفتے کے دن سرف پہنچے اور غسل فرمایا۔ دوسرے دن (یعنی اتوار) ۴ ذوالحجہ کو بالائی سمت سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ خاندان ہاشم کے بعض بچے خوشی میں گھر سے باہر نکل آئے جنھیں حضورؐ نے اپنے آگے پیچھے بٹھا لیا۔ کعبے پر نظر پڑتے ہی فرمایا "الٰہی اس گھر کو اور زیادہ عزت دے۔" پھر طواف کیا۔ پھر مقام ابراہیم پر پہنچ کر دوگانہ ادا فرمایا اور یہ پڑھا اتخذوا من مقام ابراھیم مصلے پھر کوہ صفا و مروہ پر پہنچے اور پڑھا ان الصفا و المروۃ من شعائر اللّٰہ اس جگہ سے کعبہ دکھائی دیا تو ترانہ تحمید بلند فرمایا کہ لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمد یحیی و یمیت وھو علی کل شیئی قدیر لا الہ الا اللّٰہ وحدہ انجز وعدہ و نصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ۔ پھر ان لوگوں کو جن کے ساتھ ھدی (قربانی) نہ تھی احلال کا حکم دیا' اور خود قربانی ساتھ ہونے کی وجہ سے احرام نہ اتارا۔ آٹھویں کو تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ میں قیام فرمایا۔ نویں کو نماز صبح پڑھ کر عرفات میں تشریف لائے اور تمام قریش کو بھی اسی کا حکم دیا۔ قریش عرفات میں قیام کرنا خلاف شان سمجھتے تھے اور مزدلفہ ہی میں جو حدود حرم میں ہے قیام کرتے تھے۔ عرفات میں بمقام نمرہ حضورؐ نے قیام فرمایا اور دوپہر ڈھلنے کے بعد قصوا پر سوار ہو کر میدان میں تشریف لائے اور اوپر ہی سے خطبہ دیا۔ خطبہ پورے کا پورا کسی کو یاد نہ رہا

ہو گا' اس وجہ سے مختلف راویوں سے لے کر اس کو جمع کیا گیا' اس لیے ترتیب کا کوئی ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ بہرحال خلاصہ جس میں مختلف ہدایات ہیں یہ ہے۔ اصل الفاظ کی بجائے ہم صرف ترجمے پر اکتفا کرتے ہیں۔

خطبہ حج بزبان رسالتؐ

"لوگو! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ ہم تم یہاں پھر اکٹھے نہ ہو سکیں گے۔ لوگو جس طرح یہ دن' یہ مہینہ اور یہ سرزمین حرمت والے ہیں اسی طرح اپنی جان' مال اور عزت کو بھی ایک دوسرے پر حرام تصور کرو۔ تمھیں عن قریب بارگاہ الٰہی میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ میرے بعد گم راہ ہو کر ایک دوسرے کی گردنیں نہ کاٹنے لگنا۔ جاہلیت کی رسموں کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوں۔ اپنے خاندانی مورث ربیعہ بن حارث کا خون بنو ہذیل کی گردن سے ساقط کرتا ہوں (یعنی اب رسم جاہلیت کے مطابق بنو ہاشم اس کا بدلہ لینا اپنا خاندانی فرض نہ سمجھیں اور عباس بن عبدالمطلب کی سودی رقم جو بعض لوگوں کے ذمے ہے ساقط کرتا ہوں (یعنی اسے بھی کوئی ہاشمی یا عباسی وصول کرنا خاندانی فرض نہ سمجھے۔ یہ سودی کاروبار رسم جاہلیت تھی جو آج ختم کی جاتی ہے)۔ لوگو! عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ ان کو بیوی بناتے وقت اور اپنے لیے حلال کرتے وقت تم نے اللہ کو ضامن بنایا ہے۔ لوگو! زیردستوں کا حق ادا کرتے رہو۔ جو خود کھاتے پہنتے ہو وہی ان کو بھی کھلاؤ اور پہناؤ۔ لوگو! میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں' اسے مضبوطی سے پکڑ لو تو کبھی گم راہ نہ ہو گے۔ وہ چیز "کتاب اللہ" ہے۔ لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمھارے بعد کوئی امت نہیں۔ لوگو اللہ کی عبادت سے کبھی غافل نہ ہو یعنی نماز پنج گانہ' صیام رمضان' زکوٰۃ اور حج کے فرائض ادا کرتے رہو۔ امیر وقت کی اطاعت کو' جب کہ وہ کتاب اللہ کے

خلاف حکم نہ دے، اپنا فرض سمجھو۔ اگر تم نے ان احکام کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ تمھیں اس کی جزا میں جنت عطا فرمائے گا۔ میرے ان الفاظ کو حاضر غائب تک پہنچا دیں۔"

اس کے بعد حضورؐ اکرم نے اپنی امت سے پوچھا کہ "لوگو! میری بابت (بروز قیامت) تم سے سوال کیا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟" لوگوں نے جواب دیا کہ ہم یہ کہیں گے کہ "حضورؐ نے تبلیغ احکام، حق رسالت اور بہی خواہی کے تمام فرائض ادا فرما دیے۔" حضرت اکرمؐ نے تین بار آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر نیچے کی اور ہر بار فرمایا اللھم اشھد یعنی الٰہی تو ان کی شہادت پر گواہ رہنا۔ عین اسی وقت یہ آیت اتری کہ:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا (المائدہ: ۳)

آج مسلمانو ہم نے تمھارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتوں کو بھی تمام کر دیا اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔

خطبہ غدیر خم

راستے میں بریدہ اسلمیؓ نے حضرت علیؓ کے متعلق بعض شکایات پیش کیں جو حکومت یمن کے موقع پر بہ سلسلہ تقسیم غنیمت پیدا ہوئی تھیں۔ مقام خم کے غدیر (یعنی تالاب) کے پاس حضورؐ نے ایک مختصر سا خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ من کنت مولاہ فعلی مولاہ یعنی جو مجھے اپنا حاکم و افسر تسلیم کرتا ہے وہ علیؓ کو بھی مانے (کیوں کہ یہ میرے ہی حکم سے یمن گئے تھے اور ان کا فیصلہ میرا فیصلہ ہے)۔ حضرت عمرؓ نے اس شرف پر حضرت علیؓ کو مبارک باد دی اور بریدہ اسلمیؓ تمام زندگی پھر حضرت علیؓ کے مطیع رہے اور جنگ جمل میں شہید

خطبے کے بعد حضورؐ کے حکم سے بلالؓ نے اذان دی اور ظہر و عصر ملا کر ادا فرمائی پھر موقف میں دیر تک قبلہ رو ہو کر کھڑے کھڑے دعا مانگتے رہے۔ قریب مغرب اسامہ بن زیدؓ کو اپنے پیچھے اونٹ پر بٹھا کر مزدلفہ پہنچے۔ مغرب پڑھ کر فوراً ہی عشا پڑھی اور آرام فرمانے کے لیے لیٹ گئے۔ نبوت کے دن سے لے کر آج تک کے درمیان یہ پہلی اور آخری شب تھی جب حضورؐ اکرم تہجد کے لیے بیدار نہ ہوئے۔ صبح یعنی دسویں ذی الحجہ صبح کی نماز ادا فرما کر سورج نکلنے سے پہلے روانہ ہوگئے۔ مہار شتر بلالؓ کے ہاتھ میں تھی اور اسامہ پیچھے بیٹھے غلاموں کی سربلندی کا اعلان زبان حال سے کر رہے تھے۔ راستے میں سائلین حج کو مسائل حج کی تعلیم فرماتے جاتے تھے۔ وادی محسر کے راستے سے منیٰ میں پہنچے۔ جمرہ عقبہ پہنچ کر ابن عباسؓ سے کنکریاں منگوائیں اور رمی جمارہ فرمائی۔ یہاں لوگوں کو مذہبی غلو سے بچنے کی ہدایت فرمائی۔ پھر راستے میں ضروری نصائح فرماتے ہوئے منحر (قربان گاہ) پر پہنچے۔ ٦٣ اونٹ اپنے دست مبارک سے ذبح کیے اور ٣٧ حضرت علیؓ نے ذبح کیے۔ اور سب راہ خدا میں خیرات کیے گئے۔ قربانی سے فارغ ہو کر معمرؓ بن عبداللہ سے سر کے موئے مبارک اتروائے۔ کچھ موئے مبارک حضرت اکرمؐ نے خود تقسیم فرمائے اور کچھ ابو طلحہؓ نے۔ پھر مکے تشریف لا کر طواف فرمایا اور قبلہ رو استادہ ہو کر آب زم زم نوش فرمایا۔ اس کے بعد واپس آکر ایام تشریق یعنی ١٣ ذوالحجہ تک منیٰ ہی میں قیام پذیر رہے اور یہیں سے ہر روز بعد زوال رمی جمارہ کے لیے جمرات پر تشریف لے جاتے رہے۔ ١٣ ذوالحجہ یوم سہ شنبہ کو بعد زوال منیٰ سے روانہ ہو کر وادی محصب میں پہنچے اور شب یہیں گزار کر صبح خانہ کعبہ کا آخری طواف اور نماز صبح ادا فرمائی اور یہیں سے مہاجرین و انصار کے ساتھ مدینہ طیبہ روانہ ہوگئے۔

(۲۷)

۱۱ہجری ـــــــ ایلاو تخییر

وہ کون سا انسان ہے جس نے ازدواجی زندگی گزاری ہو اور کبھی باہمی شکر رنجی اور نوک جھونک (میاں بیوی کے درمیان) نہ ہوئی ہو۔ یہ فطرت ہے اور اس کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن ہو تو کس حد تک ہو' کن معاملات میں ہو' ہو جائے تو پھر کیا کیا جائے۔ ان سارے معاملات کا اس شخص کے لیے جاننا ضروری ہے جو ازدواجی معاشرت کی اصلاح کا خواش مند ہو۔ حسن معاشرت کا جو سبق ہمیں حضرت اکرمؐ کی عملی زندگی سے مل سکتا ہے دنیا میں کسی دوسری ہستی سے مل ہی نہیں سکتا۔ لیکن قدرت کو یہ بھی مقصود تھا کہ ایک نمونہ اس کا بھی نبوی زندگی میں دکھا دیا جائے کہ اگر صنف ضعیف کی بعض لغزشوں سے شوہر کو بشریت کے تقاضے سے رنج شدید بھی پہنچے تو اس کا نباہ کس طرح کیا جائے۔ نبی اکرمؐ کی پوری زندگی میں صرف یہی ایک موقع ایسا آیا ہے کہ اسے باہمی تلخی کہا جاسکے' لیکن اس میں بھی بڑے بڑے اسباب ہیں۔

بہ تقاضائے بشری حضورؐ اکرم کو ازواج مطہراتؓ کی طرف سے بعض رنج پہنچے۔ مثلاً باہمی رقابت میں تجاوز عن الحد' یا بعض ناقابل اظہار باتوں کو ظاہر کر دینا' یا کسی معاملے میں مرضی مبارک کے خلاف کرنا' اور سب سے بڑھ کر امیرانہ زندگی کی خواہش کا پیدا ہونا اور اسی کے مطابق توسیع نفقہ کی فرمائش کرنا۔ دراصل یہی بات حضورؐ کو زیادہ ناگوار ہوئی۔ ازواج مطہراتؓ لوگوں میں

بے شمار اموال غنیمت تقسیم ہوتے اور آہستہ آہستہ آسودہ حال ہوتے دیکھتی تھیں، اس لیے طبعاً ان کے دل میں بھی مزید آسودگی کی آرزو پیدا ہوئی ہوگی۔ لیکن یہاں الفقر فخری تھا۔ بیٹی (فاطمہ زہراؓ) نے ایک کنیز مانگی تو جواب مل گیا کہ "اصحاب صفہ زیادہ حق دار ہیں۔" حضورؐ کو اپنے بال بچوں سے زیادہ امت کا خیال تھا۔ ازواج مطہرات کی یہ فرمائش ہزار فطرت نسوانی کے مطابق ہو لیکن حضورؐ کو ناگوار ہوئی تھی اور ہوئی، اور حضورؐ اکرم نے ایک ماہ تک ازواج سے ملنے کی قسم کھا لی۔ "ایلاء" شرع میں کم از کم چار ماہ بیوی سے جدا رہنے کی قسم کھانے کو کہتے ہیں۔

للذین یؤلون من نساء ھم تربص اربعہ اشھر فان فاء و فان اللّٰہ غفور رحیم (البقرہ:۲۲۶)

یعنی جو لوگ اپنی عورتوں سے الگ رہنے کی قسم کھا بیٹھیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ پس اگر اس درمیان میں قسم توڑ کر رجوع کر لیں (اور کفارہ قسم ادا کر دیں) تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

اگر رجوع نہ کیا جائے تو چار ماہ کے بعد طلاق بائن پڑ جائے گی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اس واقعہ کے بعد اتری ہے۔ عرب میں ایلا کے لیے چار ماہ کی مہلت نہ تھی، کم مدت بھی ایلا کے لیے کافی تھی اور ایلا عرب میں طلاق کا مترادف ہے۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے اس ایلا کی خبر سن کر حضورؐ سے یہی سوال کیا تھا کہ کیا حضورؐ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی؟ پس اس لحاظ سے حضورؐ اکرام کی خفگی، مسئلہ ایلا کی اصلاح و تسہیل کے لیے فتح باب ہوئی، اور اگر اس آیت کا نزول واقعے سے پہلے مانا جائے تو اس واقعے کو ایلا کہنا شرعاً صحیح نہ ہوگا۔ بہرحال حضورؐ نے کامل ایک ماہ، جو حسن اتفاق سے ۲۹ دن کا واقع ہوا تھا، بالا خانے پر تنہا نشینی میں گزارا۔ صرف نماز کے لیے مسجد میں تشریف لاتے تھے۔ اس کے بعد آیت تخییر بھی اتری اور حضورؐ بھی بالا

خانے سے اترے۔ آیت تخییر یہ ہے کہ:

یا یھا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیوۃ الدنیا و زینتھا فتعالین امتعکن و اسرحکن سراحًا جمیلا ○ وان کنتن تردن اللّٰه و رسوله و الدار الاخرۃ فان اللّٰه اعد للمحسنات منکن اجرًا اعظیمًا (الاحزاب: ۲۸'۲۹)

اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیاوی زندگی اور اس کی زینت کی طلب گار ہو تو آؤ میں تمھیں مال و اسباب دے کر عمدگی سے رخصت کردوں' اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ' اور اخروی ٹھکانا پسند کرتی ہو تو تم میں سے تمام نیکوکار بیویوں کے لیے اللہ نے اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے۔"

ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ یا تو ازواج دنیا اور زینت دنیا کو پسند کریں یا اللہ' رسولؐ اور دار آخرت کو ترجیح دیں۔ پہلی صورت میں انھیں چھوڑ دینے کا حکم ہے اور دوسری شکل میں ان کے لیے من جانب اللہ اجر عظیم ہے۔ اب دیکھو کیا حضورؐ نے ازواجؓ کو چھوڑ دیا؟ یقیناً نہیں۔ تو نتیجہ کیا نکلا؟ یہی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ' رسولؐ اور اجر آخرت پر سب کچھ قربان کر دیا۔ اگر ایسا نہ کرتیں تو حضورؐ اکرم انھیں علیحدہ کر دیتے۔ لیکن علیحدہ کرنا تو کجا۔ اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہراتؓ کے دائمی ارادہ عمل کا امتحان لے لیا تو یہ حکم دیا کہ:

لا یحل لک النساء من بعد ولا ان تبدل بھن من ازواج و لواعجبک حسنھن الا ما ملکت یمینک ط (الاحزاب: ۵۲)

ان وفا شعار بیویوں کے بعد اے رسولؐ آپ کے لیے مزید دوسری عورتیں جائز نہیں اور نہ یہ جائز ہے کہ آپ ان کی جگہ دوسری بی بیاں کریں۔ خواہ ان کا حسن و جمال آپ کو پسند کیوں نہ آئے۔ ہاں کنیزیں جائز ہیں۔

(حضورؐ نے اجازت ہونے کے باوجود بھی اس کے بعد کوئی کنیز نہیں رکھی) یہی نہیں کہ صرف حضورؐ کو روکا گیا ہو بلکہ دوسری طرف سے بھی

مسلمانوں پر دروازہ بند کر دیا گیا کہ:

ما کان لکم ان تؤذوا رسول اللّٰہ ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابداً (الاحزاب: ۵۳)

یعنی اے مسلمانو! تمھارے لیے یہ روا نہیں کہ تم رسولؐ اللہ کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ کہ تم ان کے بعد کبھی ان کی ازواج کو نکاح میں لاؤ۔

اللہ اکبر۔ اتنا قوی رشتہ' ایسا دائمی تعلق تو ماں بیٹی' اور پدر و فرزند کا بھی نہیں ہوتا۔ عورتوں کا درجہ بلند کرنے کے لیے کسی ماڈل اور نمونے کی ضرورت تھی۔ حضورؐ اکرم اگر خفا ہو کر علیحدگی کی قسم نہ کھاتے تو یہ فضائل اور یہ مسائل کب معلوم ہوتے؟ آیہ تطہیر بھی آیہ تخییر سے متصل ہی ہے اور اس کا تخاطب بھی ازواج مطہراتؓ ہی سے ہے۔

* * *

(۲۸)

وصال حق کی تیاریاں

رمضان ۱۰ھ میں سورہ نصر نازل ہوا۔ یعنی۔

اذا جاء نصر اللّٰه والفتح ○ ورایت الناس یدخلون فی دین اللّٰه افواجًا ○ فسبح بحمد ربک و استغفرہ ط انه کان توابًا ○

اس میں اشارہ تھا کہ اے رسولؐ آپ کی تبلیغ عالم گیر ہو چکی۔ اب آپ ہمہ تن یاد الٰہی میں مصروف ہو جائیں۔

پھر ذوالحجہ میں الیوم اکملت لکم دینکم کی آیت اتری۔ اس میں بھی یہی اشارہ تھا کہ کام تکمیل کو پہنچ چکا لہٰذا اب اپنے بھیجنے والے کے حضورؐ آنے کی تیاری کیجیے۔ سورہ نصر کے بعد کوئی سورت اور اس آیت کے بعد کوئی آیت نہیں نازل ہوئی۔ حضورؐ اکرم سورہ نصر کے نزول کے بعد ہی سے تیاری فرمانے لگے تھے۔ چنانچہ جبرئیل امین ہر سال رمضان میں ایک دور قرآن سنتے تھے' لیکن اس سال دو دورے فرمائے۔ اعتکاف رمضان ہر سال دس دن فرماتے تھے' مگر اس سال بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔ حجتہ الوداع میں صاف فرما دیا کہ "شاید اس سال کے بعد میں حج نہ کر سکوں۔" چند دن قبل حضرت اکرمؐ کوہ احد پر بھی تشریف لے گئے اور اس طرز سے شہدائے احد کے لیے دعائے مغفرت فرمائی اور اس طور پر ان سے مخاطب ہوئے جیسے کوئی وداع کرتا ہے۔ حجتہ الوداع کے بعد مختلف مواقع پر متعدد خطبے دیے جن میں ضروری ہدایات و

نصائح اس طرح فرمائے جس طرح کوئی رخصت ہونے والا وقت کی تنگی محسوس کر کے جلد آگاہ کرنا ضروری تصور کرتا ہو۔

بیماری کی ابتدا

حضرت اکرم لشکر اسامہ کی تیاری میں لگے تھے کہ ایک دن جنت البقیع میں مغفرت رفتگان کی دعا فرمانے تشریف لے گئے۔ واپس تشریف لائے تو درد سر کی تکلیف محسوس ہوئی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نصف شب کا وقت تھا اور حضورؐ اکرم حجرہ عائشہؓ میں تشریف فرما تھے۔ صبح آپ اسی حالت میں حضرت میمونہؓ کے حجرے میں تشریف لے گئے' کیوں کہ آج ان ہی کی باری کا روز تھا۔ علی اختلاف الروایات اس دن ۲۹ صفر ۱۱ھ یوم دو شنبہ تھا۔ ازواج مطہرات کی باری میں بحالت مرض بھی فرق نہ آنے دیا۔ ہر روز دریافت فرماتے آج کس کی باری کا دن ہے۔ چند بار یہ سوال فرمانے سے حضرت فاطمہؓ نے امہات مطہرات کو منشائے نبوی سے آگاہ کیا اور تمام امہات نے اپنی اپنی باری جناب صدیقہ کو سونپ دی۔ اس کے بعد حضرت اکرمؐ حجرہ عائشہ میں اپنے آخری لمحات تک کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے تشریف لے آئے۔

امامت صدیق اکبرؓ پر بار بار زور

جب تک طاقت رہی مسجد میں تشریف لا کر باجماعت نماز ادا فرماتے رہے۔ آخری نماز حضورؐ نے مغرب کی پڑھائی جس میں سورہ المرسلات تلاوت فرمائی۔ عشا کا وقت آیا تو بلالؓ نے حسب معمول آواز دی کہ جماعت تیار ہے۔ حضورؐ نے لگن میں پانی بھروا کر غسل فرمایا اور اٹھنا چاہا مگر غش آگیا۔ تھوڑی دیر میں افاقہ ہوا اور پھر غسل فرما کر اٹھنے کا ارادہ کیا تو پھر غشی طاری ہوگئی۔ تیسری بار پھر یہی ہوا۔ ہر بار حضورؐ سوال کرتے تھے کہ کیا نماز ہوگئی؟

اور جواب ملتا تھا کہ حضورؐ کا انتظار ہے۔ تیسری بار افاقہ ہونے کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ "ابوبکرؓ سے کہو کہ نماز پڑھائیں۔" عائشہؓ نے کہا وہ رقیق القلب ہیں، حضورؐ کی جگہ کھڑے ہونے کو برداشت نہ کر سکیں گے۔ حضرت اکرمؐ نے پھر یہی حکم دیا کہ "ابوبکرؓ نماز پڑھائیں۔" عائشہؓ نے اب کی بار حضرت حفصہ کے ذریعے کہلوایا کہ "حضورؐ عمرؓ سے نماز پڑھانے کو فرمائیں۔ حفصہؓ نے کہا تو حضورؐ خفا ہوئے اور فرمایا کہ تم یوسف والیاں ہوگئیں۔ ابوبکرؓ ہی سے کہو نماز پڑھائیں۔" حضرت ابوبکرؓ اس وقت موجود نہ تھے۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ کو کھڑا کر دیا۔ حضورؐ کے کانوں میں حضرت عمرؓ کی قرات کی آواز گئی تو فرمایا "میں کس کی آواز سن رہا ہوں، کیا یہ عمرؓ کی آواز نہیں؟" لوگوں نے عرض کی کہ "یا رسولؐ اللہ ابوبکرؓ موجود نہ تھے۔" ارشاد ہوا "مگر اللہ اور مومنین کو ایسا منظور نہیں، ابن ابی قحافہؓ (ابوبکر) کہاں ہیں وہی نماز پڑھائیں۔" حضرت عمرؓ کے کانوں میں یہ آواز پہنچی تو فوراً ہٹ گئے اور جماعت سیدنا صدیقؓ کے آنے تک ملتوی رہی۔

عقل حیران ہے کہ حضورؐ اکرم نے سیدنا ابوبکرؓ کی امامت کو بار بار اتنا زور دے کر پختہ سے پختہ تر کر دیا، مگر پھر بھی کچھ اہل ہوا ایسے ہیں جن کو آپ کے امام المسلمین اور امیر المومنین ہونے میں شبہ ہے۔ اتنی زور دار تاکید وحی الٰہی کے سوا اور کسی شے پر نہیں ہو سکتی، اس لیے یہ واقعات دیکھ کر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ اس امامت کو ہم وحی الٰہی کے ماتحت تسلیم کریں۔ نبی کریمؐ نے اپنے سامنے کائنات کے ایک ایک ذرے کو ابوبکرؓ کی اقتدا پر مجبور کر کے صاف صاف اشارہ فرما دیا کہ میرے بعد خلافت کا لاسہیم مستحق ابوبکرؓ کے سوا کوئی اور فرد بشر نہیں۔

عدم استخلاف کی مصلحت

لیکن حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم خلافت کو منصوص چیز بنانا نہیں چاہتے

تھے' بلکہ جمہوریت کے خطوط پر چلانا چاہتے تھے اس لیے صرف اشارات پر ہی اکتفا فرمایا۔

اس حکم کے بعد کئی دن تک حضرت صدیق اکبرؓ ہی امامت فرماتے رہے۔ اس مدت میں ۱۷ یا ۱۳ نمازیں آپ نے پڑھائیں۔ پہلی نماز آپ نے جب عشا کی پڑھائی تو ساری مسجد ماتم کدہ بن گئی۔ امام اور تمام مقتدیوں کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔

در نمازم خم ابروئے تو یاد آمد
حالتے رفت کہ محراب بہ فریاد آمد

مختلف احادیث قرطاس

ایک دن حضورؐ کو حضرت علیؓ سہارا دیے ہوئے تھے' اس طور پر کہ حضورؐ کا سر مبارک حضرت علیؓ کی کلائی پر تھا۔ اسی حالت میں حضرت اکرمؐ نے فرمایا کہ اے علیؓ کاغذ لے آؤ تاکہ میں ایسی تحریر لکھوا دوں جس کے بعد میری امت کبھی گم راہ نہ ہوگی۔ حضرت علیؓ کو خوف ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کاغذ لینے جاؤں اور ادھر حضورؐ کا وصال ہو جائے۔ اس لیے عرض کیا یا رسولؐ اللہ جو کچھ فرمانا ہے فرما دیں میں اسے یاد رکھوں گا۔" فرمایا " میں وصیت کرتا ہوں نماز اور زکوۃ کی اور ان کی جو تمھارے زیردست (لونڈی غلام) ہیں۔" (یہ روایت مسند علی کی ہے)۔

ایک دن عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ سے فرمایا کہ کوئی جلد یا تختی لے آ تاکہ میں ابوبکرؓ کے حق میں ایک تحریر لکھ کر اختلاف کا دروازہ بند کر دوں۔" (حضرت ابوبکرؓ اس وقت موجود تھے)۔ عبدالرحمٰن جانے لگے تو انھیں روک دیا اور فرمایا کہ "اے ابوبکر اللہ کو اور مومنین کو یہ منظور ہی نہ ہوگا کہ تجھ پر اختلاف کیا جائے۔" (یہ روایت مسند عائشہؓ کی ہے)۔

ایسا ہی ایک واقعہ صحیح بخاری میں بھی ہے۔ لیکن اس میں ہے کہ حضورؐ نے عبداللہ بن ابی بکرؓ کو بلوا کر حضرت ابو بکرؓ کے لیے فرمان خلافت لکھوانا چاہا لیکن پھر یہ فرما کر رک گئے کہ "خود رب العزت اور اہل ایمان ابو بکرؓ کے سوا کسی کو پسند نہ کریں گے۔" چنانچہ بعد کے واقعات نے اس کی حرف بحرف تصدیق کی۔ لیکن حضرت اکرمؐ نے اس کی تنصیص محض اس لیے نہ فرمائی کہ جمہوریت اسلامیہ پر اس کی زد نہ پڑے۔ یہ دراصل جمہوری فیصلہ ہی تھا جسے حضورؐ نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا۔ تھوڑے بہت اختلاف کی گنجائش کو بھی لکھوا کر ختم فرمانا چاہتے تھے' لیکن جمہوریت کے اصول کو توڑنا پسند نہ فرماتے تھے' اس لیے رک گئے۔ ایک اور موقعے پر وفات سے چار دن پہلے ایک عام خطاب کے ساتھ فرمایا کہ "لاؤ کاغذ میں ایسی تحریر لکھوا دوں جس کے بعد تم گم راہ نہ ہو گے۔" جن کے شوق اطاعت پر تکلیف رسولؐ کا احساس غالب تھا وہ تعمیل ارشاد میں ہچکچائے اور جن کو تعمیل ارشاد کا زیادہ جذبہ تھا وہ ہچکچانے والوں کے خلاف بولے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان دوسری صنف کے لوگوں میں بھی سب بحث ہی کرتے رہے اور تعمیل ارشاد کسی نے بھی نہ کی۔ حضورؐ کو شور و غل ناگوار ہوا اور فرمایا کہ میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔

حسبنا کتاب اللہ

حضرت عمرؓ پہلی قسم کے لوگوں میں تھے جنھوں نے حضورؐ کو تکلیف دینے کی بجائے ایک خدا لگتی بات لوگوں سے کہہ دی کہ "حضورؐ کو تکلیف ہے اور تمھارے پاس کتاب اللہ موجود ہے اور قرآن ہی ہم سب کے لیے کافی ہے۔"

آپ معلوم کر چکے ہیں کہ حجتہ الوداع کے خطبے میں حضرت اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ میں تم میں کتاب اللہ چھوڑے جاتا ہوں' اگر اسے مضبوطی سے پکڑ

لیا تو کبھی گم راہ نہ ہوگے۔ آج یہ فرمایا کہ میں ایک تحریر ایسی لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گم راہ نہ ہوگے۔" ان دونوں کو ملا کر دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ منشائے نبوی کو تاڑ جانے میں حضرت عمرؓ نے ٹھوکر نہیں کھائی۔

بہرکیف حضورؐ اکرم کے فرمانے کے بعد جب صحابہؓ کی باہمی تکرار شروع ہوئی تو بعض لوگوں نے حضورؐ سے مطلب دریافت کرنا چاہا تو حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ جس طرف تم بلانا چاہتے ہو اس سے یہ حال جس میں میں ہوں بہت بہتر ہے۔ پھر تین وصیتیں فرمائیں۔ ایک یہ کہ مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔ دوئم یہ کہ وفود و سفرا کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوا کرے جیسا کہ میں خود کرتا تھا۔ تیسری بات راوی کو یاد نہیں رہی۔ بعض علما کہتے ہیں کہ تیسری وصیت لشکر اسامہؓ کو بھیجنا تھی۔

زندگی کا آخری پیغام

اسی دن ظہر کے وقت حضرت اکرمؐ نے اپنے اوپر سات لبریز مشکیں ڈلوائیں۔ پھر علیؓ و عباسؓ کے سہارے مسجد میں تشریف لائے' حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ جمال اقدسؐ پر نظر پڑتے ہی پیچھے ہٹے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اپنی جگہ پر رہو۔ حضورؐ حضرت ابوبکرؓ کی دائیں طرف بیٹھ گئے۔ مقتدین ابوبکرؓ کی اور ابوبکرؓ حضورؐ اکرم کی اقتدا فرما رہے تھے۔ اس وقت طبیعت ذرا سنبھل گئی تھی۔ نماز کے بعد ختم المرسلینؐ نے ایک بلیغ خطبہ دیا جو اس حیات مستعار کا آخری خطبہ تھا۔ فرمایا:

> "اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا اللہ کے پاس والی نعمتوں کو قبول کرے' لیکن اس بندے نے اللہ ہی کے پاس کی چیزوں کو قبول کیا ہے۔"

حضرت اکرمؐ نے یہیں تک فرمایا تھا کہ صدیق اکبرؓ رونے لگے۔ لوگ اسے کسی بندے کا واقعہ سمجھ رہے تھے اور راز دار نبوت صدیق اکبرؓ جان چکا تھا کہ وہ بندہ خود آقائے دو جہاںؐ ہے۔ پھر حضرت اکرمؐ نے سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ "سب سے زیادہ جس شخص کی دولت اور رفاقت کا میں مرہون ہوں وہ ابوبکر ہیں۔ اگر میں دنیا میں کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا لیکن اسلامی رشتہ دوستی کے لیے کافی ہے۔" (بعض روایتوں میں ہے "مگر میں نے اللہ کو خلیل بنا لیا ہے۔") مسجد کے رخ پر جتنے دریچے ہیں سب بند کر دیے جائیں بجز دریچہ ابوبکرؓ کے۔" پھر فرمایا۔ "تم سے پہلی امتوں نے اپنے انبیاؑ و اولیا کی قبور کو عبادت گاہ بنا لیا ہے۔ خبردار تم اس ہلاکت میں نہ پڑنا۔"

حضورؐ نے لوگوں کو اس کے بعد انصار کے بارے میں آگاہ کیا کہ "انھوں نے بہت خوبی سے ہماری اعانت و نصرت کے فرائض انجام دیے پس جو کوئی نفع و نقصان کا متولی ہو یعنی خلیفہ ہو ان کے نیکو کاروں سے حسن سلوک اور ان کے بدوں سے درگزر کرے۔" پھر جن لوگوں نے لشکر اسامہ پر اسامہؓ کی سرداری کی وجہ سے نکتہ چینی کی تھی اس کا جواب دیا کہ "اسامہؓ میرا سب سے زیادہ محبوب اور وہ اس منصب کا اہل ہے۔" پھر فرمایا کہ میں نے خدا کی حرام کی ہوئی چیز کو حرام اور خدا ہی کی حلال کی ہوئی چیز کو حلال کیا ہے۔" پھر ارشاد ہوا کہ "اے بیٹی فاطمہؓ اور اے پھوپھی صفیہؓ نیکی کرو۔ میں تمھیں اللہ سے نہیں بچا سکتا۔"

اس کے بعد حجرۂ عائشہؓ میں تشریف لائے۔ لخت جگر فاطمہ زہراؓ سے کان میں کچھ فرمایا اور وہ رونے لگیں۔ پھر کچھ کہا اور وہ ہنسنے لگیں۔ بعد کو جناب زہراؓ نے حضرت عائشہؓ کو بتایا کہ پہلے حضورؐ نے اپنی وفات کی خبر کر دی تھی اس لیے میں رو دی۔ دوسری بار یہ خبر دی کہ تم ہی مجھ سے سب سے پہلے [illegible]

اجتناب سرمائے داری سے

کرب برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی حالت میں آپؐ نے پوچھا کہ "عائشہؓ وہ دینار تم نے خیرات کر دیے؟" عرض کیا "نہیں۔ حضورؐ کی تیمارداری نے یاد نہ آنے دیا۔" فرمایا "جلد خیرات کر دو۔ محمدؐ اپنے پروردگار کے سامنے یہ لے کر نہیں جانا چاہتا۔"

زندہ دلی

وفات سے ایک دن پہلے ازواج مطہراتؓ اور دوسرے لوگوں نے دوا پیش کی۔ حضورؐ نے انکار فرمایا۔ لوگوں نے بحالت غشی دوا منہ میں ٹپکا دی۔ حضورؐ کو ہوش آنے پر معلوم ہوا تو حکم دیا کہ جتنے لوگ دوا پلانے میں شریک تھے سب کو دوا پلائی جائے۔ یہ حضورؐ کا مزاحیہ انتقام تھا۔ مگر کون جانتا ہے کہ اس "انتقامی دوا" کا ایک ایک قطرہ ان پینے والوں کے لیے کتنی برکتوں کا سمندر ہو گا۔

آخری دیدار

آخری شب کو کروٹیں بدل بدل کر صبح کی۔ صبح کی جماعت ہو رہی تھی، کچھ افاقہ بھی تھا۔ پردہ ہٹا کر تھوڑی دیر نظارہ نماز کا لطف اٹھاتے رہے جو حضرت اکرمؐ کی پاک تعلیم کا عملی ظہور تھا۔ نمازیوں کی نظر جمال اقدس پر پڑی تو ان کے اضطراب کی یہ کیفیت ہوئی کہ سب متوجہ ہونے لگے۔

بر　مصحف　روئے　او　نظر　کن
خسرو　غزل　و　کتاب　تا　کے

ابو بکر صدیقؓ نے پیچھے ہٹنے کا ارادہ کیا۔ حضورؐ نے تسکین دی اور پردہ گرا لیا۔ بعض روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ نماز حضورؐ نے جماعت سے

حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا میں ادا فرمائی۔ بہرکیف آں حضرتؐ نے امت کے اس اجتماع کو اور اس اجتماع نے حضورؐ کو آخری بار دیکھا۔ اس نماز کے بعد حضرت اکرمؐ پر پھر کوئی دوسرا وقت نماز نہیں آیا۔ اب جوں جوں دن چڑھتا جاتا تھا۔ غشی کی نوبت بھی اتنی ہی زیادہ آتی جاتی تھی۔ گھڑی میں غشی اور گھڑی میں افاقہ ہوتا۔ حضرت فاطمہؓ سے یہ حالت دیکھ کر رہا نہ گیا۔ بولی "واکرب اباہ" ہائے باپ کی تکلیف۔" ارشاد ہوا "بیٹی آج کے بعد سے تیرے باپ کو تکلیف نہ رہے گی۔" آخری تکلیف بڑھتی گئی اور نزع کی حالت طاری ہونے لگی۔ پاس پانی کا پیالہ رکھا تھا۔ بار بار اس میں ہاتھ ڈالتے اور چہرۂ انور پر پھیرتے جاتے۔ رنگت کبھی سرخ ہو جاتی اور کبھی زرد۔ اسی حالت میں فرماتے لا الہ الا اللہ ان للموت سکرات کبھی پڑھتے مع الذین انعم اللہ علیھم... کبھی فرماتے اللھم فی الرفیق الاعلی۔ اتنے میں دروازے پر ایک آہٹ ہوئی۔ فاطمہ زہراؓ نے پوچھا "کون؟" حضورؐ نے فرمایا کہ بیٹی یہ عورتوں کو بیوہ کرنے والا' بچوں کو یتیم کرنے والا' جماعتوں کو پراگندہ کرنے والا' تمناؤں کا خون کرنے والا یعنی فرشتہ اجل ہے۔ آنے کی اجازت چاہتا ہے۔" فاطمہؓ روئیں۔ حضورؐ نے ان کے آنسو پونچھے۔ پھر حسنینؓ کو بلا کر پیار کیا۔ پھر ازواج کو بلایا۔ پھر علیؓ کو بلایا۔ علیؓ نے آپؐ کو اپنی گود میں لے لیا۔ پھر عائشہؓ نے لیا۔

صفائی دہن کا خیال

اتنے میں عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ ایک تازہ مسواک ہاتھ میں لیے اندر آئے۔ حضورؐ نے مسواک کی طرف نظر جما کر دیکھا۔ وہ سمجھ گئے اور مسواک بڑھا دی۔ حضورؐ سے چبائی نہ جا سکی۔ عائشہؓ طیبہ نے چبا کر نرم کی اور حضورؐ کو دی۔ حضورؐ نے مسواک کی۔

احکام غلامی کی تکمیل کا خیال

چاشت کا وقت آگیا تھا۔ سینے میں گھرگھراہٹ شروع ہوگئی۔ لب مبارک ہلنے لگے اور زبان پر یہ الفاظ تھے: الصلوۃ الصلوۃ و ماملکت ایمانک (نماز' نماز اور لونڈی' غلام) پھر انگلی اٹھا کر تین بار فرمایا بل الرفیق الا علٰی۔ پاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ ہاتھ بھی لٹک گئے اور آنکھیں چھت سے لگ گئیں اور اللہ کا آخری رسولؐ اپنے آخری لمحات دنیا ختم کر کے حیات نبوی کی دنیا میں چلا گیا۔ یہ بالاتفاق دوشنبے کا دن تھا اور باختلاف روایات ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ تھی۔ اس لحاظ سے مدت علالت ۱۴ روز تھی اور عمر شریف ۶۳ قمری سال اور ۴ دن۔

* * *

(۴۹)

رحلت کے بعد

کون دنیا میں اس غم کا صحیح اندازہ کرسکتا ہے جو صحابہ کو' ازواج اور کنبے والوں کو خصوصاً" جناب زہرا کو اس جدائی کے بعد ہوا ہوگا۔ کتنے تھے جو مرغ لبسمل کی طرح تڑپ رہے تھے۔ کتنے تھے جنھوں نے جنگل کی راہ لی۔ کتنے تھے جو اپنے اندھے ہونے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ کتنے تھے جو عالم تحیر میں خاموش و ساکت اور سکتہ دم تھے۔ کتنے تھے جن کی آنکھیں آنسو روکنے پر قادر نہ رہی تھیں۔ کتنے تھے جو اس خبر وفات کو ہی غلط کہہ رہے تھے۔ کتنے تھے جنھیں اپنے حواس پر قابو نہ رہا تھا اور اسے محض عارضی چند روزہ جدائی سمجھ رہے تھے اور یہ خیال کر رہے تھے کہ حضورؐ بارگاہ خداوندی میں تشریف لے گئے ہیں اور پھر لوٹ کر آئیں گے۔

حضرت عمرؓ شمشیر برہنہ لے کر مسجد میں ادھر سے ادھر دوڑ دوڑ کر اعلان کرنے لگے کہ خبردار جس کسی نے کہا کہ رسولؐ اللہ وفات پا گئے' اس کا سر اڑا دوں گا۔" ساری مسجد نبوی ماتم کدہ بنی ہوئی تھی۔ اتنے میں ابوبکر صدیقؓ سنح سے تشریف لائے۔ چوں کہ صبح حضور کو افاقہ تھا اس لیے آپ اجازت لے کر اپنی بیوی بنت خارجہ کے گھر تشریف لے گئے۔ سنح مدینہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہے۔ یہیں آپ کو خبر وفات معلوم ہوئی' فوراً چل پڑے۔ پہلے حجرہ عائشہؓ میں تشریف لے گئے۔ حضورؐ کے جسد اطہر پر چادر پڑی تھی۔

چہرۂ مبارک سے چادر ہٹا کر پیشانی کو چوما اور فرمایا "میرے ماں باپ آپؐ پر قربان۔ بلاشبہ آپؐ پر موت آچکی۔ اللہ آپؐ پر دو موتیں وارد نہ کرے گا۔" پھر مسجد میں آئے۔ لوگ دیکھتے ہی ادھر متوجہ ہوگئے۔ آپؓ نے ایک بلیغ خطبہ دیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

ایها الناس من کان منکم یعبد محمداً فانه قدمات ومن کان یعبد اللّٰه فانه حی لایموت (قال اللّٰه تعالٰی) وما محمد الارسول قدخلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر اللّٰه شیئًا ط و سیجزی اللّٰه الشکرین ○ (آل عمران: ۱۴۴)

اے لوگو! تم میں جو شخص محمدؐ کی عبادت کرتا تھا وہ سن لے کہ ان کی رحلت ہوچکی' اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے تو وہ اللہ اب بھی زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔ (اللہ تعالٰی خود فرماتا ہے کہ) "محمدؐ فقط ایک رسول ہیں بہت سے رسول ان سے پہلے بھی گزر گئے۔ پس کیا اگر وہ (محمدؐ) رحلت کر جائیں یا شہید ہو جائیں تو تم الٹے پاؤں (کفر کی طرف) لوٹ جاؤ گے؟ (یاد رکھو) جو شخص بھی اس طرح مرتد ہوگا وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا' اللہ قدر دانوں کو نیک جزا دیتا ہے۔

ابوبکر صدیقؓ کے اس خطبے سے سارے مجمع پر سناٹا سا چھا گیا اور سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ اب کسی کو وفات میں شبہ نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے آیت مذکورہ انھوں نے آج سے پہلے نہیں سنی تھی۔ جب حضرت عمرؓ کو یقین وفات ہوا تو زمین پر صدمے سے گر پڑے اور بے ہوش ہوگئے۔ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم ضبط گریہ سے عاجز تھے۔

تکفین و تدفین

حضورؐ انور کو کنبے والوں ہی نے غسل دیا' البتہ ہاتھ بٹانے میں

دوسرے لوگ بھی شریک تھے۔ علیؓ، عقیلؓ، عباسؓ اور ان کے دونوں صاحب زادے فضلؓ اور قثمؓ کنبے والوں میں اور غیر میں اسامہ اور اوسؓ بن خولی انصاری تھے۔ بعد غسل تین کفن دیے گئے جو سفید سوتی تھے۔ جنازہ تیار ہونے کے بعد جائے دفن کا سوال درپیش ہوا۔ مختلف رائیں ہوئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ نبی جہاں وفات پاتا ہے وہیں دفن ہوتا ہے۔" چنانچہ حجرہ عائشہؓ ہی کو مدفن رسول ہونے کا ابدی شرف حاصل ہوا۔ ابو طلحہؓ نے قبر کھودی جو دستور مدینہ کے مطابق لحدی تھی۔ زمین نم تھی اس لیے وہ بستر جس پر وفات ہوئی تھی قبر مبارک میں بچھا دیا گیا تھا۔ جنازہ مبارک تیار ہونے کے بعد سب سے پہلے اہل قرابت نے، پھر مہاجرین نے، پھر انصار نے، پھر عام مسلمانوں نے، پھر عورتوں نے، پھر بچوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ حجرے کے اندر کم و بیش دس دس آدمی جاتے تھے (کیوں کہ حجرہ تنگ تھا) اور صلوۃ و سلام کے ساتھ کچھ دعائیں پڑھ کر واپس آجاتے۔ یہی حضورؐ اکرم کی نماز جنازہ تھی۔ جو گروہ اندر جاتا اس کا کوئی امام نہ ہوتا تھا۔

جسد اطہر کو قبر منور میں حضرت علیؓ، فضل بن عباسؓ، اسامہ بن زیدؓ اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اتارا تھا۔ قبر مطہر مسنم یعنی کوہانی شکل کی بنائی گئی۔

حدیث مسلسل بالبکاء

مٹی دے کر صحابہ کرام لوٹ رہے تھے کہ حضرت انسؓ (جو کم و بیش دس سال حضورؐ پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم رہے تھے) حجرہ فاطمہؓ کے پاس سے گزرے۔ غم زدہ فاطمہؓ نے آہٹ پا کر دریافت کیا۔ کون ہے؟ جواب دیا "آپؓ کے پدر بزرگ وار کا خادم یعنی انسؓ ہے۔" سیدہ فاطمہ زہراؓ نے رو کر ایک عجیب سوال کیا جس پر سینکڑوں مرثیے قربان ہیں۔ فرمایا کہ:

یا انس کیف طابت انفسکم ان تحثوا التراب علیٰ رسول اللّٰہ؟
اے انس! تمھارے دلوں نے کیوں کر گوارا کیا کہ رسولؐ اللہ پر مٹی ڈال کر واپس آگئے۔"

اس حدیث کی خصوصیت یہ ہے کہ جس شیخ نے اپنے تلمیذ کو اس کی اجازت دی ہے رو کر دی ہے۔ مجھے میرے شیخ طریقت (پدر بزرگ وار حضرت قبلہ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی قدس اللہ سرہ العزیز) نے اسی طرح رو کر اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ گویا مجھ سے لے کر حضرت سیدہ فاطمہؓ تک یہ حدیث بیان کرتے وقت رونے کا سلسلہ لگاتار قائم رہا ہے۔ اس لیے اس حدیث کو "مسلسل بالبکاء" کہتے ہیں۔ میرے بہت سے احباب بھی اس حدیث کی اجازت میں شریک ہیں۔

اللّٰھم صلی علیٰ صاحب خیر الھدے وعلی من تبعہ

✳ ✳ ✳

فہرست اعلام

INSTITUTE OF ISLAMIC CULTURE : LAHORE : PAKISTAN

ادارہ ثقافت اسلامیہ